سِلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقیٔ اُردُو (ہند) نمبر ۱۰۳

تنقیدِ شعر العجم

تالیف

پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب

(نظرِ ثانی اور اضافۂ مزید کے ساتھ)

شایع کردہ

انجمنِ ترقیٔ اُردُو (ہند)، دہلی

سنہ ۱۹۴۲ء

ایڈیشن

قیمت مجلّد ۶، بلا جلد ۵

تنقیدِ شعرالعجم

عبّاس مروزی سے کمال اسمٰعیل تک

جس میں

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کے مشہور تذکرے "شعرالعجم"
کے تاریخی بیانات پر تحقیق کی روشنی میں نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

فہرست مضامین

انتساب

میں اس تنقید کو اپنے شفیق محترم مولوی
محمد شفیع ایم۔اے، سابق پرنسپل اورنٹیل کالج
و پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور،
کے نام پر
اپنے قیام لاہور کی یادگار میں دِلی شکریے کے ساتھ
معنون کرتا ہوں۔

محمود۔شیرانی

پیش کلام

"تنقیدِ شعر العجم" جسے اب کتابی صورت میں طبع کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، اکتوبر ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک، انجمن ترقیٔ اُردو کے سہ ماہی رسالے "اُردو" (اورنگ آباد) میں قسط وار نکل چکی تھی۔ اُس وقت سے اب تک اس کی طباعت کے واسطے احباب کے تقاضے ہوتے رہے، لیکن راقم کو اپنے فرائضِ منصبی سے اس قدر فرصت میسّر نہ ہوئی کہ اس کی طرف توجہ کی جاتی۔ اب یہ اقساط، نظرِ ثانی کے بعد کتابی صورت میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ کمال اسمٰعیل پر تنقید کا مسودہ پُرانے کاغذات میں سے نکل آیا، اُس کو بھی اضافہ کر دیا ہے۔

گزشتہ چند سال سے ایران میں ادبِ قدیم کا دوُر احیا ہوا۔ پُرانے اساتذہ سے متعلق ایرانیوں کی تحقیقات بھی، تنقید کے اکثر نتائج سے ہمنوا ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ راقم نے تنقید میں جو طریقہ اختیار کیا تھا، بالکل صحیح تھا۔

میں نہایت وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ تنقیدِ ہٰذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلتِ علمی کی منقصت نہیں ہے بلکہ محض احتجاج ہے، اُس مُروّجہ رَوِش کے خلاف جس میں ہمارے مصنّفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔ ہم تاریخی واقعات اور سوانح و حالات لکھتے وقت اِس قدر تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اُن کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور اُن کی صحت و دُرستی کے متعلق اپنا اطمینان کر لیں، میں اُن بزرگوں کے ساتھ بھی اِتّفاق

نہیں کرتا جو شعر العجم کو حُسن و عشق کا صحیفہ کہ کر اس کے تاریخی پہلو کی اہمیت کو گھٹانا اور تنقید کی ضرورت کو اس سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

تنقید، میرے لیے ایک علمی مشغلے کا سامان تھی اور میں اس میں پوری دِل چسپی لیتا رہا، لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب یونیورسٹی نے اسے ایم۔ اے کے نصاب سے خارج کر دیا ہی تو مجھے بڑا رنج ہُوا اور میں نے تنقید کا سلسلہ ختم کر دیا۔

تنقید کے دوران میں میں نے نہ صرف تخریبی پہلو پر نظر رکھی ہی بلکہ حسبِ اجازتِ وقت تعمیری کام بھی کیا ہی یوں تو ہر شاعر کے حال میں کم و بیش اس کا پرتو موجود ہی لیکن آنوری، نظامی، اور عطار کے تذکرے میں بہت نمایاں ہی۔

اِس تنقید کا مقصد ناظرین کے واسطے ہر قسم کی اطلاع فراہم کرنا نہیں ہی بلکہ شعر العجم کے نظری مواقع پر روشنی ڈالنا ہی، یہی نقطۂ نظر خیام کے حالات میں بھی کارفرما ہی جو میرے فاضل دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی کے قلم کا نتیجہ ہی۔ ڈاکٹر صاحب بحالتِ موجودہ اپنے مضمون کی طباعت کے حق میں نہ تھے، لیکن یہ اطلاع مجھ کو ایسے وقت ملی۔ جب کہ تمام کتاب لکھی جا کر مطبع میں پہنچ چکی تھی۔ مجھے اُن کی خواہش کی تعمیل نہ کرنے کا افسوس ہی۔

محمود شیرانی

تنقیدِ شعر العجم

علامہ شبلی مرحوم زمانۂ حال کے اُن چند مستند افاضل میں سے ہیں جن کا وجود مسلمانوں کے لیے ہمیشہ مایۂ ناز رہے گا ان کی متعدد تصنیفات نے آسمانِ علم پر اُن کو آفتاب بنا کر چمکایا ہی۔

مرحوم کا شمار ان خوش نصیب مصنفین میں کیا جا سکتا ہی جن کے فرزندانِ روحانی نے اُن کے دورانِ حیات میں قرار واقعی قدر و منزلت حاصل کر لی ہی جس کے حقیقت میں وہ مستحق ہیں۔

مرحوم نے تاریخ نگاری کی بُنیاد ایسے زمانے میں ڈالی جب فنِ تاریخ کا شوق ہمارے دل سے محو ہو چکا تھا، اُردو زبان تاریخی کتابوں سے بالکل تہی مایہ تھی اور ملک کا مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھا۔ ایسے جمود کے وقت میں ان کے قلم نے اس فن کے احیا میں وہ زبردست اور قابلِ قدر خدمت کی جو صدیوں تک یادگار رہے گی۔

تاریخ میں ان کی وسعتِ معلومات کا اندازہ مرحوم کی ان متعدد اور مختلف الموضوع تصانیف سے لگایا جا سکتا ہی جو اُردو ادبیات کی چیدہ اور منتخب کتابوں میں مانی جاتی ہیں۔

فارسی نظم کی تاریخ میں اُردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کر کے علامہ نے

شعر العجم تصنیف کی۔ اس موضوع پر اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، شعر العجم ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جا سکتی ہی۔ ملک نے بھی اُس کی قدر کرنے میں حوصلے سے کام لیا۔ چنانچہ اس وقت تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ذیل کی سطور میں میرا روئے سخن اسی کتاب کی طرف ہی اور صرف ان بیانات سے بحث کی جائے گی جن کے متعلق مجھے مولانا شبلی سے بعض تاریخی یا تنقیدی وجوہ پر اختلاف ہی۔ میرا تبصرہ ممکن ہی کہ آیندہ بھی جاری رہے۔ سر دست اس کی پہلی جلد کا مطالعہ شروع کرتا ہوں۔ شعر العجم کے نام سے جہاں جہاں حوالے دیے گئے ہیں وہ اسی جلد سے تصور کیے جائیں، اس کتاب کا جو نسخہ میرے زیر نظر ہے وہ مطبع فیض عام علی گڑھ ۱۹۰۹ء کا مطبوعہ ہی۔

شعر العجم کے مطالعے کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوئی ہی کہ علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مورخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے ہیں، رطب و یابس جو کچھ اُن کے مطالعے میں آجاتا ہی بشرطیکہ دلچسپ ہو حوالۂ قلم کر دیتے ہیں۔ بعض وقت دیکھا جاتا ہی کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی آگے جا کر خود ہی تردید کر جاتے ہیں۔ پہلے کچھ رائے قائم کی بعد میں جا کر کوئی اور نظریہ قائم کر لیا۔ ممکن ہی کہ شبلی تاریخِ اسلام میں بہتر نظر رکھتے ہوں لیکن شعرائے عجم کے حالات میں اُن کے طاقت ور قلم نے بہت لغزشیں کی ہیں اس خاص دائرے میں اُن کی معلوماتِ تاریخی نہایت محدود ہی اور نہ تمام سلسلۂ شعرا، ان کے دواوین اور آثار پر کافی عبور ہی۔ سن و تاریخ جو فنِ تاریخ کا ایک شاندار اور وقیع پہلو ہی اس پر اوّل تو پوری توجہ نہیں کی اور ضرورتاً کہیں ایسا کیا بھی تو غلطیوں سے خالی نہیں۔ بعض متاخرین کو متقدمین کا پہلو نشین بنا دیا اور بعض متاخرین کو متقدمین کا ہم بزم کر دیا ہی۔

بہت سے غیر تاریخی افسانوں نے شعر العجم میں قابلِ عزت جگہ پائی ہے۔ عام اغلاط جنھیں تذکرہ نگاروں نے اپنی اپنی تصنیف میں دُہرا کر ہماری ادبیات میں عام طور پر زباں زد کر دیا ہے، شعر العجم کے صفحات پر بھی موجود ہیں۔ ایک شاعر کے ابیات دوسرے شاعر کے نام سے بھی بعض اوقات درج ہوئے ہیں۔ اکثر اوقات ایک مورخ یا محقق کو اپنے اجتہاد کے استعمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن مولانا نے ضروری مواقع پر بھی اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے، جب کسی واقعے کی نسبت دو مختلف روایتیں آ گئی ہیں شبلی اس خوش خلق حاکم کی طرح جو مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے خوش کرنے کی بے سود کوشش میں مصروف ہو "تم بھی سچے اور تم بھی سچے" کہہ کر بغیر کسی جرح و تعدیل کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ روایات بڑے بوڑھوں کی باقیات الصالحات ہیں ان کے متعلق ردّ و قدح کرنا یا ان کو غلط ثابت کرنا ہماری شانِ اخلاق کے خلاف ہے۔

۵ کے تو انم دید زاہد جام صہبا بشکند
مے پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند

کتابت کی غلطیاں ایک اچھی تعداد میں موجود ہیں، اگرچہ فرماتے ہیں:

"غلطیاں تو اس قدر ہیں کہ سب کا احصا کروں تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے اس لیے موٹی موٹی غلطیاں لکھ دی ہیں"۔
ص ۳و۲ آخر کتاب۔

اس عذر اور آخر میں غلط نامے کے باوجود کتاب میں موٹی موٹی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔

جو جو اطلاعات آسانی سے مولانا شبلی کی دسترس میں آسکیں انھیں پر قناعت کی۔ زیادہ تحقیق اور تلاش سے کام نہیں لیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اس

حصۂ شعر العجم کے لیے (جو اس مضمون کے دوران میں میرے زیر نظر ہی) مجمع الفصحا اور تذکرۂ دولت شاہ پر زیادہ اعتماد کیا ہی، ان تصنیفات میں ہر قسم کا رطب و یابس نظر آتا ہی۔ میرے خیال میں لباب الالباب محمد عوفی، بزم آرا، یا مخزن الغرائب زیادہ مفید ہوتیں، پچھلی دونوں کتابوں سے مولانا واقف نہیں معلوم ہوتے البتہ لباب الالباب کا نام فہرست کتب میں سب سے اول ہی، جسے لب اللباب عوفی یزدی (کذا) کے نام سے یاد کیا ہی۔ (شعر العجم ص ۴)

لیکن مولانا کی فہرست میں اس کا ادخال زیادہ تر ایک اعزازی حیثیت رکھتا ہی کیونکہ آخر جلد میں غالباً انھیں اعتراف ہی کہ یہ کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری۔ فرماتے ہیں :-

"لب اللباب عوفی کی پہلی جلد کتاب کی تصنیف کے بعد چھپ[1] کر
یورپ سے آئی تو اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا" ص ۲ آخر جلد اول

اس سے میں یہی سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک لباب الالباب مولانا کی نظر افروز نہیں ہوئی تھی پھر فہرست میں اس کے شامل کیے جانے کے کیا معنی ؟

میں دیکھتا ہوں کہ فہرست میں ابو الفضل بیہقی کی تاریخ آلِ غزنین کا نام بھی درج ہی جس کے ساتھ یہ نوٹ ہی :-

"مصنف مسعود بن سلطان محمد (کذا) غزنوی کے زمانے میں تھا
ضمناً شعراے عصر کا تذکرہ کیا ہی" ص ۴

اب جو شخص تاریخِ بیہقی سے واقف ہی وہ جان سکتا ہی کہ مصنف نے شعراے عصر کے ذکر کرنے میں خاص التزام سے کام نہیں لیا۔ چند فقرے ابو حنیفہ اسکاف۔ زینتی علوی

---

[1] لباب الالباب محمد عوفی سنہ ۱۹۰۶ء میں پروفیسر براون نے شائع کی اور شعر العجم سنہ ۱۹۰۹ء میں طبع ہوئی۔

اور مسعود رازی کے ایک ایک واقعے کے متعلق اتفاقیہ حوالہ قلم کر دیے ہیں لیکن مولانا نے ان سے کچھ استفادہ نہیں کیا اور نہ ذیلِ کتاب میں کہیں حوالہ دیا اِس لیے لباب کی طرح اس کتاب کا نام بھی محض آرایش و نمایش کے لیے داخل کر لیا گیا ہی۔

دیکھا جاتا ہی کہ فہرست میں پروفیسر براون کی "تاریخ ادبیات ایران[1]" کا نام درج نہیں ہوا حالانکہ براون کے اثرات میں علامہ نے خواجہ زادہ عباس مروزی سے متعلق جسے ابو العباس لکھا گیا ہی اور جو اکثر محققین کے نزدیک فارسی شاعری کا آدم ہی، فرمایا ہی:-

"ابو العباس مروزی کے اشعار جن کا ذکر آگے چل کر کہیں آئے گا اگر روایتاً ثابت بھی ہوں تو وہ ایک اتفاقیہ تفریحِ خاطر تھی جو سلسلۂ تاریخ کی کوئی کڑی نہیں بن سکتی" شعر العجم ص ۱۶

عباس مروزی کے وہ اشعار حسبِ ذیل ہیں:-

اے رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین	گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین
مر خلافت را تو شایستہ چو مردم دیدہ را	دین یزدان را تو بایستہ چو رُخ را ہر دو عین
کس برین منوال پیش از من چنین شعرے نگفت	مر زبان پارسی راہست تا این نوع بین
لیک ازاں گفتم من این مدحت ترا تا این لغت	گیرد از مدح و ثنائے حضرتِ تو زیب و زین

[1] براون کی تاریخ اس موضوع پر سب سے اعلیٰ تصنیف ہی جو میری نظر سے گزری ہی۔ مولانا شبلی نے اس سے استفادہ بھی کیا ہی، ہمارے زمانے کی اس بہترین تصنیف کے لیے شبلی کی رائے قابل دید ہی۔ فرماتے ہیں:-

"بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براون کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہی"

مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۲۴۲ مطبع معارف ۱۹۱۷ء

ان اشعار کے متعلق مولانا اس لیے متشکک ہیں کہ (Kasiminsky)
اور پروفیسر براؤن ان کو تسلیم نہیں کرتے لیکن صفحہ ۱۸ پر مولانا اپنے گزشتہ بیانات
فراموش کر کے فرماتے ہیں :-

"اتنے سے سہارے پر کہ مامون الرشید ایک مدت تک خراسان
میں رہا تھا اور غالباً فارسی سے حرف آشنا ہو گیا تھا عباس مروزی
نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھا اور مامون الرشید نے اس کے صلے
میں ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیے"۔ ص ۱۸ شعر العجم۔

اس روایت کا پہلا ناقل محمد عوفی ہو لیکن وہ کہتا ہو کہ صرف ایک ہزار دینار
صلے میں دیے گئے، سالانہ کا ذکر نہیں کرتا، جب یہ واقعہ علامہ کے نزدیک روایتاً
ثابت نہیں تو اس کے استعمال کی زحمت کیوں گوارا کی آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"اس سے پہلے اگر برلئے نام کچھ پتا چلتا ہو تو ابو حفص حکیم سغدی کا
شعر ہو جو پہلی صدی ہجری میں موجود تھا" ص ۱۸ شعر العجم۔

ابو حفص بن احوص سغدی سغد سمرقند کا رہنے والا فن موسیقی میں اُستادِ کامل
تھا، ابو نصر فارابی نے اپنی تصنیفات میں اس کا ذکر کیا ہو، موسیقار سے ملتا جلتا
ایک ساز جس کا نام "شہرود" تھا اس نے ایجاد کیا، فارابی نے اس ساز کی شکل
اپنی تصنیف میں بیان کی ہو۔ ابو حفص بقول صاحبِ خزانۂ عامرہ' وصاحب المعجم
فی معاییر اشعار العجم ۳۰۰ھ میں گزرا ہو۔ ابو حفص فارسی فرہنگ نگاروں کا ابو البشر
مانا جا سکتا ہو اس کی فرہنگ کا ذکر فرہنگِ جہانگیری میں آتا ہو۔

رباعی کی نسبت مجھے علامہ شبلی سے اختلاف ہو، صفاریہ خاندان کا ذکر کرتے
ہوئے لکھتے ہیں :-

"شاعری کے متعلق اس خاندان کا بڑا احسان یہ ہو کہ رُباعی کی ایجاد

اسی زمانے میں ہوئی یعقوب صفار کا ایک کمسن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جاگرا بچّے کی زبان سے بیساختہ یہ مصرعہ نکلا ع

غلطاں غلطاں ہمی رود تالب گو

یعقوب بھی موجود تھا اس کو بچّے کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا لیکن چونکہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے شعرا کو بلاکر کہا کہ یہ کیا بحر ہی اُنھوں نے کہا ہزج ہی پھر تین مصرعے اور لگاکر رباعی کردیا اور دوبیتی نام رکھا، مدت تک یہی نام رہا پھر دوبیتی کی بجائے رباعی کہنے لگے۔ لیکن یہ تعجب ہی کہ عربی زبان میں آج بھی دوبیتی کہتے ہیں جس سے اہلِ عرب کی دیانت کا اندازہ ہوتا ہی" شعر العجم ص۲۱و۲۲

یہ قصہ غالباً مولانا نے دولت شاہ سمرقندی سے نقل کیا ہی لیکن یہ یاد رہے کہ دولت شاہ سمرقندی ایک نہایت ضعیف راوی ہی۔ اس سے بہتر اطلاع قدر بلگرامی نے قواعد العروض میں دی ہی۔

المعجم فی معاییر اشعار العجم میں شمس الدین محمد بن قیس جو ساتویں صدی ہجری کے ربع اول کے مصنف ہیں لکھتے ہیں کہ متقدمینِ شعرائے عجم میں ایک شاعر نے (میرا خیال ہی کہ وہ رودکی تھا) اخرم اور اخرب کے اجتماع سے نیا وزن نکالا جس کو وزنِ رُباعی کہا جاتا ہی یہ ایک ایسا مقبول وزن ہی کہ طبائع سلیم اکثر اس کی شائق ہیں اِس کے استخراج کا باعث یہ کہا جاتا ہی کہ ایک روز عید کے دن غزنیں کی تفرج گاہ میں وہ گشت کر رہا تھا اس نے دیکھا کہ کچھ لڑکے کھیل میں مشغول ہیں اور اور ان کے گرد تماشائیوں کا ہجوم ہی شاعر بھی وہاں جاکر کھڑا ہوگیا ان میں ایک لڑکا جس کی عمر دس پندرہ سال سے زائد نہ ہوگی اخروٹوں سے کھیل رہا تھا اسی اثنا

میں ایک اخروٹ گڑھے سے باہر گرا اور پھر رجعت کرتا ہوا گڑھے میں جا گرا۔ لڑکا حسین وجمیل ہونے کے علاوہ طبیعت میں موزونیت بھی رکھتا تھا اور اپنی مقفی اور مسجّع گفتگو سے حاضرین کو محظوظ کر رہا تھا اخروٹ کو گڑھے کی طرف رواں دیکھ کر بولا ع

غلطاں غلطاں ہمی رود تالب گو

شاعر نے اس کلمے سے ایک مقبول وزن معلوم کر لیا اور عروضی اصول اس پر استعمال کرکے ترانہ نام رکھا اور بحر ہزج کی فروع میں شامل کر لیا۔ المعجم ص ۸۸-۹۰

لیکن میں اس روایت کا بھی پابند نہیں ہو سکتا اگرچہ میں نے مولانا کے نظریے کی تردید کے لیے اس کو درج کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظم کی وہ صنفِ خاص جس کو ہم رباعی کہنے کے عادی ہیں کوئی شخصی ایجاد نہیں بلکہ چہار بیتی کا ارتقائی نتیجہ ہے۔ قدیم الایام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم جس کو چہار بیتی کہا جاتا تھا رائج تھی اس کے اوزان عربی اوزان سے غالباً مستخرج نہیں بلکہ ایران زا اور مقامی معلوم ہوتے ہیں۔ قدما ہزج کے مربعات میں ان کا شمار کرتے تھے تعداد میں وہ چار شعر ہوتے تھے اور چاروں شعروں میں قافیہ لانا ضروری سمجھا جاتا تھا متاخرین نے اس میں یہ ترمیم کی کہ اس کے وزنِ مربع کو مثمن قرار دیا۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان چار ابیات کی تعداد دو شعروں میں محدود ہو گئی اور چار قافیوں کے بجائے صرف تین قافیے ضروری سمجھے گئے اور مصرع سوم خصی رکھا گیا۔

قدیم چہار بیتی کا کوئی نمونہ اس وقت موجود نہیں لیکن سمجھانے کے لیے اس قدر کافی ہوگا۔ ع

یکبارہ چنیں جاہل و خونخوارہ مباش

ہمارے نزدیک یہ ایک مصرع مانا جاتا ہے قدما کے نزدیک پورا شعر تھا جس کو غالباً وہ یوں لکھتے تھے ؎

یک بارہ چنیں جا هل دخونخوارہ مباش

جاہل کی "ہ" شامل مصرع اوّل ہے اس لیے یہ ایک معقد شعر ہے جس کی تقطیع ہے مفعول مفاعیل، مفاعیل فعول یا مثلاً متقدمین کا یہ شعرِ معقد ؎

دانی کہ دل از تو نہ شود سیر مَرا

متاخرین نے اس شعر کو بھی ایک مصرع مانا اور یوں لکھا ع

دانی کہ دل از تو نشود سیر مَرا

جب ہزج اخرب یا اخرم میں ایسے چار شعر جمع ہو گئے اور آخر میں قافیہ پایا گیا قدما نے چہار بیتی نام رکھ لیا لیکن متاخرین نے ان چار اشعار کو چار مصرعے شمار کیا اس لیے چار بیتی کا نام دو بیتی رکھ دیا۔ محقق طوسی اس کے متعلق مربعاتِ ہزج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وآنچہ ازیں وزنہا مانند یک مصراع مثمن است متاخران استعمال کمتر کنند و قدما بر آن شعر بسیار گفتہ اند وایشان ہر مصراع را قافیہ آوردہ اند و آنرا بیتی می شمردہ مانند رجز مشطور یا بیت ہائے معقد از اشعار تازیان کہ آنرا نصفی معین نباشد و بدین سبب ترانہ را قدما چہار بیت می گرفتہ اند و آنرا چہار بیتی خواندہ و بتازی رُباعی و در ہر چہار قافیہ آوردن لازم می شمردہ اند۔ اما بہ نزدیک متاخران چوں مربعات ایں اوزان مستعمل نیست ایں اوزان متروک است و ہر بیتی را ازیں ابیات مصراعی می شمرند و رباعی را دو بیتی می خوانند و مصراع سوم را خصی می خوانند و قافیہ شرط نمی نہند"۔ معیار الاشعار

[اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے:-
(مربعات کے) ان اوزان میں سے ایسے وزن جو ایک مصرع مثمن کے مانند ہیں متاخرین میں غیر مستعمل ہیں۔ قدما نے ان اوزان میں کثرت سے اشعار لکھے ہیں وہ ہر مصرع (یعنی شعر مربع) کے آخر میں قافیہ لائے ہیں اور اس کو ایک بیت شمار کرتے ہیں۔ رجز مشطور یا عربوں کے معقد اشعار کی طرح جن کا نصف معین نہیں ہوتا اسی لیے قدما ترانہ کو چار بیت مانتے تھے اور اس کو چار بیتی کے نام سے یاد کرتے تھے اور عربی میں رباعی کہتے اور چاروں شعروں میں قافیہ لانا ضروری سمجھتے تھے لیکن متاخرین میں چونکہ ان کے مربع اوزان استعمال میں نہیں آرہے یہ اوزان متروک ہو چکے ہیں۔ وہ اب ان اشعار کے ہر بیت کو ایک مصرع مانتے ہیں اور رُباعی کو دو بیتی کہتے ہیں اور تیسرے مصرع کو خصی رکھتے ہیں اور اس میں قافیہ کی شرط ضروری نہیں سمجھتے۔]

چہار بیتی کا سب سے قدیم نمونہ مجھ کو ابوشکور کے ہاں ملتا ہے جس کا 'آفرین نامہ' (شاہنامہ کی بحر میں ایک مثنوی) بقول عوفی ۳۳۶ھ میں ختم ہوا تھا۔ ابوشکور کی رباعی کی موجودہ شکل یہ ہے:-

رُباعی

اے گشتہ من از غم فراوان تو پست — شد قامت من ز درد ہجران تو شست
اے شستہ من از فریب دستان تو دست — خود ہیچ کسے بسیرت و شان تو ہست

(لباب الالباب عوفی)

لیکن اگر چہار بیتی کی شکل میں لکھا جائے تو اس کی صورت حسب ذیل ہوگی ؎

اے گشتہ من از غم — فراوان تو پست
شد قامت من ز در — د ہجران تو شست
اے شستہ من از فری — ب دستان تو دست
خود ہیچ کسے بسی — رت و شان تو ہست

اب یہ چہار بیتی کی بہت اچھی مثال ہے اس کے چاروں ابیات میں قافیہ ہے اور آخری تینوں شعر معقد ہیں۔ متقدمین میں جس طرح رودکی اور شہید غزل کے لیے مشہور ہیں اسی طرح ابوطلب ترانہ کے لیے مشہور ہے۔ فرخی

بیت

از دلآرامی و نغزی چون غزلہائے شہید　　وز دلآویزی و خوبی چون ترانہ بوطلب

غزنویوں کے عہد تک چہار بیتی کا رواج رہا بعد میں دوبیتی زیادہ رائج ہوئی۔[1]

قدما کے حالات میں تاریخ نے زیادہ تر بخل و امساک سے کام لیا ہے اس لیے اُن قرون کے مشاہیر رجال کے حالات ہم تک بہت قلت کے ساتھ پہنچے ہیں۔ لیکن جو کچھ پہنچے ہیں مورخ کا فرض ہے کہ سب کو جمع کر کے صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ علامہ شبلی نے بعض موقعوں پر محض سطحی معلومات پر اکتفا کی ہے۔ مثال میں شہید کا نام پیش کیا جاتا ہے اس کا ذکر صفحات ۲۷ و ۵۳ میں کیا ہے لیکن اس کے حالات کی طرف کوئی اعتنا نہیں کی نہ اس کی وجاہت کو کما حقہٗ ظاہر کیا۔ ابوالحسن شہید بن الحسین بلخی اپنے عہد کا نہایت زبردست فلسفی اور حکیم تھا اس کے مناظرات مشہور محمد بن زکریا الرازی سے ہوئے ہیں۔ رازی نے اس کے جواب میں بعض رسائل بھی لکھے ہیں۔ فن شعر اس کے کمالات کا ایک کم تر پایہ ہے لیکن اس میدان میں بھی وہ رودکی کا ہمسر شمار کیا جاتا ہے محمد عوفی

[1] محترم فاضل علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی قابلِ قدر تصنیف 'خیام' میں جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی ہے رباعی کے تعلق میں میرے بعض بیانات کی تردید کی ہے اور نئے نظریے سپردِ قلم کیے ہیں۔ تنقید کے ضمن میں ان کا اندراج نامناسب تھا۔ اس لیے میں نے سید صاحب کے اعتراضات اور اپنے جوابات کو ایک علیحدہ ضمیمہ میں داخل کر کے کتاب کے آخر میں درج کر دیا ہے۔ ناظرین وہاں دیکھ لیں۔

رودکی پر اس کے تقدم کا معترف ہو فرخی نے ایک سے زیادہ موقعے پر اس کے نام کو شہرت دی ہو ~

شاعرانت چو رودکی و شہید مطربانت چو سرکش و سرکب

دقیقی اور منوچہری نے بھی اس کے نام کو رودکی کے نام کے ساتھ ضم کیا ہو۔
منوچہری ~

از حکیمان خراسان کو شہید و رودکی بوشکور بلخی و بوالفتح بستی ہکذی

وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ ابو محمد عبد اللہ کانی روزنی نے اپنی کتاب حماستہ الظرفا میں شہید کے بعض عربی اشعار درج کیے ہیں جن میں سے لباب الالباب میں عوفی نے تین شعر نقل کیے ہیں۔ ابن ندیم یاقوت اور ابو منصور الثعالبی سب اس کا ذکر کرتے ہیں۔ فلسفہ اخلاق اور الم پرستی شہید کی شاعری کے امتیازی جوہر ہیں۔

اب میں رودکی کے حالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

رودکی

یہ مشہور آفاق شاعر آدم الشعرا مانا جاتا ہو اس لیے خیال کیا جاتا ہو کہ علامہ نے اس کے واقعات قلمبند کرنے میں زیادہ تحقیق اور تلاش سے کام لیا ہوگا اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے تو ایسا ہی خیال گزرتا ہو۔لیکن میں ناظرین کو آغاز داستان ہی میں اطلاع دیے دیتا ہوں کہ شعر العجم میں رودکی کا افسانہ ایک دل فریب اور دل کش سراب کے منظر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔بقول آتشؔ ~

بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

مولانا لکھنے بیٹھے تھے رودکی کی داستان لیکن درمیان میں اُن کے سمند قلم نے اس قدر بدلگامیاں کیں کہ منزل مقصود سے بھٹک کر کہیں کے کہیں جا نکلے اور

حقیقی رودکی کے دھوکے میں ایک خیالی اور سیمیائی رودکی کے باغ کی سیر میں مصروف ہو گئے۔

شعر العجم میں رودکی کا نام محمد یا جعفر ص ۲۸ دیا ہے جس میں پہلا غلط اور دوسرا صحیح ہے۔ انساب السمعانی میں اس کا پورا نام یوں درج ہے۔ "استاد ابو عبداللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبدالرحمن ابن آدم السمرقندی" ص ۲۶۲

مولانا شبلی فرماتے ہیں:

"رودک نخشب کے ضلع میں جس کو نسف بھی کہتے ہیں ایک گانو کا نام ہے رودکی اسی گانو کی طرف منسوب ہے" شعر العجم ص ۲۸

انساب السمعانی (مطبوعہ یورپ ص ۲۶۲) میں رودک ایک ناحیہ کا نام ہے جس کا صدر مقام سمرقند سے دو فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے رودکی اس کی طرف منسوب ہے۔

رودکی کی نابینائی کے ذکر میں فرماتے ہیں:

"یورپ اور ایشیا کا یہ عجیب اتفاقی توافق ہے کہ رودکی بھی ہومر کی طرح مادر زاد اندھا تھا" شعر العجم صفحہ ۲۸

بعض یورپین محققین مثلاً ڈاکٹر ایتھ وغیرہم نے اس کی نابینائی سے قطعاً انکار کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ رودکی کی نابینائی کے متعلق ہمارے پاس قریب قریب ہمعصر شہادتیں موجود ہیں مثلاً دقیقی اس کی بے بصارتی کی طرف تلمیح کرتا ہوا کہتا ہے ؎

استاد شہید زندہ بایستی — وآں شاعر کور چشم باطن بیں

اور ابو زراعہ المعمری الجرجانی کہتا ہے۔ ابیات

اگر بدولت با رودکی نمی مانم — عجب مکن سخن از رودکی نکم دانم

اگر بکوری چشم او بیافت گیتی را — ز بہر گیتی من کورہ بود نتوانم

ہزار یک زاں کو یافت از عطائے ملوک — بمن دہی سخن آید ہزار چندانم

لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ مادر زاد نابینا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ منینی نے شرح یمینی (صفحہ ۵۲ جلد اول مطبوعہ مصر ۱۲۸۶ھ) میں شارح نجاتی کی سند پر لکھا ہے اور نجاتی رشیدی کے سعد نامے کے حوالے سے کہتا ہے کہ آخرِ عمر میں رودکی کی آنکھوں میں سلائی پھروادی گئی تھی۔ کتاب کلیلہ و دمنہ جیسا کہ فردوسی کے بیان سے آیندہ معلوم ہوگا رودکی نے نابینائی کے زمانے میں لکھی تھی اس کتاب کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

"لیکن خاندانِ سامانیہ نے شاعری سے اصلی کام لیے۔ چنانچہ رودکی کو کلیلہ و دمنہ کی نظم کی خدمت دی اور اس کے صلے میں چالیس ہزار درہم عطا کیے عنصری ایک قصیدے میں کہتا ہے ؎

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور"

شعرالعجم صفحہ ۲۹ و ۳۰۔ **ولہٗ** "نصر بن احمد سامانی نے رودکی کو حکم دیا کہ اس کو فارسی میں نظم کر دے"۔ شعرالعجم صفحہ ۲۶۔

اس عبارت میں علامہ شبلی کو دو مغالطے پیش آئے ہیں۔ شعر بالا میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے عجیب عجیب اصلاحیں دی ہیں مفتاح التواریخ میں صاحب ہفت قلیم کی سند پر یوں لکھا ہے۔ ؎

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش عطا گرفت بہ نظمِ کلیلہ و دمنہ

مرآت الخیال میں مطلع بنا لیا گیا ہے ؎

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش عطا گرفت ز نظم آورے بکشور خویش[1]

لیکن قصائد عنصری میں رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل شعر یوں تھا ؎

---

[1] صفحہ ۲۱۔ طبع بمبئی آقا محمد شیرازی۔

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش | بیافتہ است بتوزیع از این در و آمد
شگفتش آمد و شادی فزود و کبر گرفت | ز روئے فخر بگفت این بشعر خوش اندر [51]

یہ فیصلہ کرنا کوئی مشکل امر نہیں کہ ان قصائد میں عنصری والا مصرعہ بیافتہ است بتوزیع الخ صحیح ہی یا مولانا کا مصرع جس میں کلیلہ کا ذکر آتا ہی۔ ازرقی نے جو ابو الفوارس طغان شاہ بن الپ ارسلان محمد بن جغری بیگ داؤد سلجوقی کا مداح ہی اتفاقیہ اس واقعے کا ذکر ایک قصیدے میں کیا ہی عنصری کا شعر بالا اس کے ذہن میں ہی اور لکھتا ہی۔

حدیث میر خراسان و قصہ توزیع [52] | بگفت رودکی از روئے فخر در اشعار
بدانچہ دادہ بدو را ہزار دیناری | بنا و جوب بہم کردہ از صغار و کبار

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح عنصری کے ہاں اسی طرح ازرقی کے ہاں کلیلہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ دونوں شاعر توزیع لکھ رہے ہیں جس سے صاف ظاہر ہی کہ یہ انعام کلیلہ کے صلہ میں نہیں ملا بلکہ مختلف موقعوں پر۔ اگر مزید شہادت کی ضرورت ہی تو خود رودکی کا شعر جو غالباً اس قصے کا بانی مبانی ہی نقل کیا جا سکتا ہی ڈھونڈا ہے۔

بداد میر خراسانش چہل ہزار درم | وزو فزونی یک پنج میر ماکاں بود [53]

یہاں دیکھا جاتا ہی کہ رودکی خود بھی کلیلہ کے قصے کی تائید نہیں کرتا۔

کلیلہ کی نظم کے سلسلے میں فردوسی ابو الفضل بلعمی المتوفی ۳۲۹ھ وزیر امیر نصر المتوفی ۳۳۱ھ کا نام پیش کرتا ہی۔ میں فردوسی کے اشعار بجنسہ نقل کرتا ہوں۔

کلیلہ بتازی شد از پہلوی | بدینساں کہ اکنوں ہمی بشنوی
بتازی ہمی بود تا گاہ نصر | بدانگہ کہ شد در جہاں شاہ نصر

---

[51] دیوان عنصری صفحہ ۶۶ بمبئی ۱۳۲۰ھ طبع آقا محمد اردکانی۔
[52] قسمت کردن بر جمعے برائے دیگرے و پراگندہ کردن۔
[53] شعر العجم صفحہ ۳۶ ۱۹۰۹ء۔

گرانمایہ بوالفضل دستور اوی — کہ اندر سخن بود گنجور اوی
بفرمود تا پارسی و دری — بگفتند و کوتاہ شد داوری
ازیں پس بدو نیم و رائے آمدش — بدو بر خرد رہنمائے آمدش
ہمی خواستے آشکار و نہاں — کزو یادگاری بود در جہاں
گزارندہ را پیش بنشاندند — ہمہ نامہ بر رودکی خواندند
بہ پیوست گویا پراگندہ را — بسفت ایں چنیں دُرِّ آگندہ را
ہر آں کو سخن داند آرائش ست — چو ابلہ بود جائے بخشائش ست
حدیثِ پراگندہ بپراگند — چو پیوستہ شد مغز جان آگند

شاہنامہ جلد چہارم ص ۳۵ ۱۲۷۵ھ بمبئی۔

اس طرح آلِ سامان کی علمی فتوحات کے زریں کارناموں میں سے جس پر مولانا شبلی ان کے اس قدر مدّاح معلوم ہوتے ہیں ایک کارنامہ بالکل نکل گیا یعنی کلیلہ کی نظم امیر نصر کی فرمایش سے نہیں ہوئی بلکہ اس کے روشن خیال وزیر ابو الفضل بلعمی کے حکم سے۔ اُسی کی فرمایش سے وہ ابن المقفع کے عربی ترجمے سے فارسی نثر کے قالب میں آئی اور اسی کے ارشاد سے رودکی نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا۔

بلعم دیارِ روم میں ایک شہر کا نام ہے جہاں قبیلۂ بنو تمیم کی ایک شاخ آباد ہو گئی تھی اس نسبت کی بنا پر ابو الفضل بلعمی کہلایا[۱]۔ وہ اپنے زمانے کا بے نظیر شخص تھا علم فضل عقل و تدبر میں لاثانی تھا۔ ناصر خسرو اس کے لیے کہتا ہے۔

بوالفضل بلعمی بتوانی شدن بفضل
گر نیستی بہ نسبتِ بوالفضل بلعمی

---

[۱] انساب السمعانی طبع یورپ

اس کی وفات صفر کی دسویں شب ۳۲۹ھ میں واقع ہوئی۔ ابو الفضل کی مدح میں ان قرون میں رودکی کا ایک قصیدہ بہت مشہور تھا جس کا ایک شعر حکیم سوزنی نے صدر جہاں شمس محمد بن عمر بن عبد العزیز مازہ کی تعریف میں یوں تضمین کیا ہے؎

در مدح تو بصورت تضمین ادا کنم — یک بیت رودکی را در حق بلعمی
"صدر جہاں جہاں ہمہ تاریک شب شدست — از بہر ما سپیدۂ صادق ہمی دمی"

معزی نے غالباً رودکی کے اسی قصیدے سے ایک مصرع یوں باندھا ہے؎

از رودکی شنیدم سلطانِ شاعران — "کاندر جہاں بکس مگر و جز بفاطمی"

قولہ "رودکی نہایت پُرگو تھا رشیدی سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے چنانچہ کہتا ہے؎

شعر او را بر شمردم سیزدہ رہ صد ہزار — ہم فزون تر آید ار چونانکہ باید بشمری

یش نے اس کے اشعار تیرہ دفعہ گنے تو ایک لاکھ ٹھیرے اور اچھی طرح گنے جائیں تو اس سے بھی زیادہ نکلیں"۔ شعر العجم صفحہ ۳۲ -

یہ ترجمہ صریحاً اعتراض سے خالی نہیں۔ تیرہ مرتبہ ایک چیز گنی جا چکی ہے لیکن ابھی اس کا اچھی طرح گنا جانا باقی ہے۔ بظاہر شاعر کا مطلب تیرہ لاکھ ہے۔

رودکی کی غزلوں کی مثال میں علامہ شبلی نے یہ ابیات انتخاب کیے ہیں:۔

"اے جان من از آرزوے روے تو بر لب — بنمای یکے روے بہ بخشاے بریں جاں
دشوار نمائی رُخ و دشوار دہی بوس — آساں بربائی دل و آساں ببری جاں
نزدیک من آسانی تو باشد دشوار — نزدیک تو دشواری من باشد آساں

(شعر العجم صفحہ ۲۷)

یہ ابیات اصل میں قطران تبریزی کے ایک قصیدے کی تشبیب سے لیے

گئے ہیں جو امیر ابو نصر مملان کی مدح میں ہیں۔ ثبوت میں اسی قصیدے کا یہ شعر کافی ہوگا

سردار بزرگان ملک عالم بونصر سالار امیران ملک گیتی مملان[۵۱]

پانچویں قرن ہجریہ کے ربع دوم میں آذربائیجان میں ایک خاندان جو غالباً کرکوے کہلاتا تھا حکمران تھا۔ حکیم قطران تبریزی العضدی اس خاندان کے دو افراد کا مداح رہا ہے۔ پہلا یہی ابو نصر جس کا پورا نام ابو نصر محمد بن مسعود بن مملان ہے جو خود بھی مملان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ قطران کے اکثر قصائد اس کی مدح میں ہیں یہ ابو نصر غالباً ۴۴۲ھ اور ۴۵۳ھ کے درمیان کسی وقت فوت ہوتا ہے جب سلجوقیوں نے ایران پر اپنا اقتدار قائم کرلیا یہ خاندان ان کا مطیع ہوگیا۔

قصیدے کی تشبیب کے اشعار غزل کی مثال میں پیش کرنا شبلیانہ اجتہاد مانا جاسکتا ہے۔ غزل کی دوسری مثال میں مولانا نے یہ ابیات انتخاب کیے ہیں:-

"مشوش است دلم از کرشمۂ سلمیٰ چنانکہ خاطر مجنوں ز طرۂ لیلیٰ

چو گل شکر دہیم درد دل شود تسکین چو ترش روئے شوی وارہانی از صفرا

بردہ نرگس تو آب جادوے بابل کشادہ غنچۂ تو باب معجز عیسیٰ"[۵۲]

(شعر العجم صفحہ ۳۷)

ان اشعار کو میں نہیں سمجھ سکتا رودکی سے کیا علاقہ ہوسکتا ہے ایسی صاف وشستہ اور ہموار زبان، اس کی ترکیبوں کی کثرت اور اضافات تشبیہی پر لحاظ کرتے ہوے رودکی کی زبان ہو نہیں سکتی۔ باب معجز عیسیٰ، آب جادوے بابل، طرۂ لیلیٰ اور کرشمۂ سلمیٰ، ایسی ترکیبیں ہیں جو رودکی کے عہد میں قطعاً غیر مستعمل ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض تذکروں میں یہ اشعار رودکی کے نام پر مرقوم ہوں لیکن ایک محقق

---

۵۱ دیوان رودکی صفحہ ۵۶ طبع ایران ۱۳۱۵ھ

۵۲ دیوان رودکی صفحہ ۱۰۳ طبع ایران۔

کا یہ فرض ہو کہ دوسروں کے آرا پر ہی اعتماد نہ کرے بلکہ اپنے اجتہاد سے بھی کام لے۔

رودکی اگرچہ غزلیات کے لیے مشہور ہو لیکن افسوس سے کہا جاتا ہو کہ آج وہ کبریت احمر کی طرح نایاب ہیں۔ ذیل میں ایک مطلع اور خمریہ غزل رودکی کی پیش ہیں۔ مطلع

کس فرستاد بشب آں بتِ عیار مرا — کہ کمن یاد بشعر اندر بسیار مرا

غزل

می آرد شرف آدمی پدیذ — آزادہ تراز درم خریذ

می آزادہ پدیذ آرد از بد اصل — فراواں ہنر است اندریں نبیذ

ہر آنگہ کہ خوری مے خوش آنگہ است — خاصہ چو گل و یاسمن دمیذ

بسا حصن بلندا کہ می کشاد — بسا کرّہ نوزین کہ بشکنیذ

بسا دون بخیلا کہ می بخورد — کریمے بجہاں در پراگنیذ

رودکی کے قصائد کی نسبت فرماتے ہیں:۔

"قصیدے کا جو طریقہ رودکی نے قائم کیا آج تک قائم ہو یعنی ابتدا میں تشبیب یا بہاریہ وغیرہ پھر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز جود و سخا عدل و انصاف شجاعت و دلیری کا ذکر پھر دعائیہ صنائع شاعری میں ایک صنعت ہو جس کو ترصیع کہتے ہیں یعنی دونوں مصرعوں میں ہم وزن الفاظ لاتے ہیں مثلاً عنی ؎

رماد را اثرِ قہر او کند شنجرف — جماد را اثرِ لطف او کند شمشاد

یہ صنعت رودکی کے تمام قصیدوں میں پائی جاتی ہو۔"

(شعر العجم صفحہ ۳۸)

یہ ایک ایسا بیان ہو جس کا ثابت کیا جانا ہماری موجودہ معلومات کی روشنی

میں قریب قریب دشوار ہی اس لیے کہ آج ہمارے پاس رودکی کا کوئی کامل قصیدہ موجود نہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ قصائد میں اس کا کیا ڈھنگ تھا، تشبیب رائج تھی یا نہیں، گریز کا دستور مروّج تھا یا نہیں، صنعتِ ترصیع کی نسبت البتہ کہا جا سکتا ہی کہ رودکی کے ایّام میں اس کی رواج پذیری عام نہیں تھی اگرچہ نامعلوم بھی نہیں تھی۔ فرمایا ہی :-

"قصیدے میں اگرچہ صرف مدّاحی ہی مدّاحی ہوتی ہی لیکن رودکی نے جا بجا نیچرل سین بھی دکھلائے ہیں ؎

از بنفشہ مرز ہا گستردہ دیباہا بچین | وز شگوفہ شاخہا بربستہ درِ شاہوار
با ہوائے اودست گفتی ہر چہ در گیتی نسیم | بر زمین اودست گفتی ہر چہ در عالم بہار
از میان جوئے آں آبے رواں ہمچوں گلاب | شاخہائے گل شگفتہ بر کنار جویبار
بود ہر جا بہر نزہت گاہ بار و نقل و مل | گلستاں در گلستان و میوہ اندر میوہ زار"

(شعر العجم صفحہ ۲۸ و ۲۹)

جس طرح حضرت اسحٰقؑ نے حضرت عیص کے دھوکے میں حضرت یعقوبؑ کو دُعا دی تھی یہاں یہی حالت مولانا کی ہی۔ وہ رودکی کے تصوّر میں قطران تبریزی کے باغ کی آبیاری میں مصروف ہو گئے ہیں۔ مولانا شبلی نے یہ ابیات قطران کے اس قصیدے سے لیے ہیں جو ابو منصور دہسودان کی مدح میں ہی جیسا کہ اسی قصیدے کے مطلع سے ظاہر ہی ؎

افتخار دہر ابو منصور وہسوداں[۱] کہ ہست | بندگانش را بہ ہر یک صد ہزاراں افتخار

ابو منصور دہسودان جو ابو نصر مملان کا جانشین ہی۔ آذربائجان کا بادشاہ تھا۔ ناصر خسرو علوی بلخی جب ۴۳۸ھ میں تبریز پہنچا ہی تو آذربائجان کا بادشاہ ان ایام

[۱] دیوان رودکی ص ۲۶ میں "مقصود آنکہ" بجائے "وہسوداں کہ" لکھا گیا ہی جو غلط ہی۔

میں یہی ابو منصور تھا۔جس کا پورا نام سفر نامے میں یوں دیا گیا ہی " الامیر اجل سیف الدولہ وشرف الملۃ ابو منصور وہسو دان محمد بن مولیٰ امیر المومنین "(سفرنامۂ ناصر خسرو مؤلفۂ مولانا حالی صفحہ ۳۷)

مثال دوم میں یہ اشعار دیے گیے ہیں ؎

" کوہ دیگر کوہ سیمیں گشت و زریں شد چمن | آب دیگر بارہ روشن گشت و تیرہ شد ہوا
گشت خامش فاختہ تا شد چمن پرداختہ | گشت بلبل بے نوا تا بوستاں شد بے نوا
نار چوں بر حقّۂ زریں نگینہائے عقیق | سیب چوں بر چہرۂ سیمیں نشانہائے بکا
باد سرد آمد چو آہ عاشقاں ہنگام صبح | بانگ زاغ آمد چو از معشوق پیغام جفا "

(شعر العجم صفحہ ۳۹)

یہ اشعار قطران کے اس قصیدے سے لیے گئے ہیں جس کا مطلع ہی ؎

تا دلِ من در ہوائے نیکواں شد آشنا | از سرشک دیدہ ام گردوں نماید بس شنا

فرہنگِ رشیدی میں یہ مطلع البتہ رودکی کی طرف منسوب ہی لیکن صحیح یہی ہی کہ اس کا مالک قطران تبریزی ہی اور ابو نصر مملان کی تعریف میں ہی چنانچہ یہ شعر ؎

خسرو صافی نسب بو نصر مملاں آنکہ ہست | جسم او صافی ز ہر عیبی چو جانِ مصطفٰے[1]

معرکۂ جنگ کی مثال میں شعر العجم میں رودکی کے نام پر یہ اشعار درج ہیں ؎

"بدانگہی کہ دو لشکر برسے یک دیگر | گراں کنند رکاب و سبک کنند عناں
ز گرد اسپاں تیرہ شود رُخِ خورشید | ز بانگ مردان خیرہ شود دل کیواں
یکے کشیدہ سناں و یکے کشادہ حسام | یکے کشادہ کمند و یکے کشیدہ کماں"

(شعر العجم صفحہ ۳۹)

یہ ابیات قطران کی یادگار ہیں۔قصیدے کا مطلع ہی ؎

---

[1] دیوان رودکی صفحہ ۳ طبع ایران۔

من آں کشیدم و آں دیدم از غم ہجراں که ہیچ آدمی نیست دیدہ در دوراں[1]

یہ قصیدہ بھی ابو نصر مملان کی مدح میں ہی چنانچہ یہ شعر ؎

مقام نصر و بہا ناصر ولی بو نصر چراغ لشکر و خورشید مملکت مملاں

اسی قصیدے میں ابو نصر کی اُن لڑائیوں کا بھی ذکر آتا ہی جو اس نے اردبیل اور دارمور میں لڑی ہیں ؎

وغاش راپس پیکار اردبیل دلیل نبردش راپس پیکار دارمور عیاں

ابو نصر کے ہاتھوں امیر موغان کی شکست کا ذکر بھی اسی قصیدے میں آتا ہی- اس کے بعد علامہ یوں رقم طراز ہیں :-

"قصیدے کے حُسن کا بڑا معیار گریز ہی یعنی تشبیب کہتے کہتے ممدوح کا ذکر اس طرح چھڑ جائے جس طرح بات میں سے بات پیدا ہو جاتی ہی، یہ بالکل نہ معلوم ہو کہ بہ قصد و ارادہ ممدوح کی مدح شروع کی ہی- رودکی کی اکثر گریزیں اسی قسم کی ہیں مثلاً ایک قصیدے میں خزاں کا حال لکھتے لکھتے کہتا ہی ؎

باد خوارزمی کنارِ باغ پر دینار کرد چوں کنارِ زائراں را کردِ دست بادشا"

(شعر العجم صفحہ ۳۹)

میں نہیں کہہ سکتا کہ رودکی کے مخالص ایسے ہی برجستہ ہوتے تھے جس کے شبلی مدعی ہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ رودکی کے محاسنِ شاعری کا یہ خوبصورت موتی یعنی شعر بالا اصل میں قطران کی ملک ہی جیسا کہ بعد میں آنے والے شعر خسرو صافی نسب بو نصر مملان آنکہ ہست الخ سے ظاہر ہوتا ہی اور جس کو میں اوپر نقل کر چکا ہوں- اسی گریز کی دوسری مثال میں فرمایا ہی:-

"مثلاً باغ کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہی ؎

[1] دیوان رودکی صفحہ ۵۰ ۱۳۱۵ھ

یار من گفتا بہشت است اے نگفت ایں باغ نیست

گفتم ایں باغیست خرم چوں بہشت کردگار

آں بہشت ناپدید است ایں بہشت استے عیاں

ایں بہ نقد است آں بہ نسیہ آں نہاں ایں آشکار

آں مکافات نماز است ایں مکافات مدیح

آں عطائے کردگار ہست ایں عطائے شہریار"

(شعر العجم صفحہ ۴۰)

یہ شعر اسی قصیدے کے ہیں جو ابو منصور وہسودان کی تعریف میں ہی اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

"بعض بعض قصیدوں میں ایسی باتوں کا التزام کیا ہو جس کی تقلید کسی نے نہیں کی مثلاً ایک قصیدہ تینتیس ۳۳ شعروں کا کہا ہو جس میں صرف مطلع ہی مطلع ہیں پہلا مطلع یہ ہو ؎

نہ دانی درد ہجر[1] اے بت ہر آنگہ زار گردانی

دگر زارم نگردانی بداغ ہجر گردانی"

(شعر العجم صفحہ ۴۰)

قبلہ مولانا قطران کے قصائد کے طلسم زار میں کچھ ایسے پھنسے ہیں کہ مخلصی کی صورت اب تک ممکن نہیں ہوئی یہ چونتیس مطلع کا قصیدہ حسب معمول ابو نصر مملان کی تعریف میں ہو۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

کہ تو آثار طوفانی و تو بنیاد لطلانی	نہ موج بحر عمانی نہ کف میر مملانی
ابو نصر آنکہ یزدانش بہ نصرت داد ارزانی	ازو دولت گرانی یافت روئے گوہر ارزانی[1]

[1] دیوان رودکی صفحہ ۸۷

موسمِ بہار کے ذکر میں مولانا نے یہ اشعار بھی رودکی کے نام پر درج کیے ہیں ؎

"ہر آنچہ بست میان ارم بہم شداد　　ہر آنچہ کرد بزیر زمیں نہاں قارون
سرشک ابر پراگندہ کرد در بستان　　نسیم باد پدیدار کرد در ہاموں"

(شعر العجم صفحہ ۴۲)

اس قصیدے کا مطلع ہے ؎

منم غلام خداوند زلف غالیہ گون　　کہ ہست چون دل من زین نفاد نوان ونگون

اسی قصیدے میں ذیل کا شعر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قطران کی ملک اور ابو نصر مملان کی مدح میں ہے ؎

مکان نصرت و اقبال میر ابو نصر آن　　کہ ہست طالع او جفت طالع میمون[1]

موسمِ بہار کے ذکر میں آیندہ یہ اشعار مذکور ہیں ؎

"مہ نیسان شبیخون کرد اکنون برمہ کانون　　کہ گردون گشت از دیر گرد صحرا گشت اندر خون
اگر خواہی نشان خون نگہ کن لالہ بر صحرا　　اگر خواہی نشان گرد بنگر ابر بر گردون"

(شعر العجم صفحہ ۴۲)

یہ قصیدہ بھی قطران کے تبرکات میں شمار ہونا چاہیے جو غالباً کسی وزیر ابو الفتح کی مدح میں مرقوم ہوا ہے چنانچہ شعر ذیل ؎

چراغ فتح بو الفتح آنکہ یزداں کرد پنداری　　بدنش از جان نوشروان دلش از فہم افلاطون[2]

رودکی کے کلام کے اصلی نمونے وہی ہیں جو لغات اسدی تاریخ ابو الفضل بیہقی لباب الالباب محمد عوفی المعجم فی معاییر اشعار العجم معیار الاشعار حدائق السحر فرہنگ جہانگیری و رشیدی میں ملتے ہیں۔ تذکروں میں جو اشعار اس کی طرف منسوب ہیں وہ اس میں شک نہیں رودکی سے بہت کم علاقہ رکھتے ہیں۔ اس کی وفات کے

---

[1] دیوان رودکی صفحہ ۶۱　　[2] دیوان رودکی صفحہ ۶۶

متعلق علامہ شبلی فرماتے ہیں:-

"رودکی نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی اس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہے۔"

(شعر العجم صفحہ ۴۴)

اس عبارت میں مولانا کو دو سہو لاحق ہوئے پہلا رودکی کی تاریخ وفات کے متعلق ہے مولانا ایک باکمال اور بالغ النظر مورخ ہیں اس امر کا سب کو اعتراف ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تاریخ و سن جو تاریخی معلومات کا ایک نہایت وقیع اور اہم حصہ ہے اول تو اس کا وہ بہت کم ذکر کرتے ہیں اور اتفاقیہ اگر ذکر کر بھی دیا تو اکثر حالات میں غلط لکھتے ہیں۔ اس تاریخ کے متعلق مجھ کو جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ امیر نصر ۳۰۱ھ میں آٹھ سال کی عمر میں تخت نشین ہوتا ہے اس کے جلوس کے تین سال بعد اگر رودکی انتقال کرتا ہے تو اس کی شہرت نصر کے ہاں رسائی اور مدح گوئی سفر ہرات وغیرہ کے لیے جہاں بقول نظامی پورے چار سال نصر نے گزارے ہیں اور اس واقعے کے خود علامہ بھی معترف ہیں (شعر العجم صفحہ ۳۰) کافی وقت نہیں ملتا اس لیے یہ تاریخ ناقابل اعتبار ہے۔ انساب السمعانی میں اس کی وفات ۳۲۹ھ دی گئی ہے جو بالکل صحیح ہے۔

یہ "دیوان رودکی" رودکی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اگرچہ ایک قصیدہ[۵۱] اور بعض قطعات رودکی کے بھی اس میں شامل ہیں[۵۲] اس کا نام اگر دیوان قطران تبریزی ہوتا تو موزوں تھا۔ دیوان کے تمام قصائد قطران کے قلم سے نکلے ہیں۔

---

[۵۱] اس قصیدے کا مطلع ہے ؎

مادر مے را بکرد باید قربان | بچہ او را گرفت و کرد بزنداں

یہ قصیدہ تاریخ سیستاں مرتبہ ملک الشعرا بہار میں بھی (ص ۳۱۷-۳۲۳) منقول ہے۔

[۵۲] ان میں اکثر قطعے ایسے ہیں جو تاریخ ابو الفضل بیہقی میں رودکی کے نام لکھے گئے ہیں۔

قطران الحکیم شرف الزمان قطران العضدی تبریزی۔ شمال مغرب ایران میں پانچویں صدی کے ربع اول کے اختتام پر شعرا کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا جس نے مشرقی ایرانی شاعری کے مقابلے میں اپنے لیے نئے نئے میدان تلاش کیے۔ سامانی اور غزنوی شعرا کا مایۂ بساط زیادہ تر واقعہ نگاری اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسنِ بیان کے ذریعے دل کش بنا دینا تھا، ان کے استعارے اور تشبیہیں اکثر موجود اشیا سے تعلق رکھتی تھیں شعر میں فارسیت غالب تھی اور ان کے مبالغے نزاکت سے خالی تھے۔ اس شاعری کے مقابلے میں نئے گروہ نے شعر کا دارومدار زیادہ تر تصنّع اور صنعت پر رکھا دہمی اور غیر محسوس تشابیہہ و استعارات کام میں لائے مضمون بندی میں تکلّف اور نزاکت سے کام لیا، عربیت کو غیر ضروری فروغ دیا، مبالغہ، تجنیس اور ترکیب آرائی کو شعر کا اصلی زیور سمجھا۔ ان میں سب سے مقدم منوچہری دامغانی ہے، قطران تبریزی اور اسدی طوسی اس کے مقلد ہیں اس گروہ کے آخری تاج دار نظامی گنجوی ہیں ان شعرا کے ہاں شاعری گویا خوبصورت الفاظ کے جمع کر دینے کا نام ہے۔ تجنیس قطران کی شاعری کا اساسی جوہر تھی۔ رودکی دلوالجی حکیم قطران کا معتقد معلوم ہوتا ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

مطلع و مقطع قصائد را سیوم فرخی و قطران

ایک قصیدے میں جو دیوان میں موجود ہے اور جس کا مطلع ہے ؎

بود محال ترا داشتن امید محال بعالمے کہ نباشد ہمیشہ بر یک حال

شہر تبریز میں زلزلہ آنے کا ذکر ہے، قطران جو انسانی زندگی کے واقعات سے اثر پزیری کو ایک قسم کا ابتذال سمجھ کر کبھی ان کی طرف توجہ مبذول کرنے کا روادار نہیں، اس موقع پر کسی قدر حقیقت اور واقعیت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ زلزلے کا واقعہ ایک عالمگیر تباہی تھی جس میں چالیس ہزار نفوس ہلاک ہوئے

اس واقعے نے اس کے قلب کو گداز کر دیا ہی، اس کا دل درد سے بھر آیا ہی، شہر کی تباہی اور مرنے والوں کے ماتم میں ذیل کے اشعار اس کے قلم سے تراوش پاتے ہیں ؎

نبود شہر در آفاق خوشتر از تبریز ۔۔۔ بایمنی و بمال و بہ نیکوئی و جمال
ز ناز و نوش ہمہ خلق بود خوشا خوش ۔۔۔ ز خلق و مال ہمہ شہر بود مالامال
در او بکام دلِ خویش ہر کسے مشغول ۔۔۔ امیر و بندہ و سالار و فاضل و مفضال
یکے بخدمت ایزد و یکے بخدمت خلق ۔۔۔ یکے بجستن نام و یکے بجستن مال
یکے بخواستنِ جام بر سماع غزل ۔۔۔ یکے بتاختن یوز بر شکار غزال
بروز بودن با مطربان شیریں گوئی ۔۔۔ بشب غنودن با نیکوانِ مشکین خال
بکار خویش ہمی کرد ہر کسے تدبیر ۔۔۔ بمال خویش ہمی داشت ہر کسے آمال
بہ نیم چنداں کز دل کسے بر آرد قیل ۔۔۔ بہ نیم چنداں کز لب کسے بر آرد قال
خدا بمردم تبریز بر فگند فنا ۔۔۔ چناں بہ نعمت ایں شہر بر گماشت زوال
فراز گشت نشیب و نشیب گشت فراز ۔۔۔ رمال گشت رما دور ماد گشت رمال
دریدہ گشت زمین و خمیدہ گشت نبات ۔۔۔ دمندہ گشت بحار و روندہ گشت جبال
بسا سرائے کہ بامش ہمی شدے بفلک ۔۔۔ بسا درخت کہ شاخش ہمی بسود ہلال
ازاں درخت نماندہ مگر کنوں آثار ۔۔۔ وزاں سرائے نماندہ مگر کنوں اطلال
کسیکہ رستہ شد از مویہ گشتہ بود چو موے ۔۔۔ کسیکہ جستہ شد از نالہ گشتہ بود چو نال
یکے نبود کہ گفتے بدیگرے کہ موے ۔۔۔ یکے نبود کہ گفتے بدیگرے کہ منال
ہمی بدیدہ بدیدم چو روز رستاخیز ۔۔۔ ز بیش رایت مہدی و فتنۂ دجّال
کمال دور کناد ایزد از جمال جہاں ۔۔۔ کمی رسد بجمالے کجا گرفت کمال[1]

---

[1] دیوان رودکی صفحہ ۳۶ و ۳۷ طبع ایران ۔

زلزلہ شب پنجشنبہ سترہ ربیع الاول سنہ ۴۳۴ھ کو ایام مسترقہ میں نماز عشا کے بعد آیا تھا شہر کا ایک حصہ بالکل تباہ ہوگیا تھا اور دوسرا سالم رہا۔ ان ایام میں آذربایجان کا بادشاہ ابونصر مملان تھا۔ حکیم ناصر خسرو بلخی تبریز میں سنہ ۴۳۸ھ میں پہنچتا ہی قطران بھی اس سے ملنے آیا تھا حکیم موصوف کہتا ہی "در تبریز قطران نام شاعرے را دیدم شعرے نیک می گفت اما زبان فارسی نیکو نمی دانست پیش من آمد دیوان منجیک و دیوان دقیقی بیاورد و پیش من بخواند و ہر معنی کہ او را مشکل بود از من پرسید با او بگفتم و شرح آں بنوشت و اشعار خود بر من خواند" (سفر نامہ صفحہ ۳۷) بقول شاہد صادق[۵۱] قطران سنہ ۴۶۶ھ میں وفات پاتا ہی۔

میرے خیال میں مذکورۂ بالا بیانات کافی شہادت ہیں اس امر کی کہ موجودہ دیوان رودکی کا نہیں ہی بلکہ حکیم قطران تبریزی کا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہی کہ شبلی نے اس معاملے میں مولانا محمد حسین آزاد نیز دیباچہ نگار دیوان رودکی کے بیانات پر اعتماد نہیں کیا اور اپنے اجتہاد پر بھروسا کر کے اس فاحش غلطی کے مرتکب ہوئے اگرچہ آزاد نے سخندان فارس میں اور دیباچہ نگار نے دیباچۂ دیوان میں کافی ہوشیار کر دیا تھا۔ آزاد گو "تحقیق کے میدان کا مرد نہ ہو" یہاں اس نے گپ نہیں ہانکی تھی[۵۲]۔

ذیل میں رودکی کا ایک مرثیہ جو اس کے کسی معاصر نے لکھا ہی نقل کیا جاتا ہی۔

؎ رودکی رفت ماند حکمت اوے	مے بریزد نریزد از مے بوے
شاعرت کو کنوں کہ شاعر رفت	نبود نیز جاودانہ چنو سے
خون گشت آب چشم از غم اوے	زاندہش موم گشت آہن روے

[۵۱] مصنف محمد صادق صاحب "صبح صادق"

[۵۲] دیکھو مکاتیب شبلی صفحہ ۲۴۲ مطبوعہ معارف سنہ ۱۹۱۷ء

نالۂ من نگر شگفت مدار سو بسو زار زار نالہ بروے
چند جوئی چنونیابی باز از چنو دست در زمانہ بشوے

قبلہ شبلی فرماتے ہیں:

"تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان میں دیوان مرتب کیا وہ رودکی تھا" شعر العجم صفحہ ۲۸

رودکی کا پہلا صاحب دیوان ہونا تمام اسناد کے نزدیک مُسلّم ہے لیکن بقول نظامی عروضی حنظلہ بادغیسی المتوفی ۲۱۹ھ اس شرف کا زیادہ مستوجب ہے۔ رودکی کے زمانے میں خود رودکی کے اپنے نیز اس کے معاصرین کے کلام کو مشاہدہ کرنے سے پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کا وہ زمانہ جیسا کہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے ابجدی زمانہ نہیں تھا بلکہ اس نے قرار واقعی ترقی کر کے تمام ایسے ضروری اور خصوصی خط و خال پیدا کر لیے تھے جن کی رو سے دُنیا کی اور زبانوں کی شاعری سے سہولت کے ساتھ ممیز ہو سکتی تھی۔ اس میں وہ تمام جوہر مشاہدے میں آتے ہیں جو مقامی آب و ہوا اور ایران نژاد طبائع کی نمایاں خصوصیت ہیں قومی روایات نیز ملکی آب و ہوا کے اثرات نے اس کے عروضی اوزان تشبیہات استعارات اور تلمیحات پر اپنا رنگ جما دیا ہے۔ علاوہ بریں فن شعر نے رودکی کے ایام میں وہ عمومیت حاصل کر لی تھی کہ شعرا کثرت سے[1] موجود تھے ان ایام میں صاحب تصنیف ہونا معمولی بات

---

[1] منوچہری دامغانی بعض شعرائے سامانی کی طرف تلمیح کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

درخراسان بوشعیبؒ بوذر آن ترکِ کشی واں صبور پارسی واں رودکی چنگ زن
واں دوگرگانی وودرازی وددد لوالجی سہ سرخسی و سہ کاندر سغد بودی ہمچن
از بخارا پنج و پنج از مرو پنج از بلخ باز ہفت نیشاپوری و سہ طوسی و سہ بوالحسن

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شعرا ان ایام میں کثرت سے موجود تھے۔

تھی۔ ابوالحسن شہید بلخی، خواجہ مرادی، ابوموسیٰ فرالادی، ابوطاہر خسروانی، ابوالعباس فضل الربنجنی، ابوطاہر الطیب المصعبی، ابوالموید بلخی، طیان مرغزی، دقیقی وغیرہ اس زمانے کے مشاہیر اساتذہ سے ہیں اور ان میں اکثر بلکہ یوں کہیے قریب قریب تمام صاحب تصانیف گزرے ہیں اور تمام اصناف نظم پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اقسام شعر اور عروض فارسی نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی تھی۔ رودکی کی کلیلہ و دمنہ، ابوشکور کا آفرین نامہ ۳۳۳ھ ابوالموید بلخی کی مثنوی یوسف زلیخا اور شاہنامہ بزرگ (فارسی نثر میں تاریخ عجم پر ایک مبسوط تصنیف تھی) دقیقی کا دیوان اور اس کی داستان گشتاسپ و ارجاسپ جن میں آخر الذکر کے سوا آج سب مفقود ہیں، نمایاں حجت ہیں اس امر کی کہ رودکی کے دور میں صاحب تصنیف ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ جب اسدی طوسی اپنی لغتِ فرس پانچویں قرن کے ربع سوم میں لکھنے بیٹھا ہے تو الفاظ کا استعمال بتانے کے لیے اساتذہ کا کلام نقل کرتا ہے ان میں اکثر سامانی دور کے شعرا شامل ہیں اب تاوقتیکہ اس کے پاس ان شعرا کے قصائد اور دواوین موجود نہ ہوتے وہ اپنی لغت تیار نہیں کر سکتا تھا۔

رودکی کی شہرت راقم کے خیال میں اس لحاظ سے نہیں کہ وہ پہلا صاحب دیوان ہے بلکہ اس کے وجوہ کچھ اور ہیں، اوّل تو وہ ایک ایسی غیر معمولی شخصیت کا مالک ہے کہ خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے میں ہوتا اپنی شہرت کا سکہ معاصرین اور اخلاف کے دلوں پر ضرور جما تا، دوسرے وہ ایک بے نظیر شاعر تھا، ابوسعد الادریسی اسے اوّل درجے کا شاعر مانتا ہے ابوالفضل بلعمی عرب اور عجم میں لاثانی کہتا ہے[۵۱] اور منوچہری خراسان کے چار مشہور حکما میں اس کا شمار کرتا ہے۔

---

[۵۱] انساب السمعانی صفحہ ۲۶۲ طبع یورپ۔

میرے نزدیک رودکی کی دائمی شہرت کا باعث یہ امر ہو کہ شاہی دربار کے چار ارکان اساسی یعنی دبیر، شاعر، طبیب اور منجم میں شاعر کو سلاطین کی درگاہ میں پہلا روشناس کرنے والا شخص رودکی ہو۔ فارسی میں قصیدہ نگاری جو بارگاہ سلاطین میں شاعر کی رسائی کا بدیہی نتیجہ ہو رودکی سے شروع ہوتی ہو اور اسی بنا پر رودکی آدم الشعرا اور سلطان الشعرا مانا جاتا ہو۔

رودکی کا فارسی زبان پر کیا احسان ہو؟ اس سوال کا جواب ہم اپنی موجودہ معلومات کی روشنی میں کچھ نہیں دے سکتے اس کا سارا کلام ضائع ہو گیا ہو لیکن ایک امر قابل ذکر ہو، اس کو فارسی زبان پر غیر معمولی عبور تھا کیونکہ اب تک ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود دیکھا جاتا ہو کہ ہماری کتب لغات مشکل اور متروک الفاظ کی تشریح کے وقت رودکی کا کلام بطور سند پیش کرتی ہیں۔

رودکی کے ہاں خواہ غزل ہو یا قطعہ حقیقت نگاری سب سے نمایاں وصف ہو جو واقعات اس پر گزرتے ہیں نظم میں کہہ سناتا ہو، اس سے بحث نہیں کہ ایسا کرنے میں خود اس کا پردہ فاش ہوتا ہو مثلاً یہ مطلع ملاحظہ ہو ؎

کس فرستاد بشب آن بت عیار مرا که مکن یاد بشعر اندر بسیار مرا

اب یہ تلمیح ہو اس کی زندگی کے کسی واقعے کی طرف جو خیالی نہیں ہو اور حقیقت میں اس پر گزرا ہو، وہ حقیقت میں زندہ دل اور عشرت دوست تھا، اس کی زندگی فارغ البالی، خوش حالی اور ثروت کے آغوش میں بسر ہوئی ہو۔ حیاتِ انسانی کی المناک حقیقت کا ذکر اس کے ہاں کم ہو زندگی اس کے لیے گل و گلزار ہو راحت و شادمانی اور بے فکر زندگی کی تلقین اس کے ہاں عام ہو۔ ولہٗ

خور بشادی روزگارِ نوبہار میگسار اندر تگوک شاہوار

نظیر اکبر آبادی کے ساتھ "چکھ ڈال مال و دھن کو" اس کا بھی مقولہ ہو۔ چنانچہ کہتا ہو ؎

باخرد مند بے وفا بود ایں بخت | خویشتن خویش را بکوش تو یک لخت
بخور و بدہ کہ پر پشیماں نبود | ہر کہ بخورد و بداد آں کہ بلفخت

عمر خیام کی طرح اس کی نصیحت بھی یہی تھی کہ موت کے آنے سے قبل تم دُنیا کی نعمتوں سے حظ حاصل کرو ؎

توشۂ جان خویش ازو بردار | پیش کاید مرگ پا آگیش

دُنیا کا قدیم سے دستور چلا آتا ہو کہ مُردہ زندہ نہیں ہوتا، اور زندہ کی آخری آرام گاہ گورستان ہو ؎

مُردہ نشود زندہ زندہ بستودان شد | آئین جہاں چنین تا گردون گردان شد

دُنیا کی بے مہری اور بے وفائی شعرائے فارس کی عام تلقین ہو۔ فردوسی اور نظامی اس کی تکرار سے کبھی نہیں تھکتے رودکی ان خیالات کو سب سے پہلے اشاعت دینے والا ہو ؎

مہر مفگن بریں سرائے سپنج | کیں جہاں پاک بازیِ نیرنج
نیک او را فسانہ واری شد | بد او را کمرت سخت بتنج

دُنیا محبت کے قابل نہیں۔ اس سے نیکی کی توقع محض ایک افسانہ ہو البتہ بدی اس سے سرزد ہوتی رہتی ہو اس لیے اس کی بدیوں کے لیے کمربستہ رہ، تیری زندگی کا مقصد دُنیا سے بے پروائی اور شادکامی کا استحصال ہونا چاہیئے ولہٗ

از و بے اندہی بگزین و شادی باتن آسانی | بہ تیمار جہاں دل را چرا باید کہ بسپانی

اپنے ملک اور زمانے کے نام رواج کے مطابق رودکی شراب خواری کا عادی تھا اس کو صاف اعتراف ہو وہ کہتا ہو، شراب پینا ہر وقت اچھا ہو لیکن فصل گُل میں خاص لطف رکھتا ہو ؎

ہر آنگہ کہ خوری مے خوش آنگہ است | خاصہ چو گل و یاسمن دمبد

جب لالہ کھل جائے تم بھی پیالہ ہاتھ میں لے لو ؎

شگفت لالہ تو زینال بشگفاں کہی   زبیش لالہ بکف بر بنہادہ بہ زینال

اس کی شاعری کا ایک امتیازی جوہر جو اس کو فارسی شعرائے قدیم وجدید سے ممیز کرتا ہی یہ ہی کہ اس کا معشوق اور مخاطب ہمیشہ صنفِ نازک سے تعلق رکھتا ہی ایک مقام پر کسی شاہدِ برقع پوشس کو خطاب کرکے کہتا ہی ؎

بحجاب اندروں شود خورشید   گر تو برداری از دو لالہ حجیب

کبھی وہ کنیزکِ نیکو کا ذکر کرتا ہی اور کبھی ترکِ نارپستاں کا ؎

بسا کنیزکِ نیکو کہ میل داشت بدو   بشب زیارت او نزد او بہ پنہاں بود

ہمی خرید و ہمی ریخت بے شمار درم   بہ شہر ہرچہ ہمی ترک نارپستاں بود

ایک موقعے پر یارِ مہربان کی یاد اس کے دل میں گدگدی لیتی ہی ؎

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی   یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

رودکی کی شاعری اپنے گرد وپیش کے گزرنے والے واقعات سے غیر متعلق نہیں بلکہ اس کے ہاں ان میں پوری پوری دلچسپی کا اظہار کیا گیا ہی۔ دوستوں کی وفات پر ماتم، ملک کی فتح پر خوشی الغرض اس قسم کے واقعات بھی اس کے ہاں ملتے ہیں جس سے ظاہر ہی کہ اس کی شاعری ناآشنا مزاج نہیں ہی جس کو انسانی واقعات اور زندگی کی وابستگیوں سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

عمر کے آخری دور میں اُس کو کثرتِ آلام اور تلخیوں سے پالا پڑا ہی جس کی جھلک اس کے اشعار میں موجود ہی۔ اُس کا ایک قطعہ جس میں اُس نے اپنے بڑھاپے اور گزشتہ عظمت کی ماتم داری کی ہی سخندان فارس اور شعر العجم میں موجود ہی۔ یہاں میں ایک مختصر سی اسی قسم کی نظم پر کفایت کرتا ہوں ؎

بسا کہ مست دریں خانہ بودم وشاداں   چناں کہ جاہِ من افزوں بد از امیر وملوک

کنوں ہمانم وخانہ ہماں وشعر ہماں   مرا نگوئی کزچہ شدہ است شادی سوگ

رودکی نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں۔ کلیلہ و دمنہ کے علاوہ اسی وزن میں اُس نے کوئی اور مثنوی بھی لکھی ہی جس میں کلیلہ کی طرح چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی ہوں گی مثلاً یہ اشعار؎

گفت ہنگامے یکے شہزادہ بود   گوہری و پر ہُنر آزادہ بود
شد بگرمابہ دروں استاد غوشت   بود فربی و کلاں بسیار گوشت

(اشعار اسدی)

دیگر؎

آن کر نج دشکرش برداشت پاک   دندراں دستار آن زن بست خلک
پس زن از دکان فرود آمد چو باد   آں فلرزنگش بدست اندر نہاد
شوئے بکشاد آں فلرزش خاک دید   کرد زن را بانگ گفتش کاے پلید[۱]

بحرِ تقارب کے علاوہ بحرِ ہزج میں بھی کوئی مثنوی اس نے یادگار چھوڑی ہی۔ مثال؎

براہ اندرہمی شد راہ شاہی   رسید او تا بنزد بادشاہی

بحر خفیف میں بھی ایک مثنوی اس نے لکھی ہی مثال؎

دور تر از قرین وخویش وتبار   نسری ساخت بر سر کوہسار

رودکی کے زمانے میں دیکھا جاتا ہی کہ فن عروض پوری ترقی کر چکا تھا اکثر فارسی بحور اور اوزان میں اس کے ہاں ابیات پائے جاتے ہیں۔ اوزان میں اسکے دَور کے بعد جو اضافہ ہُوا نہایت حقیر ہی اور یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہی کہ اوزانِ ذیل سے جو اس کے عہد کے بعد ترویج پاتے ہیں رودکی ناواقف تھا مثلاً مضارع کا یہ وزن ؏ اے رایت رفیعت بنیاد نظم عالم۔ اور منسرح کا یہ وزن ؏ عشق ہمیں گو ہر بیست گو ہر دل کان او

---

[۱] جہانگیری صفحہ ۱۱ نولکشور

اور رجز کا یہ وزن ع چشمۂ خضر ساز آب از لب جام گوہری - علیٰ ہذا رمل کا یہ وزن ع صفتے است حسن او را کہ بوہم در نیاید اور مقتضب کا یہ وزن ع امشب آتشیں روئے گرم ژند خوانیہاست -

دقیقی

اس شاعر کے متعلق بھی بعض امور میں مجھ کو مولانا سے اختلاف ہے۔ تمہید میں فرماتے ہیں۔

"دقیقی خاص پایۂ تخت کا رہنے والا تھا اس کا اصلی نام منصور بن احمد ہے ابتدائی تربیت امرائے چغانیہ یعنی ابوالمظفر نے کی تھی لیکن جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی خدمت سپرد کی دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کر چکا تھا اس نے یہ خدمت قبول کی اور کم وبیش بیس ہزار شعر لکھے بعضوں کا بیان ہے کہ صرف ایک ہزار شعر تھے جو آج شاہنامہ میں شامل ہیں۔" (شعرالعجم صفحہ ۴۵)

دقیقی کا اصلی نام ابو منصور محمد بن احمد ہے وہ بخاری نہیں ہے بلکہ طوسی (لباب جلد دوم صفحہ ۱۱)

دقیقی کے اشعار کی تعداد کے متعلق یہاں ہمارے سامنے دو روایتیں ہیں ایک کی رو سے اس نے بیس ہزار ابیات لکھے۔ دوسری روایت کی رو سے ایک ہزار۔ جب ایک مورخ کے سامنے دو روایتیں موجود ہیں تو اس کا یہ بھی فرض ہے کہ کم سے کم اس امر کی تحقیق کرے کہ ان میں کون سی روایت معتبر ہے۔ ان روایات کے قدیمی رواۃ میرے خیال میں محمد عوفی اور فردوسی ہیں عوفی ساتویں صدی ہجری کا مصنف ہے جب کہ فردوسی دقیقی کا قریب قریب معاصر ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ

فردوسی اس معاملۂ خاص میں عوفی کے مقابلے میں زیادہ صحیح معلومات دے سکتا ہی کیونکہ دقیقی کا ہم عصر اور ہم وطن ہونے کے علاوہ اس کے حالات میں دل چسپی بھی لیتا ہی۔ فردوسی نے دقیقی کا ذکر کرتے ہوئے ایک چھوڑ، دو مقام پر اپنا بیان دوہرایا ہی ایک جگہ کہا ہی سے

زگشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار بگفت و سر آمد درا روزگار[۱]

دوسرے موقعے پر خود دقیقی کی زبان سے کہا ہی سے

زگشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار بگفتم سر آمد مرا روزگار[۲]

فردوسی کی اس تکرار کے باوجود اس موقعے پر مولانا اگرچہ دونوں روایتیں نقل کرتے ہیں لیکن کوئی تنقیدی فیصلہ نہیں دیتے۔

ان روایات کے متعلق ہفت اقلیم کا حوالہ دیا ہی مگر اس کی اصل عبارت یہ ہی:-

"دقیقی بقول اقل بیست ہزار و بقول اکثر ہزار بیت از داستان گشتاسپ در سلک نظم انتظام دادہ بر دست غلامی کشتہ گردید" جو صاحب ہفت اقلیم کا مقصد تھا شبلی نے بالکل اس کے برعکس لکھا اور ضعیف روایت کو فروغ دیا۔

نوح بن منصور کا دقیقی شاعر کو شاہنامے کی خدمت پر مامور کرنا جس کے مولانا مدعی ہیں اگرچہ ایک مقبولہ روایت ہی لیکن میں تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے متعلق آیندہ لکھا جائے گا۔

قولہ "دقیقی کا ایک خوش رو غلام تھا جس سے اس کو عاشقانہ محبت تھی لیکن افسوس ہی کہ اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا غلام نہایت غیور تھا اس نے ننگ کو گوارا نہ کیا اور دقیقی کا خاتمہ کر دیا۔" (شعر العجم صفحہ ۴۶)

---

[۱] شاہنامہ صفحہ ۳ جلد اول طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ۔ [۲] ابتدائی جلد سوم۔ شاہنامہ

میں اس واقعے کو صحیح تسلیم کرتا ہوں لیکن تاریخی واقعات میں علامۂ شبلی نے اپنی طرف سے جو رنگ آمیزی کی ہو اُس کے لیے یہ عبارت اچھی مثال ہو۔ اس واقعے کے متعلق سب سے قدیم بیان فردوسی کا ہو جو حسبِ ذیل ہو اور خود مولانا بھی اس کو نقل کرتے ہیں ؎

جوانیش را خوے بدیار بود — ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود
یکایک ازو بخت برگشتہ شد — بدستِ یکے بندہ برکشتہ شد

دیباچۂ قدیم میں کسی قدر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہو۔ لکھا ہو:

"دقیقی مردے بود کہ غلاماں را دوست می داشت چون از شاہنامہ یک چندے بنظم آورد اتفاق چناں افتاد کہ غلامی ترک درآں دو سہ روز خریدہ بود باوے لابہ می کرد وآں غلام کاردے بر شکم دقیقی زد و بداں زخم اورا ہلاک کرد و این شاہنامہ ناتمام بماند۔"

مولانا نے اپنی طرف سے جو جدت آفرینی کی وہ یہ ہو کہ وہ غلام خوش رو تھا، دقیقی کو اس سے عاشقانہ محبت تھی اور اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا۔ اب یہ تاریخ نہیں رہی ناول نویسی ہو گئی۔ قولہ:-

"دقیقی کے زمانے تک فارسی زبان میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ دونوں سے مل کر گویا ایک نئی زبان پیدا ہو گئی تھی عباس مروزی کے کل چار شعر ہیں لیکن عربی الفاظ فارسی سے زیادہ ہیں۔ رودکی و شہید بلخی وغیرہ کا کلام بھی اسی کے قریب قریب ہو سب سے پہلے جس نے فارسی زبان کو اس آمیزش سے پاک کر کے مستقل زبان کی حیثیت قائم کی ہو وہ دقیقی ہی ہو اس کے سیکڑوں شعر پڑھتے چلے جاؤ عربی کا ایک لفظ نہیں آتا۔"

(شعرالعجم صفحہ ۵۰)

میں شبلی کے اس کلیہ کی تائید نہیں کر سکتا کہ دقیقی کے زمانے تک فارسی میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ گویا ایک نئی زبان بن گئی تھی یہ اِدعا تاریخ اور قانونِ قدرت دونوں کے خلاف ہو۔ اگر یہ دعویٰ سلجوقی دَور کے لیے کیا جاتا تو صحیح مانا جاتا۔ زبان کا قانون بالکل مختلف ہو وہ کسی شخص کی ملکیت نہیں کہ اس کی تنہا کوشش اس میں انقلاب پیدا کر سکے ہر دَور کی زبان مختلف ہوتی ہو اور ہر شاعر اپنے عہد میں زبانِ وقت کے تتبع کے لیے اگر اس کو شہرت حاصل کرنا ہو مجبور ہو اس غرض کے لیے ضروری ہو کہ اس کی زبان رائج الوقت اور ٹکسالی ہو۔ کیا آج کسی شاعر کے لیے ولی کے عہد کی زبان میں شعر کہہ کر شہرت حاصل کرنا ممکن ہو؟ میرا جواب یہی ہو کہ ناممکن ہو لیکن دقیقی کے بارے میں صورتِ واقعہ بالکل مختلف ہو کیونکہ رودکی۔ شہید۔ فرالاوی۔ ابوشکور۔ خسروانی۔ دقیقی وغیرہ کی زبان میں کوئی فرق نہیں۔ سب اپنے اپنے وقت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ اس عہد میں عربی اور فارسی زبانیں الگ تھلگ تھیں عربی الفاظ جو ایک محدود تناسب میں رائج ہو کر قبولیتِ عام کا خلعت حاصل کر چکے تھے ہر شاعر کے ہاں ملتے ہیں۔ ان میں دقیقی بھی شامل ہو۔ یہ الفاظ زیادہ تر قطعہ غزل اور قصیدے میں ملتے ہیں۔ اس لیے کہ قافیے کی ضرورت سے عربی ذخیرے کی خوشہ چینی اکثر کی جاتی تھی مثنوی میں اس قسم کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی اسی لیے وہ ان کے اثر سے پاک ہو۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے دقیقی کوئی استثنا قائم نہیں کرتا بلکہ قاعدہ۔ چنانچہ تمثیلاً دقیقی کے اشعارِ ذیل ملاحظہ ہوں جو شبلی نے بھی درج کیے ہیں ؎

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد | آری دہد ولیک بعمرے دگر دہد
من عمر خویشتن بصبوری گزاشتم | عمرے دگر بباید تا صبر بر دہد

(شعر العجم صفحہ ۵۲)

ذیل میں دقیقی کی ایک غزل اسی غرض سے سپردِ قلم کی جاتی ہے ؎

کاش کے اندر جہاں شب نیستے | تا مرا ہجرانِ آں لب نیستے
زخم عقرب نیستے بر جانِ من | گر ورا زلف معقرب نیستے
ور نبودے کوکبش در زیرِ لب | مونسم تا روز کوکب نیستے
ور مرکب نیستے از نیکوئی | جانم از عشقش مرکّب نیستے
ور مرا بے یار باید زیستن | زندگانی کاش یا رب نیستے

عباس مروزی کے اشعار میں عربی الفاظ کی کثرت اس بنا پر ہے کہ متاخرین نے ان کو اصلاح دے کر اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے یہ اشعار میں اپنے مضمون کی ابتدا میں درج کر آیا ہوں۔ عوفی کے عہد سے پیشتر کا نسخہ اگر دستیاب ہو جائے تو ہم معلوم کر سکیں گے کہ اِن میں اور اُن میں بہت تفاوت ہوگا بلکہ وزن بھی مختلف ہوگا کیونکہ عباس کے عہد میں فارسی زبان میں رمل مثمن میں اشعار لکھے جانا قرین قیاس نہیں۔ صدیوں کے گزر جانے اور ہزاروں زبانوں پر آنے سے ایک شعر یا قطعے کی حیثیت بہت کچھ بدل جاتی ہے دوسرے ہر وقت کے زبان داں قدیم کہاوتوں اور ضرب الامثال کو اپنے عہد کی زبان میں رائج الوقت مذاق کے مطابق نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور شاعر کے اصلی الفاظ کے ابقا کا کچھ لحاظ نہیں رکھتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمانے کے انقلاب کے ساتھ ساتھ یہ الفاظ یا اشعار اپنی ہیئت بدلتے بدلتے کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ مثال کے لیے میں بہرام گور کا شعر پیش کرتا ہوں۔ دولت شاہ اس کو ذیل کی شکل میں لکھتا ہے ؎

منم آں پیل دمانُ منم آں شیر یلہ | نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ

مصرع آخر بہرام کی معشوقہ دلآرام کی طرف منسوب ہے۔ محمد عوفی لباب الالباب میں یوں لکھتا ہے ؎

ہم مشربوں میں اس کی یاد تازہ تھی۔ فرخی کہتا ہے ؎

ناظر از یدہ مدیح تو دقیقی بر گزشت
ز آفرین تو دل آگندہ چناں کز دانہ نار

تا بوقتِ ایں زمانہ مرد را مدت نماند
زیں سبب گر بنگری زامروز تا روز شمار

ہر گیاہے کز سرِ گورِ دقیقی بر دمد
گر بپرسی ز آفرین تو سخن گوید ہزار

اور غضایری کہتا ہے ؎

بشعر یاد کند روزگار برمکیاں
دقیقی آنکہ کاشفتہ شد بر و احوال

سحاق ابن براہیم را چہ بہرہ رسد
ز جود برمک و آں شعر قافیہ بدال

بیک دو بیت ندانم چہ فضل داد بدو
فسانہ باک ندارد محال را ز محال

فردوسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فنِ قصیدہ میں دقیقی بہتر مانا گیا تھا۔ شاہنامہ

؎ ستائیدۂ شہریاراں بدے
بمدح افسر نامداراں بدے

اس کا کوئی قصیدہ ہم تک نہیں پہنچا لیکن ذیل میں اُس کا ایک نفیس قطعہ جس میں شاعر نے ملک گیروں اور فاتحوں کے ضروری اوصاف اور لوازمات گنائے ہیں، تاریخ بیہقی سے لے کر نقل کیا جاتا ہے :۔

ز دو چیز گیرند مر مملکت را
یکے پرنیانی یکے زعفرانی

یکے زر بنامِ ملک بر نوشتہ
دگر ز آہنِ آبدادہ یمانی

کرا بویۂ وصلتِ ملک خیزد
یکے جنبشی بایدش آسمانی

زبانی سخن گوی و طبعے کشادہ
دلے ہمش کینہ ہمش مہربانی

کہ ملکت شکاریست کو را نگیرد
عقابِ پرندہ نہ شیرِ ژیانی

دو چیز است کو را بہ بند اندر آرد
یکے تیغِ ہندی دگر زرِ کانی

بشمشیر باید گرفتن مر اورا
بہ دینار بستنش پای ار توانی

کرا بخت و شمشیر و دینار باشد
بہ بالا تن نیزہ پشتِ کیانی

خرد باید آنجا وجود و شجاعت فلک مملکت کی دہد رایگانی

چند اشعار لغت فرس اسدی سے منقول ہیں ؎

(۱) مہرگان آمد جشن ملک افریدونا آن کجا گاؤ نکو بودش بمایونا

(۲) اکنوں شگفتہ بینی از ترک تا بین یک چندگاہ زیر پئے آہواں سمن

(۳) جمال گوہر آگینت چو زریں قبلہ ترسا کمر بمیان زر اندر چنانکہ عس زر بود رخشا

(۴) یکے صمصام فرعون کش عدو خوارے چو اژدرہا

کہ ہرگز سیر نبود وے ز مغز و از دل اعدا

(۵) برافروز آذرے ایدوں کہ تیغش بگذرد از بون

فروغش از بر گردوں کند اجسام را اخگر

ان اشعار سے اوّل تو فردوسی کے اس قول کی تائید ہوتی ہو کہ دقیقی قصیدہ نگاری میں استاد تھا۔ دوسرے اس خیال کی بھی تائید ہوتی ہو کہ ایرانی شعراء متقدم قصیدے کے میدان میں برخلاف مثنوی کے قافیے یا شکوہِ الفاظ کی غرض سے عربی الفاظ مستعار لیتے رہے ہیں۔

قولہ :- "سامانی خاندان ابتدا سے اس بات کا خواہشمند تھا کہ ان کے اسلاف کی داستان نثر سے نظم ہو کر عام زبانوں پر چڑھ جائے لیکن ابھی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی کہ ایک عظیم الشان تاریخی سلسلہ شعر کے قالب میں آجائے" شعر العجم ص ۴۵

یہ خیال اصل میں ہفت اقلیم سے ماخوذ ہو اور نہ ہفت اقلیم سے پیشتر اس کا سُراغ چلتا ہی۔

امین احمد کی اصل عبارت یہ ہو :-

"کہ چوں اکلیل سلطنت خراسان و توران بفرق آل سامان مکلل گردید

خواستند کہ احوال سلاطین عجم را در سلک نظم انتظام دہند۔ چوں دراں وقت مرتبۂ نظم عالی نگشتہ بود و ایں شیوہ چندانی شیوع نہ پذیرفتہ ہر آئینہ از حیز قوہ بفعل نمی آمد۔" (ورق ۵۰۷ مخطوطۂ مملوکۂ پروفیسر آذر)

قولہ:۔ "نوح بن منصور جب ۳۶۵ھ میں تخت نشین ہوا تو پایۂ تخت یعنی بخارا میں بڑے بڑے شعرا موجود تھے ان میں دقیقی خاص پایۂ تخت کا رہنے والا تھا.... جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی۔ دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کر چکا تھا اس نے یہ خدمت قبول کی۔" (شعر العجم صفحہ ۴۵)

سب سے قدیم روایت دقیقی کے شاہنامہ نظم کرنے کے متعلق فردوسی کے ہاں ملتی ہے جو یہ ہے ؎

چو از دفتر ایں داستانہا بسے ہمی خواند خوانندہ بر ہر کسے
جہاں دل نہادہ بریں داستاں ہماں بخردان و ہمہ راستاں
جوانے بیامد کشادہ زباں سخن گوی و خوش طبع و روشن رواں
بنظم آرم ایں نامہ را گفت من ازو شادماں شد دل انجمن

چونکہ شاہنامے کی داستانوں کا ہر محفل اور مجلس میں قصہ خوانوں کی بدولت چرچا رہتا تھا دقیقی نے ان کی عام ہر دلعزیزی دیکھ کر ان کی نظم کا ارادہ کر لیا اس تجویز کو پسندِ عام کا خلعت ملا۔

یہاں دیکھا جاتا ہے کہ فردوسی مولانا شبلی کے اس عقیدے کی کہ سامانی خاندان ابتدا سے شاہنامے کی نظم کا خواہاں تھا تائید نہیں کرتا اور نہ اس دعوے کی تصدیق کرتا کہ دقیقی نے شاہنامہ نوح بن منصور ۳۶۵ھ و ۳۸۷ھ کے حکم سے شروع کیا تھا۔ نوح نے دقیقی کو اس کام پر اگر واقع میں مامور کیا تھا تو کوئی وجہ

معلوم نہیں ہوتی کہ فردوسی اس واقعے کے اخفا کی کوشش کرتا جب کہ یہ امر بھی قرینِ عقل ہو کہ اس کے اظہار سے سلطان محمود کے دربار میں خود فردوسی کی اپنی تصنیف کی قرار واقعی قدر کیے جانے کی توقع ہو سکتی تھی لیکن نوح بن منصور کی شاہنامے کے بارے میں دلچسپی کے سوال کا فیصلہ کرنے سے پیشتر یہ امر مقدم معلوم ہوتا ہو کہ دقیقی کا زمانہ تحقیق کر لیا جائے۔

(۱) محمد عوفی اس کو ابو صالح منصور بن نصر (کذا) (سنہ ۳۵۰ھ و سنہ ۳۶۵ھ) اور نوح بن منصور (سنہ ۳۶۵ھ و سنہ ۳۸۷ھ) کے عہد کا شاعر مانتا ہو۔ دقیقی کے ایک تیسرے ممدوح کا نام ابو سعید محمد مظفر محتاج چغانی دیا ہو عوفی اس قدر اور اضافہ کرتا ہو کہ امیر ابو الحسن علی بن الیاس الآغاچی (والیِ کرمان سنہ ۳۱۷ھ و سنہ ۳۵۴ھ المتوفی سنہ ۳۵۶ھ) اور دقیقی معاصر ہیں۔ ابو سعید محمدؐ مظفر محتاج چغانی کے زمانے سے ہم ناواقف ہیں۔

ایک امیر ابو المظفر چغانی چوں کہ فرخی کا بھی ممدوح ہو اس لیے مرزا محمد بن عبد الوہاب قزوینی کا خیال ہو کہ فرخی اور دقیقی کا ممدوح ایک ہی شخص ہو جس کا پورا نام مرزائے موصوف یہ بتاتے ہیں "فخر الدولہ ابو المظفر احمدؐ بن محمدؐ چغانی" (چہار مقالہ ص ۱۶۵ مطبوعہ یورپ) لیکن فرخی کے ممدوح کا نام جیسا کہ آنے والے ابیات سے واضح ہوتا ہو۔ فخر الدولہ ابو المظفر بن احمدؐ محمدؐ چغانی ہو۔ فرخی کے اشعار یہ ہیں ؎

فخر دولت بو المظفر شاہ با پیوستگان | شادمان و شادخوار و کامران و کامگار

تا نقش کرد بر سرِ ہر نقش بر نوشت | مدح ابو المظفر شاہ چغانیاں
بن احمدِ محمدؐ شاہِ جہاں پناہ | آں شہریار کشور گیر و جہاں ستاں

ایک ابو المظفر محمدؐ بن احمدؐ والی چغانیاں کا ذکر تاریخ عتبی میں فائق کے حالات

کے ذیل میں ملتا ہی جب ابو المظفر طاہر بن فضل اس ابو المظفر کو شکست دے کر چغانیان چھین لیتا ہی تو وہ اعانت کی امید میں فائق کے پاس آتا ہی فائق فوج سے اسکی امداد کرتا ہی لیکن اسی اثنا میں طاہر بن فضل بلخ پر حملہ آور ہوکر (۳۷۷ھ میں بقول عوفی) مارا جاتا ہی۔ میرے خیال میں عتبی کا ابو المظفر محمدؐ بن احمدؐ والی چغانیاں اور فرخی کا فخر الدولہ ابو المظفر بن احمدؐ محمدؐ والی چغانیاں ایک ہی شخص معلوم ہوتے ہیں فرخی نے اس کا نام بضرورت شعر اس کی ولدیت کے بعد لکھ دیا۔

دقیقی اپنے ممدوح کا نام ایک شعر میں جو لغات اسدی میں ملتا ہی یوں بیان کرتا ہی ؎

ابو سعد آں کہ از گیتی بر و بر بستہ شد دلہا ۔۔۔ مظفر آں کہ شمشیرش بہ برد از دشمناں پردا

اب صورت یہ قائم ہوگئی ہی کہ علامہ قزوینی کا (الف) فخر الدولہ ابو المظفر احمدؐ بن محمدؐ ہی فرخی کا (با) ابو المظفر بن احمدؐ محمدؐ ہی اور عتبی کا (جیم) ابو المظفر محمدؐ بن احمدؐ ہی (دال) عوفی کا ابو سعید محمدؐ (بن) مظفر (بن) محتاج چغانی ہی اور دقیقی کا (ہا) ابو سعد مظفر ہی۔

الف اور با ایک شخص نہیں اس لیے فرخی اور دقیقی معاصر نہیں ہو سکتے دال اور ہا میں غالباً باپ بیٹے کا تعلق معلوم ہوتا ہی عوفی نے باپ بیٹے کے ناموں میں تخلیط کی ہی دقیقی جب کہ باپ کا مداح ہی عوفی نے بیٹے کا خیال کیا۔ یا یہ کہ وہ بالکل مختلف شخص ہوں بہر حال تاریخ میں ان دونوں اسما کی سُراغ رسی نہیں ہو سکتی۔ چغانی خاندان میں ابو بکر محمدؐ بن مظفر کا پتا لگتا ہی جو ۳۲۱ھ میں سپہ سالار خراسان تھا عوفی کے پیش کردہ نام میں اور اس میں یہ فرق ہی کہ کنیتوں میں اختلاف ہی اگر ان دونوں شخصوں کو ایک مانا جاتا ہی تو ابو سعد مظفر جس کا نام دقیقی اپنے شعر میں بیان کرتا ہی ابو بکر کا باپ تسلیم کیا جا سکتا ہی لیکن یہ محض قیاس ہی۔

(۲) سابق میں تمام اسناد کا خیال تھا کہ شاہنامہ فردوسی نے ۳۸۴ھ میں سلطان محمود غزنوی کے حکم سے نظم کرنا شروع کیا تھا اور دقیقی چونکہ اکثر مورخین کے نزدیک ۳۶۵ھ میں شاہنامے پر قلم اُٹھاتا ہی اس لیے دونوں شاعروں کی معاصرت کا سوال پیش نہیں آیا۔ لیکن اب جب کہ یہ نظریہ شاہنامے کی شہادت سے غلط ثابت ہو چکا ہی اور ابیات ؎

سی و پنج سال از سرائے سپنج　　بسے رنج بردم بامید گنج

اور　چو برباد دادند رنج مرا　　نبد حاصلے سی و پنج مرا

(یہ ابیات خاتمہ شاہنامہ میں سنہ ۴۰۰ھ میں لکھے گئے ہیں) جس سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ خود فردوسی ۳۶۵ھ میں اس کام پر مصروف تھا اب یا تو ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ دونوں شاعر معاصر تھے اور دونوں نے ایک ہی وقت بلکہ ایک ہی سال میں شاہنامے پر قلم اُٹھایا لیکن یہ ایک ایسا عقیدہ ہی کہ جس کے لیے کوئی بھی تیار نہیں یا دقیقی کا تقدم مان لیا جائے جس کی تائید فردوسی کے بیان سے ہوتی ہی وہ عام طور پر اس کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتا ہی جن کا صریحی مفہوم یہی ہی کہ دقیقی اُس سے اقدم تھا۔ فردوسی اس کو شاہنامے کا پہلا معمار تسلیم کرتا ہی اور اپنا رہبر اور رہنما بھی مانتا ہی۔ ع

ہم او بود گوینده را راہبر

فردوسی کے پاس دقیقی کے شاہنامے کی جو نقل تھی اپنی اصل سے دُور ہو جانے کی بنا پر کثرت سے غلط تھی شاہنامہ ؎

بنقل اندرون سُست گشتش سخن　　ازو نو نہ شد روزگار کہن

یعنی بوجہ کثرتِ نقول اُس کے کلام میں اغلاط واقع ہو گئی تھیں۔

(۳) سلطان محمود کے نام فردوسی شاہنامہ معنون کرتے ہوئے گویا ہی کہ تیں

بیس سال قبل سے اس کتاب پر مشغول تھا لیکن قدر دان سرپرست اور مُربی کے نہ ملنے کی وجہ سے میں ہمیشہ افسردہ خاطر اور غمگین رہا خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ندیدم سرافراز بخشندہٗ — بگاہِ کیان بر درخشندہٗ
ہمم ایں سخن بر دل آسان نبود — جز از خامشی ہیچ درماں نبود
یکے باغ دیدم سراسر درخت — نشستنگہِ مردمِ نیک بخت
بجائے نبد ایچ پیدا درش — جز از نام شاہی نبد افسرش
کہ اندر خورِ باغ بایستے — اگر نیک بودے بشایستے
سخن را نگہ داشتم سال بیست — بداں تا سزا وار ایں گنج کیست[۱]

اس سے میرا مقصد اسی قدر ہی کہ اگر نوح بن منصور کو واقع میں شاہنامے سے کوئی دل چسپی تھی اور دقیقی کو اُس کی نظم کی خدمت سپرد کی تھی تو فردوسی کے لیے یہ معاملہ نہایت آسان تھا وہ دقیقی کی آنکھ بند ہوتے ہی سیدھا بخارا کا رُخ کرتا اور اپنا جوہرِ کمال دکھا کر دقیقی کا منصب اپنے لیے حاصل کرتا اور بیس سال تک گوشۂ گمنامی میں سلطان محمود غزنوی کی تاجپوشی تک نہ پڑا رہتا گیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ نوح کو شاہنامے کے معاملے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

(۴) نوح بن منصور ۳۶۵ھ میں جب تخت نشین ہوا۔ نہایت کمسن تھا اور سلطنت کے امور کا کفیل سامانیوں کا مُدبّر وزیر ابو الحسن عتبی تھا۔ ظاہر ہی کہ ایک کم عمر بادشاہ جو سلطنت کے معاملات میں نام کے سوا کوئی دخل نہ رکھتا ہو علمی امور میں ایسے ذوق کا اظہار نہیں کرسکتا جو علم دوستوں میں بھی عمر کی پختگی اور سنجیدگیِ مذاق پر منحصر ہی۔

(۵) ۳۶۵ھ دقیقی کا سال وفات[۲] بھی دیا جاتا ہی اسی سال نوح بن منصور

---

[۱] شاہنامہ صفحہ ۱۲ جلد سوم ۱۳۰۸ھ۔ [۲] پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۴۷۰

تخت نشین ہوتا ہی اس لیے نوح کی فرمائش کرنے، دقیقی کا اس کے لیے ذخیرہ جمع کرنے، تیار ہونے اور ہزار شعر لکھنے کے لیے بہت کم وقفہ ملتا ہی۔

ان امور پر نظر کرتے ہوئے میں اس رائے پر قائم ہوتا ہوں کہ نہ نوح نے فرمائش کی اور نہ دقیقی نے ۳۶۵ھ میں شاہنامہ شروع کیا۔ چونکہ انھی ایام میں فردوسی کو اپنے شاہنامے پر مصروف دیکھا جاتا ہی اس لیے ضروری ہوا کہ دقیقی کا زمانہ نوح کے عہد سے اوپر کی طرف سرکایا جائے اس غرض سے یہ دلائل ناظرین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۶) دقیقی کا ایک قطعہ ہی ؎

امام فنونِ سخن بود در کرا رودکی گفتہ باشد مدیح
چو خرما بود بردہ سوے ہجر دقیقی مدیح آورد نزد او

اس قطعے سے جو رودکی کے حالات میں لباب الالباب صفحہ ۶ میں درج ہی پایا جاتا ہی کہ رودکی اور دقیقی ایک ہی شخص کے مدح سرا رہ چکے ہیں اس لیے ضروری ہی کہ دقیقی اور رودکی ہمعصر ہوں اگر ہمعصر نہ ہوں تو زیادہ تقدم اور تاخر ان میں نہ ہو۔ عتبی نے اپنی تاریخ میں رودکی دقیقی اور خسروانی کا نام اس طرح لیا ہی کہ گویا وہ ایک ہی زمانے میں تھے۔

(۷) دیباچۂ قدیم شاہنامہ دقیقی کو نصر بن احمد ۳۰۱ھ و ۳۳۱ھ کے عہد کا شاعر مانتا ہی۔ دیباچے کی اصل عبارت یہ ہی:۔

"در ایں شاہنامہ بروزگار نصر بن احمدؒ ابوالفضل بلعمی دقیقی (را) کہ شاعر او بود فرمودہ بود کہ بنظم آورد۔"

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ دقیقی اور رودکی معاصر ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاہنامہ ابوالفضل بلعمی کے حکم سے دقیقی نے نظم کرنا شروع کیا تھا اس

طرح سے سامانیوں کی علمی فتوحات کی فہرست سے یہ کارنامہ بھی جس کے لیے مولانا شبلی ان کے ثنا خواں معلوم ہوتے ہیں خارج ہوا جاتا ہو۔

(۸) امیر نصر بن احمدؒ کا جانشین امیر نوح بن نصر ۳۳۱ھ اور ۳۴۳ھ ہو چونکہ تذکرہ نگار دقیقی کو نوح بن منصور ۳۶۵ھ و ۳۸۷ھ کا شاعر مانتے ہیں اس لیے ظاہر ہو کہ وہ نوح اوّل کو نوحِ ثانی میں خبط کر رہے ہیں۔ بدقسمت نوح ثانی ایک امر میں ضرور خوش قسمت رہا ہو وہ یہ کہ اخلاف نے اس کے اسلاف کے اکثر کارنامے اس کی طرف منتقل کر دیے ہیں۔

(۹) دقیقی کی ایک تاریخ وفات ۳۴۱ھ مجھ کو دو ذرائع سے ملتی ہو پہلی شاہد صادق مصنفہ محمدؐ صادق صاحب صبح صادق، دوسرے سخن دان فارس محمد حسین آزاد ان دونوں کتابوں میں یہی تاریخ وفات ملتی ہو اور مجھ کو اس تاریخ کے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔

ابو شکور بلخی کے لیے فرماتے ہیں:۔

"۳۳۶ھ میں تھا اس کا کلام بہت کم ملتا ہو" شعر العجم صفحہ ۵۴

۳۳۶ھ محمدؐ عوفی نے ابو شکور کی مثنوی آفرین نامہ کی تاریخ اختتام دی ہو لیکن لغت فرس میں ابو شکور کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ مثنوی ۳۳۳ھ میں لکھی گئی تھی چنانچہ یہ شعر ؎

چنیں داستاں کش بگفت از نیال   ابر سی صد وسی وسہ بود سال

ابو شکور کے اشعار لغت فرس، فرہنگ جہانگیری، لباب الالباب اور المعجم فی معاییر اشعار العجم میں ملتے ہیں۔ فی زماننا سب سے قدیم رباعی جس شاعر کی ملتی ہو وہ ابو شکور رہو۔

عمارہ مروزی کے لیے ارشاد ہوا ہو:۔

"مرو کا رہنے والا تھا۔ ۳۶۵ھ میں انتقال کیا"۔ شعر العجم صفحہ ۵۵

اس کا پورا نام ابو منصور عمارہ بن محمدؒ المروزی ہے اور آلِ سامان اور آلِ ناصر کے عہد میں گزرا ہے۔ عوفی نے سلطان محمود غزنوی ۳۸۷ھ و ۴۲۱ھ کی مدح میں عمارہ کے یہ ابیات نقل کیے ہیں ؎

از کفِ شاہ نور بود بر جبینِ خور | جودش مرا ہمیل نمود است جبیں
گر بر کران دجلہ کسے نام او برد | آب انگبیں ناب شود گل انگبیں

ظاہر ہے کہ عمارہ کو سلطان کی مدح سرائی کے لیے اس کی مفروضہ وفات سے کم از کم تیئیس چوبیس سال بعد تک زندہ رہنا چاہیے فرماتے ہیں۔

"ان شعرا کے علاوہ اس دور میں اور بہت سے خوش گو اور خوش فکر تھے مثلاً اعجمی، طخاری، ابو العباس زنجی، جوئباری، ابو المثل بخاری، طلحہ وغیرہ لیکن چونکہ ان کے حالات اور اشعار بہت کم ملتے ہیں اس لیے ہم ان کے نام قلم انداز کرتے ہیں۔" (شعر العجم صفحہ ۵۶)

جن شعرا کے نام عبارتِ بالا میں ذکر ہوئے ہیں ان میں بعض کی صورتیں ایسی مسخ ہوگئی ہیں کہ ان کی شناخت بالکل دشوار ہوگئی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ مصنوعی ہستیاں قائم ہوگئی ہیں۔ مثلاً ان ناموں کی فہرست میں سب سے پہلا اعجمی ہے۔ میں اس اعجمی شاعر کی تلاش میں اتنا ہی حیران و پریشان ہوا جتنا میرے ایک انگریز فارسی خواں دوست ہاتف شاعر کی تلاش میں سرگرداں رہے تھے.......... ان کو یہ وہم ہوگیا تھا کہ ہاتف کسی شاعر کا نام ہے۔ "ہاتف گفت" اور "ہاتف ندا کرد" بار بار قطعاتِ تاریخ میں پڑھ چکے تھے ہاتف ان کے نزدیک بڑا مشہور شاعر تھا جس کو فن تاریخ گوئی میں کمال تھا بڑی تلاش کے بعد دو ایک ہاتف شاعر ان کو مل گئے لیکن انھیں اپنا نہایت مشہور اور تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھنے والا

شاعر ہاتف نہیں ملا۔

بے سود کوشش اور جستجو کے بعد میں اس نتیجے پر آیا ہوں کہ اعجمی شاعر عنقا کا ہم بزم ہی۔ اگر تاریخ کے میدان میں قیاس دوڑانے کی اجازت ہو سکتی ہو تو میں کہوں گا کہ مولانا شبلی نے اعجمی میں آغجی کی مٹی پلید کی ہو۔ اس شاعر کا پورا نام امیر ابو الحسن علی بن الیاس الآغاجی البخاری ہو۔ وہ نصر سامانی کے عہد سے والی کرمان تھا سینتیس سال کی حکومت کے بعد لشکر نے اس کے مظالم سے تنگ آکر اس کے فرزند الیسع کو امیر بنا لیا۔ ابو الحسن بخارا جاکر سنہ ۳۵۶ھ میں وفات پاتا ہو۔ آلِ الیاس کا بانی یہی شخص ہو اس کے فارسی اشعار کا دیوان بقول ثعالبی (تتمہ الیتیمہ) نہایت معروف تھا عوفی نے اس کا ذکر کیا ہو، لغات اسدی میں اس کا ایک شعر ملتا ہو لیکن اس کا نام ابو علی الیاس دیا گیا ہو جس طرح کہ تاریخ گزیدہ اور سیاست نامہ میں۔

تیسرا نام ابو العباس ربنجی ہو اس کا پورا نام ابو العباس فضل بن عباس الربنجنی ہو رَبنجَن (بفتح را وکسر با وسکون نون وفتح جیم وسکون نون) سغد سمرقند میں ایک شہر کا نام ہو۔ ربنجنی بڑے پایے کا شاعر ہو اور رودکی اور ابو شکور کا ہمعصر۔ نصر بن احمد سامانی سنہ ۳۰۱ھ و سنہ ۳۳۱ھ کی وفات اور اس کے جانشین نوح بن نصر سنہ ۳۳۱ھ و سنہ ۳۴۳ھ کے جلوس سلطنت کی تہنیت میں کہتا ہو ؎

بادشاہے گزشت خوب نژاد	بادشاہے نشست فرخ زاد
زاں گزشتہ زمانیاں غمگیں	زیں نشستہ جہانیاں دل شاد
بنگر اکنوں بچشم عقل وبگو	ہرچہ بر ماز ایزد آمد داد
گر چراغے ز پیش ما برداشت	باز شمعے بجائے او بنہاد

یہ اشعار اس قرن اور قرنِ مابعد میں بہت مشہور رہے ہیں۔ فرخی شاعر

نے ایک قصیدے میں جو سلطان محمود کی وفات سلاکلہ اور امیر محمد کی تاجپوشی پر لکھا ہی ان اشعار کو یوں تضمین کیا ہو ؎

"شمع داریم و شمع پیش نہیم	گر بکشت آں چراغ مارا باد
گر برفت آں ملک نمابگزاشت	بادشاہے کریم پاک نژاد
سخت خوب آمد ایں دوبیت مرا	کہ شنیدم ز شاعرے اُستاد
"بادشاہے نشست فرخ زاد	بادشاہے گزشت پاک نژاد
برگزشتہ ہمہ جہاں غمگیں	برنشستہ ہمہ جہاں دل شاد"

ابو الفضل بیہقی کے ہاں یہی ابیات ایک مرتبہ اور سلطان فرخ زاد کی وفات اور سلطان ابراہیم غزنوی کی تخت نشینی کے موقع پر ایک قطعے میں تضمین ہوے ہیں وہو ہذا ؎

"بادشاہے برفت فرخ زاد	بادشاہے نشست حور نژاد
از برفتہ ہمہ جہاں غمگیں	وز نشستہ ہمہ جہاں دل شاد
گر چراغے ز پیش ما برداشت	باز شمعے بجائے آں بنہاد"
یافت چوں شہر یار ابراہیم	ہر کہ گم کرد شاہ فرخ زاد

دوسرا نام طخاری ہی میں اس کی تلاش میں ناکامیاب رہا چہار مقالہ میں ایک طحاوی البتہ ملتا ہی لیکن شعر العجم میں دو مقام پر اس کو طخاری لکھا ہی۔ دیکھو صفحہ ۲۶ شعر العجم۔

پانچواں نام طلحہ ہی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ شعرائے سامانیہ میں اس کو کیوں شمار کیا گیا۔ طلحہ اس دَور کے شاعروں سے دو صدی بعد گزرا ہی اس کا عہد آل سلجوق کے عہد میں محسوب ہونا چاہیے۔ اس شاعر کا ذکر لباب الالباب میں آتا ہی اور عوفی نے اس کا پورا نام یوں دیا ہی۔ "الاجل شہاب الدین ابو الحسن طلحہ المروزی"۔

طلحہ نے اپنے دوست حکیم محمود ابن علی السمائی المروزی کا مرثیہ بھی لکھا ہی۔

دورِ غزنویہ

شبلی فرماتے ہیں :-

"عبد الملک کے بعد جب اس کا بیٹا منصور تخت نشین ہؤا تو الپتگین خراسان چھوڑ کر غزنین چلا گیا اور یہاں ۱۶ برس تک حکومت کر کے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحٰق قائم مقام ہؤا لیکن چند روز کے بعد مر گیا۔ الپتگین کا ایک غلام سبکتگین تھا اس نے الپتگین کے عہد میں ایسی قابلیت کے جوہر دکھائے کہ ابو اسحٰق کے بعد لوگوں نے ۳۶۵ھ میں اسی کو غزنین کا حاکم مقرر کر دیا۔" شعر العجم صفحہ ۵۶ و ۵۷

ان بیانات میں دو ایک باتیں قابلِ غور ہیں؛ الپتگین کا غزنین آکر سولہ سال حکومت کرنا معتبر تاریخی روایات کے خلاف ہی۔ حمد اللہ مستوفی اور اس کا مقلد فرشتہ اس بارے میں سند نہیں مانے جا سکتے۔ اصل یہ ہی کہ الپتگین غزنین آنے کے آٹھ ماہ بعد ۳۵۲ھ میں وفات پاتا ہی۔ ۳۵۵ھ میں اُس کا فرزند اور جانشین ابو اسحٰق فوت ہوتا ہی۔ بلکاتگین[۵۱] امیر بنا لیا جاتا ہی جس کے عہد میں ترقی کر کے سبکتگین بڑے عہدے پر پہنچتا ہی۔ بلکاتگین کے ساتویں سال میں سلطان محمود کی ولادت ہوتی ہی۔

---

۵۱ بلکاتگین کا سکہ ضرب ۳۵۹ھ پٹروگراڈ (روس) میں موجود ہی۔ پروفیسر براؤن اس کو ابو اسحٰق کا بھائی اور الپتگین کا فرزند کہتے ہیں (تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۲۷۲) بلکاتگین کا ذکر جامع الحکایات محمدؒ عوفی۔ طبقات ناصری۔ شاہد صادق اور منتخب التواریخ حسن بن محمدؒ بن خاکی شیرازی میں ملتا ہی۔ آخری دونوں اسناد کی رُو سے بلکاتگین ۳۶۲ ہجری میں مارا جاتا ہی۔

بلکاتگین کے مارے جانے کے بعد امیر پیری انتخاب کیا جاتا ہو لیکن بہت جلد بعد معزول ہو کر ۳۶۶ھ میں سبکتگین امیر تسلیم کر لیا جاتا ہو۔ فرماتے ہیں :۔

"سبکتگین پہلا شخص ہو جس نے ہندستان کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا اور جے پال کو بار بار سخت شکستیں دیں سامانی دربار سے اس کو ناصر الدین کا خطاب ملا ۳۸۳ھ میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل جو الپتگین کی دختر کے بطن سے تھا بلخ میں تخت نشین ہوا، محمود غزنین میں تھا اس نے بھائی کو لکھا کہ بلخ میں حکومت کیجیے لیکن غزنین میرے قبضے میں رہنے دیجیے" شعر العجم صفحہ ۵۰۔

سبکتگین اور جے پال کے درمیان صرف دو مرتبہ جنگ ہوئی سبکتگین کی وفات ۳۸۳ھ میں ہرگز ہرگز نہیں ہوئی بلکہ باجماع مورخین اس کے چار سال بعد یعنی شعبان ۳۸۷ھ میں۔ باپ کی وفات کے وقت محمود نیشاپور میں تھا نہ غزنیں میں۔ محمود اگر اس وقت غزنیں میں ہوتا یا غزنیں پر اس کا قبضہ ہوتا تو بھائیوں میں جنگ کی نوبت نہ آتی۔ کیونکہ محمود اور اسمٰعیل کے درمیان غزنیں متنازعہ فیہ تھا۔ محمود غزنیں کا طالب تھا جو اس وقت اسمٰعیل کے قبضے میں تھا اور وہ اس کے معاوضے میں بلخ یا نیشاپور اسمٰعیل کو دے رہا تھا۔ اسمٰعیل کو یہ تقسیم پسند نہ تھی، محمود نے اول ان کے ذرائع استعمال کیے جو برادرانہ خطوط اور نصیحت و فہمایش کی شکل اختیار کیے ہوئے تھے۔ ابو الحارث فریغونی والی گوزگان بھی اس معاملے میں واسطہ بنا۔ اس نے بھائیوں میں بالمشافہ ملاقات کی تجویز کی، اسمٰعیل نے اس کو بھی مسترد کر دیا۔ محمود ہرات و بست کے راستے غزنیں کے قریب آگیا آخر اسمٰعیل اور محمود میں جنگ ہوئی اور اسمٰعیل ہزیمت پا کر غزنیں کے قلعے میں پناہ گزیں ہوا[۱۵]۔ محمود نے پُر امن

---

[۱۵] تاریخ یمینی از عتبی۔

ذرائع سے قلعہ غزنین (بقول بدایونی چھ ماہ بعد) اسمٰعیل[1] سے لے لیا۔

سلطان محمود کے علمی کارناموں کے ذکر میں فرماتے ہیں:۔

"غزنین میں اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں تمام دنیا کے نوادر موجود تھے"

شعر العجم صفحہ ۵۸

یہ روایت فرشتہ کے نام سے منقول ہو لیکن فرشتے کی اصل عبارت یہ ہو:۔

"در جوار آں مسجد مدرسۂ بنا نہاد و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ دہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف فرمود" (فرشتہ صفحہ ۳۰ نول کشور)

میں نے جب مولانا کا یہ بیان دیکھا نہایت محظوظ ہوا کہ یہ عجائب خانے اور چڑیا گھر جن کو ہم مغربی بدعت سمجھا کرتے ہیں، ہمارے اسلاف کی ایجاد نکلے لیکن فرشتہ نے میری تمام خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ خدا جانے قبلہ مولانا نے یہ نکتہ آفرینی کیوں کی۔

اسی کتب خانے اور سلطان کی علم دوستی کے متعلق کتاب بحر الفوائد میں جو منتصف قرن ششم ہجری کی فارسی زبان میں ایک تصنیف ہو اور ملک شام میں اتابک ابی سعید ارسلان آبہ بن آق سنقر کے لیے لکھی گئی تھی روایت ذیل مرقوم ہو:۔

"سلطان غازی محمود سبکتگیں گفت ہمہ مرادہائے جہان درجہاں یافتم مگر یک آرزو دفترہا خواندن و خبرہائے گزشتگان دانستن پس فرمود تا در شہر غزنین کتب خانہ بساختند چوں شب درآمدے علما را جمع کردے تا میخواندندے"۔

شعرا کے حق میں محمود کی شاہانہ فیاضیوں کے ذکر میں فرماتے ہیں:۔

ایک موقعے پر جب شہزادہ مسعود خراساں سے غزنیں میں آیا اور شعرا نے

---

[1] اسمٰعیل کے دو درہم راقم کے مجموعۂ سکوکات میں موجود ہیں۔

دربار عام میں قصائد پیش کیے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور
زینتی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عنایت کیے۔"

(شعر العجم صفحہ ۵۸)

مولانا نے یہ واقعہ سلطان محمود کی طرف منسوب کیا ہو۔ اگر فرزند کی فیاضیاں باپ کے جود و کرم کی فہرست میں شمار کرنا غلطی میں داخل ہیں تو بیانِ بالا قطعی غلط ہو۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں کہ محمود فیاض نہیں تھا بلکہ یہ مُراد ہو کہ اس کا فرزند سلطان مسعود بھی جود و سخا میں اپنے باپ سے کم نہیں تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ سلطان مسعود سے تعلق رکھتا ہو نہ سلطان محمود سے۔

سلطان محمود ۲۳ ربیع الآخر ۴۲۱ھ کو پنجشنبہ کے روز ظہر کے وقت انتقال کرتا ہو اور یہ انعام بروز دوشنبہ ۲۷ یا ۲۸ رمضان ۴۲۲ھ کو جشن مہرگاں مناتے وقت سلطان مسعود غزنین میں عطا کرتا ہو۔ اِس انعام بخشی کے وقت نہ محمود زندہ تھا اور نہ مسعود شہزادہ۔ اس کے متعلق بیہقی کے الفاظ ہیں " شاعرا نکہ بیگانہ بودند بیست ہزار درم فرمود و علوی زینتی را پنجاہ ہزار درم بر پیلے بخانۂ او بردند و عنصری را ہزار دینار بدادند۔" (بیہقی صفحہ ۳۲۳)

لیکن یہ پیل بار انعام بخشیاں سلطان محمود کی بدعاتِ حسنہ سے تصوّر ہونی چاہییں اگرچہ میں اپنے قول کی تائید میں تاریخی براہین پیش نہیں کرسکتا کیونکہ محمود کی تمام تاریخیں سوائے ایک آدھ کے برباد ہوگئی ہیں۔ اگر آج ہمارے پاس تاج الفتوح، مقامات ابو نصر مشکانی، تاریخ محمودی از ابو الفضل بیہقی، تاریخ ملّا محمّد غزنوی اور تاریخ محمود ورّاق موجود ہوتیں تو ہم محمود کی فیاضی سرپرستی علوم و فنون اور قدر دانی شعرا کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے قابل ہوسکتے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ محمود ہاتھی بھر بھر کر انعامات دینے کا عادی تھا۔

ایسی تلمیحیں موجود ہیں جن میں محمود کے ایسے ہاتھیوں کا ذکر آتا ہی۔ نظامی فرماتے ہیں ؎

؎ مرا پیلبار از تو مقصود نیست — کہ پیل تو چوں پیل محمود نیست

عنصری ایک موقعے پر کہتا ہی ؎

امید دارم کیں بار صد ہزار تمام — بمن بیارد بر پاے پیل بر فیال

امیر معزی ؎

زبہر نام اگر شاہ زاولی محمود — بہ پیلوار بہ شاعر ہمی شیانی داد

کنوں کجاست، بیا گو بجود شاہ نگر — کہ جود او بصلہ گنج شائگانی داد

شیخ عطار ؎

چہ آن گر فیل وارش کم نہ ارزید — بر شاعر فقاعے ہم نہ ارزید

زہی ہمت کہ شاعر داشت آنگاہ — کنوں بنگر کہ چوں برگشت از راہ

سلطان محمود شعرا پر چار لاکھ دینار سالانہ صرف کیا کرتا تھا۔ ہر نئے شاعر کو اس کے دربار میں عزت کے ساتھ جگہ دی جاتی تھی وہ شاعروں کو دیکھ کر مسرور ہوتا تھا۔ فرخی کہتا ہی ؎

تو از دیدار مادح ہم چناں شادان شوی شاہا — کہ ہر گہ نیم از ان وامق بگشت از دیدن عذرا

طواف شاعراں بینم بگرد قصر تو دائم — ہمانا قصر تو کعبہ است و گرد قصر تو بطحا

عنصری کو انعام میں ایک ہزار دینار عطا ہوے اسی اثنا میں باتوں میں غزال پر کوئی لطیفہ ہو گیا سلطان نے شاعر سے اس لطیفے پر غزل کی فرمایش کی عنصری نے فی البدیہہ تعمیل ارشاد کی محمود نے اصلی انعام میں ایک ہزار کا اور اضافہ کر دیا۔ عنصری ؎

ہزار بود ہزار دگر ملک بفزود — بیک غزل کہ زمن خواست بر لطیفہ غزال

فرشتہ کہتا ہی کہ عنصری کو اس قصیدے کے صلے میں جس کا مطلع ہی ؎

اگر مراد بجاہ اندر است جاہ و مال | مرا ببین کہ ببینی جمال را بکمال

چودہ ہزار درم صلے میں عطا ہوئے تھے۔

سلطان نے ایک مرتبہ کسی نووارد شاعر کو تین ہزار موتی انعام میں دیے چنانچہ عنصری اس واقعے کا ذکر یوں کرتا ہے ؎

بیک عطا سہ ہزار از گہر بشاعر داد | کز آں خزینہ گہے زرد چہرہ گہ لاغر
نہ شاعر یکہ قدیمش زرنج خدمت بود | نہ نیز ہیچ بدرگاہ او گزشتہ گزر
ازیں سبب در عالیش مجمع شعر است | اگر بود بسفر شاہ یا بود بحضر

(دیوان عنصری صفحہ ۷۶ بمبئی ۱۳۲۱ھ)

محمود شاعر دوست اور شعر پرست ہونے کے علاوہ خود بھی ایک اعلیٰ پائے کا شاعر تھا۔ بزم آرا میں عنصری کی بیاض سے جو خود عنصری کے قلم کی لکھی ہوئی تھی، محمود کی یہ غزل مرقوم ہے ؎

من گرد دل خویش ہوائے تو تنیدم | با مہر تو پیوستم و از خویش بریدم
دیگر ز بتان چوں تو ندیدم زپی آنکہ | بت نیست بجائے کہ من آنجا برسیدم
با من بچخیدٔ آں کہ چو او کس نہ گرفتم | نگرفت سر زلف تو ہر چند چخیدم
چوں زلف شدم دست چو بت خانہ شدم روے | چوں زلف تو کاویدم و چوں روے تو دیدم
گفتم کہ یکے بندہ خریدم بدرم من | نے نے غلط است اینکہ خداوند خریدم

محمد عوفی نے شاہی شعرا میں دوسرے نمبر پر اس کا ذکر کیا ہے۔ گلستان نامی ایک کنیز تھی سلطان کو اس کنیز سے دلی محبت تھی جب اس کا انتقال ہوا محمود نے ذیل کا مرثیہ لکھا ؎

تا تو اے ماہ زیر خاک شدی | خاک را بر سپہر فضل آمد
دل جزع کرد گفتم اے دل صبر | ایں قضا از خدائے عدل آمد

آدم از خاک بود خاکی شد　　　　ہر کہ زو زاد باز اصل آمد

سلطان محمود نے اپنی وفات سے قریب زمانے میں یہ نہایت مشہور قطعہ لکھا تھا جو متاخر تذکرہ نویسوں نے اوروں کی طرف منسوب کر دیا ہے[۱]

زبیم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے　　　　جہاں مسخر من شد چو تن مسخر سرائے

گہے بعز و بدولت ہمی نشستم شاد　　　　گہے زحرص ہمی رفتمی زجائے بجائے

بسے تفاخر کردم کہ من کسے ہستم　　　　کنوں برابر بینم ہمی امیر و گدائے

اگر دو کلۂ بوسیدہ بر کشتے زدو گور　　　　سر امیر کہ داند زکلۂ گدائے

ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست　　　　بسے مصاف شکستم بیک فشردن پائے

چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نکرد　　　　بقا بقائے خدا یست و ملک ملک خدائے

سلطان محمود کی ادبی اور علمی سرپرستی کے ذکر میں شبلی فرماتے ہیں:۔

"اس نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا کہ عجم گو خود مٹ گیا لیکن اُس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے"۔ (شعر العجم صفحہ ۵۹)

یہ عقیدہ کہ محمود نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوایا جتنا عام ہے اتنا ہی غلط ہے اور نہ مولانا اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ فردوسی کے حالات میں خود معترف ہیں چنانچہ ایک چھوڑ دو مقام پر فرماتے ہیں:۔

"کیا عجیب بات ہے جو واقعہ جس قدر زیادہ مشہور ہوتا ہے اسی قدر اکثر غلط اور بے سروپا ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کے دربار میں پہنچکر اُس کے حکم سے شاہنامہ لکھنا شروع کیا۔ اکثر تذکروں میں بھی لکھا ہے۔ لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے"۔ شعر العجم صفحہ ۱۱۲

ایک اور موقعے پر فرمایا ہے:۔

---

[۱] سر تراش دلاک و حجام و بندہ مقابل آزاد۔

"عام خیال یہ ہو کہ شاہنامہ سلطان محمود کی فرمایش سے لکھا گیا لیکن یہ بھی
محض غلط ہو فردوسی نے خود سبب تصنیف لکھا ہو" شعر العجم صفحہ ۳"

اس قسم کے تخالف اور تضاد شعر العجم کے بدنما خط و خال ہیں۔
محمودی دَور کے شعرا کے ذکر میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اسدی طوسی نے لغات فارسی کی تدوین کی اور بدائع و صنائع فارسی
پر ایک کتاب لکھی" شعر العجم صفحہ ۵۹

اسدی طوسی نے البتہ فارسی لغات میں ایک رسالہ لکھا ہو لیکن سلطان محمود غزنوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ نہ وہ محمود کا معاصر ہو اور نہ اس کا شاعر۔ اسدی اگرچہ طوسی ہو لیکن اس کا اکثر حصّۂ عمر زیادہ تر شمال و مغرب ایران میں گزرا ہو۔ ۴۵۸ھ میں امیر ابودلف والی اتران کے لیے اسدی نے اپنا گرشاسپ نامہ تصنیف کیا چونکہ مشرقی ایران کے مقابلے میں ان اطراف میں فارسی زبان کم سمجھی جاتی تھی اس لیے بلخی، ماوراُلنہری اور خراسانی لغات جمع کرکے لغت فرس تیار کی۔ پال ہورن کا خیال ہو کہ اسدی نے یہ کتاب اپنے آخر حصّۂ عمر میں تالیف کی اگرچہ اس کی صحیح تاریخ تعین نہیں کی جا سکتی۔ محمود ۴۲۱ھ میں وفات پاتا ہو۔ گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ میں تصنیف ہوتا ہو۔ لغت فرس اس کے بھی بعد لکھی جاتی ہو اس لیے سلطان کی طرف اس کا منسوب کیا جانا میرے نزدیک ایک حیرت خیز امر ہو۔ اسدی کی طرف صنائع و بدائع کی کتاب تصنیف کیے جانے کا قصّہ میری نظر سے نہیں گزرا اور کوئی تعجب نہیں اگر اس کی ہستی بھی ایسی ہی غابت ہو جیسے ہاتف شاعر کا وجود۔

بعض موقعوں پر دیکھا جاتا ہو کہ علّامہ شبلی کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں بعد میں ایک واقعہ ایسا بیان کر دیتے ہیں جس سے پہلے واقعے کی تردید ہو جاتی ہو

اور ناظر اسی کشمکش دبیخ میں رہ جاتا ہے کہ ان متضاد بیانات میں سے کس بیان پر اعتماد کرے اس قسم کی دو ایک مثالیں اوپر گزر چکی ہیں ایک تازہ مثال یہاں گزارش ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"محمودی شعرا اگرچہ بے شمار ہیں لیکن جن نامعدوں کو محمود نے ندما میں داخل کر لیا تھا اور جو آسمان سخن کے سبعہ سیارہ تھے یہ ہیں عنصری، فردوسی، اسدی عسجدی، غضاری[۱]، فرخی، منوچہری" شعر العجم صفحہ ۶۰

دوسرے موقعے پر ارشاد کیا ہے:-

"محمود کے دربار میں چار سو شعرا تھے جن میں فرخی، عسجدی، غضاری منوچہری جیسے قادر الکلام بھی شامل ہیں" شعر العجم صفحہ ۶۱

یہاں دیکھا جاتا ہے کہ دو مقام پر منوچہری محمود کے شعرا اور ندما میں داخل ہے لیکن منوچہری کے حالات میں فرماتے ہیں :-

"لیکن منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود کے مرنے کے بعد غزنین میں آیا لہٰذا اس لیے فردوسی کا ہم بزم نہیں ہو سکتا" (شعر العجم صفحہ ۱۸۷)

ایک محقق کا اولین فرض یہ ہے کہ جو واقعہ بیان کرے اس کی پوری پوری تحقیق اور تفتیش کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرلے اور ہمیشہ کے لیے اسی پر قائم ہو جائے اور اگر آیندہ بھی اس کے اظہار کی ضرورت ہو تو وہی بیان کرے یہ نہیں ہونا چاہیے

---

[۱] اس شاعر کا نام شبلی عام طور پر غضاری لکھتے ہیں لیکن محمد عوفی صاف اس کو غضایری لکھتا ہے اس سے بھی قدیم سند کی ضرورت ہو تو عنصری کا یہ شعر موجود ہے۔

ایا غضایری اے شاعر یکہ در دلِ تو   بجز تو ہر کہ بود جملہ ناقصند دکال

(دیوان عنصری صفحہ ۷۶ بسنہ ۱۳۲۰ھ طبع آقا محمد اردکانی) ایک موقعے پر مسعود سعد سلمان نے ع
چون لطف شاہ ماضی کا پہ شاعر غضاری۔ بضرورت شعری لکھا ہے جو مستثنیات میں شمار ہونا چاہیے۔

کہ جو رطب و یابس ملا قبول کر لیا۔ نہ اس امر کا خیال رکھا کہ یہ بیان پہلے بیان کے خلاف جاتا ہی یا آیندہ بیان کے مخالف ہوتا ہی بیش دیکھتا ہوں کہ مولانا کی تحقیق کا یہ پہلو نہایت کمزور ہی۔

جو پہلی روایت ان کے سامنے آتی ہی اسی کو نہایت فیاض دلی کے ساتھ تسلیم کر لینے کو مستعد ہیں مثلاً عنصری کے ذکر میں فرماتے ہیں :۔

"ایک دفعہ سلطان نے فصد لی رودکی نے برجستہ کہا ؎

آمد آن رگ زنِ مسیح پرست ... نیش الماس گون گرفتہ بدست

طشت زرین و آبدستاں خواست ... بازوئے شہریار را بربست

نیش بگرفت وگفت عز علیک ... ایں چنیں دست راکہ یارد خست

سرفرو برد و بوسہ برداد ... وز سمن شاخ ارغواں برجست"

(شعر العجم صفحہ ۶۳)

یہ اشعار اصل میں حکیم شہاب الدین شاہ علی ابی رجا الغزنوی کے ہیں۔ شبلی نے انھیں عنصری کے نام پر لکھا لیکن حضرت کاتب نے عنصری کے بجائے رودکی کا نام پسند کیا چنانچہ اس غلطی بالائے غلطی نے ایک ایسی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی ہی جس کا جواب یہ شعر ہو سکتا ہی ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا ... الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

ابو رجا سلطان بہرام ۵۱۲ھ تا ۵۴۷ھ کے عہد کا شاعر ہی اور اس قطعے میں اس نے بہرام شاہ کے فصد لینے کا ایک واقعہ نظم کیا ہی جو یہ ہی کہ بادشاہ کو ایک مرتبہ فصد کھلوانے کی ضرورت پیش آئی اتفاق سے عیسائی فصّاد جو آیا حسین اور سادہ رو تھا۔ اس نے فصد کھولی اور خون بہنا شروع ہوا۔ بادشاہ نے مذاق میں کہیں اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ ڈال دیا اُس نے بُرا مانا اور غصّے کے لہجے میں

کہا ادھر اُدھر ہاتھ کیوں مارتے ہو خاموش بیٹھو۔ بہرام شاہ نے معذرت میں کہا تم جانتے ہو فصد کے وقت ہاتھ میں لٹو رکھنے کا رواج ہی۔ تمھاری زنخداں ہو بالکل گوئی سیمیں کے مشابہ ہی میں نے لٹو سمجھ کر ہاتھ میں لی تھی۔ مولانا نے اس قطعے کو ادھورا لکھ کر سارا لطف غارت کر دیا۔ ابو رجا کا قطعہ یہ ہی :۔

آمد آن کودک مسیح پرست نیش الماس گوں گرفتہ بدست
طشت تدویج آبدستاں خواست بازوے شہریار عالم بست
نیش بگرفت وگفت عزّ علیہ ایں چنیں دست راکہ یارد خست
سر فرو برد و بوسہ داد برد وز سر نوک نیش خوں برجست
ایں عجب بیں کہ دیدہ بود بچشم کز سمن شاخ ارغواں برجست
بود فصاد ہمچو ماہ تمام ذقن سادہ اش گرفت بدست
گفت فصاد ایں روا نبود دست ہر سو زدن چو مردم مست
شاہ گفتا غلط نہ کردستم در غلط کردہ ام جو ابم ہست
شرط باشد بوقت کردن فصد گوئی سیمیں گرفتن اندر دست

جب ایک واقعہ دو مختلف شخصوں کی طرف منسوب ہوتا ہی مولانا بغیر کسی تلاش اور تفحص کے وہ قصہ دونوں کے لیے تسلیم کر لیتے ہیں ایسا کرنے میں اگرچہ مولانا نے اپنے اعتقاد کی وسیع المشربی کا ثبوت دے دیا لیکن تنقید کے اہم فرائض قضا کر دیئے۔ اس قسم کی ایک مثال ذیل میں پیش کی جاتی ہی۔ فرماتے ہیں :۔

"ایک دفعہ محمود چوگان کھیلنے میں گھوڑے پر سے گر پڑا اور خفیف سا زخم آیا عنصری نے فی البدیہ کہا ؎

شاہا ادبے کن فلک بد خو را کآسیب رسانید رُخ نیکو را

گر گوئی خطا رفت بہ چوگانش زن — در اسپ غلط کرد بمن بخش اورا

اخیر مصرع دو پہلو رکھتا ہے - ایک یہ کہ گھوڑے نے اگر غلطی کی تو میری خاطر اس کو بخش دیجیے دوسرے یہ کہ گھوڑا اگر غلط رو ہے تو مجھے دے ڈالیے - محمود نے اس حسنِ طلب کے صلے میں گھوڑا عنصری کو دے دیا عنصری نے ایک اور رباعی گھوڑے کی طرف سے معذرت میں لکھی ؎

رفتم بر اسپ تا زنازش بکشم — گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر خوشم

نے گاو زمینم کہ جہاں برگیرم — نے چرخ چہارم کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینے کا قصد کیا گھوڑے نے کہا کہ پہلے میرا عذر تو سُن لیجیے کچھ میں گاوِ زمیں تو نہیں ہوں کہ عالم کا بار اٹھاؤں نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لیے پھروں "۔ شعر العجم صفحہ ۶۴

مولانا کی خوش اعتقادی قابل رشک ہو جاتی ہے جب یہ قصہ سلطان سنجر اور امیر معزی کی طرف بھی ذیل کے الفاظ میں منسوب ہوتا ہے - فرماتے ہیں :-

"ایک دفعہ سلطان سنجر گیند کھیل رہا تھا اتفاق سے گھوڑے نے شوخی کی اور سنجر گھوڑے سے گر گیا معزی نے برجستہ رباعی پڑھی ؎

شاہا ادبے کن فلکِ بدخو را — کو چشم رسانید رخِ نیکو را

گر گوئی خطا کرد بہ چوگانش زن — در اسپ خطا کرد بہ من بخش اورا

یعنی اے بادشاہ! آسمان کو ذرا تنبیہ کر دیجیے اس نے آپ کو نظر لگا دی - اگر گیند کی خطا ہے تو چوگان سے اس کو ماریے اور گھوڑے کا قصور ہے تو میرے حوالے فرمائیے - اخیر کا مصرع دو پہلو رکھتا ہے - سنجر نے گھوڑا معزی کو عنایت کیا معزی نے دوبارہ رُباعی پیش کی ؎

رفتم بر اسپ تا بہ جرمش بکشم　　　گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر خوشم
نے گاوِ زمینم کہ جہاں برگیرم　　　نے چرخ چہارمیں کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینی چاہی اس نے کہا کہ پہلے میرا عذر تو سُن لیجئے میں کچھ گاو زمین تو ہنیں کہ عالم کا بار اٹھاوں نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لیے پھروں مطلب یہ ہی کہ سلطان سنجر کا بار اُٹھانا گاو زمین اور آفتاب (آسمانؔ[1]) کا کام ہی۔" شعر العجم صفحہ ۲۱۱

ع　خطاے بزرگان گرفتن خطا است

ہمارے پُرانے معتقدات سے ہی لیکن افسوس کہ انھیں غلط اصولوں کی پیروی کا نتیجہ ہی کہ آج ہماری تاریخیں رطب ویابس غث وسمین اور دروغ و راست کا مجموعہ بن رہی ہیں، ہماری جرح وتعدیل کے پُرانے ہتھیار پڑے پڑے زنگ آلود ہو گئے لیکن اس خوش اعتقادی کا روسیاہ جس نے ہمیں ان کے استعمال سے روک رکھا ہی۔ اس قسم کے موضوعات سے شبلی نے اگرچہ عنصری کی رونق محفل خوب کردی لیکن قصۂ بالا کا اصلی موضوع میرے خیال میں امیر معزی ہی۔

فرّخی

شعر العجم میں فرخی کے باب کا نام "قلوع" (ص۴۳) دیا گیا ہی حالانکہ چہار مقالہ اور لباب میں صاف جولوغ مرقوم ہی۔ اس شاعر کے حالات شبلی نے جیسا کہ صفحہ ۷۷ کے ایک حاشیے میں کہا ہی چہار مقالہ نظامی عروضی سے لیے ہیں۔ فرماتے ہیں "گویا میں نے اسی کا لفظی ترجمہ کیا ہی" اگرچہ وہ لفظی ہنیں کہا جاسکتا

[1] خط ہلالی میں لفظ آسمان میرا اضافہ ہی آفتاب غلط معلوم ہوتا ہی۔

کیونکہ بعض مقامات پر تصرفات بھی کیے ہیں - فرماتے ہیں :-

"ابوالمظفر چغانی اُس زمانے میں سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا
گورنر تھا اور نہایت فیاض طبع اور قدردانِ سخن تھا" شعرالعجم ص۹۹

چہار مقالہ میں ابوالمظفر چغانی کا البتہ ذکر ہو لیکن یہ خیال کہ ان ایام میں وہ سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا کہیں ظاہر نہیں کیا نہ چہار مقالہ میں ایسے الفاظ ہیں جن کا مفہوم یہ عبارت ہو سکے - ابوالمظفر چغانی کا سلطان کی طرف سے گورنر بلخ مقرر کیا جانا ایک غلط بیان ہو - دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں بیان کیا ہو :-

"فرخی مادح امیر کبیر ابوالمظفر بن امیر ناصرالدین ست کہ در روزگار
سلطان محمود سبکتگین والی بلخ بود"

(تذکرۂ دولت شاہ مطبوعۂ یورپ صفحہ ۵۵)

ایسا معلوم ہوتا ہو کہ علامہ شبلی نے ابوالمظفر چغانی والیِ چغانیان اور ابوالمظفر نصر برادر سلطان محمود کو ایک ہی شخص قرار دیا ہو - چغانیہ ماوراءالنہر میں ایک ولایت کا نام ہو اور فرخی کے ممدوح کا نام ابوالمظفر بن احمد محمد والیِ چغانیاں ہو جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہو ؎

تا نقش کرد بر سرِ ہر نقش بر نوشت مدح ابوالمظفر شاہِ جہانیاں
بن احمدِ محمدِ شاہِ جہاں پناہ آں شہریار کشور گیر و جہاں ستاں

تاریخ یمینی میں اس کو ابوالمظفر محمد بن احمد لکھا گیا ہو فرخی غالباً بضرورتِ شعر اس کا نام ولدیت کے بعد لایا ہو - چغانی خاندان چغانیہ میں امیر نصر متوفی ۳۳۱ھ کے عہد سے حکمران رہا ہو، سامانیوں کے دور میں سامانیوں کا برائے نام مطیع تھا غزنویوں کے عہد میں یہ خاندان برقرار اور برسرِ حکومت رہا، آلِ غزنہ سے ان کے

اچھے مراسم تھے، چنانچہ ابو القاسم والی چغانیاں سلطان مسعود غزنوی کا داماد تھا جیسا کہ بیہقی (ص ۶۱۲) سے معلوم ہوتا ہی۔ فرخی اپنے ممدوح ابو المظفر کا ذکر ایک آزاد اور مطلق العنان فرماں روا کی حیثیت سے کرتا ہی جس کو کبھی خسرو کبھی شہریار اور کبھی بادشاہ کے القاب سے یاد کرتا ہی اور ظاہر ہی کہ بلخ کے گورنر کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال ہرگز ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ **قولہ**

"فرخی کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا اور اب اس نے اس فن میں کافی ترقی کر لی تھی، شاعری کی قدر دانی کے قصے ہر جگہ مشہور تھے اس لیے اس کو خیال ہُوا کہ اس ذریعے سے یہ مشکل حل ہو گی۔" (شعر العجم ص ۵۹)

یہ عبارت نظامی عروضی کے چہار مقالے میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ **قولہ**

"فرخی ہر طرف پیچھے پیچھے دَوڑتا پھرتا تھا تھک کر چُور ہو گیا اور وہیں زمین پر پڑ کر سو رہا۔ صبح دن چڑھے اُٹھا۔" (شعر العجم صفحہ ۷۶)

فقراتِ بالا کے درمیان نظامی کے ہاں یہ عبارت ہی۔ "آخر الامر رباطی ویران بر کنارِ لشکر گاہ پدید آمد کرگان در آن رباط شدند، فرخی بغایت ماندہ شدہ بود در دہلیز رباط دستار زیر سر نہاد و حالی در خواب شد از غایت مستی و ماندگی۔ کرگان را شمردند چہل و دو سر بودند، رفتند و احوال با امیر بگفتند، امیر بسیار بخندید و شگفتیہا نمود و گفت مردے مقبل ست کار او بالا گیرد، او را و کرگان را نگاہ دارید و چوں او بیدار شود مرا بیدار کنید مثالِ پادشاہ را امتثال کردند۔ دیگر روز بطلوع آفتاب فرخی برخاست۔" (چہار مقالہ صفحہ ۴۰)

باوجود ایسی قطع و برید کے جس کی کچھ مثالیں اوپر گزری ہیں مولانا مدعی ہیں کہ میں نے چہار مقالہ کا لفظی ترجمہ کیا ہی۔ **قولہ**

"ایاز جو سلطان محمود کا محبوبِ خاص تھا، فرخی کا نہایت قدر دان تھا

اور اس سے نہایت خلوص رکھتا تھا۔ ربط زیادہ بڑھا تو محمود کو رشک ہؤا یہاں تک کہ فرخی کا دربار میں آنا بند کر دیا۔ فرخی نے متعدد قصیدے معذرت میں لکھے، بالآخر سلطان صاف ہوگیا اور فرخی بدستور دربار میں جانے لگا۔" (شعر العجم صفحہ ۷۸)

یہاں شبلی نے مجمع الفصحا کی روایت کو فروغ دے کر فرخی کو سلطان کا رقیب بنایا ہی۔ اگر مولانا قصائد فرخی کو زرا زحمت گوارا فرما کر غور سے مطالعہ فرماتے تو اُن کو علم ہوجاتا کہ یہ روایت بالکل ضعیف ہی۔ صرف ایک قصیدہ ہی جس میں شبہ کے لیے گنجایش نکل سکتی ہی باقی تہمت ہی اور قیاس آرائی۔ نہ لباب الالباب اور چہار مقالہ میں فرخی اور ایاز کی محبت کا قصہ آتا ہی۔

قولہ: "اس زمانے کے تمدن اور معاشرت پر تعجب ہوتا ہی کہ شعرا محمود کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے اُس میں علانیہ ایاز کے حسن و معشوقی کا ذکر کرتے تھے اور محمود اس سے خوش ہوتا تھا۔ فرخی ایک قصیدے میں لکھتا ہی ؎

امیرِ جنگجو ایاز اویماق — دل و بازوی خسرو روز پیکار
زنانِ پارسا از شوق گروند — بہ کابین کردنی اورا خریدار
نہ بر خیرہ بدو دل داد محمود — دل محمود را بازی مپندار
جُز او در پیشِ سُلطاں نیز کس بود — جز او سلطان غلامان داشت بسیار
اگر چوں میر یک تن بود آن جا — نہ چندیں بدمر اورا گرم بازار

(شعر العجم صفحہ ۷۸)

یہ نکتہ شبلیانہ ندرت آفرینی کی مثال ہی اس معاملۂ خاص میں مولانا مجمع الفصحا وغیرہ کے رہینِ منت نہیں ہیں بلکہ اپنے ذاتی اجتہاد کے۔ علانیہ ایاز کی حسن و

معشوق کا ذکر تو کیا محمود ایسا جابر بادشاہ تھا کہ اپنے غلاموں کی طرف کسی کی پوری نگاہ بھر کر دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ ابوالفضل بیہقی نے اس قسم کا ایک واقعہ اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

ایک روز سلطان کے ہاں باغ فیروزی میں مجلسِ شراب تھی، امیر یوسف برادر محمود بھی موجود تھا۔ شراب کا دَور چل رہا تھا اور غلام دو دو مل کر نوبت بہ نوبت ساقی گری کر رہے تھے۔ ان میں طغرل کی باری بھی آئی۔ طغرل اس روز قبائے سُرخ پہنے تھا۔ امیر یوسف پر شراب کا پورا اثر ہو چکا تھا۔ یوسف کی جب طغرل پر نظر پڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے محویت کے عالم میں دیکھتا رہا۔ سلطان کو بھائی کی یہ حرکت ناگوار گزری اور کہنے لگا کہ باواجان نے مرتے وقت عبداللہ دبیر کی معرفت پیغام بھیجا تھا۔ میں بیہقی کے الفاظ نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں :-

"محمود را از پیغامِ من بگوے کہ مرا دل بہ یوسف مشغول ست و برائے تو سپردم باید کہ وے مانجوی خویش برآری وچوں فرزندانِ خویش عزیز داری وماتا ایں غایت دانی کہ براستائے تو چند نیکوئی فرمودہ ایم وپنداشتیم کہ باادب برآمدہ ونیستی چناں کہ ماپنداشتیم۔ درمجلس شراب در غلامانِ ماچرانگاہ می کنی وترا خوشش آید کہ ہیچ کس در مجلس شراب در غلامانِ تو نگرد وچشمت از دیرباز برین طغرل بماندہ است واگر حرمتِ روانِ پدرم نبودی ترا مالشے سخت تمام رسیدے، ایں یک بار عفو کردم و ایں غلام را بہ تو بخشیدم کہ مارا چنو بسیارست، ہوشیار باش تا باز دیگر چنو ہو نیفتد کہ با محمود چنیں بازیہا نہ رود۔ یوسف متحیر گشت و برپائے خاست و زمین بوسہ داد وگفت توبہ کردم ونیز چنیں خطا نیفتد ہرگفت بنشیں بنشست وآں حدیث فرا برید۔" (بیہقی صفحہ ۳۰۶)

اس سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ شعرا کے لیے محمود کے مدحیہ قصائد میں ایاز کے حسن و معشوقی کا ذکر قریب قریب دشوار تھا۔ فرخی کے جو اشعار انھوں نے اپنے استدلال میں لکھے ہیں اُن سے میں اندازہ کرتا ہوں کہ دیوانِ فرخی اُن کی نظر سے نہیں گزرا، کیونکہ یہ قصیدہ محمود کی مدح میں نہیں ہو بلکہ خود ایاز کی تعریف میں اور اس وقت لکھا گیا جب محمود دُنیا سے انتقال کر چکا ہو اور سلطان مسعود اپنی تخت نشینی کے بعد ایاز کو اس کے حُسنِ خدمات کے صلے میں جن کی تفصیل بھی اسی قصیدے درج ہو ایک گراں بہا انعام دیتا ہو۔ قصیدے کا مطلع ہو ؎

غمِ نادیدنِ آن ماہ دیدار — مرا در خوابگہ ریزد ہمی خوار

اور گریز کے وقت شاعر گویا ہو ؎

ز دل برداشت خواہم بار اندہ — چو نزدِ میر سید یافتم بار

امیر جنگجو ایاز اویماق — دل و بازوی خسرو روز پیکار

اس کے بعد شاعر سلطان مسعود بن محمود کی فیاضی ایاز کی خدمت کے صلے میں یوں بیان کرتا ہو ؎

خداوند جہاں مسعود محمود — کہ او را از ہمی بخشند بخروار

جزا او را از ہمہ میراں کرا داد — بیک بخشش چہل خروار دینار

نہ داد اندیش چندیں بیہدہ زر — بہ چندین و بصد چندیں سزاوار

بجائے قدر میر و حشمت شاہ — تو ایں را خوار دار و اندک انگار

بجائے بر دو خواہد خسرو او را — کہ سالاراں بد و گردند سالار

بدو بخشد چو مالِ خطۂ بست — خراجِ خطۂ مکران و قصدار

کجا گردد فراموش آنچہ او کرد — ز بہرِ خدمتِ شاہِ جہاں دار

میانِ لشکر عاصی نگہہ داشت — وفا و عہد آن خورشید احرار

بروز روشن از غزنیں بروں رفت | ہمی زد با جہانے تا شب تار
نماز شام را چنداں کہ خواندند | کہ دشت از کشتہا شد پشتہ ہموار
گروہے را ازان شیران جنگی | بکشت و مابقی را داد زنہار
جزا و ہر گز نہ کہ کرد ست ایں کیتی | بخوان شہنامۂ و تاریخ احرار
خدایا ناصر او باش و از قدر | سر رایاتش از خورشید بگزار

فرخی کے حالات میں یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہی کہ سلطان محمود کے دربار میں اس کا تعلق کس زمانے سے ہُوا ہی؟ اس غرض کے لیے سب سے صحیح اطلاع اس کے دیوان سے مل سکتی ہی۔ میں ناظرین کی معیت میں دیوان کا مطالعہ ذیل میں شروع کرتا ہوں۔ ضمناً بعض واقعاتِ تاریخ معاصر پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

فرخی کے ہاں اسماے ذیل کی مدح میں قصائد ملتے ہیں :۔

(۱) سلطان محمود غزنوی (۲) عضد الدولہ ابو یعقوب یوسف بن ناصر الدین سبکتگین برادر سلطان محمود۔ (۳) ابو احمد محمد بن سلطان محمود (۴) سلطان مسعود شہید بن سلطان محمود (۵) خواجۂ بزرگ شمس الکفاۃ احمد بن حسن میمندی (۶) خواجہ سید اسعد (۷) خواجہ ابو الفتح علی بن الفضل (۸) خواجہ سید ابو بکر حصیری (۹) خواجہ منصور بن حسن (۱۰) ابو الفتح عبد الرزاق بن احمد (۱۱) عمید منصور ابو الحسن (۱۲) ایاز اویماق (۱۳) ابو بکر عبد اللہ بن یوسف (۱۴) خواجہ ابو سہل دبیر (۱۵) خواجہ عمید سید ابو احمد غنمی (۱۶) خواجہ سید بو سہل عراقی وکیل (۱۷) خواجہ بوسہل رئیس الرؤسا احمد بن حسن (۱۸) خواجہ سید ابو سہل عمر کدخدائے عضد الدولہ (۱۹) فخر الدولہ ابو المظفر محمد بن احمد چغانی۔

اس فہرست میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہی کہ امیر نصر بن ناصر الدین سپہ سالار خراسان اور خواجہ ابو العباس فضل بن احمد اسفرائنی (۳۸۸ھ و

سنہ ۴۰۱ھ) وزیر اوّل سلطان محمود، المتوفی سنہ ۴۲۴ھ کا نام داخل نہیں ان جلیل القدر اشخاص کے نام کی فرخی کے ممدوحین میں عدمِ شمولیت ایک قابلِ تعجب امر ہی۔ فہرست میں اکثر ایسے نام نظر آتے ہیں جو پانچویں قرن کے آغاز کے بعد محمود کے ہاں رسوخ اور شہرت حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً امیر یوسف، امیر محمدؒ اور مسعود چوتھی صدی کے اختتام پر کسی شمار و قطار میں نہ تھے سنہ ۴۰۱ھ میں امیر یوسف سترہ سال کا تھا اور امیر محمدؒ اور مسعود چودہ چودہ سال کے۔ سنہ ۴۰۸ھ میں امیر محمدؒ والی گوزگانان اور امیر مسعود والی ہرات (بقول فرشتہ) بنائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہی کہ شعرا اس سن کے بعد ان کی مدح سرائی کرنے لگے ہیں۔

قصائد فرخی کے تتبع سے معلوم ہوتا ہی کہ اس شاعر کا تعلق زیادہ تر امیر یوسف ابن ناصر الدین، امیر ابو احمدؒ محمدؒ اور خود سلطان محمود سے رہا ہی۔ لیکن اول الذکر امیر یوسف سے اس کو خاص تعلق تھا بلکہ غزنین کی آمد پر سلطانی دربار میں رسائی حاصل کرنے سے قبل امیر یوسف کے دربار سے واسطہ پیدا کر لیتا ہی۔ اس وقت تک وہ بالکل گم نام اور اجنبی تھا۔ چنانچہ فرخی ؎

بطبع آب رواں گرم گاہ سوے سراب	چو تشنہ گشتہ و گم بودہ مردمی بودم
بوستانی خوشتر ز روزگار شتاب	مرا تفضلِ تو آب داد و راہ نمود

امیر یوسف کی فیاضیوں نے اِسے جلد خوش حال کر دیا۔ فرخی ؎

شکرِ تو بر من فراواں واجب ست اے شہریار
از فراوانی نہ دانم گفت شکرت کیں کدام
چیست نیکوتر ز جاہ از تو رسیدستم بجاہ
چیست شیریں تر ز کام از تو رسیدستم بکام

ابھی مدح سرائی کا تعلق قائم بھی نہیں ہوا تھا کہ امیر نے غالباً اُس کا ذکر سُن کر

خلعت بھیجا - فرخی ؎

شاعران را ملکان خواستہ اگاہ دہند | کہ بدیشاں ہمی آرند مدیحی چو گہر
او مرا خلعت و دینار بوقتے فرمود | کہ مرا مدحت او گشتہ نبود اندر سر

اس سے ظاہر ہو کہ امیر یوسف نے خواہش کر کے فرخی کو اپنے ہاں بلوایا۔

امیر نے ایک مرتبہ گینڈا کمند سے پکڑا اس کے لیے فرخی کہتا ہی ؎

جز تو کے بست کرگ را بکمند | اے ترا امیر کرگ گیر لقب

امیر یوسف اپنے اسراف کی وجہ سے تنگ دست رہتا تھا اس کے متعلق شاعر کہتا ہی ؎

مرا غم آید اگرچہ مرا دلے ست فراخ | زمان دادن و بخشیدن بداں کردار
چنان ملک را باید کہ باشدے ہر روز | خزانہ پُر درم و پُر سلیح و پُر دینار
چو خرج خویش فزون تر ہمی ز دخل کند | ز زرّ و سیم خزانہ تہی بود ناچار

ایک قصیدے میں امیر کے حاجب طغرل کی کتخدائی کا ذکر آتا ہی جو امیر یوسف نے نہایت دھوم دھام سے کی تھی ؎

از پئے حاجب طغرل کہ ز شاہان جہاں | حاجبے نیست چنو ہیچ کسے را دیگر
بہ پسند دل خویش او را درخواست زنے | ز تبارے کہ ستودہ است باصل و بگہر
ہرچہ شایست بکرد واں چہ بایست بداد | کار او کرد تمام و شغل او بُرد بسر
آن چہ او کرد بتزویج یکے بندۂ خویش | نکند ہیچ شہے از پئے تزویج پسر
آں نہالے کہ درین خدمت حاجب بنشاند | سر بعیوق بر آورد و بخندید ز بر
خدمت میر بدل کرد ہمی تا از دل | خدمت او کند امروز ہر آن کو بر تر
خدمتش بود پسندیدہ بہ نزدیک امیر | لاجرم میر کلہ داد مر او را و کمر

طغرل ظرافت اور لیاقت میں بے مثل تھا، ترکستان سے ارسلان خاتون

نے سلطان محمود کے پاس ہدیے میں بھیجا تھا، جیسا کہ گزشتہ سطور میں دیکھا گیا ہی۔ سلطان نے امیر یوسف کو دے دیا۔ یوسف نے اپنے فرزندوں کی طرح اِس کی پرورش کی۔ جب جوان ہوگیا ایک نامی گھرانے میں اس کی شادی کردی۔ اس عروسی کے متعلق بیہقی کہتا ہی۔

بڑے غیر ضروری تکلّف اور تیاریاں کی گئی تھیں جن کو سمجھ دار لوگوں نے ناپسند کیا۔

فرخی کا دوسرا ممدوح امیر محمدؒ ہی۔ امیر محمدؒ معلوم ہوتا ہی اپنے خاندان میں سب سے زیادہ علم دوست اور قدر دانِ علم تھا۔ متعدد کتابیں اسے ازبر تھیں۔ فرخی کئی موقعوں پر اس قسم کی تلمیحیں کرتا ہی۔ چنانچہ ؎

قطب معالی ملک محمد محمود ناصر علم و معین ملت و مختار

آن کہ ز دعویٰ فزون نماید معنی وان کہ ز گفتار بیش دارد کردار

جود و سخا را ازو فزون شدہ قدرت علم و ادب را بدو فروختہ بازار

اہل ادب را بزرگ دارد و شگفت این ز بزرگیش بس بزرگ مپندار

قدر گہر جز گہر شناس نداند اہل ادب را ادیب داند مقدار

چشم بداں دور باد زان شہ کان شہ سخت ادب پرورست و علم خریدار

دیگر

پدر از ملکِ زمین بیشتریں یافتہ بہر پسر از کتب جہاں بیشتریں کردہ زبر

دیگر

چون بسا بر سر زبان دارد فقہ و تفسیر و مسند و اخبار

تیسرا شخص جس سے ہمارے شاعر کو دل چسپی رہی ہی، خود سلطان محمود ہی۔ فرخی کے ہاں محمود کی زندگی کے واقعات کے متعلق جو بیانات ملتے ہیں ان میں

سب سے قدیم فتح قنوج و کالنجر ہی۔ دو قصیدوں میں حملۂ سومنات کا ذکر آتا ہی۔ دو قصیدوں میں مختصراً فتح رَی کا ذکر ہی جو محمود کے آخری دورانِ عمر کا کارنامہ ہی۔ مہم قنوج سے پیشتر کے کارناموں کا فرخی کے ہاں کوئی ذکر نہیں۔ اس لیے واضح ہوتا ہی کہ ہمارا شاعر سلطان کے دربار میں ۴۰۹ھ سے پیشتر جو مہم قنوج کا سال ہی آتا ہی یہی وجہ ہی کہ اس سن کے واقعات اس کے ہاں ملتے ہیں اور قبل کے واقعات نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہی کہ سلطان کے بھائی امیر نصر اور وزیر سابق فضل بن احمدؒ کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔ کیونکہ اس کے آنے کے وقت یہ دونوں جلیل المرتبہ اشخاص غزنین میں موجود نہ تھے۔ فضل بن احمد ۴۰۲ھ میں ہلاک ہوتا ہی، امیر نصر اگرچہ ۴۱۲ھ میں وفات پاتے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اکثر اوقات غزنین سے باہر سیستان و خراسان میں رہے ہیں۔ امیر نصر کے بعد امیر یوسف سپہ سالا خراسان بنایا جاتا ہی۔

فتح سومنات ۴۱۶ھ جس میں فرخی بھی شامل تھا سلطان محمود کے نمایاں کارناموں میں سے ہی۔ شاعر کے بیان سے معلوم ہوتا ہی کہ محمود کے دل میں دو آرزوئیں بے حد گدگدی لیتی رہی ہیں۔ پہلی زیارتِ خانۂ کعبہ، دوسری فتح سومنات

؎ خدایگان را اندر جہاں دو حاجت بوُد	ہمیشہ ایں دو ہمی خواست زایزدِ داور
یکے کہ جائے گہ حج ہندواں بکند	دگر کہ حج کند و بوسہ بر دہد بحجر
یکے ازان دو مُرادِ بزرگ حاصل کرد	دگر بعون خدلئے بزرگ کردہ شمر

ولہٗ

توفیق دہ اورا و ببر تا بکند حج	چوں کرد بہ شادی و بہ پیروزی باز آر

معلوم ہوتا ہی کہ سومنات نے سلطان کی توجہ کسی غیر تاریخی روایت کی بنا پر اپنی طرف اور بھی جذب کر لی تھی۔ وہ روایت یہ تھی کہ مکۂ معظمہ میں تین زبردست

بُت تھے عزیٰ لات اور منات۔ عزیٰ اور لات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں برباد کردیے گیے، لیکن منات کو کافر چُرا کر ہندستان لے آئے۔ سومنات اور منات کے ناموں میں اشتراک یا ہم کی پیچیدہ دشواریوں نے اس روایت کو سلطان کے دربار میں بہت کچھ فروغ دے دیا۔ اسی روایت کے زیر اثر صاحب طبقات ناصری سومنات کا نام منات ظاہر کرتا ہے اور فرخی :-

ملک ہمی بہ تبہ کردن منات شتافت شتاب او ہمہ از بہرِ دیں بود اکثر
منات ولات وعزاے در مکہ سہ بت بودند زدست بُرد بُت آرائے آں زماں آزر
ہمہ جہاں ہمی آں ہرسہ را پرستیدند جز آں کسے کہ برو بود از خدائے نظر
دوناں ہمیبرِ بشکست وہر دورا آنز دز فگندہ بود ستان پیش کعبہ پاے سپر
منات را زمیان کافران بدزدیدند بکشور دگر انداختند ازان کشور
بجایگاہے کز روزگار آدم باز بہ آں زمین نہ نشست و نہ رفت جز کافر
زبہرِ آں بُتِ بتخانہ بنا کردند بصد ہزار تماثیل و صد ہزار صور
بہ بتکدہ در بُت را خزانہ کردند درآں خزانہ بہ صندوق ہائے پیل گہر
گہر خریدند اورا ز شہرہا چنداں کہ سیر گشت زگوہر فروش گوہر خر
برابر سرِ بت کلۂ فرو ہشتند نگار کار بیاقوت و بافتہ بگہر
بزرِ پختہ یکے جرد ساختند اورا چو کوہ آتش و گوہر برو بجائے شرر
خراج مملکتے تاج و افسرش بودہ است کمینہ چیزے آں تاج بود و آں افسر
پس آنگہ آنزا کردند سومنات لقب لقب کہ دید کہ نام اندرو بود مضمر
خبر فگندند اندر جہاں کہ از دریا بتے برآمد زیں گونہ و بدیں پیکر
مدبرِ ہمہ خلق ست و کردگارِ جہاں ضیا دہندۂ شمس ست و نور بخش قمر
بعلم ایں بود اندر جہاں صلاح و فساد بحکم ایں بود اندر جہان قضا و قدر

گروہِ دیگر گفتند نے کہ این بُت را — بر آسمان برین بود جایگاہ و مقر
کسے نیاورد این را بدین مقام کہ این — ز آسمان بخودی خود آمدہ است ایدر
بدین بگوید روز و بدین بگوید شب — بدین بگوید بحر و بدین بگوید بر
چو این ز دریا سر بر زد و بخشک آمد — سجود کردند این را ہمہ نبات و شجر
بشیر خویش مر این را بشست گاؤ کنون — بدین تقرب خوانند گاؤ را مادر
ز بہر شُگی چندیں ہزار خلق خدائے — بقول دیو فرو ہشتہ بر خطر لنگر
فریضہ ہر روز آن سنگ را بشستندے — بہ آب گنگ و بشیر و بزعفران و شکر
ز بہرِ شستن آن بت ز گنگ ہر روزے — دو جام آب رسیدے فرون زدہ ساغر
از آبِ گنگ چہ گویم کہ چند فرسنگ ست — بسومنات بدان جایگاہ زلت و شر
خدائے خواند آن سنگ را ہمی شمنان — چہ بیہُدہ سخن ست این کہ خاک شان بر سر
بر آن نیت کہ مرآن را بمکہ باز برند
بکند وا ینک با ماہی بر و ہمسر

فرخی سُلطان کے اور سفروں میں بھی ہمراہ رہا ہی ؎

شنیدہ ام کہ ہمیشہ چناں بدی دریا — کہ بر دو منزل از آواش گوش گردد کر
ہمی نماید نوبت ہمی نماید شور — ہمی بر آید موجش برابر محور
سہ بار با تو بدریاے بیکرانہ شدم — نہ موج دیدم و نے ہیبت و نہ شور نہ شر

سلطان محمود کی عادت تھی کہ جنگ کے وقت گھمسان کے معرکوں میں فوجوں کا دل بڑھانے کے لیے خود سب سے آگے بڑھتا تھا چنانچہ فرخی ؎

من ملک محمود را دیدستم اندر روز جنگ — بہ پیش لشکر خویشتن کردہ سپر ہنگام کار

فرخی کے قول سے معلوم ہوتا ہی محمود کے قبضے میں ہاتھیوں کی سب سے زائد تعداد اس کے آخر زمانۂ حیات میں سترہ سو پچاس تھی ؎

بعرض گاہ تو لشکر چناں کہ باز نمود ہزار و ہفتصد داند پیل بدشمار

دیگر

گفت آن ہزار و ہفتصد و پنجاہ کوہ کیست گفتم ہزار و ہفتصد و پنجاہ پیل شاہ

کابل میں جب پندرہ شوال ۴۲۲ھ کو سلطان مسعود آیا اور ہاتھیوں کا جائزہ لیا گیا تو اس وقت سولہ سو ستر ہاتھی عمدہ حالت میں موجود تھے اس تعداد میں بیمار اور لاغر جانور شریک نہ تھے۔

فرخی کا اپنا بیان ہے کہ وہ سلطان محمود کے انعامات کی بدولت ایک امیرانہ اور آسودہ زندگی بسر کر رہا ہے وہ کہتا ہے:-

از فضل خداوند و خداوندیِ سُلطان امروز من از سے بہ امسالِ من از پار
باضیعتِ آبادم و با خانۂ آباد با نعمت بسیارم و با آلت بسیار
ہم با گلۂ اسپم و ہم بارمۂ میش ہم با صنم چینیم و ہم با بُت تاتار
ساز سفرم ہست و نوائے حضرم ہست اسپان سبک پائے و ستوران گزیں کار
از ساز مرا خیمہ چو کاشانۂ مانی وز فرش مرا خانہ چو بت خانۂ فرخار
میران و بزرگان جہاں را حسد آید زیں نعمت و زیں آلت و زیں کار و زیں بار
محسود بزرگان شدم از خدمتِ محمود خدمت گرِ محمود چنیں باشد ہموار

سلطان مسعود کے عہد میں خواجۂ بزرگ احمدؒ بن حسن میمندی کو خطاب کرکے کہتا ہے ؎

من بندہ را کہ خدمت من بست سالہ است از بہرِ خدمتِ تو پدید آمدہ بیسار

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخی کو غزنین کے دربار سے تعلق پیدا کیے اس وقت تک تقریباً بیس سال ہو چکے تھے خواجہ احمدؒ حسن میمندی ۴۲۴ھ میں وفات پاتے ہیں اس حساب سے فرخی ۴۰۴ھ میں یا اس کے قریب زمانے میں آیا ہے۔

خواجہ ابوبکر حصیری فقیہ سے جو سلطان محمود کے ندیموں میں ایک امیر کبیر تھا، فرخی کو بوجہ ہم وطنی خاص رابطہ رہا ہی اس کے مدحیہ قصیدے میں اپنی پچاس سالہ عمر کا بھی ذکر کرتا ہی ؎

خدمت او کن و مخدوم شو و شاد بزی   من ازیں گونہ بگردیدم سالے پنجاہ

حصیری کا زیادہ عروج محمود کے اواخر ایام میں ہوا، غالباً یہ قصیدہ بھی اسی زمانے کا ہی اس سے قیاس کیا جاسکتا ہی کہ فرخی ۳۷۰ھ سے کچھ پہلے پیدا ہوا تھا۔

فردوسی

فردوسی کے حالات کے لیے ہمارے پاس قدیم و جدید متعدد ذرائع موجود ہیں لیکن ان میں جو زیادہ اہمیت رکھتے ہیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) شاہنامہ - اس کتاب میں بعض موقعوں پر شاعر کے حالات مل جاتے ہیں - (۲) دیباچۂ قدیم شاہنامہ - اس دیباچے کی تاریخ تحریر سے ہم ناواقف ہیں - قیاساً کہا جاسکتا ہی کہ وہ فردوسی سے دو ایک صدی بعد لکھا گیا ہی لیکن اس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں - (۳) نظامی عروضی نے منتصف قرن ششم میں اپنا چہار مقالہ لکھا اس میں فردوسی کے حالات بھی مختصر ملتے ہیں۔

برخلاف دیگر مشاہیر کے فردوسی کے حالات کے متعلق ہر وقت اور ہر زمانے میں تلاش و جستجو رہی اور ہر عصر میں کچھ نہ کچھ لکھا گیا - اس لحاظ سے فردوسی خوش نصیب کہلائے جانے کا مستحق ہی لیکن ایک نقص یہ واقع ہوگیا کہ جہاں دیگر مشاہیر کے حالات سرے سے ملتے ہی نہیں وہاں فردوسی کے متعلق واقعات کا ایک انبار موجود ہوگیا - ہر قسم کی روایات جھوٹی سچی باتوں، تاریخ اور افسانے

نے ہمارے شاعر کے سوانح کو اپنی جولانیوں کا میدان بنا لیا۔ اس لیے فردوسی کے واقعہ نگار کو اگر کوئی اصلی شکایت ہو تو واقعات کی قلت اور غیر حاضری کے باعث سے نہیں ہو بلکہ اُن کی افراط اور کثرتِ تنوّع کی بنا پر، کیونکہ متخالف اور متناقض روایات کا سلسلہ اس کو بے حد پریشان کرتا ہو اور وہ شبلی کے ہمزبان ہو کر بول اُٹھتا ہو۔ "ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے"۔ اس لیے اس کا فرض ہو کہ جب وہ فردوسی ابیات میں گھُسے تو صحیح کو باطل سے حقیقت کو مجاز سے اور تاریخ کو افسانے سے تمیز کرنے کے لیے متقدمین میں سے کوئی نہ کوئی بدرقہ ساتھ لے لے، تن تنہا اس دشوار گزار راستے کو طے کرنے میں بھٹک جانے کا احتمال ہو۔

ان دشواریوں کا احساس کر کے پروفیسر براؤن نے فردوسی کے حالات لکھتے وقت اپنے لیے دو رہبر تجویز کر لیے پہلا نظامی عروضی سمرقندی اور دوسرا دولت شاہ جو اواخرِ قرنِ نہم ہجری کا مصنف ہو۔ صورتِ حالات میں براون کا انتخاب قریب قریب مناسب اور موزوں تھا لیکن جب براون کی تاریخ ادبیاتِ ایران علامہ شبلی کی نظر سے گزری تو ایک بے محل اور غیر ضروری خفگی کا اظہار فرمایا ایک خط میں جو اپنے دوست مہدی حسن صاحب کے نام گیارہ اپریل ۱۹۰۷ء کو لکھا گیا تھا فرماتے ہیں :۔

"بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ براون کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہُوا نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہو۔ برادر اسحاق سے پڑھوا کر بھی سُنا خود بھی الٹ پلٹ کر دیکھا۔ فردوسی کی نسبت صرف دو تین صفحے لکھے ہیں جس میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مذاق اتنا صحیح ہو کہ آپ فردوسی کا درجہ سبعہ معلقہ کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کسی حیثیت سے یہ کتاب اور

شعرائے فارس کے کلام کے برابر نہیں ہیں مع سود اور ہرجہ کے آپ سے دام لوں گا۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه -

شبلی گیارہ اپریل ۱۹۰۶ء"

(جلد دوم، مکاتیب شبلی صفحہ ۲۴۲ معارف پریس اعظم گڈھ)

یورپ کے نہایت مشہور فاضل اور مستند مستشرق کی نسبت جس نے اپنی تمام عمر فارسی ادبیات اور ایران کی خدمت میں وقف کردی اور اپنی تصنیفات اور تالیفات سے تمام فارسی خواں دنیا کو رہینِ منّت کر دیا ہی جس کی فضیلت اور علم کے تمام ایرانی قائل ہیں۔ ہندستان کے معروف ادیب کی یہ رائے پڑھ کر میں ایک سناٹے میں آگیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ رائے کن مقولوں پر محمول کی جائے۔ شبلی عالمِ بے بدل سہی لیکن ان کی یہ تنگ چشمی اور کوتاہ نظری ہمیشہ افسوس کے ساتھ یاد کیے جانے کے قابل ہی۔

اگر تاریخ ادبیاتِ ایران سوقیانہ اور عامیانہ ٹھیری تو میں نہیں کہہ سکتا کہ شعر العجم کو پھر کون سی صف میں جگہ ملے گی۔ سچ تو یہ ہی کہ مولانا کی رائے میں واقعیت اسی درجے تک موجود ہی جس درجے تک ایک شاندار شاعرانہ مبالغے میں ہوتی ہی۔ مولانا شبلی کا مذاق اتنا صحیح ہی کہ سخندانِ فارس مولانا آزاد مرحوم کو براؤن کی تصنیف سے بہتر مانتے ہیں۔ انھیں مہدی حسن صاحب کے نام ایک اور خط میں فرماتے ہیں :-

"براون کی گھتونی سے کہیں بہتر ہی" (ایضاً، مکاتیب شبلی صفحہ ۲۴۲)

شعر فہمی عالمِ بالا معلوم شد۔ شبلی کا اس جوش و ہیجان کے ساتھ براون کو اپنے ناوکِ بیداد کا ہدف بنانے میں خدا جانے کیا اسرار ہی۔ براون کی تصنیف میرا دل خوش کن مطالعہ رہی ہی اور میں نے اس سے بہت کچھ استفادہ کیا ہی۔ یہ کتاب

اپنے فن میں بے حد مفید اور کار آمد ہو اور بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس وقت تک اس سے بہتر کوئی تصنیف اِس جامعیت کے ساتھ کسی زبان میں موجود نہیں۔ برون نے جو دشوار گزار اور کٹھن منزل طے کی ہو شبلی اُس کے مردِ میدان نہیں ہو سکتے۔

لیکن ناظرین کو یہ بھی معلوم رہنا چاہیئے کہ آخر پروفیسر برون نے وہ کون سا قصور کیا تھا جس کے لیے بارگاہِ شبلی سے اِس قدر مخذول و معتوب بنائے گیے۔ برون نے اپنی تاریخ ادبیات ایران (صفحہ ۱۴۲ طبع ۱۹۰۶ء) میں فردوسی کے شاہنامے کے متعلق الفاظِ ذیل میں رائے دی ہو :-

"اس عظیم الشان نظم کی ادبی وقعت و قابلیت کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر اندازہ کرنے میں مشرقی اور مغربی محققین قریب قریب متفق ہیں اس لیے میں بڑے تذبذب اور تردد کا احساس کر کے معترف ہوں کہ میں اس جوش و ہیجان میں شریک ہونے کے ناقابل ہوں۔ میری رائے میں شاہنامہ سبعہ معلقہ کی مساوات پر بھی نہیں آسکتا۔ اگرچہ یہ مثنوی ممالکِ اسلام میں تمام رزمیہ نظموں کے لیے نمونہ اور مثال بن گئی ہو میرے خیال میں خوبیِ بیان، نزاکتِ جذبات اور حُسنِ ادا میں فارسی زبان کی بہترین اخلاقی، افسانوی اور عشقیہ نظموں کی ہمردیف نہیں بن سکتی، بے شک ذوق اور وجدان کے معاملوں میں بحث و مباحثہ کرنا خصوصاً ادبیات کے شعبے میں تقریباً بے سود ہو۔ شاہنامہ کی قدر شناسی کے بارے میں غالباً میرا قصور کسی قدر اس قدرتی عجز کی بنا پر بھی ہو جس کی وجہ سے میں بالعموم رزمیہ اشعار کو پسند کرنے سے قاصر ہوں۔ ان خامیوں سے ہم سب واقف ہیں خاص کر موسیقی

ہیں جہاں واگنر کا ایک سرود بعض کو بالکل محو اور وارفتہ بنا دیتا ہو اور
بعض کو بالکل بے تعلق چھوڑ دیتا بلکہ الٹا ناخوش کر دیتا ہو۔"

مولانا شبلی اور پروفیسر براؤن کے بیانات میں جو فرق ہو اس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں براؤن نے سبعہ معلقہ کو ترجیح دیتے ہوئے ساتھ ہی نیک نیتی کے ساتھ یہ اقرار بھی کر لیا کہ میں شاہنامے کی حقیقی داد دینے سے معذور ہوں۔ براؤن کا دوسرا قول کہ شاہنامے سے بہتر فارسی زبان میں اور نظمیں بھی ہیں۔ شبلی اس موقعے پر اغماض کر جائیں تو دوسری بات ہو ورنہ نظامی اور فردوسی کے مقابلے میں انھوں نے صاف نظامی کی افضلیت تسلیم کی ہو۔

ہمارا مشرقی مذاق انتہا پسند واقع ہوا ہو۔ عطریات میں ہم تیز بو والے عطر پسند کرتے ہیں۔ کھانوں میں چٹ پٹی یا کثرت سے شیریں اشیا ہمیں مرغوب ہیں لباس میں بھڑک جائز سمجھتے ہیں اسی طرح تاریخ بھی وہی پسند کرتے ہیں جس میں قصے بھی ہوں۔ اس کی کبھی پروا نہیں کرتے کہ یہ افسانے ہیں یا واقعہ۔ شبلی نے ملکی مذاق کی تبعیت میں فردوسی کے حالات قلم بند کرتے وقت اسی قسم کے ذرائع تلاش کیے جو ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوں۔ نظامی عروضی اور دولت شاہ کے علاوہ مولانا کے پاس سب سے بہتر جو سند ہو وہ دیباچۂ بایسنغری ہو۔ اگر براؤن کی تقلید میں پہلے دو مصنفین پر ہی اکتفا کرتے تو شاید مولانا کم ٹھوکریں کھاتے لیکن دیباچۂ بایسنغری اُن کے مذاق کی چیز تھی اس کو دیکھ کر ایسے مفتون ہوئے کہ فردوسی کے حالات میں الف سے لے کر یا تک، چند موقعوں کے سوا دیباچہ ہی ان کے پیشِ نظر رہا اور اس کے زیادہ دل چسپ مقامات کو جن کا زیادہ لغو ہونا بھی ظاہر ہو دل کھول کر نقل کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ شعر العجم میں فردوسی کا تاریخی حصہ قریب قریب ناقابلِ اعتبار ہو۔ ان چند مراتب کے بعد ہیں شعر العجم کا مطالعہ

شروع کرتا ہوں۔

فردوسی کے نام کے لیے شبلی فرماتے ہیں :-

"حسن بن اسحاق بن شرف نام اور فردوسی تخلص تھا دولت شاہ کا بیان ہو کہ کہیں کہیں وہ اپنا تخلص ابن شرف شاہ بھی لاتا ہو مجالس المومنین میں بعض مورخوں کے حوالے سے اس کے باپ کا نام منصور بن فخرالدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا ہو" (شعر العجم صفحہ ۹۳)

خدا جانے مولانا نے صاحبِ مجالس المومنین کو کیوں کانٹوں میں گھسیٹا۔ قاضی صاحب کے اصلی الفاظ یہ ہیں :-

"و بعضے گفتہ اند کہ او منصور بن فخرالدین احمدؒ ابن مولانا فرخ الفردوسی است"

یعنی قاضی صاحب کے نزدیک فردوسی کا نام منصور ہو نہ اُس کے باپ کا۔ فردوسی کے نام کے متعلق مورخین میں اختلاف ہو۔ تاریخ گزیدہ میں حسن بن علی، دولت شاہ کے ہاں حسن بن اسحاق، دیباچہ بایسنغری میں منصور بن احمدؒ، مجالس المومنین میں منصور بن احمدؒ ہو۔ لیکن اس باب میں سب سے بہتر مدار علیہ دیباچۂ قدیم شاہنامہ ہو جس کا بیان ہو :-

"پدر فردوسی دو فرزند داشت یکے حکیم ابوالقاسم المنصور الفردوسی دیگے مسعود"

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں :-

"وطن میں بھی اختلاف ہو چہار مقالے میں ہو کہ طبرستان کی نواحی میں باژ نام ایک گانو تھا فردوسی یہیں کا رہنے والا تھا"

(شعر العجم صفحہ ۹۳)

جب ہم چہار مقالے کو اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو اس میں صاف لکھا ہی :-

"استاد ابوالقاسم فردوسی از دہاقین طوس بود از دیہے کہ آن دیہہ را باژ خوانند واز ناحیت طبران است" (طبع یورپ صفحہ ۴۷)

اب کہاں طبرستان اور کہاں طبران، علامۂ شبلی کو سخت غلط فہمی واقع ہوئی ہی۔ شمالی ایران کا وہ کوہستانی علاقہ جو بحیرۂ خزر پر واقع ہی طبرستان کہلاتا تھا۔ حدود دامغان سے لے کر کوہستان ری تک سب طبرستان میں شامل تھا اور وسیع معنوں میں اس کا اطلاق دارالمرز یعنی گیلان، ماژندران، دیلمان، رستم دار اور جرجان پر ہوتا تھا۔ طبران یا طابران طوس کے ایک شہر کا نام ہی طوس میں دو شہر شامل تھے اور مجموع طوس کہلاتا تھا پہلے شہر کا نام طبران اور دوسرے شہر کا نام نوقان تھا۔ ابوالفضل بیہقی کے ہاں طابران کا ذکر آتا ہی۔

"پس بدیں عزم سوے طابران طوس برفت"۔ (صفحہ ۷۵۶)

فرماتے ہیں :-

"سنہ ولادت معلوم نہیں البتہ سال وفات ۴۱۱ھ ہی اور چونکہ عمر کم از کم اسّی برس کی تھی جیسا کہ وہ خود لکھتا ہی ؎

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد ۔۔۔ امیدم بہ یکبارہ برباد شد

اس لیے سال ولادت تقریباً ۳۲۹ھ سمجھنا چاہیے"۔

(شعر العجم صفحہ ۹۳ و ۹۴)

جب چار سو گیارہ سے اسّی تفریق ہوئے تو حاصل تفریق ۳۳۱ھ ہی نہ ۳۲۹ھ۔ شعر بالا سے بھلا کون شخص یقین کر سکتا ہی کہ فردوسی نے اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔ کیا اس عمر کے بعد گلزارِ عالم کی ہوا کھانا فردوسی کے لیے ممنوع تھا نہ وہ اپنی عمر ہشتاد بتا رہا ہی بلکہ نزدیک ہشتاد کہتا ہی شعر مذکورۂ بالا

خاتمۂ شاہنامہ میں آتا ہی اور خاتمہ سنہ ۴۰۰ھ میں مرقوم ہوا تھا چنانچہ یہ شعر ؎

زہجرت شدہ پنج ہشتاد بار کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار

مولانا کا یہ عقیدہ تسلیم کرکے کہ فردوسی کا انتقال اسّی برس کی عمر میں ہوا۔ اس کا سال ولادت معلوم کرنے کے لیے چارسو میں سے ہشتاد کی تفریق کرنی ہوگی جس سے سال ولادت سنہ ۳۲۰ھ برآمد ہوتا ہی نہ سنہ ۳۲۹ھ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ سنہ ۴۰۰ھ میں فردوسی اپنی عمر کا اٹھترواں دَور طے کر رہا تھا اِس لیے کہ اپنی عمر کے اڑتالیسویں سال جب سنہ ۳۷۰ھ ہوگا وہ شاہنامہ شروع کرتا ہی اڑتالیس اور تیس (مدت شاہنامہ) اٹھتر ہوتے ہیں۔ سنہ ۳۸۸ھ میں (سلطان محمود کی تخت نشینی کا سال) فردوسی چھیاسٹھویں سال میں تھا بارہ اور چھیاسٹھ اٹھتر ہوتے ہیں جس طرح ۳۸۸ اور بارہ چارسو ہوتے ہیں۔ فردوسی کی ولادت اس لیے سنہ ۳۲۲ھ و سنہ ۳۲۳ھ کے درمیان قرار پاتی ہی۔

اِس کے بعد شبلی فردوسی کے باپ کا ایک خواب نقل کرتے ہیں جس کی تاویل بخیب الدین معتبر بیان کرتا ہی۔ اصل میں اس قصے کا بانی دیباچۂ بایسنغری ہی اس سے پیشتر اس کی سُراغ رسانی نہیں کی جاسکتی۔ یہ دیباچہ سنہ ۸۲۹ھ میں تصنیف ہوُا ہی۔ اس امر میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے قصّوں کا تعلق فردوسی کی حقیقی تاریخ سے بہت کم ہی وہ ایسے زمانے کی یادگار ہیں جب فردوسی کے متعلق اصلی تاریخ کی غیر حاضری میں افسانے اور قصص شائع ہونے لگے ہیں۔

قولہ "چونکہ آبائی پیشہ زمیں داری تھا اور جس گانو میں سکونت تھی خود اِس کی مِلک میں تھا اس لیے معاش کی طرف سے فارغ البال تھا۔"

(شعر العجم صفحہ ۹۴)

نظامی کی سند پر عبارتِ بالا نقل کی گئی ہو لیکن اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:-

"فردوسی در آں دیہہ شوکتے تمام داشت چناں کہ بدخل آں ضیاع

ازامثال خود بے نیاز بود۔" (چہار مقالہ صفحہ ۴۷)

نظامی فردوسی کو گانو کا مقتدر شخص مانتا ہی لیکن مولانا نے وہ گانو ہی اس کو عنایت کر دیا۔

فردوسی کی آسودگی اور فارغ البالی کا قصہ میرے خیال میں بے بُنیاد معلوم ہوتا ہی اور شاہنامہ میرے اس خیال کا موید ہی۔ شاعر کئی موقعوں پر اپنی تنگ دستی کا شاکی ہی۔ چنانچہ ؎

(۱) دو دیگر کہ گنجم وفادار نیست ‏ ‏ ‏ ‏ مرایں رنج راکس خریدار نیست

(شاہنامہ جلد اول صفحہ ۲)

(۲) مرا دخل و خورد ار برابر بدے ‏ ‏ ‏ ‏ زمانہ مرا چوں برادر بدے

(شاہنامہ جلد چہارم صفحہ ۱۲۷ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

(۳) نماندم نمکسود ہیزم نہ جو ‏ ‏ ‏ ‏ نہ چیزے پدیداست تا جو درو

بدیں تیرگی روز و ہولِ خراج ‏ ‏ ‏ ‏ زمیں گشت از برف چوں کوہِ عاج

من اندر چنیں روز و چندیں نیاز ‏ ‏ ‏ ‏ باندیشہ در گشتہ فکرم دراز

ہمہ کارہا شد سر اندر نشیب ‏ ‏ ‏ ‏ مگر دست گیرد حسین قتیب[۱]

اس سے ظاہر ہی کہ شاعر حسین قتیب سے اپنی زمین کا حاصل ادا کرنے کی استدعا کرتا ہی۔

قولہ "فردوسی نے وطن ہی میں شاہنامے کی ابتدا کی اور ابو منصور نے جو طوس کا صوبے دار تھا اس کی سرپرستی کی۔ ابو منصور کے مرنے کے بعد

---

[۱] شاہنامہ جلد سوم صفحہ ۱۱۲ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ۔

طوس کا عامل سلان خاں ہوا چوں کہ شاہنامے کا اب ہر جگہ چرچا
پھیلتا جاتا تھا، سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی سلان خاں کے نام حکم پہنچا
کہ فردوسی کو دربار میں بھیجدو۔ فردوسی نے پہلے تو انکار کیا لیکن
پھر شیخ معشوق کی پیشین گوئی یاد آئی اس لیے راضی ہو گیا۔"
(شعر العجم صفحہ ۹۵)

اس عبارت میں کئی امور دامنگیر تامل ہیں شبلی اس عاملِ طوس کا نام یہاں
ابو منصور لکھتے ہیں لیکن صفحہ ۱۱۵ پر منصور بن محمدؔ بتاتے ہیں اور اس اختلاف کی
کوئی توجیہ بھی بیان نہیں کرتے۔ فردوسی خود اس کا نام نہیں لیتا ٹرنر میکن اپنے
شاہنامے کی سُرخی میں منصور بن محمدؔ لکھتا ہے۔ یہ قول کہ ابو منصور کے بعد سلان خاں
عاملِ طوس ہوا غلط معلوم ہوتا ہے۔ یہ منصور بن محمد یا ابو منصور یا مہتر گردن فراز
(جیسا کہ فردوسی لکھتا ہے) اگر واقع میں عاملِ طوس تھا تو ۳۷۰ھ کے قرب وجوار
میں جب کہ شاہنامے کی ابتدائی منازل طے ہو رہی تھیں وفات پا چکا ہو ان ایام
میں طوس یا خراسان کا آلِ غزنہ سے کوئی علاقہ نہیں تھا اور خراسان ابو علی سیمجوری
حسام الدولہ تاش اور فائق کے حملوں کی جولاں گاہ بن رہا تھا اس سے قیاس
کیا جا سکتا ہے کہ منصور بن محمدؔ سیمجوریوں کا کوئی ملازم یا ماتحت ہوگا اسی وجہ سے
فردوسی نے اس کا نام جب شاہنامہ سلطان محمود کے نام منسوب کیا شاہنامے
سے خارج کر دیا۔ سیمجوریوں اور غزنویوں کی رقابت سب کو معلوم ہے اور خراسان
کے لیے ان کی زور آزمائیاں تاریخ میں مسطور ہیں۔ جب میں نے سلان خان کا
نام پڑھا تو بہت حیران ہوا کہ یہ پٹھانوں کا سا نام غزنوی تاریخ میں کہاں سے
نکل آیا۔ دیباچہ بایسنغری میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ ارسلان خاں
ہے لیکن آخری حصہ پھر بھی کھٹکتا رہا۔ کیوں کہ ان ایام میں خاں کا استعمال صرف

شاہانِ ترک کے نام سے تعلق رکھتا تھا۔ آخر تاریخ میں رجوع کرنے سے معلوم ہُوا کہ یہ ارسلان خاں اصل میں ارسلان جاذب ہی جو سلطان محمود کا غلام اور مشہور و معرُوف جنرل تھا۔ یہ شخص بقول عتبی ۳۸۹ھ میں طوس کا عامل مقرر ہوا۔ ۳۷۰ھ اور ۳۸۹ھ کے درمیان طوس پر خدا جانے کتنے انقلاب آئے ہیں۔ اور کتنے عامل بدلے گئے ہیں۔ محمود کا فردوسی کو دربار میں طلب کرنا قطعاً غلط ہی۔ شیخ محمد معشوق طوسی کا تعلق فردوسی کی روایات میں قدیمی معلوم نہیں ہوتا اور دیباچۂ بایسنغری کے عہد سے شروع ہوتا ہی جو زمانہ درویش پرستی کا عنفوان شباب ہی۔ لیکن وہ تاریخی بزرگ ہیں۔ مصنف کشف المحجوب اپنے معاصرین میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ نفحات الانس (ص ۲۸۳، نول کشور، ۱۹۰۵ء) میں جامی انھیں "عقلاے مجانین" میں شمار کرتے ہیں اور شیخ ابوسعید ابوالخیر متولد ۳۵۷ھ متوفی ۴۵۱ھ کا ہمعصر بتاتے ہیں۔ ان بیانات کی رُو سے انھیں فردوسی کا معاصر خورد مانا جا سکتا ہی۔

قولہ "دربار کا میر منشی ربیع الدین (کذا) دبیر تھا اس نے عنصری سے کہا کہ بادشاہ کو مدت سے شاہنامے کی تصنیف کا خیال تھا لیکن دربار کے شعرا میں سے کسی نے اس کی ہامی نہیں بھری اب اگر فردوسی سے یہ کام بن آیا تو تمام شعراے دربار کی آبرو خاک میں مل جائے گی عنصری نے کہا بادشاہ سے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فردوسی کو اُلٹا پھیر دیجیے لیکن اس کی اور تدبیر کرنا چاہیے چنانچہ فردوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ یہاں کا قصد بے فائدہ ہی۔ سلطان کو یوں ہی ایک خیال پیدا ہُوا تھا جس کی بنا پر آپ کی طلبی کا حکم صادر ہُوا لیکن اُس دن سے آج تک پھر کبھی ذکر تک نہیں آیا۔ اس لیے حقیقت واقعہ سے آپ کو اطلاع

دیدی گئی۔ فردوسی نے ہرات سے واپس جانا چاہا لیکن ساتھ ہی خیال پیدا ہوا کہ شاید اس میں کچھ بھید ہو۔ اتفاق سے عنصری اور بدیع الدین دبیر میں شکر رنجی پیدا ہوئی عنصری نے فردوسی کو جو خط لکھا تھا، بدیع الدین ہی کے مشورے سے لکھا تھا۔ اب بدیع الدین نے فردوسی کے پاس قاصد بھیجا کہ فوراً ادھر کا عزم کیجیے عنصری نے جو لکھا خود غرضی سے لکھا تھا۔ فردوسی نے خط کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آتا ہوں۔ یہ اشعار بھی خط میں درج کیے ؎

بگوش از سروشم بسے مژدہ ہاست — دلم گنج گوہر زباں اژدہاست
چہ سنجد بمیزان من عنصری — گیا چوں کشد پیش گلبن سری

(شعر العجم صفحہ ۹۵و۹۶)

اس قصے میں رودکی اور عنصری کا نام دیباچۂ بایسنغری میں ہر مقام پر ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے حتیٰ کہ ابیات مذکورۂ بالا کے ایک تیسرے شعر میں جس کو مولانا نے دانستہ ترک کر دیا رودکی کا نام یوں لیا گیا ہے ؎

زبید النتی باشد و کودکی — کہ رائے فردنی زند رودکی

یعنی اس سازش میں رودکی اور عنصری دونوں شریک وسہیم ہیں۔ مولانا نے جیسا کہ حاشیے میں ارشاد کرتے ہیں ("دیباچہ نویسوں نے عنصری کے ساتھ رودکی کا نام بھی لکھا ہے لیکن رودکی اس سے پہلے ۳۰۴ھ (کذا) میں مر چکا تھا") اس کا نام خارج کر دیا۔ بعض اوقات کسی روایت کی تصدیق یا تردید اور اس کے ضعف وثقاہت کی شناخت تاریخی تائید کی غیر حاضری میں اسی قصے میں نکل آتی ہے جس سے ایک محقق کو اپنی تحقیق میں بڑی امداد ملتی ہے اس لیے ہر مورخ اپنا فرض جانتا ہے کہ پرانی روایات کو جوں کا توں جیسی اس تک پہنچی ہیں

حوالۂ قلم کردے اور اپنی طرف سے کوئی تغیر و تبدل ترمیم و اضافہ نکرے۔ اِس قصے کے راوی نے جس کو تاریخ کے فن سے کوئی دل چسپی معلوم نہیں ہوتی غالباً خاقانی کا یہ شعر ذہن میں رکھ کر کہ ؎

شاعر ساحر منم ملک معانی مراست ریزہ خورِ خوانِ من رودکی و عنصری

یہ قیاس مترتب کیا کہ ان دونوں شاعروں کا ایک زمانہ ہی اور فردوسی کی برتری کا سکّہ بٹھانے کے لیے اِس لغو قصے کی بنیاد ڈالی حالانکہ رودکی و عنصری میں پوری ایک صدی کا فاصلہ ہی۔ رودکی ۳۲۹ھ میں وفات پاتا ہی اور عنصری ۴۳۱ھ میں۔ مولانا شبلی کو قصہ پسند آیا لیکن رودکی کا نام تاریخی مشکلات کی بنا پر کھٹکا چنانچہ اسے قلم زد کر دیا۔ شبلی نے اِس ترمیم سے تنقید کو ان افسانوں کی تردید اور تکذیب سے عاجز کر دیا ہی۔ انھوں نے مرقومۂ بالا دونوں شعروں کو فردوسی کی ٹکسال کا مان لیا آخر اس تیسرے شعر نے کیا قصور کیا تھا وہ بھی اسی مصنف کا ہی جس مصنف کے پہلے دو شعر ہیں۔ فردوسی اپنی خواہش سے غزنین آیا ہی نہ سلطان محمود کی طلبی پر اِس لیے قصۂ ہذا کی اس کے واقعاتِ زندگی میں کہیں جگہ نہیں ہو سکتی۔ محمود کے دبیروں میں بدیع الدین کسی دبیر کا نام نہیں اور نہ 'الدین' پر ختم ہونے والے نام اس عہد میں رائج تھے ان کا رواج دیر میں ہوتا ہی۔

قولہ "حسن اتفاق سے دربار کے ممتاز شعرا یعنی عنصری، فرخی، عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے اور بادۂ و جام کا دَور چل رہا تھا۔ فردوسی اُدھر جا نکلا۔ حریفوں نے اس کو مخل صحبت سمجھ کر روکنا چاہا ایک نے کہا کہ اس کو چھیڑا جائے تو خود تنگ آکر چلا جائے گا۔ عنصری نے کہا یہ تہذیب اور آدمیت کے خلاف ہی۔ آخر رائے قرار پائی کہ رباعی کا ایک مصرع

طرح کیا جائے۔ سب اس پر طبع آزمائی کریں اگر یہ بھی مصرع لگائے
تو شریک صحبت کر لیا جائے ورنہ شرمندہ ہو کر اٹھ جائے گا عنصری
نے ابتدا کی اور کہا ع چوں عارض تو ماہ نباشد روشن
فرخی نے کہا ع مانند رخت گل نبود در گلشن
عسجدی نے کہا ع مژگانت ہمی گزر کند از جوشن
قافیوں میں شین کا التزام تھا اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ
قافیہ باقی نہیں رہا تھا فردوسی نے برجستہ کہا ع
مانند سنانِ گیو در جنگ پشن
سب نے گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی فردوسی نے تفصیل بیان کی
اس وقت تو سب نے اس کو شریک صحبت کر لیا لیکن رشک اور
حسد ایشیائی قوموں کا خاصہ ہے سب نے سازش کی کہ فردوسی دربار
تک نہ پہنچنے پائے۔" (شعر العجم صفحہ ۹۶ و ۹۷)

اس قصے کا اصلی راوی صاحب دیباچۂ قدیم ہے لیکن اس کے ہاں وہ
حصہ جو حسد اور سازش سے تعلق رکھتا ہے غیر حاضر ہے۔ پشن کسی پہلوان کا نام نہیں
جیسا کہ براون اور شبلی کا خیال ہے وہ ایک مقام کا نام ہے جہاں ایرانی لشکر
پر تورانیوں نے شبخون مارا تھا۔ شاہنامے میں اس کے متعلق حسبِ ذیل
روایت ہے۔

ایرانی لشکر بسر کردگی طوس بن نوذر کاسہ رود کے پاس پہنچ جاتا ہے پہاڑی
گھاٹی میں جہاں سے راستہ جاتا ہے تورانیوں نے ناگہانی حملوں سے تحفظ کی
خاطر ہیزم کا انبار لگا دیا تھا۔ ایرانی لشکر اس انبار میں آگ لگا کر بخیریت غنیم
کے علاقے میں گھس جاتا ہے۔ سامنے ایک حاکم نشین قلعہ ہے جس کے حاکم

کا نام نژاو ہی۔ نژاو دوسرے روز بیژن سے جنگ کر کے فرار ہو جاتا ہی۔ اس
کی بیوی اسپنوی گرفتار کر لی جاتی ہی ایرانیوں کی آمد کی اطلاع افراسیاب
کو ملتی ہی اور تورانی لشکر بہ سپہ سالاری پیران ویسہ بہت جلد تیار ہو کر مقابلے
کے لیے روانہ ہوتا ہی۔ جاسوسوں کے ذریعے سے پیران کو اطلاع ملتی ہی کہ
ایرانی شرابیں پی پی کر مست و غافل پڑے ہیں۔ طلایہ اور چوکی کا کوئی انتظام
نہیں ہی۔ رات کو پیران مع اپنی تمام فوج کے بقصد شبخون آتا ہی ایرانیوں کو سوتا
دیکھ کر حملہ کر دیتا ہی اور قتل عام ایک بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہو جاتا ہی۔ گیو
اپنے خیمے میں بیدار ہی ہتیار لگا اور گھوڑے پر سوار ہو کر سپہدار یعنی طوس کے خیمے میں آکر
اس کو بیدار کرتا ہی پھر اپنے باپ گودرز کو جا کر جگاتا ہی ادھر بیژن کو جو مست پڑا تھا ہُشیار
کرتا ہی اتنے عرصے میں تورانیوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیے تھے صبح ہوئی
تو معلوم ہُوا کہ تمام ایرانی فوج کٹ چکی تھی اور معدودے چند متنفس بچے تھے
الغرض یہی مناسب معلوم ہُوا کہ فرار اختیار کیا جائے خیمہ و خرگاہ بار و بنہ چھوڑ کر
بھاگے۔ تورانیوں نے تعاقب کیا اور فراریوں نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر جانیں
بچائیں۔ یہ حالات ہیں اس بہت مشہور جنگ پشن کے۔ میرا مقصد اِس جملہ معترضہ
سے یہی ہی کہ ہم نے جنگ پشن کے حالات دیکھ لیے ہیں اِس میں کوئی ایسا
موقع نظر نہیں آتا جس میں سنان گیو کی کوئی قابل ستایش و تحسین کارگزاری
دیکھی جاتی جس کی بنا پر مصرع بالا میں کوئی خوش گوار تلمیح قائم ہوتی یہ چند نفوس
جن میں گیو بھی شامل ہی بدشواری تمام اپنی جانیں بچا کر بھاگے ہیں نہ گیو کو اس
جنگ میں کسی فخریہ کارنامے کا موقع ملا ہی اور نہ اس نے کبھی اِس پر فخر کیا ہی
اس کے برخلاف ہومان تورانی جب کہ گیو اور طوس سے میدانِ جنگ میں ایک
موقعے پر مناظرے میں مصروف ہی فخریہ کہتا ہی ؎

تو دانی کہ من روز جنگ پشن		چہ کشتم بداں رزمگاہ کشن

(شاہنامہ جلد دوم صفحہ ۲۷۲ طبع ۱۲۷۵ھ)

خلاصہ یہ ہو کہ جنگ پشن ایرانیوں کے لیے ایک شرمناک ہزیمت تھی اور مصرع بالا میں گیو کے نیزہ کے لیے جو ادعا کیا گیا ہو۔ بالکل بے حقیقت ہو میرا خیال ہو کہ یہ مصرع کسی ایسے شخص کے قلم سے نکلا ہو جو بوجہ شہرت محض اس جنگ کے نام سے واقف ہو لیکن اس کی اصلی کیفیت اور ضمنی واقعات سے بالکل بے خبر ہو پشن کے متعلق شاہنامے میں کئی تلمیحیں موجود ہیں۔ یہ ادّعا بھی غلط معلوم ہوتا ہو کہ شین کے التزام کے ساتھ کوئی اور شگفتہ قافیہ موجود نہیں کشن (بفتح اوّل وثانی بمعنی انبوہ بسیار) پشن سے زیادہ مشہور اور شگفتہ قافیہ موجود ہو اور غزنوی دَور میں ہر شاعر نے اس کا استعمال کیا ہو۔ فردوسی ؎

یکے سرو بد سبز و برگش کشن		برو شاخ چوں رزمگاہِ پشن

اوزان رباعی میں اس قدر گنجایش ہو کہ اسباب اور اوتاد ہم قافیہ ہوسکتے ہیں اسی وجہ سے جوشن (جس میں دو سبب خفیف ہیں) اور پشن (جو وتد مجموع ہو) قافیہ بن گئے۔ اگر اس قصے کے ہیرو واقعی عنصری و فرخی ہیں تو اُن کے لیے نہایت آسان تھا کہ اپنی قوافی کو بحرِ متقارب سالم یا بحر ہزج سالم اور متعدد اور مشہور بحروں میں لاکر جن کے قافیے صرف اسباب پر ختم ہوتے اور اوتاد کا استعمال ناممکن ہوتا فردوسی اور اس کی بے محل مداخلت سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھتے۔ ایسے بڑے پایے کے شعرا سے اس ادنیٰ سے نکتے کی فروگزاشت ناقابلِ معافی ہو۔

فردوسی غزنین میں سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت پہنچتا ہو۔ کیا

ایسے ابتدائی زمانے میں یہ مشہور شعرا عنصری فرخی اور عسجدی جن میں سے ہر ایک فنِ شعر کا کامل اُستاد ہی شہرت حاصل کرکے محمود کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔اوروں کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن فرخی کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہی کہ وہ سلطان محمود کے دربار میں اِس عہد سے پندرہ سولہ سال بعد آیا ہی جیسا کہ فرخی کے حالات میں گزارش ہو چکا ہی۔ان وجوہ کی بنا پر مجھ کو اس قصے کے تسلیم کرنے سے انکار ہی مغربی تنقید بھی اس کے تسلیم کرنے سے منکر ہی۔

اس کے بعد شبلی سلطان محمود کے ندیم ماہک کا قصہ قلم بند کرتے ہیں جس میں دکھایا گیا ہی کہ ماہک کی معرفت فردوسی دربارِ سلطانی میں رسائی حاصل کرتا ہی لیکن اس قصے کا راوی بھی صاف دیباچہ بایسنغری ہی اور اسی فہرست میں داخل ہونا چاہیے جس میں رودکی اور عنصری والا قصہ درج ہوا ہی۔

اِس کے بعد شبلی فرماتے ہیں :-

"یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان محمود نے شاہنامے کی تصنیف کا حکم دیا تھا اور سات شاعر یعنی عنصری، فرخی، زینی، عسجدی، منجیک، چنگرزن، خرمی، ابوبکر اسکاف ترمذی اس کام کے لیے انتخاب ہوئے تھے۔"

(شعر العجم صفحہ ۹۷و۹۸)

شاہنامے کے لیے سات شعرا کا سلطان کے حکم سے مامور ہونے کا قصہ سب سے پہلے دیباچۂ بایسنغری میں ملتا ہی اس کی مجعولیت کے لیے یہی کافی دلیل ہی۔شعرا کے نام لکھنے میں شبلی خاص بے پروائی سے کام لیتے ہیں۔ان ناموں میں نمبر سوم زینی ہی اس نام کا کوئی شاعر نہیں گزرا۔ان کی مُراد غالباً زینتی سے تھی۔محمد عوفی اس کو زینتی علوی محمودی لکھتا ہی۔نمبر پنجم منجیک اس کا

پورا نام ابوالحسن علی الترمذی ہی عوفی اس کو شعرائے آل سامان میں داخل کرتا ہی ابوالمظفر طاہر بن الفضل کا مادح بیان کرتا ہی، طاہر ۳۷۷ھ میں وفات پاتا ہی۔ نمبر ششم خرمی اس شاعر کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا عوفی اور نظامی اس سے ناواقف ہیں۔ نمبر ہفتم ابوبکر اسکاف ترمذی۔ تذکروں میں کسی ابوبکر اسکاف کا سراغ نہیں چلتا نفحات الانس میں البتہ جامی ایک بزرگ ابوبکر اسکاف کا ذکر کرتے ہیں۔ دیباچۂ بایسنغری میں ابوبکر اسکاف کے بجائے ابوحنیفہ اسکاف ملتا ہی۔ عوفی نے شعرائے آل سلجوق میں اس کا شمار کیا ہی اور اس کا زمانہ عہد سلطان سنجر قائم کیا ہی لیکن عوفی کو اس بارے میں سہو ہوا ہی۔ ابوحنیفہ اسکاف سلطان ابراہیم غزنوی کا مداح ہی۔ ابوالفضل بیہقی اپنی تاریخ میں اس کی بہت تعریف کرتا ہی وہ فضل و ادب اور علمیت میں بے مثال تھا شعر اس کی کمترین صنعت ہی۔ جب ابوالفضل سے اس کی پہلی ملاقات امیر فرخ زاد ۴۴۳ھ و ۴۵۱ھ کے عہد میں ہوئی ہی ابوحنیفہ اس وقت مفت درس دیا کرتا تھا۔ ابوالفضل کی فرمایش سے اس نے تین قصیدے لکھے جو تاریخ بیہقی صفحہ ۳۳۵-۳۴۴ اور صفحہ ۴۷۰-۴۷۶ اور صفحہ ۷۹۷-۸۰۱ پر درج ہیں۔ سلطان ابراہیم نے اپنے حبس کے ایام میں ابوحنیفہ کی بعض تصنیفات دیکھیں ان کی عبارت اور خط کو بہت پسند کیا جب تخت نشین ہوا ابوحنیفہ کو بلوایا اور اس کے قصیدے سُنے اور خوب خوب انعام دیے اور تربیت کی۔ بعد میں منصب اشراف ترمک اس کے سپُرد ہوا۔

قولہ ”فردوسی اس وقت چپکا ہو رہا اور خود یہ داستان نظم کرنی شروع کی رات کو جب معمول کے موافق کھانے پر بیٹھے تو فردوسی نے کہا عنصری سے پہلے شعرا نے رستم و سہراب کی داستان نظم کی ہی چنانچہ خود میرے

پاس ایک نظم موجود ہی جس کے آگے عنصری کے اشعار کی کچھ حقیقت نہیں۔ یہ کہہ کر نظم حوالے کی۔ سرنامہ تھا ؎

کنوں خور دو باید مئی خوش گوار | کہ می بوئے مشک آرد از جوئبار
ہوا پر خروش و زمیں پر زجوش | خنک آں کہ دل شاد دارد بنوش
ہمہ بوستاں زیر برگ گل است | ہمہ کوہ پر لالہ و سنبل است

(صفحہ ۹۲ طبع سوم)

دیباچے میں نہ کھانا کھانے کا ذکر ہی اور نہ عنصری سے پہلے داستان رستم و سہراب کی نظم کا' اس کی عبارت ہی :-

"ابوالقاسم باندک زماں داستان رستم و اسفندیار نظم کرد چنانکہ ہک واقف نبود ابتدائیش آں بود ؎

کنوں خور د باید مئے خوش گوار | کہ می بوئے مشک آرد از جوئبار

شبے با ماہک گفت سیر الملوک را بیشتر نظم دادہ اند و صنعت سخن وری آنرا اساس محکم نہادہ ماہک گفت ممکن نباشد"

لطف یہ ہی کہ مولانا رستم و سہراب کی داستان کا ذکر کرتے ہیں اور شعر داستان رستم و اسفندیار کے نقل کر رہے ہیں۔ بہر حال دیباچے کے نزدیک سب سے پہلی داستان جو فردوسی نے سلطان محمود کو پیش کی داستانِ رستم و اسفندیار ہی نہ داستان رستم و سہراب۔ دیباچۂ قدیم اس سلسلے میں داستانِ سیاؤش کا ذکر کرتا ہی لیکن شاہنامے کے نزدیک سب سے پہلی داستان جو سلطان محمود کو پیش کی گئی ہی داستان جنگ کیخسرو ہی۔ شاہنامے میں سب سے پہلا موقع یہی ہی جہاں سلطان محمود کے مدحیہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ ان کی ابتدا ہی ؎

زیزداں ابر شاہ باد آفریں | کہ نازد بدو تخت و تاج و نگیں

خداوند تاج و خداوند گنج ۔ خداوند شمشیر و خفتان و رنج
کہ گنجش ز بخشش بنالد ہمی ۔ بزرگی ز نامش ببالد ہمی
ز دریا بدریا سپاہ ویست ۔ جہاں زیر فر کلاہ ویست
بگیتی بکاں اندروں زر نماند ۔ کہ منشور بخشش ورا بر نخواند
ز دشمن ستاند رساند بدوست ۔ خداوند پیروزگر یار اوست
بزم اندروں گنج بیرا گند ۔ چو رزم آیدش شیر و پیل افگند
چو او مرز گیرد بہ شمشیر تیز ۔ بر انگیزد اندر جہاں رستخیز
ازاں دست و آں تیغ گوہر فشاں ۔ ز گیتی نجوید ہمی جز نشاں
کہ در بزم دریاش خواند سپہر ۔ برزم اندروں شیر خورشید چہر
گواہی دہد در جہاں آب و خاک ۔ ہماں بر فلک چشمۂ آفتاب
کہ چوں او نبود ست شاہی بجنگ ۔ نہ در بخشش و کوشش و نام و ننگ
اگر مہر با کیں نیامیزدے ۔ ستارہ ز خشمش فرو ریزدے
تنش زورمند است و چندیں سپاہ ۔ کہ اندر میاں باد را نیست راہ
پس لشکرش ہفتصد ژندہ پیل ۔ خدائے جہاں یاور و جبرئیل
ہمی باژ خواہد ز ہر مہترے ۔ ز ہر نامدارے و ہر کشورے
اگر باژ ندہند کشور دہند ۔ ہماں گنج و ہم تخت و افسر دہند
کہ یارد گزشتن ز پیمان اوے ۔ دگر سر کشیدن ز فرمان اوے
کہ در بزم گیتی بدو روشن ست ۔ برزم اندروں شیر در جوشن ست
ابوالقاسم آں شہریار دلیر ۔ کجا گور بستاند از چنگ شیر
جہاں دار محمود کاندر نبرد ۔ سر سرکشاں اندر آرد بگرد

(شاہنامہ جلد دوم صفحہ ۲۴۴ بمبئی سنہ ۱۲۷۵ھ)

اِس مدح کے بعد فردوسی گویا ہو کہ میں نے یہ نظم اس مقصد سے لکھی ہو تاکہ ایامِ پیری میں اس سے نفع حاصل کروں لیکن مجھ کو کوئی قدردان سرپرست نہیں ملا۔ میں منتظر رہا حتیٰ کہ اس امید اور انتظار میں عمر کے پینسٹھ سال میں نے فکرِ افلاس اور پریشانی میں گزار دیے جب پینسٹھ گزر گئیں چھپاسٹھویں سال میں لگا ضیعفی نے عصا میرے ہاتھ میں دے دیا میری سُرخ و سفید رنگت زعفرانی ہوگئی، بڑھاپے نے کمر جھکا دی آنکھوں کی بصارت ضیعف ہوگئی تب میں نے ایک آواز سُنی کہ فریدوں کی تلاش کون کر رہا تھا وہ دیکھو فریدوں زندہ ہوگیا اور زمین و زمانہ اس کے غلام بن گئے (یہ تلمیح ہو سلطان محمود کی تخت نشینی کی طرف) اس نے اپنی فیاضی اور انصاف سے دُنیا کو مسخر کر لیا ہو اس کی تاریخ کے آثار اور علامات سب طرف نمایاں ہیں جب میں نے یہ آواز سُنی اپنی کتاب اس کے نام پر منسوب کر دی اور توقع کرتا ہوں کہ پادشاہ اس ضیعفی کے عالم میں میری دستگیری کرے اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں کہ یہ کتاب پادشاہ کے نام پر ختم کر دوں اسی تمہید میں ذیل کے شعر آتے ہیں ؎

چو پیکار کیخسرو آمد پدید — زمن جادوییہا بباید شنید

بدیں داستاں در ببارم ہمی — بسنگ اندروں لالہ کارم ہمی

کنوں خطبہٴ یافتم زیں نشاں — کہ مغز سخن یافتم بیش ازاں

اِن اشعار سے ظاہر ہو کہ شاہنامہ فردوسی اس وقت سلطان کے نام معنون کر چکا ہو تب ہی تو فخریہ لہجے میں کہتا ہو کہ جنگ کیخسرو کے دوران میں تم میری سحر کاریاں دیکھنا اس داستان میں موتیوں کا مینھ برسا دوں گا اور پتھر میں لالہ اُگا کر ناممکن کو ممکن کر دکھاؤں گا۔ میرے دیباچے کے لیے ایسا عالیشان مخاطب مل گیا ہو جس سے میرے سخن گستری کے مغز میں بیشی ہوگئی۔

شاہنامے سے اس قدر اور معلوم ہوتا ہے کہ داستانِ رستم و سہراب اور داستان سیاؤش طوس میں لکھی گئی تھیں۔ مؤخر الذکر داستان فردوسی نے اپنی عمر کے سال پنجاہ و ہشتم یا ۳۸۷ھ میں لکھی ہے۔ داستانِ رستم و اسفندیار اگرچہ غزنین میں لکھی گئی ہے اور اس میں سلطان کی طرف تلمیح بھی موجود ہے تاہم اس کو اولیت کا فخر حاصل نہیں اس کے مقابلے میں داستانِ سکندر بہتر استحقاق رکھتی ہے۔

قولہ "فردوسی نے کہا طوس کا باشندہ ہوں محمود نے اس کے حالات پوچھے اور اسی سلسلے میں پوچھا کہ طوس کب سے آباد ہے اور کس نے آباد کیا فردوسی نے تفصیل سے واقعات بیان کیے۔"

(شعر العجم صفحہ ۹۹)

گویا یہ باتیں سلطان اور فردوسی میں داستانِ اسفندیار سنانے کے بعد ہو رہی ہیں مولانا طوس کی آبادی کے بیانات کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے گزر گئے ان کی تفصیل دیباچۂ بایسنغری میں حسب ذیل ہے کہ :-

"جب کیخسرو نے اپنے باپ سیاؤش کا انتقام لینے کے لیے طوس بن نوذر کو افراسیاب سے جنگ کے لیے بھیجا تو ہدایت کر دی کہ کلات کے راستے سے توران نہ جانا کیوں کہ وہاں میرا ایک بھائی فرود رہتا ہے وہ سودائی مزاج ہے ایسا نہ ہو کہ تجھ سے لڑ مرے۔ طوس اس ہدایت پر تعمیل کا اقرار کر کے رخصت ہوا۔ جب تورانی سرحد آئی تو کیخسرو کی ممانعت کے باوجود اس نے کلات ہی کا راستہ اختیار کیا۔ بعد میں کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ طوس اور فرود میں جنگ ہوئی اور فرود مارا گیا۔ کیخسرو فرود کے قتل کی خبر معلوم کر کے بہت برافروختہ ہوا کہ میں نے طوس کو باپ کے خون کا بدلہ لینے بھیجا تھا نہ بھائی کو قتل کرانے جب طوس توران

سے لوٹا۔ ندامت کی وجہ سے کیخسرو کے پاس نہیں گیا بلکہ خراسان میں ٹھہر گیا اور وہاں کسی قصبے کو شہر کی صورت میں آباد کر کے اپنے نام پر اس کا نام شہر طوس رکھا۔"

اس قصے کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہو کہ فردوسی نے سلطان محمود سے بیان کیا جس سے تاریخ میں فردوسی کی بلند پایگی کا نقش سلطان کے دل پر جم گیا، میں اس روایت کے پچھلے حصے سے یہاں بحث کرتا ہوں۔ اتفاق سے شاہنامے میں یہ تمام قصہ موجود ہو شاہنامے میں لکھا ہو کہ جب کیخسرو کو اس کے بھائی فرود کے مارے جانے کا پرچہ گزرا تو اس نے اپنے چچا فریبرز کو سپہ سالار بنا کر بھیج دیا اور طوس کو معزول کر کے واپس آنے کا حکم دیا طوس لشکر کی کمان فریبرز کے سپرد کر کے سیدھا کیخسرو کی خدمت میں پہنچ گیا۔ چنانچہ شاہنامہ سے ؎

برفت و ببرد آنکہ بد نوذری | سوارانِ جنگ آورِ لشکری
بہ برنگرد ایچ گونہ درنگ | بنزدیک شاہ آمد از دشت جنگ
زمین را ببوسید در پیش شاہ | نگرد ایچ خسرو بدو در نگاہ
بدشنام بکشاد لب شہریار | برآن انجمن طوس را کرد خوار

خسرو نے بڑی لعنت و سرزنش کے بعد طوس بن نوذر کو اُس کے اپنے گھر میں قید کیے جانے کا حکم دیا جس کو خدائے سخن اپنے برجستہ اور زور دار الفاظ میں یوں ادا کرتا ہو ؎

نژادِ منوچہر و ریشِ سفید | ترا داد بر زندگانی امید
دگرنہ بفرمودمی تا سرت | بداندیش کردی جدا از برت
برو جاودان خانہ زندانِ تست | ہمان گوہرِ بد نگہبانِ تست
ز پیشش براند و بفرمود بند | بہ بند از دلش بیخ شادی بکند

(شاہنامہ صفحہ ۳۱۷ جلد دوم طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

اب ظاہر ہو کہ شاہنامے کے بیان کے مطابق طوس بجائے خراسان میں ٹھہرنے اور طوس آباد کرنے کے سیدھا کیخسرو کے پاس جاتا ہو اور قید کر دیا جاتا ہو۔ شاہنامے سے یہ امر بھی ثابت ہو کہ شہر طوس طوس بن نوذر سے بہت پہلے آباد تھا، گنج عروس کیکاؤس نے طوس ہی میں رکھا تھا۔ کیخسرو نے یہ خزانہ خلع سلطنت کے وقت گیو زال اور رستم پر تقسیم کر دیا۔ (شاہنامہ) ؎

دگر گنج کش خواندے عروس | کہ آگند کاؤس در شہر طوس
بگودرز فرمود کانرا بہ بخش | بگیو و بزال و خداوند رخش

سام نے جو رستم پہلوان کا دادا ہو اسی طوس میں ایک اژدہا مارا تھا۔ داستانِ رستم و اسفندیار میں رستم اپنے اسلاف کی ستایش کے وقت سام کے ذکر میں گویا ہو ؎

نخستیں بطوس اندروں اژدہا | کہ از چنگ اوکس نگشتے رہا
بدریا نہنگ و بہ خشکی پلنگ | دمش نرم کردے بکہ خارہ سنگ
بکشت آنچناں اژدہا را بگرز | جہاں گفت اورا نہی فرد برز

شہر طوس کے بانی کی حیثیت سے ہمارے ہاں عام طور پر طوس بن نوذر کا نام لیا جاتا ہو اور یہ روایت دیباچۂ بایسنغری سے قدیم ہو پہلوی روایات بھی اسی عقیدے کی موید ہیں جیسا کہ "شترو ی ہائے ایران" (شہر ہائے ایران) سے معلوم ہوتا ہو میرا مطلب یہاں اس روایت کے صحت و سقم سے نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہو کہ اِس قصے کا فردوسی کی طرف منسوب کیا جانا غلط ہو۔

شبلی فرماتے ہیں :۔

اِس زمانے میں امرد پرستی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا محمود نے فردوسی سے فرمایش کی کہ ایاز کے سبزۂ خط کی تعریف میں کچھ کہے فردوسی نے

برجستہ کہا ہے

مست است بتا چشم تو و تیر بدست — بس کس کہ ز تیر چشم مست تو نخست
گر پوشد عارضت زرہ عذرش ہست — کز تیر بتر سد ہمہ کس خاصہ ز مست

(شعر العجم صفحہ ۹۹)

عنصری اور فرخی کے ذکر میں اس خاص موضوع پر مولانا کافی لکھ چکے تھے اگر اس موقعے پر ایاز کے قصے کو نہ دوہراتے تو کرم کرتے۔ ع

کہ حلوا چو یکبار خوردند و بس

علامہ شبلی نے شعر العجم کے ورق کے ورق فردوسی کے حالات سے بھر دیے لیکن افسوس ہو کہ ان کو ایک ادنیٰ سی بات اب تک معلوم نہیں ہوئی کہ آخر فردوسی سلطان محمود کے دربار میں کون سے زمانے میں آیا اگر اس خفیف سے واقعے کی تعیین کر لی جاتی تو کئی موقعوں پر دیباچے کی لغویات پر اعتبار کرنے سے بچ جاتے اور ایسا آسان شکار نہ بن جاتے۔ میں پھر گزارش کرتا ہوں کہ فردوسی سلطان محمود کے دربار میں اُس کے اورنگ نشین ہوتے ہی آجاتا ہو۔ یعنی ۳۸۸ھ میں غزنین آچکا ہو اس سال سے ۳۹۴ھ تک سلطان محمود سے اس کے خوش گوار تعلقات قائم رہتے ہیں اس کے بعد کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ اب میں یہ سوال پیش کرتا ہوں کہ ان ایام میں کیا ایاز کے ارغواں زار پر سبزۂ خط نکل آیا تھا؟ اگر ایسا ہو تو کم سے کم ۳۸۸ھ میں اس کی عمر بیس سال کی ہونی چاہیے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مولانا، فرخی کو بھی ایاز کے تیرِ نگاہ کا زخمی بتا چکے ہیں جس کی یادداشت میں شاعر کا دربار بند ہوتا ہو (شعر العجم صفحہ ۸۰) یہ پہلے دکھایا جا چکا ہو کہ فرخی غزنی میں ۴۰۵ھ کے بعد آیا ہو۔ ایاز کی عمر جس کا شعلۂ عارض ۳۸۸ھ میں آتش خس پوش بن چکا ہو فرخی کی آمد پر چھبیس

سال ہونی چاہیے۔

ناظرین کو فرخی کا قصیدہ ایاز کی تعریف میں یاد ہوگا جس کے بعض اشعار فرخی کے حالات میں نقل ہوئے ہیں۔ اِن میں سے ایک دو شعر یہاں دوبارہ نقل کرتا ہوں ؎ (فرخی)

سوار یکرہ درمیداں بیاید | باین اند رفتند دلہاے نظار
یکے گوید کہ آں سرویست برکوہ | یکے گوید گل تازہ است پربار
زنانِ پارسا از شوے گردند | بکابیں کردنی اورا خریدار

یہ قصیدہ ۴۲۱ھ میں لکھا گیا ہو فرخی یہاں ایاز کو کبھی سرو کہتا ہو اور کبھی گلِ تازہ۔ اس قسم کے الفاظ سولہ سترہ سے پچیس تیس سالہ نوجوان کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں نہ ترپن چوّن سال کے بوڑھے کے لیے۔ اِس سے میں یہ قیاس مترتب کرتا ہوں کہ ایاز ۴۲۱ھ میں اپنی عمر کا خوش ترین دَور یعنی شباب کا زمانہ طے کر رہا تھا اور یہ کہ جب فردوسی سلطان کے یہاں آیا ہی یعنی ۳۸۸ھ میں اُس کا وجود بھی دُنیا میں نہ تھا۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ایاز ان ایام میں پیدا ہو چکا تھا تو اپنی ماں کی گود میں کھیلتا ہوگا۔ رُباعی بالا ایک نامعلوم طریقے سے فردوسی کی طرف منسوب ہو غالباً دیباچۂ بایسنغری اس کا قدیم ترین راوی ہی۔

قولہ "محمود نہایت محظوظ ہوا اور شاہنامے کی تصنیف کی خدمت سپرد کی ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہنچ جائے تو ہزار اشرفیاں دے دی جایا کریں لیکن فردوسی نے متفرق رقم سے انکار کیا اور کہا کہ جب کتاب پوری ہو جائے گی تو ایک ساتھ لوں گا۔"

(شعر العجم صفحہ ۹۲ طبع سوم ۱۳۳۹ھ)

فردوسی کے حامیوں نے قانونی حیلے تراشنے کی خاطر اس معاملے کو ایک معاہدے کی صورت میں بدل دیا ہو تاکہ سلطان پر الزام آسکے اور فردوسی اس کی ہجو لکھنے میں حق بجانب ٹھیرے۔ یہ روایت دیباچۂ قدیم میں بھی موجود ہو۔ تاہم ناقابلِ قبول ہو۔ سلطان اور فردوسی میں کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہوا۔ فردوسی اپنی نیک نامی اور قدردانی کی امید میں شاہنامے کی نظم پر مصروف ہوا، اور بقول خود سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت سے بیس سال پہلے سے مشغول تھا۔ چنانچہ :- ؎

سخن را نگہد اشتم سال بیست بداں تا سزاوار ایں گنج کیست

کسی دوسرے مقام پر کہتا ہو ؎

ہمی گفتم ایں نامہ را چند گاہ نہاں بود از چشم خورشید و ماہ

خود مولنا شبلی بھی اس روایت کو صحیح نہیں مانتے۔ فرماتے ہیں :-

"عام طور پر مشہور ہو کہ فردوسی نے سلطان محمود کے دربار میں پہنچ کر اُس کے حکم سے شاہنامہ لکھنا شروع کیا۔ اکثر تذکروں میں بھی یہی لکھا ہو لیکن یہ غلط اور محض غلط ہو۔" (شعر العجم صفحہ ۱۰۶ طبع سوم ۱۳۳۹ھ)

فرماتے ہیں :-

"دولت شاہ نے لکھا ہو کہ چوں کہ فردوسی نے ایاز کی طرف کبھی رُخ نہیں کیا اِس لیے اس نے در اندازی کی اور محمود کو یقین دلایا کہ فردوسی رافضی ہو۔" نظامی عروضی کا بیان ہو کہ دربار کا بڑا گروہ وزیر اعظم حسن میمندی کا مخالف تھا اور چونکہ فردوسی کا مربی اور سرپرست وہی تھا اِس لیے اس کی ضد پر اس گروہ نے محمود کے کان بھرے اور فردوسی کو معتزلی اور رافضی ثابت کیا۔" دیباچے میں ہو کہ فردوسی کو خود حسن میمندی نے

تباہ کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ غزنین اور اطراف وجوانب کے امرا فردوسی
کو طرح طرح کے تحفے بھیجتے تھے فردوسی بھی اشعار کے ذریعے سے
ان کا شکریہ ادا کرتا تھا حسن کو یہ ناگوار معلوم ہوتا لیکن فردوسی کچھ
پروا نہیں کرتا تھا اور کہتا تھا ۔

من بندہ کز مبادی فطرت نبودہ ام — مائل بمال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوئے در وزیر چرا ملتفت شوم — چوں فارغم ز بارگہ پادشاہ نیز

حسن میمندی مذہباً خارجی تھا اور فردوسی شیعہ اس لیے اس نے فردوسی
کی مخالفت کی ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے"

(شعر العجم صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲)

جب پروفیسر برون نے دیباچۂ بایسنغری کی طرف توجہ نہیں کی تو اس
کی یہی وجہ تھی کہ دیباچہ کے بیانات (اور مجھ کو کہنا چاہیے اکثر بیانات) پایۂ تاریخ
سے ساقط ہیں لیکن شبلی نے اس قابل مورخ کی تصنیف کو تو "برون کی کھتونی" کہہ کر
دُور پھینک دیا اور دیباچے پر آنکھ بند کر کے بھروسا کر لیا۔ اب یاس کے لہجے
فرماتے ہیں کہ ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے۔ وہی مثل
ہوئی جیسے کوئی کہے کہ تاریخ میں ہارون الرشید کا تذکرہ الف لیلہ کے بیان
سے مختلف ہے ان میں سے کس پر اعتبار کیا جائے؟ یہ معاملہ تو نہایت آسان
تھا سب کو معلوم ہے کہ نظامی نے ۵۵۰ھ کے قرب وجوار میں اپنی کتاب لکھی
ہے اور دیباچہ ۸۲۹ھ میں لکھا گیا اب جو ذرائع معلومات کے نظامی کو مل سکتے
ہیں وہ صاحب دیباچہ یا دولت شاہ کو نہیں مل سکتے اِس لیے نظامی کے
بیانات کے مقابلے میں دیباچے کی لغویات کو کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی۔
دیباچہ نگار کا پایۂ تحقیق صرف اِس ایک ادنیٰ سی بات سے ظاہر ہے کہ اس کو

دیگر واقعات در کنار سلطان محمود کے وزیر کا نام تک صحیح معلوم نہیں۔ اِس وزیر کا نام خواجہ ابو القاسم احمدؒ بن حسن میمندی ہی والدین کے گناہ کی اولاد کو عقوبت ملتے سُنا ہی، لیکن فرزند کی بداعمالیوں کی پاداش میں صاحبِ دیباچہ نے احمدؒ کے باپ حسن کو ماخوذ کیا ہو۔ علامہ شبلی جو ایک مورّخ بے بدل ہیں بجائے اس کے کہ ان امور سے دیباچے کی لغویت کا سُراغ چلاتے خود اس کی لغویت کے شکار بن گئے۔ چنانچہ بار بار اس کا نام حسن میمندی لکھ رہے ہیں اور لطف یہ ہی کہ جہاں نظامی عروضی نے چہار مقالے میں "خواجۂ بزرگوار احمد حسن" لکھا تھا شبلی نے اس کو بھی اصلاح دے دی۔ چنانچہ جب اس کا بیان نقل کیا تو وہاں احمدؒ حسن کے بجائے حسن میمندی لکھا گویا نظامی کی غلطی کی تصیح کی۔ مولانا کو معلوم ہوتا ہی گلستان خوب یاد تھی کیوں کہ اس میں ایک حکایت آتی ہی۔ "تنے چند از بندگان سلطان محمود گفتند حسن میمندی را کہ سلطان چہ گفت در فلاں مصلحت۔" (باب چہارم حکایت ہفتم) لیکن شیخ سعدیؒ کو میں مصلحِ اخلاق مانتا ہوں نہ مصلح تاریخ جو لوگ غزنوی ادبیات اور اس عہد کی تاریخ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہی کہ خواجہ احمد بن حسن میمندی اپنے ذاتی نام سے یاد کیے گئے ہیں نہ ان کے باپ حسن میمندی کے نام سے۔ فرخی کہتا ہی ؎

خواجہ بزرگ شمس کفاۃ احمدِ حسن کاحسان او و نعمتِ او دست کبریاست

دیگر

دستور ملک صاحب ابو القاسمِ احمد آں حمد و ثنا را بدل و دیدہ خریدار

عتبی اور بیہقی وغیرہ سب اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ حسن میمندی کسی زمانے میں سلطان کا وزیر نہیں بنا بلکہ امیر ناصر الدین سبکتگین کے عہد میں کسی خطا پر مصلوب ہُوا تھا۔ دوسری بات یہ ہی کہ جن دِنوں فردوسی کا قصہ درپیش تھا

اِن دنوں خواجہ احمدؒ میمندی وزیر نہیں تھا بقول عتبی ۴۰۱ھ میں خواجہ احمدؒ باقاعدہ وزیر بنایا جاتا ہو اگرچہ اِس سے چند سال پیشتر نیم سرکاری طریقے پر وزارت کا کام بھی کرتا رہا ہو۔ اشعار کی زبان بھی فردوسی کی زبان نہیں میں نظامی کے بیان کو تسلیم کرتا ہوں اس ترمیم کے ساتھ کہ فردوسی کا دوست اور محسن وزیر اوّل تھا وہ وزیر دوم کو سمجھا اس وزیر کا نام خواجہ ابو العباس فضل بن احمدؒ اسفرائنی ہو اس سے فردوسی کے اچھے تعلقات تھے شاہنامے میں دو موقعوں پر اِس کا ذکر آتا ہو اور فردوسی اس کا ممنون بھی معلوم ہوتا ہو۔ شاہنامہ سے

ز دستور فرزانۂ دادگر پراگندہ رنج من آمد بسر[۱]

صورتِ حالات میں یہی دُرست معلوم ہوتا ہو کہ فردوسی کا سرپرست خواجہ ابو العباس تھا نہ خواجہ ابو القاسم احمدؒ شاہنامے میں خواجہ ابو القاسم کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

مذکورۂ بالا دونوں شعر جو وزیر اور بادشاہ کی درگاہ سے ہمارے شاعر کی بے نیازی اور استغنا کے معلن ہیں۔ فردوسی کے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے نہ وہ اس کی زبان میں ہیں ــ ان پر عربی کا گہرا اثر ہو۔ مبادی فطرت۔ مائل۔ طامع۔ وزیر۔ ملتفت۔ فارغ۔ فردوسی کے روز مرہ میں داخل نہیں۔ ان شعروں کا مالک صاحبِ دیباچہ ہو نہ فردوسی۔

محسن میمندی مذہباً خارجی تھا' کاش اس موقع پر تو مولانا اپنی آنکھیں کھولتے کہ وہ شیعہ روایات کی بھول بھلیاں میں پھنس گئے ہیں۔ یہ سوچنے کی بات ہو کہ خواجہ ابو القاسم احمدؒ جو سلطان محمود کا رضاعی بھائی اور بچپن کا دوست ہم مکتب اور ہم صحبت تھا خارجی کیوں کر ہو سکتا ہو لیکن مولانا شیعہ

---

[۱] جلد دوم ص ۲۴۴ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ۔

روایت کے راز کو نہ سمجھے خواجہ کا خارجی خیال کیا جانا ایسا ہی ہو جیسا سلطان محمود کو خارجی کہنا۔ ہجو کے اشعار میں خود سلطان کو خارجی بنانے کی کوشش کی گئی ہو افسوس شبلی برون کے سبعہ معلقہ کی سوئی نہ دیکھ سکے لیکن دیباچے کے اونٹ کے اونٹ نگل گئے۔

قولہ "دیباچے میں ایک اور وجہ بیان کی ہو اور وہ قرین قیاس ہو سلطان محمود کو دیلمی خاندان سے سخت عداوت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سخت متعصب شیعہ تھے (دیباچے میں رافضی کا لفظ تھا جس کو ہم نے بدل دیا) اسس خاندان کا تاجدار فخر الدولہ تھا وہ فردوسی کا نہایت قدردان تھا جب فردوسی نے رستم و اسفندیار کی داستان نظم کی تو اُس نے صلے کے طور پر ہزار اشرفیاں بھیجیں اور لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو نہایت اعزاز و احترام کیا جائے گا۔ یہ خبر تمام غزنین میں پھیل گئی محمود نے سُنا تو اس کو ناگوار گزرا۔ (شعر العجم صفحہ ۱۰۳)

یہاں علامۂ شبلی پھر دیباچۂ بایسنغری کے دامِ فریب میں پھنس گئے وہ اس کے عشوہ ہائے لاجوردی کے کچھ ایسے مفتون ہو گئے ہیں کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

فخر الدولہ دیلمی اور فردوسی کا قصہ تاریخی لحاظ سے قطعی غلط ہو جس کی تفصیل یہ ہو کہ رکن الدولہ بویہ المتوفی ۳۶۶ھ کے تین فرزند تھے عضد الدولہ مویّد الدولہ اور فخر الدولہ۔ عضد الدولہ بوجہ شہرت چنداں محتاج بیان نہیں۔ مویدالدولہ کو باپ نے حینِ حیات میں اصفہان دے دیا اور فخر الدولہ کو ری۔ رکن الدولہ کے بعد مویدالدولہ نے عضد الدولہ اپنے بڑے بھائی کے حکم سے فخر الدولہ پر فوج کشی کی فخر الدولہ بھاگ کر قابوس بن وشمگیر کے ہاں پناہ گزیں ہوا

۳۷۰ھ میں موید الدولہ نے جرجان پر حملہ کیا۔ قابوس اور فخر الدولہ شکست کھا کر خراسان بھاگ آئے۔ سامانیوں نے ان کی امداد کے لیے حسام الدولہ ابوالعباس تاش کے ساتھ زبردست فوج روانہ کی لیکن مہم ناکامیاب رہی ۳۷۳ھ میں موید الدولہ کے انتقال پر فخر الدولہ اپنے بھائی کے تخت پر بیٹھا۔ امیر سبکتگین اور فخر الدولہ ماہ شعبان ۳۸۷ھ میں آگے پیچھے انتقال کرتے ہیں۔ سبکتگین کے بعد باپ کی وصیت کے موافق امیر اسمٰعیل تخت نشین ہوتا ہے۔ ملک کے مقاسمہ پر بھائیوں میں جھگڑا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محمود ۳۸۸ھ میں تخت نشین ہوتا ہے۔ فردوسی اس واقعے کے بعد غزنین آتا ہے داستانِ رستم و اسفندیار غزنین ہی میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے خاتمے میں سلطان کے حق میں دعائیہ اشعار موجود ہیں۔ چنانچہ شاہنامہ

۵ سر آمد کنوں رزم اسفندیار — کہ جاوید باد اسر شہریار

ہمیشہ دل از رنج پرداختہ — زمانہ بفرمان او ساختہ

دلش بادشادان و تاجش بلند — بگردن بد اندیشش اورا کمند

قصہ کوتاہ جب داستانِ رستم و اسفندیار لکھی گئی ہے فخر الدولہ اپنی قبر میں سو رہا تھا اس لیے فخر الدولہ کا فردوسی کے لیے انعام بھیجنے کا قصہ بالکل بے بنیاد ہے۔

قولہ "بہر حال وجہ کچھ ہو واقعہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کی قدر دانی کا حق ادا نہ کیا فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہنامے کا صلہ پہنچا فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں۔ فردوسی نے بڑی بیتابی سے دستِ شوق بڑھایا لیکن سونے کے پھل کے بجائے چاندی کے پھول تھے۔ فردوسی کے دل سے بے ساختہ آہ نکلی تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں اور ایاز سے کہا کہ پادشاہ سے کہنا کہ میں نے یہ خونِ جگر ان سفید دانوں کے لیے نہیں کھایا تھا۔ ایاز نے محمود سے ساری کیفیت بیان کی۔"

(شعرالعجم صفحہ ۱۰۴ و ۱۰۵)

دیباچۂ قدیم کسی راوی منصور کی سند پر لکھتا ہو کہ سلطان محمود کے دبیر ابوسہل ہمدانی نے سلطان سے عرض کی کہ ساٹھ ہزار دینار زر رکنی ایک شاعر کو دینے کی کیا ضرورت ہی طلائی سکوں کے بجائے رُوپہلے سکّے ہی بہت ہیں سلطان اس مشورے پر عمل پیرا ہوا اور ساٹھ ہزار درم ایک ظرف میں رکھوا کر بھجوا دیے اس رقم کو فردوسی نے حمام کے دروازے پر لٹوا دیا اس بارے میں دیباچۂ قدیم اور چہار مقالہ متفق ہیں۔

یہ رقم اگرچہ شاہنامے کے مقابلے میں ہیچ ہی تاہم ان ایام میں رُپے کی قیمت پر لحاظ کرتے ہوئے اچھی خاصی رقم تھی۔ ساٹھ ہزار درہم ہمارے سکوں میں پندرہ ہزار روپے کے مساوی ہیں، اب پندرہ ہزار رُپے ایک اسّی سال کے بوڑھے کے لیے جو افلاس کے ہاتھوں تنگ ہو چنداں محقر نہیں۔ فردوسی کا شاہنامے کی نظم سے یہی مقصد تھا کہ اس کا ضعیفی کا زمانہ آسایش اور فارغ البالی میں گزر جائے۔ ؎

بہ پیوستم این نامۂ باستاں | پسندیدہ از دفتر راستاں
کہ تا روز پیری مرا بر دہد | بزرگی و دینار و افسر دہد[1]

یہ مقصد اس رپے سے ایک حد تک حاصل ہو سکتا تھا۔ میرے نزدیک اس رقمِ کثیر کا حمام کے دروازے پر لٹوا دینا ناقابلِ عمل ہی اور نہ شاہنامہ اِس قصّے کی تائید کرتا ہی۔ فردوسی کے بیان سے اس قدر معلوم ہوتا ہی کہ وہ حاسدان اور بدگویوں کی سخن چینی کی وجہ سے سلطان کے ہاں سے قطعاً محروم گیا۔ ؎

چنیں شہریارے و بخشندۂ | بگیتی ز شاہاں درخشندہ
نکرد اندریں داستانہا نگاہ | ز بدگوئے و بختِ بد آمد گناہ

---

[1] شاہنامہ جلد دوم صفحہ ۴۴۲ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ

حسد برد بدگوئے در کارِ من تبہ شد بر شاہ بازارِ من
(شاہنامہ جلد چہارم صفحہ ۲۰۱۴ تمہید داستان شیریں خسرو)

بہر حال سائل منعم سے اور تشنہ دریا سے محروم گیا۔

محمود کے ہاں کئی بوسہل ہیں ایک بوسہل زوزنی دوسرا بوسہل حمدوی ایک بوسہل ہمدانی بھی ہے۔ لیکن فردوسی کے قیام غزنین کے زمانے میں ان میں سے شاید ایک بھی دبیر نہ ہو۔ حسن میمندی اس وقت اپنی گور میں آرام کر رہا تھا۔

صاحب دیباچۂ بایسنغری میں ایجاد کا مادہ ضرورت سے زیادہ ہے بعض اوقات اِس کے پاس قدیم راوی ہیں ورنہ اکثر اوقات وہ خود واقعات تراش لیتا ہے۔ مثلاً ہجو سلطان محمود میں شعر ذیل اِس نے دیکھا ؎

مرا سہم دادی کہ در پائے پیل تنت را بسایم چو دریائے نیل

اس پر اس نے قصۂ ذیل تیار کیا جس کو میں شبلی کے الفاظ میں ادا کرتا ہوں:-

محمود نے حسن میمندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی اور کہا تیری در اندازی نے مجھ کو بدنام کر دیا میمندی نے کہا کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیج دیتے تب بھی فردوسی کو آنکھوں سے لگانا تھا انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے۔ اس چبھتے ہوئے فقرے نے محمود کے دل میں اثر کیا اور برہم ہو کر کہا کہ کل میں اس قرمطی کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں گا (یہاں دیباچے کے اصلی الفاظ یہ ہیں کہ آں قرمطی را بامداد در پائے پیل اندازم وعقوبت اورا عبرت سائر بے ادباں سازم) فردوسی کو خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا صبح کو محمود باغ میں آیا تو فردوسی نے دوڑ کر پاؤں پر سر رکھ دیا اور بدیہہ یہ اشعار پڑھے" ؎

چو در ملک سلطاں کہ چرخش ستود بسے ہست ترسا و گبر و یہود
گرفتند در ظل عدلش قرار شدہ ایمن از گردش روزگار
چہ باشد کہ سلطان گردوں شکوہ رہی را شمارد یکے زاں گروہ

سلطان محمود کو رحم آیا اور اس کی تقصیر معاف کی۔" (شعر العجم صفحہ ۲۰۵)

یہاں فردوسی کے بدیہہ اشعار کی زبان پر بھی ناظرین ایک منٹ کے لیے غور کر لیں۔

خدا جانے صاحب دیباچہ کا یہ کون سا پر اسرار ماخذ ہو جس سے حسب ضرورت وہ فردوسی کے اشعار نقل کر دیتا ہو جس تک نہ متقدمین کی رسائی ہوئی اور نہ متاخرین کی، اور اشعار بھی ایسے برمحل ہوتے ہیں کہ گویا فردوسی نے اسی موقعے کے لیے لکھے تھے مگر میں یہی کہوں گا کہ یہ اشعار صاحب دیباچہ کی تصنیف ہیں۔

قولہ غزنین سے چلتے وقت فردوسی نے ایاز کو ایک لفافہ سربمہر دیا اور کہا کہ میرے جانے کے ۲۰ دن بعد بادشاہ کو دینا، فردوسی، ہرات کو روانہ ہوا، محمود نے لفافہ کی مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے:۔

یکی بندگی کردم اے شہریار کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
بنی افگندم از نظم کاخ بلند کہ از باد و باراں نیابد گزند
بسے رنج بردم دریں سال سی عجم زندہ کردم بدیں پارسی
چو بر باد دادند گنج (کذا) مرا نہ بد حاصلے سی و پنج مرا
اگر شاہ را شاہ بودے پدر بسر بر نہادے مرا تاج زر
وگر مادر شاہ بانو بدے مرا سیم و زر تا بہ زانو بدے
پرستار زادہ نیاید بکار وگر چند دارد پدر شہریار

سر ناسزایان برافراشتن | وزیشان امید بہی داشتن
سر رشتۂ خویش گم کردن است | بہ جیب اندرون مار پروردن است
درختے کہ تلخ است ویرا سرشت | گرش بر نشانی بباغ بہشت
ور از جوے خلدش بہ ہنگام آب | بہ بیخ انگبین ریزی و شہد ناب
سرانجام گوہر بکار آورد | ہماں میوۂ تلخ بار آورد
ز بد اصل چشم بہی داشتن | بود خاک در دیدہ انباشتن
ازاں گفتم ایں بیت ہائے بلند | کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا | بماند ہجا تا قیامت بجا

(صہ ۹۹ ، شعر العجم ۱۳۳۹ھ طبع سوم)

سلطان محمود کے دربار سے فردوسی کی محرومی کا قصہ موجودہ ہجو کا بانی ہے لیکن یہ ہجو کسی اصلی بنیاد پر قائم نہیں بلکہ وضعی ہے۔ تذکرہ نگاروں کی عام روایت ہے کہ سلطان نے فی شعر ایک دینار دینے کا وعدہ کیا اور جب تیس پینتیس سال کی محنت کے بعد شاعر شاہنامہ ختم کر کے لایا تو سلطان نے وعدہ خلافی کی اور سونے کے سکوں کی جگہ چاندی کے درہم دیئے جو شاعر نے کھڑے کھڑے حمام کے دروازے پر لُٹا دیے۔ یہ بیان اگر دُرست ہوتا تو فردوسی ہجو لکھنے میں حق بجانب ہوتا۔ مگر فردوسی کی اپنی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود کی تخت نشینی سے بیس سال پہلے سے اس نظم پر مصروف تھا۔ شاہنامے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شاعر کو کسی قسم کا انعام نہیں ملا۔ چنانچہ :-

چنیں شہریارے و بخشندۂ | بگیتی ز شاہاں درخشندہ
نکرد اندریں داستانہا نگاہ | ز بدگوی و بخت بد آمد گناہ

حسد برد بدگوی در کار من　　تبہ شد بر شاہ بازار من

(داستان خسرو پرویز و شیریں ص۵۱)

وہ اپنی ناکامی دشمن کی بدگوئی اور اپنی بدنصیبی پر محمول کرتا ہی۔ اس صورت میں ہجو لکھنا اس کے لیے نامناسب تھا۔

موجودہ ہجو دیباچۂ بایسنغری (تالیف ۸۲۹ھ) کے عہد سے چلتی ہی اور دیباچہ نگار زیادہ تر اس کا ذمہ دار ہی۔ اس کی طیاری کے لیے بڑا حصہ شاہنامے سے لیا گیا ہی اس کے بعد گرشاسپ نامہ، بہمن نامہ نیز دیگر نامعلوم ذرائع سے خوشہ چینی کی گئی ہی۔ پھر اس کالائے وزدیدہ کو مسلسل نظم کی شکل میں ترتیب دینے کے واسطے جدید اشعار حسب موقع و ضرورت لکھ کر داخل کیے گئے۔ اس طرح سو شعر کی یہ ہجو تیار ہوئی۔ ورنہ دیباچۂ بایسنغری سے قبل کے شاہناموں میں ہجو کے اشعار نہایت کم تعداد میں ملتے ہیں۔

مولانا شبلی کے منقولہ اشعار کی تعداد پندرہ ہی۔ ان میں سے شعر اوّل و دوم 'بنا ہائے آباد' الخ اور 'پی افگندم' شاہنامے سے لیے گئے ہیں جو 'در ستایش سلطان محمود و گلہ روزگار' کی سرخی کے ذیل میں 'لشکر آراستن خسرو بجنگ افراسیاب' سے قبل (ص۹۷۴ جلد دوم۔ شاہنامہ طبع محمد مہدی اصفہانی ۱۲۶۲ھ۔ بمبئی) ملتے ہیں۔

شعر ۳۔ 'بسی رنج بردم' الخ اگرچہ مطبوعہ شاہناموں میں نہیں ملتا لیکن ایک نہایت قدیم نسخے ۷۵۲ھ کے خاتمے میں موجود ہی۔ اس کے دوسرے مصرع میں زندہ کی جگہ 'گرم' مرقوم ہی۔

شعر ۴ 'چو بر باد دادند رنج مرا' الخ خاتمہ شاہنامہ میں آتا ہی۔

شعر ۷۔ 'پرستار زادہ نیاید' الخ اس شعر کا استعمال فردوسی نے

شاہنامے میں کسی مختلف مقصد سے کیا تھا۔ جب نوشیروان نے مہران ستاد کو
اپنے واسطے خاقان چین کی دختر پسند کرنے کے لیے چین روانہ کیا اس کو
ہدایت کی کہ خاقان کے متعدد لڑکیاں ہیں تو ان کے ظاہری حسن و جمال اور
زیب و زینت پر نہ جانا۔ اصلی ملکہ کی اولاد لانا۔ مجھے باندی کی بیٹی نہیں چاہیے
اگرچہ اس کا باپ بادشاہ ہو۔ فردوسی نے اس موقعے پر یہ شعر لکھا تھا:۔

پرستارہ زادہ نیاید بکار اگرچند باشد پدر شہریار

("پاسخ نامۂ خاقان از نوشیرواں و فرستادن مہران ستاد را برائے دیدن آوردن
دختر خاقان"۔ صفحہ ۸۹۶ جلد چہارم۔ ۱۲۶۲ھ)

ہجو نگار نے شاہنامے سے چرا کر سلطان محمود کے خلاف استعمال کیا۔
شعر ۸ و ۹ 'سرناسزایان' الخ اور 'سررشتۂ خویشتن' الخ بہمن
نامے کے بعض اوراق میں جو دسویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے میری
نظر سے گزرے ہیں

قولہ "اب اس نے ہرات سے طوس کا رُخ کیا۔ طوس سے قہستان گیا
ناصر لک یہاں کا حاکم تھا، اس کو خبر ہوئی تو ندیمانِ خاص کو استقبال
کے لیے بھیجا اور نہایت اخلاص کے ساتھ پیش آیا۔" (صفحہ شعر العجم)

مولانا غالباً دیباچۂ بایسنغری کی سند پر لکھ رہے ہیں۔ مگر مشکل یہ آپڑی ہے کہ فردوسی
کے عہد میں کسی ناصر لک والیٔ قہستان کا پتا نہیں چلتا۔ اس موقعے پر صاحب دیباچہ
کو سہو ہو گیا۔ اس نے ناصر الدین والی قہستان کو جو ہمارے شاعر سے دو ڈیڑھ سو
سال بعد گزرا ہے فردوسی کا معاصر قرار دے دیا۔ محقق طوسی نے اپنی مشہور تالیف
اخلاق ناصری اسی ناصر الدین والی قہستان کے نام پر لکھی ہے۔ یہ ناصر الدین
رکن الدین خورشاہ والی الموت کی طرف سے قہستان کا عامل تھا۔ اخلاق ناصری

کے دیباچے میں یہ عبارت ملتی ہی۔

"بوقت مقام قہستان درخدمت حاکم آں بقعہ مجلس عالی شہنشاہ اعظم بادشاہ معظم ناصر الحق والدین ملک الملوک عرب و العجم اعدل ولات السیف والقلم خسرو جہاں شہریار امیران ناصر الدین عبدالرحیم بن ابی منصور تغمدہ اللہ برحمتہ"

ٹِس لک کی تشریح سے قاصر ہوں، غالباً تمیزی یا عربی کلمہ ہی۔ اس ناصر الدین کا ایک خطاب محتشم بھی ہی جو نظم آیندہ منسوب بہ فردوسی کے شعر ذیل سے معلوم ہوتا ہی۔ ؎

ولیکن ز فرمودۂ محتشم ندانم کزین بیش چوں سرکشم

روضۃ الصفا میں بھی اس کو ناصر الدین محتشم کہا گیا ہی۔ اس سے ظاہر ہی کہ ناصر لک محتشم اور ناصر الدین محتشم ایک ہی شخص ہی۔ اس کی عبارت ہی :-

"دریں اثنا ملک شمس الدین کرت را برسالت پیش ناصر الدین محتشم کہ فاضل محقق خواجہ نصیر الدین طوسی اخلاق ناصری را بنام او نوشتہ فرستادہ داد درآں اوان از قبل رکن الدین خورشاہ والی قلعۂ سرسخت بود۔" (صفحہ جلد پنجم)

قولہ "فردوسی نے ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی جس میں حاسدوں کی درازی اپنی مظلومی اور سلطان محمود کی بدعہدی و ناقدردانی کا ذکر تھا۔"

به غزنین مرا گرچه خوں شد جگر ز بیداد آں شاہ بیدادگر
کزاں ہیچ شد رنج سی سالہ ام شنید از زمیں آسمان نالہ ام
ہمی خواستم تا فغانہا کنم بگیتی ازو داستانہا کنم
بگویم ز مادرش و ہم از پدرش نہ ترسم بغیر از خداوند عرش
چو دشمن نمیداند از دوست باز بہ تیغ زبانش کنم پوست باز
ولیکن ز فرمودۂ محتشم ندانم کزیں بیش چوں سرکشم

فرستادم ار گفتۂ داشتم | بہ نزدیک خود ہیچ نگذاشتم
اگر باشد این گفتہا ناصواب | بسوزاں در آتش بشویاں در آب
گزشتم ایا سرور نیک رای | ازیں داوری تا بدیگر سرای
رسد لطف یزداں بفریاد من | ستاند بمحشر از و داد من

فردوسی نے مثنوی کے اشعار ناصر لک کو سُنائے تو اس نے سمجھایا کہ بدگوئی اہلِ کمال کی شان نہیں، میں لاکھ روپے ان اشعار کے معاوضے میں دیتا ہوں، اشعار کہیں ظاہر نہ ہونے پائیں، فردوسی نے منظور کیا۔"

(شعر العجم ص۱۷۱ و ص۱۷۲)

میرے خیال میں مثنوی سے مراد اشعار بالا نہیں بلکہ ہجو کے ابیات ہیں۔ نہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا کہ فردوسی نے ناصر لک کو سُنائے تھے۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہو کہ فردوسی اور ناصر لک میں ملاقات نہیں ہوئی۔ شاعر سلطان کی ہجوگوئی پر تلا ہوا تھا بلکہ اس کے ماں باپ تک کو بھا ننا چاہتا تھا لیکن محتشم کے کہنے پر اس نے ہجو کا ارادہ ترک کر دیا اور جو کچھ لکھی وہ محتشم کی خدمت میں یہ کہ کر بھیج دی کہ اب اسے اختیار ہو چاہے جلائے چاہے دھو ڈالے۔ وہ اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہو قیامت کے دن انصاف ہوگا۔

اشعار بالا فردوسی کے قلم سے نہیں نکلے۔ اس کے مقابلے میں صاحب دیباچۂ بایسنغری ان کا جائز مالک کہلائے جانے کا زیادہ حق دار ہو۔ قدیم مآخذ میں یہ اشعار نہیں ملتے۔

قولہ "فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا ؎

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست | چگونہ دریا کا نرا کنارہ پیدا نیست

چہ غوطہا زدم واندر وندیدم دُر | گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست
(شعر العجم ص۱۰۱)

یہ قطعہ بالعموم فردوسی کی طرف منسوب ہی اور فردوسی کا معلوم ہوتا ہی لیکن دراصل اس کے چار شعر ہیں۔ وہو ہذا :-

حکیم گفت کسی را کہ بخت و الا نیست | بہیچ وجہ مرا او را زمانہ جویا نیست
برو مجاور دریا نشیں مگر روزے | بدست افتد دُرّے کجاش ہمتا نیست
خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست | کدام دریا کانرا کرانہ پیدا نیست
شدم بدریا غوطہ زدم نہ دیدم دُر | گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست

حقیقت میں یہ قطعہ فردوسی کے صحیح جذبات کا آئینہ دار ہی۔

قولہ سلطان نماز جمعہ پڑھنے کے لیے جامع مسجد میں آیا تھا اتفاق سے ان اشعار پر نظر پڑی نہایت متاسف ہُوا مسجد سے آکر ناصر لک کا عریضہ دیکھا اور بھی مکدر ہُوا جن لوگوں نے فردوسی کے حق میں کانٹے بوئے تھے ان کو بُلاکر سخت توبیخ کی کہ تم نے دُنیا میں مجھ کو بدنام کر دیا"۔
(شعر العجم صفحہ ۱۰۸)

یہاں دیباچے میں صاف لکھا ہی کہ سلطان نے حسن میمندی کو فردوسی کے حق میں کانٹے بونے کی پاداش میں ہلاک کر دیا، مولانا شبلی خدا جانے کیوں اس اہم واقعہ کو قلم انداز کر گئے دیباچے کے الفاظ ہیں :-

"وبداں جماعت کہ خیانت بفردوسی کردہ بودند غضب بسیار فرمود و حسن میمندی را بخطاب علیف مخاطب داشت بلکہ نام آں بد فرجام برجریدۂ اموات برنگاشت ؎

چو فردوسی آں مرد والا گہر | غمیں شد ز میمندی بے ہنر

اذیت بسے زانفرو مایہ دید	وز و بے سبب رنج وحرماں کشید
طبیعت مکافات آغاز کرد	سرش بادم تیغ انباز کرد"

تاریخی معاملات میں اس قدر دست بُرد قطعاً ناجائز ہو مولانا کو اختیار تھا کہ روایات کو قبول کریں یا رد کر دیں لیکن جب ایک مرتبہ قبول کر لیا تو لازم تھا کہ قصے کے تمام خط وخال نقل کرتے ۔حسن میمندی سبکتگین کے عہد میں بے شک قتل کیا گیا ہو لیکن ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا فردوسی کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا ۔

بعض وقت دو روایتوں کو لے کر مولانا نے ان کی کھچڑی سی پکا کر رکھ دی ہی- اِس غرض کے لیے دو مختلف روایتوں کا ذکر کرنا ضروری ہی-

نظامی کا بیان ہو کہ فردوسی ہرات سے طوس جا کر وہاں سے بخط مستقیم طبرستان اسپہبد شہریار کے پاس چلا گیا جو مشہور آل باوند کا ایک رکن تھا طبرستان میں فردوسی نے ہجو لکھ کر اور دیباچے میں اضافہ کر کے شاہنامہ شہریار کو پیش کیا کہ اس کتاب میں تمھارے بزرگوں کے حالات ہیں اس لیے تمھارے نام اس کا منسوب ہونا بہت مناسب ہو۔شہریار نے اِس کو تسلی دی اور کہا کہ کتاب تو محمود ہی کے نام پر رہنے دے البتہ سلطان کی ہجو میں ایک لاکھ رُپے میں خریدتا ہوں خود سلطان کسی دن نادم ہوگا اور تیری رضا جوئی کرے گا۔

دوسری روایت دیباچہ بایسنغری میں یوں ہو کہ فردوسی سلطان کے خوف سے ماژندران چلا گیا وہاں کا والی ان دنوں فرزندان شمس المعالی قابوس بن وشمگیر سے تھا دیباچے کے اصلی الفاظ یہ ہیں :-

"والی ماژندران در آں زمان از فرزندان فرزاں (کذا) شمس المعالی قابوس بن وشمگیر بن منوچہر (کذا) بن شمس المعالی بود وپسر او داماد

سلطان بود و از طرف مادر دختر زادۂ مرزبان بن رستم بن شروین کہ مصنف مرزبان نامہ است۔"

جب والی کو معلوم ہوا کہ طوس کا ایک شیعہ شاعر جس نے شاہنامہ غزنین میں نظم کیا تھا اپنی کتاب لے کر ماژندران آیا ہو اور فردوسی اور محمود کے تعلقات بھی اس کو معلوم ہوئے چوں کہ شیعۂ غلات سے تھا کہنے لگا چونکہ شاعر دوستدار اہل بیت ہو اگر اپنی تصنیف میرے پاس بھیجے گا معقول معاوضہ پائے گا۔القصہ فردوسی نے والی اور اِس کے اسلاف کی تعریف میں ابیات اضافہ کرکے شاہنامہ پیش کیا والی بہت خوش ہُوا لیکن بعد میں سلطان کے خوف سے معقول صلہ دے کر رخصت کر دیا۔

مولانا فرماتے ہیں :۔

"ماژندران کی حکومت قابوس بن وشمگیر کے خاندان میں چلی آتی تھی اور اس زمانے میں سپہبد فرماں روا تھا اِس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرت ظاہر کی اور فردوسی کو دربار میں بُلایا۔ فردوسی نے مدحیہ اشعار اضافہ کرکے شاہنامہ پیش کیا۔ سپہبد نے چاہا کہ فردوسی کو دربار سے نہ جانے دے لیکن پھر سلطان محمود کا خیال آیا ایک گراں بہا صلہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ محمود آپ سے ناراض ہو اس لیے میں آپ کو ٹھیرا نہیں سکتا آپ اور کہیں تشریف لے جائیں۔"

(شعر العجم صفحہ ۱۰۹)

قابوس کے خاندان میں کوئی اسپہبد نہیں گزرا۔ اسپہبد کسی شخص کا نام نہیں بلکہ آل باوند کا خاندانی خطاب ہو۔ قابوس آل زیار سے تعلق رکھتا ہو جن کا پایۂ تخت جرجان تھا۔

باوندیہ خاندان کی حکومت کوہستان پریم اور شہریار کوہ میں تھی اس خاندان کے تمام حکمراں اسپہبد کہلاتے تھے۔ مثلاً اسپہبد شہریار، اسپہبد رستم اور اسپہبد شروین وغیرہ۔ صاحب دیباچہ جس کی روایت کو مولانا نے نظامی عروضی کے بیان پر ترجیح دی حسب معمول شبلی کو غلط راستے پر لے جا رہا ہے اس غریب کو والی کا نام تک بھی معلوم نہیں اگرچہ اس کے بڑے بوڑھوں کے نام گنا گیا اور وہ بھی غلط سلط۔ آل زیار میں دو بادشاہ سلطان محمود کے داماد ہوئے۔ پہلا منوچہر بن قابوس ۴۰۳ھ و ۴۲۴ھ لیکن یہ شخص صاحب دیباچہ کا ہیرو نہیں، سلطان کا دوسرا داماد امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس مصنّف قابوس نامہ ہے۔ کیکاؤس ۴۱۲ھ میں پیدا ہوتا ہے عہد سلطان مودود ۴۳۳ھ و ۴۴۱ھ میں غزنین جاتا ہے اور انھیں ایام میں صبیہ سلطان محمود سے غالباً اس کی شادی ہوتی ہے اور عنقریب بعد تخت نشین ہو جاتا ہے۔ اب صاحب دیباچہ کی مراد اس کیکاؤس سے ہے کیونکہ وہ سلطان کا داماد ہونے کے علاوہ مرزبان بن رستم بن شروین کا دخترزادہ بھی ہے۔ قابوس نامہ میں امیر عنصر المعالی اپنے فرزند گیلان شاہ سے کہتا ہے:

وجدۂ مادرم دختر ملک زادۂ المرزبان بن رستم بن شروین کہ مصنف
مرزبان نامہ است وسیزدہم پدرش کیکاؤس بن قباد بود برادر ملک
نوشیران عادل و مادر تو فرزند ملک سلطان محمود بن ناصر الدین بودہ۔"

عنصر المعالی کا باپ امیر اسکندر ہے وہ کبھی بادشاہ نہیں ہوا۔ اگر صاحب دیباچہ کی مُراد عنصر المعالی سے ہے تو وہ فردوسی کی وفات سے جو ۴۱۱ھ میں مانی جاتی ہے ایک سال بعد پیدا ہوا اگر اس کے باپ اسکندر بن قابوس سے مُراد ہے تو وہ کبھی بادشاہ نہیں ہوا۔ یہ ہے معیار صاحب دیباچہ کی تاریخ دانی کا۔ خدا جانے

ایسے جاہل کو شبلی نے اپنا خضر راہ کیوں بنالیا۔

فردوسی کا اٹھتر اسی سال کی عمر میں قہستان، طبرستان، ماژندران اور بغداد جانا غیر اغلب معلوم ہوتا ہے دیباچۂ قدیم اس باب میں خاموش ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیباچے کے عہد تک فردوسی کے سفر کا قصہ اختراع نہیں ہوا تھا۔ صحیح صرف اس قدر ہے کہ وہ غالباً سجستان یا خراسان امیر ابوالمظفر نصر بن ناصر الدین سبکتگین برادر سلطان محمود کے پاس چلا جاتا ہے۔ شاہنامہ ان کی خدمت میں پیش کرتا ہے صلہ مانگتا ہے اور ساتھ ہی یہ التجا کرتا ہے کہ امیر سلطان سے بھی سفارش کرے چنانچہ شاہنامہ سے

چو سالار[۱] شہ ایں سخن ہائے نغز	بخواند بہ بیند بہ پاکیزہ مغز
ز گنجش من ایدر بوم شادماں	کزو دور بادا بد بد گماں
وزاں پس کند یاد بر شہر یار	مگر تخم رنج من آید ببار
کہ جاوید باد افسر و تخت اوے	ز خورشید تابندہ تر بخت اوے

(داستان خسرو شیریں جلد چہارم صفحہ ۱۰۴)

معلوم نہیں کہ فردوسی امیر نصر کے ہاں کامیاب رہا یا ناکام رہا؟

---

[۱] امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین متوفی ۴۱۲ھ جنھیں فردوسی "سالار شہ" کے خطاب سے یاد کرتا ہے ابتدا میں سپہ سالار خراسان مقرر ہوئے۔ بعد میں سجستان ان کو تفویض ہوا۔ ان کا سکہ ۴۰۴ھ کا ضرب سجستان لاہور میوزیم میں موجود ہے۔ بعض درموں پر صرف 'شاہ نصر' درج ہے۔ ایسے دو درم راقم کے مجموعۂ مسکوکات میں شامل ہیں۔ فردوسی کے ساتھ ان کے تعلقات بے حد خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ شاہنامے میں تین مختلف موقعوں پر ان کا ذکر آیا ہے۔ پہلے تمہید داستان شیریں خسرو میں جس سے اشعار بالا منقول ہیں۔ دوسرے دیباچۂ شاہنامہ میں۔ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵ پر ملاحظہ ہو)

بعض اوقات مولانا اپنے راویوں کے بیانات میں تصرف بیجا یا دخل بیجا بھی کرلیا کرتے ہیں جس کی ذمے دار ان کی سہل انکاری اور بے پروائی مانی جاسکتی ہے۔ اس قسم کی بعض مثالیں پیشتر گزرچکی ہیں ذیل میں تازہ مثال پیش ہے:-

"ایک دفعہ سلطان محمود ہندستان کی مہم سے واپس آرہا تھا راستے میں دشمن کا قلعہ تھا وہیں ٹھیر گیا اور قاصد بھیجا کہ حاضر خدمت ہو کر اطاعت بجالائے۔ دوسرے دن قاصد جواب لایا لیکن ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ محمود نے وزیراعظم سے کہا کہ دیکھ کیا جواب لایا ہے وزیر نے برجستہ کہا ؎

اگر جز بکام من آید جواب | من و گرز و میدانِ افراسیاب

محمود پھڑک اُٹھا اور پوچھا کس کا شعر ہے۔ وزیر نے کہا اُس بدقسمت کا جس نے ۲۵ برس خون جگر کھایا اور کچھ نہ حاصل ہوا۔ محمود نے کہا مجھ کو سخت ندامت ہے غزنین پہنچ کر یاد دلانا۔ غرض پائے تخت میں پہنچکر ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس روانہ کیں لیکن تقدیر پر کس کا زور ہے

(صفحہ ۱۲۴ کا بقیہ حاشیہ)

نخستین برادرش کہتر بسال | کہ در مردمی کس ندارد ہمال
بویژہ دلاور سپہ دار طوس | کہ در جنگ بر شیر دارد فسوس
زگیتی پرستندہٴ فر نصر | زید شاد در سایہٴ شاہ عصر

تیسرے مقام پر خاتمہٴ داستان اسکندر میں ؎

جہاں دار و سالار او میر نصر | کزو شادمانست گردندہ عصر
سپہ دار چوں بو المظفر بود | سر لشکر از ماہ برتر بود
کہ پیروز نامست و پیروز بخت | ہمی بگذرد کلک او از درخت

اِدھر شہر کے ایک دروازے سے جس کا نام رودبار تھا صلہ پہنچا اُدھر
دوسرے دروازے سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔"

(شعر العجم صفحہ ۱۰۹ و ۱۱۰)

یہ روایت فردوسی کے بہت قریب زمانے تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ ۵۱۴ھ میں نظامی نے امیر معزی سے سُنی اور معزی نے امیر عبدالرزاق سے۔ مَیں اس کے بعض خط و خال جو اصل روایت سے مختلف ہیں یہاں دکھاتا ہوں۔ نظامی نے لکھا تھا کہ ۵۱۴ھ میں مَیں نے یہ واقعہ سُنا مولانا نے حاشیہ میں اس کے بجائے ۵۱۲ھ لکھا۔ نظامی نے لکھا تھا کہ "محمود کے راستے میں کسی متمرد رئیس کی عملداری تھی جو ایک مضبوط قلعے کا مالک تھا اور محمود کا پڑاؤ دوسرے روز اسی قلعے کے نیچے تھا اِس لیے قاصد پیشتر روانہ کر دیا کہ رئیس کل حاضر ہو کر رسوم بندگی بجا لائے اور خلعت لے کر واپس چلا جائے۔ دوسرے روز محمود نے کوچ کیا خواجہ بزرگ بادشاہ کے دستِ راست پر چل رہا تھا کہ ایلچی واپس آتا اور سلطان کی طرف بڑھتا نظر آیا خواجہ سے سلطان نے پوچھا کیا جواب دیا ہوگا۔ خواجہ نے جواب میں شعر مذکورۂ بالا پڑھ دیا۔ اس بیان سے بعض جزئیات میں مولانا کو اختلاف ہے جہاں نظامی نے لکھا تھا کہ فردوسی نے پچیس سال محنت کی وہاں شبلی نے پندرہ سال لکھے، نظامی نے لکھا تھا کہ فردوسی کے لیے ساٹھ ہزار دینار کی نیل سرکاری اونٹوں پر بھجوائی۔ مولانا نے اِس کے بجائے ساٹھ ہزار اشرفیاں بھجوانا ظاہر کیا۔ اشرفی اور دینار میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ دینار ہمارے سکّوں میں ڈھائی تین رُپے کے برابر ہے اور اشرفی بچیس تیس رُپے کے۔ نہ اشرفیاں اس عہد میں رائج تھیں۔ نظامی کے ہاں شہر کا نام طبران اور اُس کے دوسرے دروازے کا نام رزان ہے مولانا نے ان ناموں کا ذکر تک نہ کیا۔ اگر ہم کسی

مصنف کے بیانات کے ساتھ اس طرح بے پروائی کریں اور یہ طریقہ کچھ دن جاری رہے تو اصلی روایت چند ہی روز میں بالکل مسخ ہو جائے گی۔ مثال کے لیے میں شعر مرقومہ بالا پیش کرتا ہوں کہ بے پروا اور غافل راویوں کے ہاتھوں اِس شعر میں اس قدر تصرف اور تغیر ہُوا ہی کہ فردوسی موجودہ حالت میں صرف ایک مصرع کا مالک رہ گیا ہی جس کا اثر روایت کے اعتبار پر بھی پڑتا ہی شاہنامے میں فردوسی نے دو طرح اِس کو لکھا ہی ؎

(۱) چو فردا بر آید بلند آفتاب من و گرز و میدان و افراسیاب

(شاہنامہ جلد اول صفحہ ۱۳۲ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

(۲) تجویم برین کینہ آرام و خواب من و گرز و میدان و افراسیاب

(جلد دوم صفحہ ۲۴۰ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

شبلی ارشاد کرتے ہیں :-

”ناصر خسرو نے سفرنامے میں لکھا ہی کہ ۴۳۰ھ میں جب میں طوس پہنچا تو ایک بڑی کارواں سرا دیکھی لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہُوا کہ فردوسی کے صلے سے تعمیر ہوئی ہی۔ فرہنگ رشیدی اور چہار مقالے میں لکھا ہی کہ اس کا نام چاہ ہی اور مرو اور نیشاپور کے راستے میں ہی۔“

(شعرالعجم صفحہ ۱۱۱)

ناصر خسرو کا سفرنامہ مؤلفۂ مولانا الطاف حسین حالی طبع ۱۸۸۲ء میری زیرِ نظر ہی اس میں رباط چاہ یا کسی اور رباط کا جو فردوسی کے صلے سے تعمیر ہوئی ہو مطلق ذکر نہیں۔ شبلی اپنی اقتباسات کو ایک بے پروائی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھتے ہیں خدا جانے کہاں سے حوالہ لیا اور کس کے نام سے لکھا۔ مولانا نے بسم اللہ ہی غلط کی۔ ناصر خسرو کا سفر ۴۳۷ھ سے شروع ہوتا ہی اور آپ فرماتے

ہیں کہ ۴۳۷ھ میں ناصر خسرو طوس پہنچا مرو سے حکیم ناصر خسرو ۲۳ شعبان ۴۳۷ھ کو
نیشاپور کے ارادے سے نکلا اور سرخس ہوتا ہُوا شنبہ گیارہ شوال سال مذکور کو نیشاپور
پہنچ گیا۔ سرخس اور نیشاپور کے راستے میں طوس[۵۱] جہاں رباط چاہ بتائی جاتی ہو نہیں
آتا اِسی لیے حکیم مذکور نہ طوس اور نہ اس کی رباط کا ذکر کرتا ہو اس کے الفاظ
یہ ہیں :۔

"پس بمرو رفتم و ازاں شغل کہ بعہدۂ من بود معاف خواستم و گفتم کہ مرا عزم
سفر قبلہ است پس حسابیکہ بود جواب گفتم و از دُنیاوی آنچہ بود ترک کردم
الا اندک ضروری و بست وسوم شعبان بعزم نیشاپور بیروں آمدم و از مرو
بسرخس شدم کہ سی فرسنگ باشد و از آنجا بہ نیشاپور چہل فرسنگ است
روز شنبہ یازدہم شوال در نیشاپور شدم چہار شنبہ آخر ایں ماہ کسوف بود
و حاکم زماں طغرل بیگ محمدؐ بود برادر جغری بیگ"۔ (سفرنامہ صفحہ ۳۴)

فرماتے ہیں :۔

"نظامی عروضی کا بیان ہو کہ علی دیلمی شاہنامے کا مسودہ صاف کیا کرتا تھا
اور بودلف راوی تھا یعنی شاہنامہ حفظ یاد رکھتا تھا اور جلسوں اور صحبتوں
میں لوگوں کو سُناتا تھا لیکن شاہنامہ میں فردوسی نے ان دونوں کا نام

---

[۵۱] سرخس اور نیشاپور کے راستے کی منزلیں حسب ذیل ہیں :۔
سرخس سے رباطِ آبگینہ (چھ فرسنگ) رباطِ آبگینہ سے رباطِ توران (سات فرسنگ) رباطِ توران
سے رباطِ ماہی (سات فرسنگ) رباطِ ماہی سے رباطِ سنگ بست (چھ فرسنگ) رباطِ سنگ بست
سے دیہہ خاکستر (تین فرسنگ) دیہہ خاکستر سے دیہہ باد (پانچ فرسنگ) دیہہ باد سے نیشاپور (سات فرسنگ)
ان منازل میں جو میں نے نزہت القلوب حمد اللہ مستوفی سے لی ہیں معلوم ہوتا ہو کہ شہر طوس راستے میں
نہیں آتا۔

اس انداز سے لیا ہی جس سے ظاہر ہوتا ہی کہ وہ فردوسی کے سرپرست
اور مربی تھے کاتب اور راوی نہ تھے ؎

ازاں نامور نامداران شہر علی دیلم و بودلف راست بہر

بودلف کی نسبت قاضی نور اللہ شوستری کا قیاس ہی کہ یہ وہ بودلف
ہی جو ایک محتشم رئیس تھا جس کے نام پر اسدی طوسی نے گشتاسپ نامہ
(کذا) اور دیباچے میں اس کی مدح وثنا کی ہی ؎

ملک بودلف شہر یارِ زمیں جہاں دار آرائی پاک دیں
بزرگے کہ باآسماں ہمسراست زنسلِ براہیم پیغمبر است
(شعر العجم صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶)

شاہنامے میں بودلف کا ذکر یوں آتا ہی ؎

ازاں نام ور نام داران شہر علی دیلمی بود کو راست بہر
کہ ہموارہ کارم بخوبی رواں ہمی داشت آں مرد روشن رواں

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ "بود کو" کے بجائے بودلف چاہیے۔ میں یہ بھی
اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ علی دیلم اور بودلف ایک ہی شخص معلوم ہوتے ہیں علی اس
کا نام اور کنیت بودلف ہی کیونکہ شعر مابعد میں ضمیر اور فعل واحد آئے ہیں اور کوئی
تعجب نہیں اگر وہ کاتب ہو۔ جو اسمائے صفات اس کے لیے استعمال ہوئے
ہیں مثلاً "راست بہر" اور "آں مرد روشن رواں" ان سے ظاہر ہی کہ وجاہتِ
دُنیاوی کے لحاظ سے علی دیلمی کوئی موقر رتبہ نہیں رکھتا تھا۔ میں قاضی صاحب
کے نظریے میں شریک نہیں ہو سکتا کیونکہ کنیت کی مماثلت اوّل تو کوئی وقیع اور
وزنی دلیل نہیں ہو سکتی علاوہ بریں گرشاسپ نامۂ اسدی جیسا کہ اسدی
کے حالات میں دکھایا جاچکا ہی ۵۸ھ میں تصنیف ہوتا ہی۔ بُعدِ زمانی کے

علاوہ مراتبِ دنیاوی میں اختلاف ایک کو دوسرے سے امتیاز دینے کے لیے کافی ہو۔

تاریخِ عجم پر بعض قدیم عربی تراجم و تصنیفات کے نام گنا کر علامہ شبلی فرماتے ہیں:-

"ان تمام قرائن اور تصریحات سے ثابت ہوتا ہو کہ فردوسی کا ماخذ زیادہ تر ایران کی وہ تاریخیں ہیں جو عربی میں ترجمہ ہو گئی تھیں لیکن فردوسی کا قومی غرور عرب کے احسان کو گوارا نہیں کرتا۔ فردوسی کا دعویٰ ہو کہ قدیم زمانے کی ایک نہایت مبسوط تاریخ ایران کی موجود تھی لیکن مرتب اور مدوّن نہ تھی۔ موبدوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزا تھے۔ ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بڈھے بڈھے پرانے موبد جمع کیے اور ان پراگندہ اجزا کو زبانی روایتوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مکمل کتاب تیار کرائی"

(شعر العجم صفحہ ۱۲۳)

فردوسی کو اس کے قومی غرور کے اثرات میں عربوں کی احسان ناشناسی کا ملزم قرار دینے میں مولانا شبلی صریح بے انصافی سے کام لے رہے ہیں اس لیے کہ عربوں کے احسان کا کوئی سوال یہاں شروع ہی سے پیش نہیں آتا۔ تاریخِ ایران پر تراجم و تالیفات کرنے والے تمام تر ایرانی تھے عربی زبان اس عہد کے ایران کی علمی و ادبی زبان تھی۔ عبداللہ بن المقفع۔ محمد بن جہرم البرمکی۔ ہشام بن قاسم سپاہانی۔ بہرام شاہ بن مردان شاہ۔ بہرام بن بہرام سپاہانی۔ بہرام الموبد۔ نادویہ بن شاہویہ اصفہانی۔ طبری۔ مسعودی۔ ابو حنیفہ دینوری۔ موسیٰ بن عیسیٰ الخسروی۔ ابوالموید بلخی قریب قریب تمام ایرانی اور ایران زا ہیں۔ فردوسی کو اپنے ملکی

بھائیوں کی تصنیفات سے امداد لینے میں قومی غرور کیوں مانع آتا۔ نہ عربی ذرائع کا نظر انداز کرنا فردوسی کے لیے ممکن تھا۔ مثلاً سکندر کے حالات شاہنامے میں اسلامی روایت کے مطابق ہیں جو کسی پہلوی نسخہ سے منقول نہیں ہو سکتے۔ مجوسیوں کے ملعون اور مردود سکندر اور فردوسی کے سکندر میں جو خانۂ کعبہ کی زیارت کو بھی جاتا ہی بڑا فرق ہی۔

رہا یہ امر کہ فردوسی نے عربی تصنیفات سے زیادہ کام کیوں نہیں لیا۔ اس کے جواب تو بہت ہو سکتے ہیں لیکن میں اس کی استطاعت ماحول اور زمانے کی مشکلات کا مختصر سا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ تعلیم ہمارے زمانے کی طرح اِن ایام میں عام نہیں تھی اس لیے کتابوں کا عزیز الوجود ہونا لازمی تھا۔ علمی کتابوں کا ہر مقام پر دستیاب ہونا بھی دشوار تھا۔ سامانی شاہی کتب خانے میں اگر یہ تمام ذخیرہ موجود تھا تو فردوسی جیسے غریب شاعر کے لیے اس تک رسائی معلوم۔ شاہنامے کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کے مقصد سے اِس نے بلخ بخارا اور ہرات وغیرہ شہروں کا سفر بھی کیا ہی۔ سیاحوں اور شائقین کے لیے سفر کرنا اور اپنی تلاش جاری رکھنا اِن ایام میں دشوار تھا۔ خراسان پر تین زبردست شخص اپنا استحقاق جتا رہے تھے اور اپنے حقوق کی محافظت میں ایک دوسرے کو زبانِ شمشیر سے جواب دے رہے تھے۔ حسام الدولہ ابو العباس تاش سپہ سالار ابو علی سیمجوری اور فائق بدنصیب خراسان کے طاقت ور دعویدار تھے۔ جنگ و فساد کی آگ ہر طرف بھڑک رہی تھی ؎

زمانہ سرائے پُر از جنگ بود — بجویندگاں بر جہاں تنگ بود

(شاہنامہ جلد اوّل صفحہ ۳)

فردوسی کو اپنی تصنیف کے لیے کسی معتبر اور مکمل تصنیف کی ضرورت تھی

جو تمام قصص و افسانہ و تاریخِ ایران پر حاوی ہو۔ مورخ کو اپنے تاریخی سرمایہ کے لیے قدیمی ذرائع بھی درکار ہیں اِس ضرورت سے اِس نے اپنے آپ کو زردشتی روایات کا پابند کر لیا چنانچہ ایسی ہی کتاب پسند کی جس کے راوی اور مدون پارسی اور مجوسی تھے۔ فردوسی کا یہ قول کہ قدیم تاریخ ایران ایک پریشان اور بے ترتیب حالت میں تھی میری رائے میں بالکل صحیح ہے۔ شبلی نے جس قدر تصانیف کا نام لیا ہے ان کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ عربی ذرائع تاہم فردوسی کے مقصد کے لیے نا مکمل تھے۔ فردوسی خود باوجود جد و جہد تمام سلسلۂ روایاتِ ایران پر حاوی نہ ہو سکا۔ اگرچہ نامۂ خسرواں کے علاوہ متعدد مقامات پر زندہ راویوں سے بھی مدد لی پھر بھی کئی داستانیں فردوسی سے چھوٹ گئیں مثلاً گرشاسپ نامے کی داستانیں فردوسی کو دستیاب نہیں ہوئیں چنانچہ (اسدی) ؎

بشہنامہ فردوسی نغز گوی	چو از پیش گویندگاں بردگوی
بسے یاد رزمِ یلاں کردہ بود	وزیں درسخن یاد نا وردہ بود
نہالے بدایں رستہ ہم زاندرخت	شدہ خشک و بے بار و پژمردہ سخت[1]

ابو علی بلعمی بھی کہتا ہے کہ گرشاسپ کی داستان ابو المؤید بلخی نے اپنے شاہنامۂ بزرگ میں مفصل بیان کی ہے علیٰ ہذا شہریار نامہ اور بہمن نامے کے واقعات ہیں جو فردوسی کی نظر سے نہیں گزرے اور سلجوقی عہد میں دوسرے شعرا نے ان کو نظم کیا۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ایران کی تاریخ پر کوئی سندی اور جامع کتاب موجود نہیں تھی اس کے علاوہ پہلوی اور عربی زبانوں میں چھوٹے چھوٹے رسالے اور داستانوں کا وجود کافی شہادت ہے اس خیال کی کہ سلسلۂ روایات ایران کی مکمل تدوین نہیں ہوئی تھی جستہ جستہ داستانیں مثلاً شہزاد و پرویز۔ کارنامۂ اردشیر

---

[1] گرشاسپ نامۂ حکیم اسدی ص ۱۰ و ۱۱ طبع آقا میرزا محمد ملک الکتاب۔ بمبئی ۱۳۰۷ھ

مزدک نامہ، گنج شایگان، شطرنج نامہ، کارنامک ارتخشتر، یادگار زریران، اندرز خسرو قباتان ثابت کرتی ہیں کہ تاریخ عجم ایک منتشر حالت میں تھی اور اس کی داستانیں مختلف لوگوں کے پاس ملتی تھیں ؎

پراگندہ در دست ہر موبدے　　　　وزو بہرہ بردہ ہر بخردی

(شاہنامہ جلد اوّل صفحہ ۳)

فردوسی کا یہ دعویٰ کہ ایک دہقان رئیس نے پُرانے موبدوں کو جمع کرکے ایران کی تاریخ پر ایک کتاب تدوین کی بالکل راست معلوم ہوتا ہے۔ دیباچۂ قدیم شاہنامہ اس بارے میں کافی روشنی ڈالتا ہے ابومنصور عبدالرزاق کے ذکر میں اس دیباچے میں لکھا ہے :۔

"ابومنصور عبدالرزاق[۱] مردے بود با فر و خوش کام و بزرگ اندر کام روائی و با دستگاہی تمام از بادشاہی و اندیشہ بلند داشت و بگوہر از تخم گردان ایران بود ...... از روزگار آرزو کرد تا اورا نیز یادگارے باند دریں جہاں پس دستور خویش ابومنصور المعمری را بفرمود تا بخداوندان کتب نامہ کرد و کس فرستاد از دہقان و فرزانگان و جہاں دیدگان از شہرہا بیاوردند و چاکرا و ابومنصور المعمری را بفرمود تا نامہ گرد کرد و کس فرستاد بشہرہائے خراسان و ہشیاران را از آنجا بیاورد از ہر جائے چوں شاخ (ماخ ؟) پسر خانی (؟) از

[۱] بقول گردیزی اس کا نام ابومنصور محمد بن عبدالرزاق ہے۔ اس کے ابتدائی حالات معلوم نہیں۔ عبدالملک بن نوح سامانی ۳۴۳-۳۵۰ھ کے عہد میں امیر ابوالحسن محمد بن ابراہیم کے عزل پر جمادی الآخر ۳۴۹ھ میں اس کو سپہ سالار خراسان بنا دیا گیا۔ لیکن الپتگین (بانی خاندان غزنہ) کو خوش رکھنے کے واسطے اسی سال ذیحجہ میں یہ منصب اس سے لے کر الپتگین

(بقیہ صفحہ ۱۳۴ پر)

ہرات وچوں یزداں داد پسر شاپور از سیستان و ماہوی خورشید پسر بہرام
از شاپور (نیشاپور) و شادان پسر برزین از طوس و بنشاندند بفرا آوردن
این ناہما (از کیومرث) نخستین کہ اندر جہاں آمد او بود کہ آئین مردے
آورد و مردمان را از جانوراں پدید کرد تا یزدگرد کہ آخر ملوک کیان بود
اندر ماہ محرم کہ سال برسی صد و چہل و شش (بود) از ہجرت خواجہ دنیا

(صفحہ ۱۳۳ کا بقیہ)

کو دے دیا گیا۔ ابومنصور واپس طوس چلا گیا۔ منصور بن نوح ۳۵۰ - ۳۶۶ھ کے زمانے میں غزنی کی طرف فرار کرتے وقت الپتگین خراسان اسی ابومنصور بن عبدالرزاق کے حوالے کر گیا۔ ادھر دربار بخارا سے وہ الپتگین کی مزاحمت اور گرفتاری کے واسطے مقرر ہوا۔ ابومنصور نے اپنی فوج تعاقب میں بھیجی مگر الپتگین ہاتھ نہ آیا۔ اگرچہ دربار بخارا نے ابومنصور کو سپہ سالار خراسان بنانے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن اس کو یقین نہ آیا اور کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ مرو کی طرف بڑھا۔ شہر کے دروازے اس پر بند کر دیے گئے۔ اس نے غارت گری شروع کر دی۔ باورد اور نسا پہنچا۔ حاکم نسا کے ورثا سے بہت مال وصول کیا۔ آخر وشمگیر نے یوحنا طبیب کو ہزار دینار رشوت دے کر اس کو زہر دلوا دیا۔ سامانیوں نے امیر ابوالحسن محمد بن ابراہیم مذکور کو دوبارہ سپہ سالار خراسان بنا کر ابومنصور کی سرکوبی کو روانہ کیا۔ جنگ قائم ہونے پر زہر اپنا اثر کر چکا تھا۔ بینائی تک زائل ہو گئی۔ شکست کے بعد اس کے آدمیوں نے اسے لے جانا چاہا مگر اس کی حالت اس قدر غیر ہو چکی تھی کہ خود اس نے کہا کہ میرے لیے راحت اسی میں ہے کہ تم مجھے یہیں چھوڑ جاؤ۔ چنانچہ اس کو میدانِ جنگ میں چھوڑ دیا گیا۔ عین اس وقت ایک سقلابی غلام جو احمد بن منصور بن قراتگین کی فوج سے متعلق تھا پہنچا۔ اس نے سب سے پہلے اس کا سر کاٹا پھر انگلی سے انگوٹھی اُتاری اور اپنے افسر کے پاس لے گیا۔ ابومنصور کا قتل ۳۵۰ھ میں تصور کرنا چاہیے۔

دعقبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم و ایں را شاہنامہ نام نہاد"

دیباچۂ قدیم کا یہ بیان فردوسی کے قول کی پوری پوری تصدیق کرتا ہی اور یہی شاہنامہ فردوسی کا قدیمی ماخذ ہی جس کا نسخہ اس کے مہربان دوست نے بہم پہنچایا تھا۔

قولہ "سامانیوں (کذا) کو ایران کی تاریخ مرتب کرنے کا ہمیشہ خیال رہا۔ ان میں سے نوشیرواں کو سخت شغف تھا۔ چنانچہ تمام اطراف و دیار میں قاصد بھیج کر ہر جگہ سے تاریخی ذخیرے جمع کیے۔ یزدگرد نے اپنے زمانے میں ان سب کو دانشور دہقان کے حوالے کیا کہ کیومرث سے لے کر خسرو پرویز کے زمانے تک مکمل اور مرتب تاریخ تیار کر دے۔ دانشور مذکور مدائن کے رؤسا میں تھا اور نہایت صاحبِ حوصلہ اور فاضل شخص تھا اس نے ان تمام ذخیروں کو عمدگی سے ترتیب دے کر ایک مبسوط اور جامع تاریخ تیار کی۔ (شعرالعجم صفحہ ۱۲۵)

تاریخ ایران کے متعلق نوشیرواں کا اشتیاق اور اس کے لیے ذخیرہ جمع کرنے کا ذکر کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ علیٰ ہذا دانشور دہقان اور اس کی کتاب تدوین کرنے کا قصہ بھی کتبِ تواریخ میں نہیں ملتا۔ فردوسی نے شاہنامے میں نوشیرواں کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں اُس کی دانشمندی اور دانائی کی بڑی تعریف کی ہی لیکن واقعۂ بالا کا ذکر نہیں کیا۔ شاہنامے سے اس قدر معلوم ہوتا ہی کہ ہرمز پسرِ نوشیرواں عادل نے قید کے ایام میں اپنے فرزند خسرو پرویز سے درخواست کی کہ وہ ایک فوجی آدمی جس کو پرانی جنگوں کے قصے یاد ہوں بھیج دے اور ایک بوڑھا آدمی جو بادشاہوں کے حالات میں دستگاہ رکھتا ہو ان کی نوشتہ تاریخ لائے۔ (شاہنامہ)

دیگر سوارے ز گردن کشاں — کہ از رزم دیرینہ دارد نشاں

برمن فرستی کہ از کارزار — سخن گوید و کردہ باشد شکار
ہماں نیز دانندہ مردی کہن — کہ از شہر یاران گزارد سخن
نوشتہ یکے دفتر آرد مرا — بداں درد و سختی سرآید مرا
(ص ۱۶۷۳ بمبئی)

قولہ:۔ "رستم و شغاد کا قصہ جہاں شروع کیا ہی تمہید میں لکھا ہی کہ احمدؒ بن سہل کے دربار میں ایک بڈھا تھا جو سام نریمان کی اولاد سے تھا اس کے پاس ایران کی تاریخ تھی اور رستم کی اکثر داستانیں اس کو زبانی یاد تھیں شغاد کا قصہ میں نے اس سے لے کر نظم کیا۔" (شعر العجم ص ۱۱۸، سنہ ۱۳۳۹ھ)

مولانا کے آخری جملے کی کسی قدر تشریح ضروری ہی۔ فردوسی نے لکھا ہی مصرع بگویم سخن آنچہ زو یافتم۔ بظاہر شاعر کا مطلب روایت شفاہی سے ہی اگرچہ آزاد سرو اور فردوسی کی ملاقات ان کے زمانوں کے تفاوت کو دیکھتے ہوئے مشکل معلوم ہوتی ہی۔

احمدؒ بن سہل جس کے پاس آزاد سرو تھا بقول زین الاخبار اصیلانِ عجم سے ہی جزرتج میں جو مرو کے عمدہ مواضعات سے ہی ان کا خاندان آباد تھا۔ احمد کا باپ سہل بن ہاشم نجوم میں بڑا کامل تھا۔ احمد کے تین بھائی تھے فضل۔ حسین اور محمدؒ۔ سہل سے کسی نے پوچھا کہ تم نے اپنے فرزندوں کا طالع بھی دیکھا ہو۔ اس نے جواب دیا کیا دیکھوں، تینوں ایک ہی دن میں عربوں کی حمایت میں مارے جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب احمد بڑا ہوا اس نے اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کی ٹھانی۔ اس کے پاس ہزار آدمی جمع ہو گئے۔ عمروؒ بن لیث نے اس کو بلوا کر قید میں ڈال دیا آخر حمام کے بہانے فرار ہو کر مرو پہنچا اور فوج جمع کر کے عمرو کے عامل کو گرفتار کر لیا پھر اسمٰعیل بن احمدؒ سامانی کے پاس بخارا چلا گیا۔ جب ۲۸۹ھ میں خراسان پر اسمٰعیل کا قبضہ ہوا، نیشاپور احمد بن سہل کے حوالے ہوا۔ اس کے ہاتھ سے بڑے بڑے

کام نکلے۔ اسمٰعیل کے جانشین احمد بن اسمٰعیل ۲۹۵ھ و ۳۰۱ھ کے عہد میں بھی معزز و مکرم رہا۔ امیر نصر ۳۰۱ھ و ۳۳۱ھ کے دور میں جب حسین بن علی نے بغاوت کی احمد اس کی سزادہی کے لیے مامور ہوا۔ پہلے اس نے ہرات حسین کے بھائی سے چھینا پھر حسین کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد ایسے واقعات پیش آئے کہ خود احمد بن سہل باغی ہو گیا۔ اس نے امیر نصر کا نام خطبے سے موقوف کر دیا۔ قراتگین امیر گرگان نے اس پر چڑھائی کی۔ احمد بن سہل نیشاپور چھوڑ کر مرو چلا آیا اور قلعہ حصین تعمیر کیا۔ بخارا سے اس کی سرکوبی کے واسطے حمویہ بن علی آیا۔ اس نے ایسی ایسی چالیں چلیں کہ احمد بن سہل تمام حزم و احتیاط بالائے طاق رکھ کر قلعہ سے نکلا اور اپنے حریف سے جنگ کرنے میدان پہنچ گیا۔ دریا کے کنارے گھمسان کا معرکہ ہوا اس کی فوج شکست کھا کر بھاگ گئی۔ احمد تنہا لڑتا رہا۔ گھوڑا مارا گیا۔ پیدل ہو کر لڑا اور پکڑا گیا۔ بخارا لے جا کر قید میں ڈال دیا گیا جہاں ۳۰۷ھ میں اس نے وفات پائی۔

آزاد سرو احمد بن سہل کا ساتھی فردوسی سے ملاقات کے وقت تقریباً سو یا سو سے زیادہ عمر کا ہوگا۔ ان کی ملاقات ۳۶۵ھ اور ۳۷۰ھ کے درمیان ہونی چاہیے جب فردوسی شاہنامے کے واسطے ذخیرے کی تلاش میں مختلف شہروں کا سفر اختیار کرتا ہے۔

قولہ "عربوں کے حملے میں یہ کتاب حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کی گئی آپ نے اس کا ترجمہ سُنا اور فرمایا کہ یہ مزخرفات کا مجموعہ دیکھنے کے قابل نہیں۔ غرض یہ کتاب لوٹ میں تقسیم ہو کر حبش پہنچی۔ بادشاہِ حبش نے اس کا ترجمہ کرایا۔ وہاں سے ہندستان پہنچی۔ یعقوب لیث نے اپنے زمانۂ حکومت میں اس کو ہندستان سے منگوا کر ابو منصور عبدالرزاق

بن عبدالرزاق بن عبداللہ فرخ کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے
چنانچہ تاج بن خراسانی ہروی یزداں داد شاپور سیستانی، ماہوی
بن خورشید نیشاپوری، سلیمان طوسی ان سب نے مل کر اس کا ترجمہ کیا
یہی کتاب سامانیوں کو ہاتھ آئی اوران کے حکم سے دقیقی نے اس کو
نظم کرنا شروع کیا۔ اس روایت کا یہ حصّہ کہ کتاب حبش گئی، وہاں
ترجمہ ہوکر پھر ہندستان پہنچی ہندستان سے ایران میں آئی صریح غلط
اور بیہودہ ہے باقی واقعات صحیح ہوں تو عجب نہیں "

(شعر العجم صفحہ ۱۲۵ و ۱۲۶)

شکر ہے کہ اس موقعے پر شبلی نے اپنے مایۂ ناز دیباچے کے خلاف کسی قدر صدا بلند تو کی لیکن میں ان باقی واقعات پر نظر ڈالتا ہوں۔ صاحب دیباچہ نے یعقوب بن لیث کو ایک صدی پایۂ فردوین میں رکھا۔ یعقوب ۲۶۵ھ میں رہگزائے ملکِ عدم ہوتا ہے۔ بھلا ۳۶۰ھ میں یعقوب اپنی قبر سے اُٹھ کر ابومنصور عبدالرزاق کو حکم دینے کہاں سے آگیا، صاحب دیباچہ کو اپنے قصّوں کے توڑ جوڑ میں تاریخ کا لحاظ نہیں رہا۔ ابو منصور عبدالرزاق نے ترجمے کا حکم نہیں دیا بلکہ تدوین اور تصنیف کا۔ اس معاملے میں دیباچۂ قدیم اور شاہنامہ دونوں متفق ہیں ۳۴۶ھ میں یہ تصنیف تیار ہوئی تھی نہ ۳۶۰ھ میں۔ تاج خراسانی کو دیباچہ قدیم میں شاخ پسر خانی لکھا ہے لیکن شاہنامے میں اس کا نام "ماخ" ہے ؎

یکے پیر بد مرزبانِ ہری	پسندیدہ و دیدہ از ہر دری
جہاں دیدہ و نام او بود ماخ	سخندان با برگ و با برز و شاخ
بپرسیدمش تا چہ دارد بیاد	ز ہرمز کہ بنشست بر تخت داد

(بادشاہی ہرمز و انوشیرواں جلد چہارم صفحہ ۲۵)

فردوسی نے اس سے داستانِ ہرمز حاصل کی۔ مولانا کا سلیمان طوسی دیباچۂ بایسنغری میں سلیمان بن نورین ہو مگر دیباچۂ قدیم میں صاف شادان پسرِ برزین ہو مزید شہادت کے لیے شاہنامہ موجود ہو۔ بیت

نگہ کن کہ شادان برزین چہ گفت　　　بدانگہ کہ بکشاد راز از نہفت

(فرستادن نوشیرواں برزوی پزشک را بہ ہندستان برائے آوردن داروی شگفت و فرستادن برزوکتاب کلیلہ و دمنہ را نزد او (جلد چہارم صفحہ ۳۴)

گویا شادان بن برزین کے حوالے سے داستانِ کلیلہ و دمنہ فردوسی نے لکھی ہو۔ مولانا کے بیان کا یہ حصہ کہ یہ کتاب سامانیوں کے ہاتھ آئی اور ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا ذرا غور طلب ہو۔ خدا جانے صاحب دیباچہ نے یہ بیان کہاں سے اخذ کیا۔ اگر صحیح ہو تو مولانا شبلی فردوسی پر عربیوں کے احسان نہ ماننے کے معاملے میں ناحق ناراض ہوئے جب سامانی اور دقیقی اس کو مستند کتاب مانتے آئے ہیں تو پھر فردوسی نے معتبر مان کر اپنے شاہنامے کی بنیاد اگر اسی کتاب پر ڈالی تو کیا قصور کیا۔

خور فیروز کا سلطان محمود کی خدمت میں تاریخ عجم پیش کرنا یا پادشاہ کرمان کا مورخ آذر برزین کو جو عجم کی تاریخ پر سب سے بڑے سرمائے کا مالک تھا سلطان کے دربار میں روانہ کرنا ضعیف روایتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بات البتہ صاف ہو وہ یہ ہو کہ محمود کو تاریخ ایران سے کوئی خاص ذوق یا لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔ شبلی فرماتے ہیں :۔

> ایران میں عربی بہایت شدت سے مخلوط ہو گئی تھی عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا اس کے چار شعر آج موجود ہیں جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں۔ رودکی اور ابوشکور وغیرہ کا

کلام عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہی سلطان محمود کے زمانے میں ایک فاضل
نے شاہنامے کے جواب میں عمرنامہ ایک کتاب نثر میں لکھی تھی وہ
ہماری نظر سے گزری ہو اس کا بھی یہی حال ہو اسی زمانے میں شیخ بو علی
سینا نے حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی
میں لکھی جائے لیکن عہدہ برآ نہ ہوسکا۔ (شعر العجم صفحہ ۱۴۲)

ایران میں شروع ہی سے عربی کا شدت سے مخلوط ہونا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ عباس مروزی کے اشعار اس بارے میں سند نہیں مانے جاسکتے متاخرین کے ہاتھوں ان میں اس قدر ترمیم ہوگئی ہو کہ قدامت کی بو تک باقی نہیں رہی رودکی کے متعلق مولانا کو جو سہو ہی وہ ظاہر ہی قطران تبریزی کے قصائد کی بنا پر ایسا فرماتے ہیں لیکن وہ سلجوقی عہد کی زبان ہو اس دور میں عربی فارسی زبان میں بہت دخیل ہوگئی تھی۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر مولانا نے یہ نظریہ قائم کیا کہ دقیقی فارسی زبان کے گلزار کو عربی الفاظ کے خس و خاشاک سے پاک کرنے والا ہی۔ رہا ابو شکور بلخی اس کے کلام کا جس قدر نمونہ شعر العجم صفحہ ۵۴ و ۵۵ میں دیا گیا ہو اس میں عربی کا ایک لفظ بھی قسم کھانے کو نہیں ملتا۔ عربی کا اثر ابتدا میں فارسی پر کچھ نہیں تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ اثر بتدریج ترقی کرتا گیا حتیٰ کہ پانچویں اور چھٹی صدیوں میں اس نے ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا۔ عمرنامہ اور حکمت علائیہ ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں اس لیے کہ وہ پانچویں صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں اور نثر میں ہیں حکمت علائیہ کی نسبت یہ خیال کہ شیخ بو علی سینا نے خالص فارسی میں لکھنے کا قصد کیا مجھ کو غیر تاریخی معلوم ہوتا ہی کیوں کہ اول تو فلسفیانہ اصطلاحات کی فارسی زبان میں غیر موجودگی کی بنا پر ایسا قصد کرنا دیوانگی سے کم نہیں تھا۔ دوسرے شیخ نے اس تصنیف میں ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا وہ صرف یہ کہتا ہو:-

"باید کہ من خادم ایں مجلس بزرگوار کتابے تصنیف کنم بپارسی کہ اندروے اصلہا و نکتہاے ونج علم از علماے پیشینگان گرد آورم بغایت مختصر"
(مایۂ دانشش علائی مطبع فیروز دکن)

علامہ شبلی فردوسی کی شاعری پر خیال آرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-
"سہراب اب سپہ گری چھوڑ کر عشق کا دم بھرنے لگا۔ دیکھو فردوسی اس کی نالہ و زاری کو کس طرح ادا کرتا ہی ؎

همی گفت از اں پس دریغا دریغ — کہ شد ماہ تابندہ در زیر میغ
غریب آہوے آدم در کمند — کہ از بند جست و مرا کرد بند
زہی چشم بندی کہ آں پر فسوں — بہ تیغم نخست و مرا ریخت خوں
ندانم چہ کرد آں فسوں گر بمن — کہ ناگہ مرا بست راہ سخن
بہ زاری مرا خود بباید گریست — کہ دلدار خود را ندانم کہ کیست
همی گفت دمی سوخت از غم بسے — نمی خواست رازش بداند کسے
و لے عشق پنہاں نماند کہ راز — بروم نماید ہمی اشک باز
غم جاں برآرد خروش از دروں — اگر چند عاشق بود ذو فنوں

ان شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہی شاعرانہ ترکیبیں یہی ہیں ع کہ از بند جست و مرا کرد بند
ع بہ تیغم نخست و مرا ریخت دخوں
یہ سب کچھ ہی لیکن فردوسی اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ سہراب کی داستان لکھ رہا ہی محمد شاہ و واجد علی شاہ کی نہیں اس لیے فوراً سہراب کو ہومان کی زبان سے نصیحت کرتا ہی اور دیکھو ایک حوصلہ مند فاتح کی نصیحت کا کیا انداز ہی ؎

ازاں کار ہوماں نبودش خبر | کہ سہراب راہست خوں درجگر
ولے از فراست بدل نقش بست | کہ او را پریشانیے داد دست
بدام کسے پائے بند آمدہ است | ز رُشفے بتی در کمند آمدہ است
نہاں می کند درد و خونیں دلست | ہوس میرود راہ و پا در گلست
یکے فرصتے جست و گفتش براز | کہ اے شیر دل گرد گردن فراز
فریب پری پیکرانِ جواں | نخواہد کسے کو بود پہلواں
نہ رسم جہانگیری و سروری است | کہ از مہر ماہی بباید گریست
ز توراں بکارے بروں آمدیم | شناور بہ دریائے خوں آمدیم
اگر چند ایں کار باشد بکام | ولے ہست در پیش رنجے تمام
بباید شہنشاہ کاؤس و طوس | چو رستم کہ بر شیر دارد فسوس

پھر بہت سے ایرانی پہلوانوں کے نام گنا کر کہتا ہے

تو ئی مرد میدان ایں سر و رہ | چہ کارت بہ عشقِ پری پیکراں
تو کارے کہ داری نبردی بسر | چرا دست یازی بکارِ دگر
بہ نیروی مردی جہاں را بگیر | ز شاہاں بدست آر تاج و سریر
چو کشور بدستِ تو آید فراز | بہر جائے خوباں برندت نماز
ازاں گفتہ سہراب بیدار شد | دلش بستہ بند پیکار شد
بگفت اے سرِ نام دارانِ چین | بگفتار خوبت ہزار آفریں
شد ایں گفت تو داروے جانِ من | کنوں با تو نو گشت پیمانِ من
جہاں را سراسر چہ خشک و چہ آب | در آرم بفرمان افراسیاب
بگفت این و دل راز دلبر بکند | بر آمد بر افراز تخت بلند

دیکھو ایک شجاع دامِ عشق میں اتفاقاً پھنس بھی جاتا ہے تو کس طرح

جلد چھوٹ کر نکل جاتا ہو۔ فردوسی نے موقع پاکر عشقیہ شاعری کا کمال بھی دکھلا دیا۔" (شعر العجم صفحہ ۱۴۹، ۱۵۱، طبع سوم)

سطور بالا میں مولانا کی نکتہ سنجیاں قابل ستایش ہیں لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہو کہ اس موقعے پر مولانا کسی نامعلوم شاعر کے کلام کی داد دینے میں مصروف ہیں کیونکہ یہ تمام اشعار الحاقی ہیں فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور بعد میں کسی نے اضافہ کر دیے ہیں یہ اصل میں چھپن اشعار کا ایک قطعہ ہو جو ؎

ہمی جست گرد آفرید و ندید — دلش مہر پیوند او برگزید

سے شروع ہوکر

ازاں شاد شد شاہ توراں زمیں — ہمی کرد سہراب را آفریں

پر ختم ہوتا ہو اور اِن اشعار کے درمیان واقع ہو ؎

بفرماں ہمہ پیش او آمدند — بجاں ہر کسے چارہ جو آمدند

(سطر ۳۲ صفحہ ۸۹)

ازاں پس چو نامہ بخسرو رسید — غمی شد دلش کاں سخنہا شنید

(جلد اوّل صفحہ ۹۰ سطر ۱۵ بمبئی ۱۲۷۵ھ)

ان اشعار کی تلاش میں میں نے شاہنامے کے کئی معتبر اور قدیمی نسخے دیکھے لیکن ان میں یہ اشعار نظر نہیں آئے۔ علاوہ بریں خود ٹرنر میکن جس نے پہلی مرتبہ شاہنامہ چھاپ کر شائع کیا ہو ان اشعار کو الحاقی مانتا ہو۔

منوچہری

اس سے قبل ایک مقام پر گزارش ہو چکا ہو کہ مولانا کے سنین و تاریخ غلط ہوتے ہیں اس قسم کی ایک تازہ مثال ذیل میں پیش ہو۔ شبلی فرماتے ہیں :-

"امیر منوچہر بن شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر جو مشہور رئیس اور جرجان کا فرماں روا تھا اور ۳۸۶ھ میں تخت نشین ہوا تھا یہ اس کے دربار میں ملازم تھا۔ اس مناسبت سے منوچہری تخلص کیا تھا ۴۲۱ھ میں امیر منوچہر نے انتقال کیا تو یہ غزنین میں آیا۔"

(شعر العجم صفحہ ۱۸۶)

فلک المعالی امیر منوچہر ۴۰۳ھ میں تخت نشین ہوا نہ ۳۸۶ھ میں۔ اس کی وفات ۴۲۳ھ میں ہوئی نہ ۴۲۱ھ میں۔ ولہ

"تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس نے عنصری کی شاگردی بھی اختیار کی لیکن یہ بھی ایک خوشامد کا پہلو تھا جس طرح قلعہ میں لوگ بہادر شاہ سے گلستان پڑھنے جایا کرتے تھے۔" (صفحہ ۱۸۶ شعر العجم)

یہاں تذکرہ نگار کیوں بدنام کیے جاتے ہیں عنصری کی استادی کا تو خود منوچہری کو اعتراف ہو جہاں وہ کہتا ہو ؎

کو جریر و کو فرزدق کو ولید و کو لبید	روبہ و عجاج و دیک الجن و سیف ذویزن
گو فراز آیند و شعر اوستادم بشنوند	تا غریزی روضہ بینند و طبیعی نسترن

کیا واقعی بہادر شاہ بادشاہ اتنی فارسی بھی نہیں جانتے تھے کہ گلستاں پڑھا سکتے؟ بادشاہ مرحوم کی تالیف شرح گلستاں جو ۱۸۵۷ء سے کئی سال پیشتر قلعہ معلیٰ میں چھپی تھی، راقم کے کتب خانے کی زینت ہو۔

اس کے بعد فرماتے ہیں :-

"بہرحال عنصری نے اس کو دربار شاہی میں پہنچایا اور سلطان محمد ابن سلطان محمود کے حضور میں ترخانی کا منصب ملا یعنی جب چاہتا دربار میں چلا جاتا کچھ روک ٹوک نہ تھی۔ محمد چند روز کی سلطنت کے بعد یعنی ۴۲۲ھ میں گرفتار ہو کر قید ہوا اور اس کے بھائی سلطان مسعود نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا۔" (شعر العجم صفحہ ۱۸۷)

منصبِ ترخانی کا ذکر ہم غزنوی دور میں نہیں پڑھتے۔ میرا خیال ہے کہ یہ عہدہ سلاطینِ مغول کے عہد میں رائج ہوا۔ یہ ایک ترکی عہدہ ہے نہ ایرانی۔ منوچہری کا سلطان محمد ابن سلطان محمود سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اسی لیے اس کے دیوان میں محمد کی مدح میں کوئی قصیدہ موجود نہیں اور نہ ان ایام میں منوچہری کے دربارِ غزنہ سے تعلقات قائم ہوئے تھے۔ فرماتے ہیں :-

"دولت شاہ نے اس کو بلخی لکھا ہے چونکہ نہایت دولت مند تھا اس لیے شصت گلہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔" (شعر العجم صفحہ ۱۸۶)

قبلہ مولانا دولت شاہ کی سند پر منوچہری کو بلخی مان رہے ہیں لیکن اگر منوچہری کے اشعار پر جن کو خود مولانا بھی نقل کرتے ہیں ذرا لحاظ کر لیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ بلخی نہیں بلکہ دامغانی ہے۔ چنانچہ شعر

سوی تاج عمرانیاں ہم بدینساں　　بیامد منوچہری دامغانی

اس کا لقب شصت گلہ نہیں تھا بلکہ کسی اور متاخر شاعر کا جس کا نام بقول پروفیسر براون (صفحہ ۱۵۴ جلد دوم) شمس الدین احمد منوچہر ہے۔

منوچہری اپنا نسب سامانی شاہی خاندان سے بیان کرتا ہے :-

منم از نژاد بزرگانِ سامان　　کہ بودند شاہان چیرہ کواکب

فقیہ ہونے کے علاوہ عربی صرف ونحو اور علم طب میں بھی کامل تھا ۔

من بدانم علم دین و علم طب و علم نحو   تو نہ دانی دال و ذال و را و زا و سین و شین

عربی ادب میں اس کی مہارت غیر معمولی تھی، تاریخ عرب اور تاریخ عجم سے خوب واقف تھا، نجوم و ہیئت اور موسیقی کا بھی عالم تھا۔ غیر معمولی حافظے کا مالک ہونے کی وجہ سے شعرائے عرب کا کلام اس کے ورد زبان رہتا ہی، اس کی غیر معمولی علمیت فنی، ادبی اور تاریخی تلمیحات نے اس کے دیوان کو مشکل اور ادق بنا دیا ہی۔ بعض قصیدوں میں وہ لغات کا ابر بن کر گرجتا اور برستا ہی۔ تشبیب نگاری، مناظر قدرت، بہار، باغ، گل و ریاحین، مرغ و پرند، سفر، شام و صبح، برف وغیرہ کے بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہی۔ جس طرح کہ تشبیہات و استعارات میں جدّت قدم قدم پر اس کے ہاں ملتی ہی۔ اسی طرح صنائع بدائع، لفظی لطافتیں، نئے عروضی اوزان کے استعمال میں بھی اسے تقدّم حاصل ہی۔ مبالغہ، تکلّف اور تصنّع اس کے ہاں سب سے پہلی مرتبہ دیکھے جاتے ہیں۔ منوچہری کو اس نئی صنفِ شاعری کا موجد کہنا چاہیے جس کی ابتدا اور نشو و نما شمال مغرب ایران میں ہوئی اور جس نے قطران تبریزی خاقانی اور نظامی جیسے شعرا پیدا کیے۔ تجنیس کی بدعت منوچہری نے غزل کے میدان میں بھی شروع کر دی تھی لیکن شکر ہی کہ یہ رواج مقبول نہ ہُوا۔ گھوڑے کے بیان میں منوچہری کو خاص شغف ہی جس طرح تشبیب کا وہ بادشاہ ہی اسی طرح مدح کے میدان میں اس کا سمندِ قلم اسپ لنگ بن جاتا ہی مدح نگاری کبھی اس کو راس نہ آئی وہ طبیعت کا تمام زور تشبیب پر صَرف کر دیتا ہی اور اسی ایک بات نے اس کے دیوان کو موجودہ مذاق میں زیادہ مقبول بنا دیا ہی۔

۴۲۵ھ میں جب ساری اور آمل کی طرف سلطان مسعود بن محمود کا گزر ہوا سلطان نے ری سے جہاں ان ایّام میں منوچہری مقیم تھا خواہش کر کے ُبلایا ۔

خواست از ری خسرو ایران مرا از شصت میل	خود ز تو ہر گز نیندیشید در چندیں سنین

جب سلطان غزنین کی طرف مراجعت کرتا ہی منوچہری بھی کچھ عرصے کے بعد غزنین پہنچ جاتا ہی ؎

دانی کہ من مقیم بر درگہ شہنشہ	تا باز گشت سلطان از لالہ زار ساری
وین دشتہا بریدم وین کوہہا پیادہ	دو پاے با جراحت دو دیدہ گشتہ تاری
امید آں کہ روزے خواند ملک بہ پیشم	بختم شود مساعد روزم شود بہاری
اکنوں کہ شاہ شاہان بر بندہ کرد رحمت	کوشی کہ رحمت شہ از بندہ در گزاری
ختم آیدت کہ خسرو بر من کند نکوئی	ای ویحک آب دریا از من دریغ داری

سلطان مسعود کو اس کی طرز شاعری دل سے پسند تھی ؎

از بہر آں کہ شعرم شہ را بدل خوش آید	برخاست از تو غلغل بہ خلست از تو زاری
من شعر بیش گویم کان شاہ را خوش آید	الفاظ ہاے نیکو ابیاتہاے جاری
گر تو بہر مدیحے چندیں طپید خواہی	ہنجار ناصبوری ہنجار بے قراری

مسعود نے بعض وقت خود شعر کی فرمائش کی ہی۔ منوچہری ؎

درخواستی تو شعرم ایں آمدت ز رادی	اینت کریم طبعی اینت بزرگواری
اضعاف حرفہائے کز شعر من شنیدی	نیکیت بادو رحمت شادیت و شادخواری

سلطان مسعود کے دربار سے تعلق پیدا کرنے سے پیشتر منوچہری گرگان، ری اور خانقین میں رہ چکا ہی ؎

مر مرا بارے بدیں درگاہ شاہ ست آرزو	نز ری و گرگاں ہمی یاد آیدم نز خانقین

پھر مسعود کی شاہانہ فیاضیوں کی طرف تلمیح کرتا ہوا گویا ہی ؎

شاعرانرا در ری و گرگاں و در شرواں کہ دید	بدرہ عدلی بہ پشت پیل آوردہ بزین
آنچہ ایں مہتر دہد روزے بکمتر شاعراں	معتصم ہر گز بہ عمر اندر نداد و مستعین

جس طرح انشا کی آمد نے لکھنؤ میں اسی طرح منوچہری کی آمد نے دربار غزنین میں ایک شور مچا دیا ہے۔ حسد جو تلامیذ الرحمٰن کا ازلی حصہ ہے بہت جلد اپنا رنگ لایا اور منوچہری کے بہت حاسد کھڑے ہو گئے ان میں شروان کی طرف کا کوئی شاعر ہے جس کا نام باوجود کوشش نہ معلوم ہو سکا۔ منوچہری کے خلاف اس نے بہت کچھ حصہ لیا۔ عام حاسدوں کی شکایت اگرچہ منوچہری کے کئی قصائد میں ملتی ہے لیکن وہ قصائد میں شاعر کا روئے سخن اسی شروانی کی طرف ہے۔

جب کہتا ہے ؎

سالِ پارین با تو مارا چہ جدال و جنگ خاست   سالِ امسالین تو با ما درگرفتی جنگ و کین
باش تا سالِ دگر نوبت کرا خواہد بدن   تا کرا می بایدم زد بر بروے پوستین
من ترا از خویشتن در بابِ شعر و شاعری   کمترین شاعر شناسم ہذہ حق الیقین
گر مرا فرمودہ بودے خسرو بندہ نواز   بہتر از دیوان شعرت پاسخے کردم متین
میر فرمودت کہ ردیک شعر او را کن جواب   بود سالے و نکردی ننگ باشد بیش ازین
لیکن اشعار ترا آں قدر و آں قیمت نہ بود   کش بفرمودے جواب آں خسرو شاعر گزین
گر تو اے ناداں نہ دانی ہر کسے داند کہ تو   نیستی با من بگاہ شعر گفتن ہم نشین
من بفضل از تو فزونم تو بمال از من فزوں   بہتر ست از مال فضل و بہتر از دنیاست دیں
مال تو از شہریار شہریاران گرد گشت   ورنہ اندر ری تو سرگیں چیدہ از پارگین
گر نہ باشد در چنیں حالت مزیدے مر ترا   عار ضے بس باشدت بر لشکر میر مہین
ہیچ سالے نیست کز دینارسی صد چار صد   از پئے عرض حشم کمتر کنی در آستین
واں گہے گوئی من از شاہ جہاں شاکر نیم   گر نہ ننگ آید ازیں شہ رخت ادبر بندییں
باز شروان شو بدان جائے کہ داوندت ہمی   گوشت خوک مردہ یکماہہ و نانِ جویں

۴۲۸ھ میں سلطان مسعود نے دریائے جیحون پر پل باندھے جانے کا حکم دیا

اس کے متعلق منوچہری ایک قصیدے میں کہتا ہے ؎

جز تو نہ بست گردن جیحوں کسے بپل — وندر نراند پیل بہ جیحون دراں ہزار
دو سال یا سہ سال دراں بود تا ببست — جسری در آب جیحوں محمود نامدار
در مدت دو ہفتہ ببستی تو اے ملک — جسری در آب جیحوں بہ زان ہزار بار
دریا بداں سپہ کہ بجیحوں گزاشتی — دریا نگردد بود بجیحوں کسے گزار
سالار خانیاں را با خیل و با حشم — کردے ہمہ نگوں و نگوں بخت و خاکسار
تا بہ کسے گرفتہ نہ باشد خدائے خشم — پیش تو ناید و نہ کند با تو چار چار
پور تگین کہ خشم خدائے اندر و رسید — او را ازاں دیار و واند باین دیار
تا گنج او خراب شد و خیل او اسیر — تا روز او سیاہ شد و جان او فگار
او مار بود و مار چو آہنگ او کنی — اندر جہد ز بیم بسوراخ تنگ خار
گر شاہ مانگشت درا بود زین قبیل — گر تنگ غار ہیچ امیرے نکشت مار

مذکورۂ بالا بیانات میں شاعر نے واقعیت کا بہت کم لحاظ رکھا ہے۔ اصلی معاملات کو اس قدر رنگینی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی شناخت قریب مشکل ہوگئی ہے۔ پل کے لیے بیہقی کہتا ہے :-

دہشتم ماہ ربیع الاول نامۂ رفت سوئے سبکتگین چوگان دار محمودی و فرمودہ آمد تا بر جیحون پلے بستہ آید کہ رکاب عالی را حرکت خواہد بود سخت زود وجواب رسید کہ پل بستہ آمد بدو جائے و در میانہ جزیرہ پلے سخت قوی و محکم کہ آلت وکشتی ہمہ بر جائے بود ازاں وقت باز کہ امیر محمود فرمودہ بود (بیہقی صفحہ ۷۰۴)

جب تمام ضروری سامان اور کشتیاں محمود کے وقت سے تیار تھیں تو ظاہر ہے کہ پل دو ہفتہ کے اندر آسانی سے ترتیب دیا جا سکتا تھا اس پر شاعر

کو فخر اور بے جا فخر کرنے کا موقع ملا کہ جب محمود نے پُل کے لیے دو تین سال لگائے میرے ممدوح نے صرف دو ہفتوں کے اندر اندر تیار کر لیا۔

پورتگین کے خلاف مسعود نے جس مہم کا ارادہ کیا تھا اُس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وزیر اور سران سپاہ اِس مہم کے سخت مخالف تھے چنانچہ وزیر احمد عبدالصمد کی اس کی نسبت یہ رائے تھی جو اس نے ابونصر مشکانی سے ظاہر کی تھی، مَیں بیہقی کے الفاظ درج کرتا ہوں:۔

"وزیر چند بار اُستادم را گفت می بینی کہ چہ خواہد کرد از آب گزارہ خواہد شد درچنین وقت بر ماندن پورتگین، بدان کہ وے بختلان آمدہ بیج آب بگذشت این کارے ست کہ خدائے بداند کہ چون شود اد ہام وخاطر ازیں عاجز ند و بونصر جواب داد کہ جز خاموشی روئے نیست کہ نصیحت کہ بہ تہمت باز گردد نا کردنی ست و ہمہ حشم می دانستند و با یک دیگر می گفتند بیرون پردہ از ہر جنسے چیزے، و بوسعید مشرف را می فرا کردند تا می نبشت و مسعود می داشت وچوں پیش امیر رسیدندے بر موافقت او سخن گفتندے کہ در خشم می شد۔"

(بیہقی صفحہ ۷۰۴ و ۷۰۵)

اِسی ماہ کی اُنّیس تاریخ دوشنبہ کے روز مسعود نے پل سے عبور کیا اور ترمذ پہنچ گیا۔ بائیس کو ترمذ سے کوچ کیا اور سلخ کو چغانیاں پُہنچا۔ تیسری ماہ ربیع الآخر بُدھ کے روز درۂ شومان کی طرف بڑھا کیونکہ اس طرف پورتگین کا سُراغ چلا تھا۔ سردی نے اُدھر اپنا زور دکھایا برف باری جاری تھی جتنی تکلیف لشکر نے اس سفر میں اُٹھائی پہلے کسی سفر میں نہیں دیکھی تھی۔ نو ربیع الآخر کو وزیر کا خط آیا اس میں تحریر تھا کہ داؤد سلجوقی ایک بڑے لشکر کے ساتھ سرخس سے گوزگاناں

کی طرف بڑھ رہا ہی اس کا قصد ہو کہ اندخود کے راستے سے جیحون پہنچکر پُل توڑ دے اور دریا پر قبضہ کر لے۔ اگر خدانخواستہ پل ٹوٹ گیا تو تکلیف کے علاوہ بڑی رسوائی کا سامنا ہی۔ امیر مسعود اس خط کو دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ پورتگین اس وقت تک سرمان سے نکل چکا تھا اور دَرّے پر قابض تھا وہاں کے چپہ چپہ زمین سے واقف تھا۔ علاوہ بریں ہوشیار بدرقے اس کے ہمراہ تھے۔ ناچار امیر مسعود بغیر کوئی کام بنائے لوٹا۔ بارہ کو جمعہ کے روز نہایت عجلت میں روانہ ہوا۔ پورتگین اس موقعے کا منتظر تھا وقت پاکر بہیر پر آپڑا کچھ اونٹ اور کوتل گھوڑے لے گیا جس سے پریشانی اور بدنامی ہوئی۔ (بیہقی صفحہ ۷۰۷)

ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس بیان میں اور منوچہری کے بیان میں بڑا فرق ہی محمودی دَور کے شعرا مثلاً عنصری اور فرخی کے اکثر بیانات تاریخ سے حرف بحرف ملتے ہیں۔ لیکن منوچہری اپنے زور بیان نادرالکلامی اور جوش طبیعت کی خاطر واقعات کو بے دردی کے ساتھ قربان کر دیتا ہی۔

منوچہری کے ممدوحین کی فہرست میں یہ نام شامل ہیں :۔

(۱) ابوسعید سلطان مسعود بن یمین الدولہ محمود۔ (۲) شمس الوزرا احمدؒ بن عبدالصمد وزیر سلطان مسعود (۳) بادشاہ ابوالمظفر (۴) فضل بن محمدؒ (۵) ابوالحسن بن الحسن (۶) علی ابن محمدؒ (۷) خواجہ احمدؒ (۸) خواجہ ابوالعباس (۹) علی بن عبیداللہ (۱۰) ببگقو (۱۱) خواجہ محمدؒ (۱۲) محمدؒ قصری (۱۳) بوحرب بختیار محمدؒ (۱۴) ابوالحسن بن علی بن موسیٰ عمرانی (۱۵) حمید بوسہل زوزنی دبیر سلطان مسعود (۱۶) ابوربیع بن ربیع (۱۷) اسد بن حارث بن منصور امام جیلان۔

اسدی طوسی

یورپین تحقیقات مُظہر ہی کہ دو اسدی گزرے ہیں جو ایک دوسرے سے باپ بیٹے کا تعلق رکھتے ہیں اور اسدی تخلص دونوں میں عام ہی۔ اسدی کلاں کا نام ابونصر احمد بن منصور طوسی ہی جو صاحب مناظرہ ہی۔ دوسرا اسدی خُرد اس کا فرزند جس کا نام علی بن احمد الاسدی الطوسی ہی اور گرشاسپ نامہ اور لغت فرس کا مصنف ہی یہ بیان مجھ کو بظاہر عجیب و غریب معلوم ہوتا ہی۔ باپ بیٹے میں تخلص کا اشتراک نہایت غیر معمولی ہی۔ لیکن دو زبردست مغربی مستشرق ڈاکٹر ایتھ اور پروفیسر براؤن اس کے راوی ہیں۔ اس نظریے کی ایک تصدیق نظامی گنجوی کے بیان سے بھی ہوتی ہی۔ محمود کے دربار سے فردوسی کی ناکامی کے اسباب پر غور کرتے ہوئے موصوف اتفاقیہ اسدی کا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

در سخا و سخن چو می پیچیم کار بر طالع است ما ہیچیم

نسبت عقربی است یا قوسی بخل محمود و بذل فردوسی

اسدی را کہ جود او بنواخت طالع و طالعے بہم درساخت

(بہرام نامہ خمسہ ص۲۶)

یہاں محمود کے تعلق میں اسدی کلاں مانا جا سکتا ہی نہ اسدی خورد۔ اس لیے یہ یہ مغربی نظریہ قابل تسلیم ہی۔

مولانا شبلی کے پیش نظر اگرچہ پروفیسر براؤن کی تاریخ تھی تاہم وہ اس اہم مغربی انکشاف کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہتے۔ جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا ہی کہ شعر العجم میں دونوں اسدیوں میں تخلیط قائم ہو گئی۔ فرماتے ہیں:-

"اقلیم سخن (رزم) کا یہ دوسرا تاجدار ہی۔ صاحب آتش کدہ نے

اس کو سلطان محمود کے سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہو۔"

(شعر العجم صفحہ ۱۸۲)

یعنی بسم اللہ ہی غلط کی۔ محمود کے سبعہ سیارہ میں اگر کسی اسدی کا شمار ہو سکتا ہو تو وہ اسدی کلاں ہو اور مولانا اسدی خرد کا حال لکھنے بیٹھے ہیں جو گرشاسپ نامہ کا مصنف ہو۔ اگر مذکورۂ بالا مغربی نظریے پر یقین نہ کیا جائے تو بھی مولانا کا بیان غلط ہو اس لیے کہ صاحب گرشاسپ نامہ سلطان محمود کا ہم عصر نہیں اس کا گرشاسپ نامہ جیسا کہ آیندہ ذکر ہوگا، ۴۵۸ھ میں تصنیف ہؤا ہو اس لیے وہ محمود سے بعد کا شاعر ہو۔ قولہ:۔

"عراق سے آذربائیجان آیا۔ یہاں کا رئیس ابودلف کرکری تھا۔"

(شعر العجم صفحہ ۱۸۲)

آذربائیجان میں ان ایام میں جیسا کہ قطران تبریزی کے قصائد سے معلوم ہوتا ہو مملانی خاندان برسرِ حکومت تھا جو کرکوئی کہلاتا تھا ابودلف کرکری، ارّان کا بادشاہ تھا جو شروان آذربائیجان اور بحر خزر کے درمیان واقع ہو۔ ارّان اور ارمن دونوں ابودلف کی زیرِ حکومت تھے۔ نہیں معلوم مولانا کو یہ مغالطہ کیونکر پیش آیا حالانکہ اسدی کے اشعار سے جن کو خود مولانا صفحہ ۱۱۶ پر نقل کرتے ہیں یہ امر صاف ظاہر ہو۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

ملک بودلف شہر یارِ زمیں   جہاں دار ارّانی پاک دیں

اسدی ان ابیات میں اُس کو ارّانی کہتا ہو۔ شبلی فرماتے ہیں:۔

"اسدی سب سے پہلا شخص ہو جس نے مصطلحات فارسی پر کتاب لکھی چنانچہ اس کے خاص ہاتھ کا لکھا ہؤا نسخہ ویانات (کذا) کے کتب خانے میں موجود ہو۔ سلگین نے اس کتاب کو چھاپ کر شائع

بھی کیا ہی" (شعر العجم صفحہ ۱۸۴)

یہ اطلاع "مسٹر براون کی کتاب جلد دوم" سے لی گئی ہو جیسا کہ حاشیہ میں ارشاد ہُوا ہی لیکن مولانا پروفیسر براون کا مطلب نہ سمجھے۔ اسدی کی مصطلحات فارسی اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کہیں موجود نہیں نہ اُس کو سلگمین نے شائع کیا البتہ اس کا ایک نسخہ جو پنجشنبہ ۹ ماہ محرم ۷۳۳ھ کو عبدالرحمن بن احمد بن الظہیر نے نقل کیا تھا ڈاکٹر پال ہورن نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا ہی۔ عبدالرحمن کا نسخہ ویانا میں نہیں بلکہ پاپائے روم کے کتب خانے میں ہی۔ دار السلطنت ویانا میں اسدی کے قلم کی جو کتاب ہی وہ حکیم ابو منصور موفق بن علی ہروی کی کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ ہی جس کو اسدی نے شوال ۴۴۷ھ میں اپنے قلم سے نقل کیا ہو۔ کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہی "علی بن احمد الاسدی الطوسی الشاعر" اس کتاب کو سلگمین نے البتہ ۱۸۵۹ء میں چھاپا ہی۔

اسدی کے نام کو زندہ رکھنے والی اس کی تصنیف گرشاسپ نامہ ہی۔ ابتدا میں گرشاسپ نامے کا محرک ابو دلف شیبانی کا وزیر محمد بن اسماعیل حصبی ہوا۔

(گرشاسپ نامہ) ص ۵

ہمی بد سرِ داد و بنیادِ دیں — گراں مایہ دستور شاہِ زمیں
محمد مہ جود و چرخ ہنر — سمائیل حصبی مر اورا پدر
ز چرخِ رواں تا بہ ارمند و خاک — چہ و چون گیتی بدانستہ پاک

باقی اشعار شبلی نے درج کیے ہیں اس لیے میں دوہرانا ضروری نہیں سمجھتا۔

جب ابو دلف شیبانی کو اسدی کے اس ارادے کی اطلاع ہوئی اس نے اپنے ملازم لولو کی زبانی پیام بھیجا کہ یہ کتاب میرے نام پر لکھی جائے۔

(گرشاسپ نامہ) ص ۵

به پیروزی آور دلیے من پیام گزین خدا لولو نیک نام
که گوید همی شاه فرهنگ جوی بنام من این نامه را باز گوی
اگر زاں که فردوسی این نامه گفت تو باگفتهٔ خویش گردانش جفت
کنوں گر سپهرم نه سازد کمیں بگویم بفرمانِ شاه زمیں

اس کے بعد اسدی کہتا ہو کہ دو مثنوی نگار خاکِ طوس سے پیدا ہونے پر تم کوئی تعجب نہ کرنا یہ امرِ واقعہ ہو۔ چنانچہ ؎

دو گویا چنیں خاست باشد ز طوس چنو شد نگوئی تو باشد فسوس
گز د نامه را خوب کارے بود ز من در جہاں یادگارے بود

گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ میں دو سال کی محنت کے بعد ختم ہوا۔ اس کے اشعار کی تعداد دس ہزار ہو۔ شاعر نے خاتمے میں خود بیان کیا ہو۔ (گرشاسپ نامہ) ؎

شد این داستان بزرگ اسپری به پیروز روزی و نیک اختری
ز هجرت بد ور سپهری که گشت شده چار صد سال و پنجاه و هشت
جز آن کاندریں داستاں بد ز بن ز هر در بسے گرد کردم سخن
چنیں نامهٔ ساختم پر شگفت که هر دانشے زو توان بر گرفت
بهشتیست بزمش ز کافور خشک گیاهش ز عنبر درختاں ز مشک
بسے حور نو کردش آراسته از اندیشه دوشیزگاں خاسته
زبان روان شان ز فرهنگ تن ز دانش زبان و ز معنی دهن
چناں کم بد اندر سخن پایگاه بگفتم نبشتم سپردم به شاه
بر آمد همی بیت او ده هزار دو سال اندریں برده شد روزگار
مباد آں نه بینده را آفریں که کمتر نویسد یکے بیت ازیں

خری تاکید کے باوجود گرشاسپ نامہ جس قدر برباد کیا گیا ہو مشکل سے اور کتاب

اس تندد برباد ہوئی ہوگی ۔ قطران آذر بائیجان میں اور اسدی ایران میں اس طرز شاعری کے مقلد ہیں جس کے خصوصی جراثیم پہلی بار منوچہری کے ہاں معائنے میں آتے ہیں ۔ یہ صنفِ شاعری صنائع بدائع ، لفظی لطافت ، ترکیبوں کی خوش آہنگی، غیر فطری تشبیہات و استعارات اور صنعت مبالغہ میں اغراق کے لیے مشہور ہے ۔ لفظی شان و شوکت اور خیالات کے اظہار میں غیر معمولی تکلف جس کے نمایاں خط و خال ہیں ۔

منوچہری اپنی مرکب تشبیہات میں عدیم المثال ہے ۔ اسدی نے بعض موقعوں پر اس کی تقلید کی ہے ۔ مثلاً یہ شعر :-

ہمی تافت خنجر ز گرد و سپاہ   چو ایمان پاک از میانِ گناہ

دیگر

دو زلفش ہمہ جیم و دو جیم دال   دہن میم و بر میمش از نقطہ خال

قطران صنعتِ تجنیس کا حاکم ہے اسدی اس کی بھی پیروی کرتا ہے ۔ شعر

بزرگاں بہ بزم اندر آرام رام   نشستند جفت غم انجام جام

لیکن یہ صنعت لطیف سچ تو یوں ہے کہ قطران کا حصہ ہے ۔ میں اُس کے چند اشعار نقل کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا (قطران)

چوں بطرفِ جوے بنہادہ گل خود بشے روے   جائے با معشوق می خوردن بطرفِ جوے جوے

بردہ از مرجان بگونہ لالۂ نعماں سبق   بردہ از مطرب بدستاں بلبل خوش گوے گوے

بستد از یاقوت و بسد لالہ و گلنار نار   یافت از کافور و عنبر خیری و شبوے بوے

از نسیمِ سوسن و گل گشت چوں قرقیر باغ   وز دم و زلفِ بتِ من گشت چوں مشکوے کوے

چشمِ من چوں چشمۂ آموے گشت از ہجر او   تن بجوں چوں درمیانِ چشمۂ آموے نے

صنعت مبالغہ اس میں شک نہیں کہ اسدی کا خاص حصہ ہے میں بخوفِ طوالت

صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں ؎

بشب مورچہ بر پلاسِ سیاہ — نمودی بچشم از دو صد میل راہ
زگرد نبرد و زگردِ زمین — زمین گشت گردون و گردون زمین
خروشش چنان دشت بگرفتے — کہ در دسے سپاہے گزر یافتے
چنان تیرہ گیتی کہ از لب خروش — زبس تیرگی رہ نبردی بگوش

فردوسی اور اسدی کی شاعری میں وہی تفاوت ہے جو آمد اور آورد سادگی اور تصنع میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

فردوسی کے ہاں جہاں حلاوت ہے اسدی میں ملاحت جھلک مارتی ہے جذلے سخن کی متانت کے مقابلے میں اسدی کے ہاں چلبلاہٹ اور بانکپن کا نمک بھی موجود ہے۔ بلند مضمون، منتخب الفاظ، چست بندش، جوش و خروش کی تاثیر، چیدہ تشابیہ برجستہ اسماے صفات نے اسدی کے کلام کو زیادہ شوخ اور سگھڑ بنا دیا ہے۔ زبان کی ترقی، وقت کی مساعدت اور طبیعت کی رنگینی اسدی کے حق میں فیصلے کے لیے جھکتی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اصل اصل ہے اور نقل نقل۔

شاہنامہ اور گرشاسپ نامے میں بہت مضامین عام ہیں بعض موقعوں پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسدی نے شاہنامہ سامنے رکھ کر گرشاسپ نامہ لکھا ہے مثلاً داستان بیژن کی تمہید کے وہ اشعار جن میں ایک تاریک رات کا منظر کھینچا گیا ہے اور جو شاہنامے کے قدیم ترین اشعار مانے جا سکتے ہیں۔ اسدی ان کا جواب دیتا ہے۔

شاہنامہ

شبے چوں شبہ روئے شستہ بقیر
نہ بہرام پیدا نہ کیواں نہ تیر

گرشاسپ نامہ

شبے بد چو زنگی سیہ تر ز زاغ
مہ نو چو در دستِ زنگی چراغ

شاہنامہ

دگرگونہ آرایشے کردہ ماہ
بسیج گذر کرد بر پیش گاہ

شدہ تیرہ اندر سرائے درنگ
میاں کردہ باریک و دل کردہ تنگ

ز تاجش سہ بہرہ شدہ لاجورد
سپردہ ہوا را بہ زنگار گرد

سیاہ شب تیرہ بر دشت و راغ
یکے فرش افگندہ چوں پرِ زاغ

چو پولاد زنگار خوردہ سپہر
تو گفتی بقیر اندر اندودہ چہر

نمودم ز ہر سو بچشم اہرمن
چو مارِ سیہ باز کردہ دہن

ہرآنگہ کہ برزد یکے باد سرد
چو زنگی بر انگیخت ز انگشت گرد

چناں گشت باغ و لب جوئبار
کجا موج خیزد ز دریاے قار

فرو ماند گردونِ گرداں ز جاے
شدہ سست خورشید را دست و پاے

زمیں زیر آں چادر قیر گوں
تو گفتی شدستی بخواب اندروں

گرشاسپ نامہ

سیاہیش در ہم سیاہی بدیر
چو موج از بر موج دریاے قیر

چو ہندو بقیر اندر اندودہ روے
سیہ جامہ و رُخ فروہشتہ موے

جہاں تیرہ گیتی کہ از لب خروش
ز بس تیرگی رہ نبردی بگوش

میان ہوا جاے جاے ابر دیم
چو افتادہ بر چشمِ تاریک نم

جہان گفتیش دوزخی ہست تار
بہر گوشہ دیو اندرو صد ہزار

از انگشت بدشان ہمہ پیرہن
دہاں باد تاریک دود از دہن

زمیں را کہ از غار دیدار نہ
زبان را رہ و روئے گفتار نہ

بزندانِ شب در بہ بند آفتاب
فروہشتہ بر دیدہا پردہ خواب

فرشتہ گرفتہ ز بس بیم پاس
پری در نہیب اہرمن در ہراس

بسانِ تنِ بیر داں بد زمیں
ہوا چوں دژم سوگئے دل غمیں

شاہنامہ	گرشاسپ نامہ
جہاں را دل از خویشتن پُر ہراس	بر آں سوگ برگردہ گردوں ز رشک
جرس برگرفتہ نگہبان پاس	رُخ نیلگوں پُر ز سیمیں سرشک
نہ آوائے مرغ و نہ ہرائے دد	تو گفتی یکے آئینہ ست از فراز
زمانہ زبان بستہ از نیک و بد	ستارہ درو چشم زنگی ست باز

فردوسی کے ہاں اکثر تشبیہات مادی اشیا سے تعلق رکھتی ہیں، اسدی کی اکثر تشبیہیں ایسی ہیں جو غیر محسوس ہیں۔ موج دریائے قیر، پیرہن انگشت، زندانِ شب دوزخ تار واہمہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسدی نے اپنے رسمی مبالغہ کو ہاتھ سے نہیں دیا اور چوتھے شعر میں اپنی برجستہ طرز میں کہتا ہی کہ دنیا اس قدر تاریک تھی کہ نالہ لب سے نکلتے ہی بوجہ کثرت تاریکی راہ گم کرکے کہیں کا کہیں بھٹک جاتا تھا اور کانوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ فردوسی خدائے سخن ہی، مبتدی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ تاہم اسدی نے جو کچھ زور طبیعت دکھایا ہی لائق تحسین ہی۔

بعض موقعوں پر دیکھا جاتا ہی کہ اسدی نے فردوسی کے خیالات کو اپنے ہاں لے لیا ہی اور سرقہ کی سرحد ممنوعہ سے ڈانڈا مینڈا ملایا ہی

شاہنامہ	گرشاسپ نامہ
کہ آبے کزو سرد آز اد رست	ہر آں چہ کہ خوردی از آب پاک
سزد گر نباید برو خاک شست	نشاید فگندن برو سنگ و خاک
بیاست از مرگ مقے سپید	چو پیرت سییں کند گوشوار
بودن چہ داری تو چندیں امید	ازاں پس تو جز گوش مردن مدار

شاہنامہ

یکے داستاں زد بریں مردمہ
کہ درویش راچوں برانی زدہ
بگوید کہ من ہتر دہ بدم
ہمہ بندہ بودند ومن مہ بدم

گرشاسپ نامہ

یکے رابدہ در ندادند جائے
ہمی گفت بردہ منم کتخدائے

اس میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا کہ صاحب گرشاسپ نامہ نے فردوسی کے خیالات سے اپنی شاعری کو چمکایا ہی۔

مثنوی کا ایوان جس کی بُنیاد رودکی، ابوشکور اور دقیقی جیسے معماران سخن نے ڈالی تھی فردوسی نے اپنے زمانے میں اس ایوان کو نہایت بلند اور عالی شان بنادیا، اسدی نے دھیمے رنگوں میں اس پر بیل بوٹے اور نقش ونگار بنائے نظامی نے اپنے وقت میں ان رنگوں کو زیادہ شوخ اور لطیف کردیا۔

چوتھا دور

قولہ "اُس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی۔ سلطان محمود اپنی ملکی اور فوجی خصوصیات کا بہت دِلدادہ تھا، تاہم دفتر کی زبان اس کے عہد میں بھی عربی رہی۔ فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہُوا تو اُس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کردی جائے۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۰۹)

سلطان محمود کے دوَر میں ابتدائی دس گیارہ سال تک دفتر کی زبان فارسی تھی، کیونکہ سلطان کے وزیر اوّل ابو العباس فضل بن احمد کو عربی کا علم نہ تھا، اس لیے تمام تحریرات فارسی ہی میں تھیں۔ ~~۴۰۱~~ھ سے ابو القاسم احمد بن حسن میمندی وزیر ہوئے چونکہ وہ عربی داں تھے اس لیے فارسی ترک کردی گئی اور عربی کا رواج ہُوا۔ تاہم فارسی کا استعمال قطعاً متروک نہیں ہُوا۔ اور ایسی حالتوں میں جب کہ مکتوب الیہ فارسی داں ہوتا تمام تحریات فارسی ہی میں بھیجی جاتی تھیں۔

گزشتہ بالا بیان میں نے تاریخ یمینی سے اخذ کیا ہے، لیکن تاریخ بیہقی کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان مسعود کے زمانے میں دربارِ غزنہ کی زبان فارسی ہی تھی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دربار میں عربی سے زیادہ فارسی کا رواج تھا۔ جب خلیفہ قادر باللہ وفات پاتا ہے اور قائم بامر اللہ اس کا جانشین ہوتا

ہی، بارگاہ خلافت سے ایک سفیر مع فرمانِ خلیفہ آتا ہو۔ یہ فرمان عربی میں تھا، چنانچہ اس کو اصل عربی میں سُنائے جانے کے بعد سلطان مسعود کی خواہش پر اس کا فارسی ترجمہ سُنایا جاتا ہی جس سے ظاہر ہی کہ غزنیں میں عربی کم سمجھی جاتی تھی۔ بیہقی کے الفاظ یہ ہیں :۔

"امیر خواجہ بونصر را آواز داد، پیش تخت شد، و نامہ بستد، و باز پس آمد، و روے فراتخت بایستاد، و خریطہ بکشاد، و نامہ بخواند چوں بپایاں آمد، امیر گفت، ترجمہ اش بخواں، تا ہمگناں رامقرر گردد، و بخواند بپارسی، چناں کہ اقرار دادند شنوندگان کہ کسے را ایں کفایت نیست" (صفحہ ۳۹۲)

اسی طرح سلطان مسعود جب دربار عام میں اپنے بیعت نامے کی تصدیق کرتا ہی تو ابونصر مشکانی اصل عربی کو پڑھ کر سُناتا ہی لیکن اس کے فارسی ترجمے کو خود سلطان مسعود پڑھ کر حاضرین کو سُناتا ہی چنانچہ :۔

"امیر گفت، شنودم و جملہ آں مرا مقرر گشت، نسخۂ پارسی مرادہ بونصر بدو باز داد و امیر مسعود خواندن گرفت واز بادشاہان ایں خاندان رضی اللہ عنہم ندیدم کسے کہ پارسی چناں خواندے و نبشتے کہ وے نسخۂ عہد را تا آخر بر زبان راند، چناں کہ ہیچ قطع نہ کرد و پس دوات خاصہ پیش آوردند در زیر آں بخط خویش تازی و پارسی ہم زیر آنچہ از بغداد آوردہ بودند و ہم زیر آنچہ استادم ترجمہ کردہ بود نبشت"

بیعت نامے کا عربی مسودہ اگرچہ بغداد سے تیار ہو کر آتا ہی لیکن سلطان مسعود عہدِ بیعت کرتے وقت اس کے فارسی ترجمے کو ترجیح دیتا ہی چنانچہ فارسی

عہد نامے کو سرِ دربار پڑھ کر سُناتا ہی- اس سے ظاہر ہی کہ دربارِ غزنہ میں فارسی ہی درباری زبان مانی جاتی تھی، علاوہ ازیں بیہقی میں اور بیسیوں خطوط ہیں جو سلجوقیوں، غزنویوں اور طبرستانیوں کے درمیان آتے جاتے ہیں، لیکن یہ سب فارسی میں ہیں جس سے بوثوق کہا جا سکتا ہی کہ کم از کم مسعود کے دور میں فارسی زبان ہی درباری زبان تھی۔

قولہ "سنجر کے شاعرانہ مذاق اور قدردانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہی کہ شاعری کی قدر و قیمت اس کے دربار میں کیا تھی۔

ایک دفعہ ارکانِ دولت کے ساتھ عید کا چاند دیکھنے نکلا، سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی، خوشی سے اُچھل پڑا، سب کو انگلی کے اشارے سے بتایا، ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سُنائے۔ معزّی اس وقت تک دربار میں امید واری کرتا تھا، موقع پاکر اس نے برجستہ کہا :-

اے ماہ چو ابروانِ یاری گوئی ۔۔۔ یا ہمچو کمانِ شہریاری گوئی
نعلے زدہ از زرِ عیاری گوئی ۔۔۔ در گوشِ سپہر گوشواری گوئی

یعنی اے چاند تو ابروے معشوق ہی یا بادشاہ کی کمان یا سونے کی نعل یا آسمان کے کان کا آویزہ۔

سنجر نے اسپ خاصہ اور پانچ ہزار درہم عطا کیے، معزّی نے پھر برجستہ کہا :-

چوں آتشِ خاطرِ مرا شاہ بدید ۔۔۔ از خاک مرا بر زبرِ ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من بشنید ۔۔۔ چوں باد یکے مرکبِ خاصم بخشید

سنجر نے ہزار دینار کے عطیے کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب اس
کے خطاب میں شامل کیا جائے۔ چونکہ سنجر کا لقب معزالدین بھی تھا
اس لیے معزی لقب ملا جو آج تخلص ہو کر مشہور ہے"
(شعرالعجم صفحہ ۱۱ و ۲۱۰)

حکایتِ بالا سلطان سنجر سے علاقہ نہیں رکھتی، بلکہ نظامی عروضی جو اس قصّے کا سب سے قدیم راوی ہے اور جو تمام قصہ خود امیر معزّی کی زبان سے سنتا ہے، سنجر کے باپ ملک شاہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ملک شاہ کا لقب معزالدین بھی تھا، اس کے علاوہ نظامی کے اور مولانا کے بیانات میں ضمنی اختلافات ہیں۔

ایک موقعے پر امیر معزی نظامی سے اپنی سرگزشت بیان کرتے وقت کہتا ہے کہ میرے باپ امیر الشعرا برہانی نے ابتدائے عہدِ سلطنت سلطان ملک شاہ میں اپنی وفات کے وقت مجھ کو اس مشہور قطعے کے ذریعے سے جس کا ایک بیت یہ ہے :-

من رفتم و فرزندِ من آمد خلف الصدق   او را بخدا و بخداوند سپردم

سلطان ملک شاہ کے سپرد کر دیا، اس کی وفات کے بعد اس کی تنخواہ اور چندی میرے نام کر دی گئی اور بادشاہی شاعر بن گیا۔ اگرچہ سال بھر برابر حاضر رہا، لیکن بادشاہ کا دیدار دُور سے بھی مجھ کو میسر نہ آیا اور تنخواہ سے ایک دینار تک وصول نہیں ہوُا اور قرض برابر بڑھتا گیا۔ رمضان سے ایک یوم قبل میں شہزادۂ علاء الدولہ امیر علی فرامرز کی خدمت میں حاضر ہوُا، یہ شہزادہ شعردوست ہونے کے علاوہ سلطان کا داماد اور ندیم خاص تھا، دربار میں اس کی بڑی عزت تھی اور میرے ساتھ مہربانی سے پیش آیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے عرض کی کہ یہ بڑی مشکل ہے کہ جو وصف باپ میں ہو بیٹے میں بھی ہو بات یہ ہے کہ امیر برہانی

میرا باپ نہایت ہوشیار آدمی تھا، اور سلطان شہید الپ ارسلان فنِ شعر میں اس کا معتقد بھی تھا۔ میں شرمیلا اور خاموش طبیعت کا واقع ہوا ہوں، سال بھر خدمت گزاری کرتے گزری تنخواہ سے ایک حبہ وصول نہیں ہوا مفت میں ہزار دینار کا قرض دار ہوگیا ہوں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر سلطان سے اجازت دلوادیں کہ نیشاپور چلا جاؤں اور اپنا قرض ادا کرنے کی کوئی سبیل نکالوں۔ امیر علی نے جواب میں کہا کہ یہ ہمارا قصور ہے کہ اب تک تیری طرف سے غفلت برتی گئی لیکن اطمینان رکھ کہ آیندہ ایسا نہیں ہوگا، آج مغرب کے وقت بادشاہ چاند دیکھنے نکلے گا، تو حاضر رہنا دیکھیں خدا کیا کرتا ہے۔ شہزادے کے حکم سے سَو دینار نیشاپوری مجھ کو اسی وقت مل گئے، میں خوش خوش گھر آیا، اور رمضان کے بندوبست میں مصروف ہوگیا، عصر کے قریب سراپردۂ سلطانی پر آکر حاضر ہوگیا، شہزادہ علاء الدولہ بھی اسی وقت آیا۔

میں اب نظامی کی اپنی عبارت نقل کرتا ہوں:-

"آفتاب زرد سلطان از سراپردہ بدر آمد، کمان گروہہ در دست، علاء الدولہ بر راست، من بدویدم و خدمت کردم، امیر علی نیکوئیہا پیوست و بماہ دیدن مشغول شدند، و اول کسے کہ ماہ دید سلطان بود عظیم شادمانہ شد۔ علاء الدولہ مرا گفت، پسر برہانی دریں ماہ نو چیزے بگوئے۔ من بر فور ایں دو بیتی بگفتم:-

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی	یانی چو کمانِ شہر یاری گوئی
نعلے زدہ از زرِ عیاری گوئی	در گوشِ سپہر گوشواری گوئی

چوں عرضہ کردم، امیر علی بسیارے تحسین کرد، سلطان گفت برد از آخُرہ ہر کدام اسپ کہ خواہی بکشاے، و دریں حالت بر کنار

آخر بودیم، امیر علی اسپے نامزد کرد، بیاوردند و بکسان من دادند، ارزیدے سی صد دینار نشاپوری، سلطان بمصلّیٰ رفت و من در خدمت، نماز شام بگزاردیم و بخوان شدیم، بر خوان امیر علی گفت پسر برہانی دریں تشریفے کہ خداوند جہاں فرمود ہیچ نگفتی حالی دو بیتے بگوے من برپاے جستم و خدمت کردم و چنانکہ آمد حالے ایں دو بیتی بگفتم:-

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید   از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من بشنید   چو باد یکے مرکب خاصم بخشید

چوں ایں دو بیتی اداکردم، علاء الدولہ احسنتہا کرد و بسبب احسنت او سلطان مرا ہزار دینار عطا فرمود علاء الدولہ گفت جامگی و اجراش نرسیدہ است فردا بر دامن خواجہ خواہم نشست تا جامگیش از خزانہ بفرماید و اجراش بر سپاہاں نویسد، گفت مگر تو کنی کہ دیگراں را ایں حسبت نیست و ادرا بلقب من باز خوانید و لقب سلطان معز الدنیا والدین بود، امیر علی خواجہ معزی خواند سلطان گفت امیر معزی، آں بزرگ بزرگ زادہ چناں ساخت کہ دیگر روز نماز پیشین ہزار دینار بخشیدہ وہزار و دویست دینار جامگی و برات نیز ہزار من غلہ بمن رسید، بود و چوں ماہ رمضان بیروں شد مرا بمجلس خواند و با سلطان ندیم کرد و اقبال من روے در ترقی نہاد و بعد ازاں پیوستہ تیمار من ہمی داشت و امروز ہرچہ دارم از عنایت آں بادشاہ زادہ دارم"۔

(چہار مقالہ طبع لیڈن صفحہ ۴۲ و ۴۳)

قولہ "غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہی لیکن سچ یہ ہی کہ اس صنم کدہ کے آذر نظامی ہی ہیں"۔ (صفحہ ۲۱۴)

تغزل میں نظامی کسی خاص امتیاز کے مستحق نہیں کیونکہ غزل کے پہلے

باغبان شہید، رودکی اور دقیقی ہیں۔ غزنوی دور میں عنصری بلکہ خود سلطان محمود کو اس کی آبیاری میں مصروف دیکھا جاتا ہے۔ حکیم سنائی زیادہ تر زہریات اور کمتر تصوف کے مضامین کی اس میں اشاعت دیتے ہیں، مجاز کے پردے میں حقیقت کے اسرار کی ترجمانی ان سے شروع ہو جاتی ہے۔ انوری کے ہاں سوز و گداز اور عشقِ محض ہے۔ یہ عطار ہیں جو غزل کو میخانہ کا راستہ بتاتے ہیں۔ رندوں کی صحبت میں جگہ دیتے ہیں اور حقیقت و مجاز کی دو عملی میں اس کا نشیمن آباد کرتے ہیں۔ مولانا روم اور عراقی بادۂ تند کے ساغر پلا پلا کر اسے مستِ سرمدی بنا دیتے ہیں، حقیقت و مجاز ایک دوسرے سے ایسے گھُل مل جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے امتیاز کرنے میں دِقت پیش آتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظامی نے غزل کی کوئی خدمت کی ہو۔ لیکن سنائی، انوری اور خاقانی کے مقابلے میں انھوں نے کوئی امتیازی رتبہ حاصل نہیں کیا۔ اس لیے اس میدان میں نظامی کسی خاص شکریے کے مستحق نہیں ہیں۔

حکیم سنائی

دیوانۂ لائے خوار کے قصّے کے ذکر کے بعد جس کو بسبب کثرتِ شہرت قلم انداز کیا جاتا ہے علامہ شبلی فرماتے ہیں :۔

قولہ حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بھٹئی کرتے تھے یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو ان کے عقدِ نکاح میں دینا چاہا اور انھوں نے انکار کیا، چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا :۔

من نہ مرد زن و زر و جاہم | بخدا اگر کنم دگر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم | بہ سر تو کہ تاج نستانم

(شعر العجم صفحہ ۲۱۷)

مجھ کو اس قصے پر یقین لانے میں بہت کچھ تامل ہی، اس لیے کہ یہ اشعار حدیقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور حدیقہ حکیم سنائی نے ساٹھ سال کی عمر میں تصنیف کیا ہی چنانچہ اشعار

روزگار حسود بے باکم | از دلِ شوخ جان غمناکم
کرد پشتم کمان و گام چو تیر | کرد رویم چو قیر و موے چو شیر
پائے بر پایم آمد از غم شصت | لاجرم دست میزنم بر دست

(حدیقہ صفحہ ۵۹۶)

دیگر

عمر دادم بجملگی بر باد | بر من آمد ز شصت صد بیداد

(صفحہ ۵۹۸)

عمر کی زیادتی بجائے خود اہم مانع ہونے کے علاوہ جس موقعے پر ان کا ایراد ہوا ہی وہاں متن میں کوئی ایسا ایما نہیں پایا جاتا جس سے یہ گمان کیا جائے کہ ان اشعار کا مخاطب سلطان بہرام شاہ غزنوی ہی۔ تنہا ان اشعار کی بنا پر نتیجۂ بالا قائم کرنا خالی از غرابت نہیں۔ یہ اشعار "قناعت" کے عنوان کے ذیل میں آتے ہیں اور زیادہ تر ایسا پایا جاتا ہی کہ ان میں کسی خاص پادشاہ کی طرف خطاب نہیں ہی۔ ان ہی ابیات کے بعد یہ اشعار آتے ہیں ؎

زاں کہ چوں طوقِ منت بکشم | لقمۂ خوانِ نعمت بچشم
نبوم بہرِ طمع مدحت گوئے | ایں نیابی ز من جز از من جوئے

(حدیقہ ص ۶۱۱)

الغرض یہ اشعار اسی طرح چلے گئے ہیں اور ان سے کوئی صریحی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔ شاعر کا مقصد قناعت کی تعلیم و تلقین ہے اور پادشاہی خدمت سے اعراض و اغماض وغیرہ وغیرہ۔

قولہ "حکیم سنائی نے جب حدیقہ تصنیف کیا تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں اس لیے علما نے سخت مخالفت کی یہاں تک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی بہرام شاہ نے دار الخلافۂ بغداد سے استفتا طلب کیا، وہاں کے علما نے لکھا کہ یہ مسائل قابلِ اعتراض نہیں۔" (شعر العجم صفحہ ۲۱۸)

جہاں تک تذکروں سے معلوم ہے، بہرام شاہ نے دار الخلافت سے استفتا طلب نہیں کیا خود دولت شاہ جس سے غالباً مولانا نے یہ قصّہ نقل کیا ہے کہتا ہے:۔

"چوں کتاب حدیقہ تمام کرد، علمائے ظاہر غزنین بر حکیم طعن کردند و آں کتاب را بدار الاسلام بغداد فرستاد و بدار الخلافت عرض کرد و از علمائے بغداد و ائمہ آں دیار بر صحت عقیدۂ خود فتوی حاصل کرد۔"

مخزن الغرائب میں لکھا ہے:۔

"چوں کتاب حدیقہ را با تمام رسانید، بمطالعۂ علمائے ظاہر غزنین درآمد، زبان طعن بر او دراز کردند و بہ کفر و الحاد منسوب نمودند، خواستند او را تشہیر کنند، او بعلمائے غزنین گفت کہ چرا مرا ملامت و سرزنش می کنید۔ گفتند تو در حدیقہ خلاف شرع گفتۂ، گفت کتاب حدیقہ را بعلمائے دار السلام بغداد عرض

می دارم، اگر علمار آنجا بر کفر من فتویٰ دہند ہر چہ سزائے ما باشد بما رسانید، پس حدیقہ را بدار الخلافت بغداد فرستاد، واز علمار بغداد و ائمہ آنجا بر صحت عقیدہ خود فتویٰ ساخت، علما و ائمہ آنجا بر صحت عقیدہ و بہ ثبوت ایمان و مذہبش دستخط و مواہیر نمودند، ازاں سرزنش و بلیہ نجات یافت۔"

مزید ثبوت کی ضرورت کے وقت خود حکیم سنائی کا قول نقل کیا جا سکتا ہو اس بارے میں حدیقہ کے خاتمے میں کافی اطلاع موجود ہو۔

سنائی امیر برہان الدین ابو الحسن بن ناصر الغزنوی الملقب بہ بریانگر کو خطاب کر کے کہتے ہیں :۔

اے تو بر دینِ مصطفےٰ سالار — بر طریقِ برادراں کن کار
عہدِ دیرینہ را بیاد آور — از طریقِ برادری مگذر
دین حق را بحق توئی برہاں — مر مرا زیں عقیلہا برہاں
تو بہ بغداد شاد و من ناشاد — خود نگوئی ورا رسم فریاد
سال و مہ ترسناک و اندگیں — گشتہ محبوس تربت غزنیں

(صفحہ ۸۵۱ ۔ نولکشور)

بدایونی نے غالباً اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو کہ کتاب حدیقہ سنائی نے اپنے حبس کے ایام میں لکھی تھی ۔ منتخب التواریخ میں بہرام شاہ کے ذکر میں لکھتے ہیں :۔

"وحدیقۃ الحقیقۃ شیخ بنام اوست کہ در ایام حبس فرمودہ وجہت حبس شیخ تعصب غزنویہ بودہ در وادی تسنن"۔ (صفحہ ۱۲ طبع نولکشور)

کمن آخر برادری پیش آر — وز میاں ایں حجابہا بردار

گرچہ ہستم اسیرِ ہر نا اہل — چشم دارم کہ کار گردد سہل
تا کی ایں انقباض وایں دوری — بسر من کہ تو نہ معذوری
عہدہائے قدیم را یاد آر — حق نان و نمک فرو مگذار"

اس کے بعد حدیقہ کے ذکر میں کہتے ہیں :-

ایں کتابے کہ گفتہ ام در پند — چوں رُخِ حور دلبر و دلبند
ہرچہ دانستہ ام ز نوع علوم — کردہ ام جملہ خلق را معلوم
آنچہ نص است وآنچہ اخبارست — وز مشائخ ہر آنچہ آثارست
اندریں نامہ جملگی جمع ست — مجلس عقل را یکے شمع است
ملکوت ایں سخن چو بر خوانند — حرز و تعویذ خویشتن دانند
یک سخن زین و علمائے دانش — ہمچو قرآن پارسی دانش" صد ۸۵۲

اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہوئے گویا ہیں :-

"جاہلاں جملہ ناپسند کنند — وز سر جہل ریشخند کنند
واں کہ باشد سخن شناس و حکیم — ہمچو قرآں درا کند تعظیم
گر کند طعنہ اندریں ناداں — گو بکن نیست بہتر از قرآن
بہر شاں لفظم ار بود ترفند — تو بر و شکر کن بر ایشاں خند
نخورم غم گر آلِ بوسفیاں — بنو نند از حدیث من شاداں
بندہ را مدحِ مصطفےٰ است غذا — جان من باد جانش را بفدا
آل او را بجاں خریدارم — وز بدی خواہِ آل بیزارم
گر بدست ایں عقیدہ و مذہب — ہم بریں بد بداریم یارب" صد ۸۵۳

اس کے بعد امیرِ بریانگر سے استفتا کرتے ہیں :-

تو چہ گوئی بیار و فتوی کن — نیست اندر سخن مجال سخن

گفتم این دربت فرستادم | دُرِ گنج علوم بکشادم
گر ترا این سخن پسند آید | جان من رستہ از گزند آید
ور پسند تو ناید این گفتار | خود ندیدی بجملہ باد انکار
این سخن را مطابقت فرمائے | نیک و بد در جواب باز نمائے
ندہم بیش ازین ترا تصدیع | عرض کن بر ہمہ شریف و وضیع
گوئی این اعتقاد مجدود ست | جملہ بر گفتنش آنچہ مقصود ست ۸۵۴ھ

حکیم سنائی ایک معلم کے فرزند تھے، جیسا کہ حدیقۃ الحقائق کے دیباچے میں ارشاد کرتے ہیں، حدیقہ آپ نے خواجہ رئیس احمدؒ بن مسعود بیشہ کی فرمایش سے لکھا ہو ؎

لیکن کنون ز بس کرمش زیر تیشہ ام | خواجہ رئیس احمدؒ مسعود بیشہ را

اس کتاب کی تصنیف کے زمانے میں خواجہ احمدؒ ہی ان کی جملہ ضروریات کے متکفل تھے۔ سنائی اس کی تصنیف پر قریباً دس سال یعنی ۵۲۵ھ سے ۵۳۵ھ تک مصروف رہے ؎

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام | پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

بعض نسخوں میں آخری مصرع یوں آتا ہو ع

پانصد و بست و پنج گشتہ تمام

حدیقہ میں ایسا معلوم ہوتا ہو کہ بعض اشعار الحاقی بھی ہیں، مثلاً جنگِ جمل کے واقعات کے ذکر میں شاعر نے تمام معتبر تاریخوں سے اختلاف کیا ہو۔ جنگ جمل (۳۶ھ) میں حضرت عائشہؓ و حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ ایک فریق تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک فریق۔

حدیقہ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کو ایک فریق قرار دیا ہو

اور کہا گیا ہی کہ حضرت معاویہؓ اس جنگ میں فرار ہوتے ہیں اور بغداد کی طرف چلے جاتے ہیں ؎

درجمل چوں معاویہؓ بگریخت خون ناحق بسے بخیرہ بریخت
شد ہزیمت بجانب بغداد گشتہ از فعل زشت خودناشاد

جب حضرت عائشہؓ کے اونٹ کی کوچیں کاٹ دی جاتی ہیں اور ہودج گرتا ہی، ام المومنین امان مانگتی ہیں حضرت علیؓ حضرت محمدؐ بن حضرت ابوبکرؓ کو بلواتے ہیں اور محمدؐ آکر چاہتے ہیں کہ بہن کا سر کاٹ لیں، لیکن حضرت علیؓ منع کرتے ہیں ؎

جمل آں ستیزہ را پے کرد برگ وساز معاویہؓ نے کرد
ہودج زن بخاک تیرہ فتاد وزخجالت نقاب رخ نکشاد
گفت بدکردہ ام امانم دہ وزترحم کنوں ضمانم دہ
چوں بدیدند زود برگشتند درخوی خون ورانیاغشتند
خواند حیدر برادرش رازود جملہ احوالہا ورا بنمود
رفت دستے محمدؐ بوبکرؓ آں ہمہ صدق وفارغ ازہمہ مکر
پس برآہیخت تیغ تا بزند گفت حیدر مکن کس ایں نکند
عفوکن تا بسوے خانہ رود بعد ازیں کارہاے بدنکند صفحہ ۲۸

حضرت محمدؐ پھر اپنی بہن کو مکۂ معظمہ کی طرف بھجواتے ہیں آپ جب مکہ پہنچ جاتی ہیں، کچھ عرصے بعد حضرت معاویہؓ آپ کو قتل کر دیتے ہیں ؎

برگرفتش محمدؐ از سر راہ جملہ لشکر شدہ زکار آگاہ
بسوے مکہ زود بفرستاد درتواضع محل دراںنہاد
باہزاراں خجالت وتشویر رفت زی مکہ جفت گرم وزحیر

عاقبت ہم بدست آں باغی　　شد شہید و بکشت آں طاغی

آں کہ باجفت مصطفےٰ زینساں　　بدکند مرورا بمرد محواں ص۱۸۲

شاعری کی ایک اور اہم خدمت جو سنائی نے کی ہی تغزل ہی۔ سنائی کے عہد سے پیشتر غزل کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن اس صنفِ سخن نے ان کے ہاں مستقل شان پیدا کرلی ہی۔ بلحاظ زبان اُن کی غزل، قطعہ اور قصیدے میں متقدمین کی طرح کوئی تفاوت نہیں دیکھا جاتا۔ تخلص کا رواج، غزل کے مقطع میں سب سے پیشتر اُنہی کے ہاں پایا جاتا ہی۔ وارداتِ حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا اُنہی سے شروع ہوتا ہی۔ اگرچہ مذاق میں زہدیت غالب ہی تاہم تغزل کو خرابات کا راستہ بنانے والے حکیم سنائی ہیں۔ عرفان اور رندی کی آمیزش کے قدیم ترین نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ عطارؒ اور مولانا رومؒ ان ہی کی بُنیادوں پر قصر و ایوان تعمیر کرتے ہیں۔ قصہ مختصر سنائی کے ہاں شاعری بلحاظِ غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہی۔ زہدِ خشک کا خاتمہ ہوتا ہی۔ رندی اور مستی کی داغ بیل ڈالی جاتی ہی، صومعہ چھوڑا جاتا ہی۔ میخانہ آباد کیا جاتا ہی۔ زہد سے اعتزال ہوتا ہی اور خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہی۔ امثال :-

در دل آنرا کہ روشنائی نیست　　در خرابات آشنائی نیست

پسرا خیز و جام بادہ بیار　　کہ مرا برگِ پارسائی نیست

جرعۂ مے بجان و دل بخرم　　پیش کس مے بدیں روائی نیست

دیگر

اے ساقی مے بیار پیوست　　کاں یارِ عزیز توبہ بشکست

برخاست زجائے زہد و دعویٰ　　در میکدہ با نگار بنشست

بنہاد زسر ریا و طامات　　از صومعہ ناگہاں بروں جست

بنهاد زپائے، بند تکلیف — زنار مغانہ بر میاں بست
مے خورد و مرا بگفت، می خور — تا بتوانی مباش جز مست
اندر رہِ نیستی ہمی رو — آتش در زن بہر چہ وے ہست

میرزا محمد حواشی چہار مقالہ (ص۱۵۱) میں لکھتے ہیں کہ ان کی وفات باصح اقوال ۵۴۵ھ میں ہوئی۔ امیر معزی المتوفی ۵۴۲ھ کے مرثیہ میں سنائی نے یہ اشعار لکھے ہیں :۔

تا چند معزا اے معزی کہ خدایش — زیں جا بفلک بردو قبائے ملکی داد
چون تیر فلک بود قرینش سرہ آورد — پیکان ملک بردو بہ تیر فلکی داد

بہرام شاہ غزنوی کے علاوہ انھوں نے سلطان سنجر کی بھی مداحی کی ہے، ایک قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

خاک را از باد بوئے مہربانی آمدہ است
در دہ آں آتش کہ آب زندگانی آمدہ است

سنجر کے ابتدائی تخت نشینی کے ایام میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں ؎

چوں بسلطانی نشستی تہنیت گویم ترا
اے کہ اسلاف ترا سلطاں نشانی آمدہ است

خواجہ احمد معروف بہ عارفِ زرگر اور قاضی فضل بن یحییٰ بن صاعد اور علی بن ابراہیم ہروی کے ساتھ سنائی نے قصائد تبدیل کیے ہیں۔ شیخ الاسلام جمال الدین ابو المفاخر، محمد بن منصور سرخسی مفتی مشرق کی تعریف میں سنائی نے ایک سے زیادہ ترکیب بند لکھے ہیں اور بقول پروفیسر محمد اقبال ام۔اے۔پی ایچ ڈی مثنوی سیر العباد الی المعاد بھی انہی محمد بن منصور کے نام پر لکھی ہے۔

(حواشی راحت الصدور (ص۴۷۲ طبع یورپ)

عمر خیّام

ذیل کا مضمون میری درخواست پر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پروفیسر اورئنٹل کالج لاہور نے لکھا تھا چنان چہ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے رسالہ 'اردو' میں انھی کے نام سے چھپا تھا۔ مضمون میں بقول ان کے اُس وقت بھی خامیاں تھیں اور اب جب کہ بیس سال کا زمانہ گزر چکا اور اس عرصے میں خیام پر سیکڑوں مقالات اور بیسیوں کتابیں لکھی گئیں نئے نظریے قائم ہوئے اور نئی حقیقتیں منکشف ہوئیں ضرورت تھی کہ مضمون پر نظرِ ثانی کی جاتی۔ علاوہ اس کے چوں کہ وہ اس کے لہجے اور اندازِ بیان پر بھی مطمئن نہ تھے میں نے اُن سے دوبارہ درخواست کی کہ مضمون کو از سرِ نو لکھ دیں۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ اِدھر تو کتابت ہو چکی تھی اور اُدھر اُنھیں فرصت نہ تھی اِس لیے افسوس ہے کہ ان ناگزیر حالات میں مضمون کو اُسی ناقص شکل میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

اس دوران میں خیّام پر جو نہایت اہم کتابیں تالیف ہوئیں وہ حسبِ ذیل ہیں:۔ (۱) "رباعیاتِ خیّام کا تنقیدی مطالعہ" از پروفیسر کرسٹن سین (کوپن ہاگن ۱۹۲۷ء)، (۲) "خیّام" از سید سلیمان ندوی (اعظم گڑھ ۱۳۵۲ھ) (۳) "عمر خیام" از ڈاکٹر ریمپس (جرمنی ۱۹۳۵ء)، (۴) "عمر خیام اور اس کی رباعیاں" از ڈاکٹر ریمپس (۱۹۳۵ء)، (۵) "رباعیات حکیم عمر خیام" معہ مقدمہ از ڈاکٹر روزن (طہران ۱۳۰۵ھ شمسی)، (۶) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں عمر خیام پر مضمون از پروفیسر منورسکی، (۷) "دی نکٹار آف گریس" از سوامی گووند تیرتھا (الہ آباد ۱۹۴۱ء)۔

محمود شیرانی

اسلامی دُنیا کے تمام گزشتہ شاعروں اور ادیبوں میں خیّام کی ہستی بالکل یگانہ ہے ایران کے اس شاعر فیلسوف کو جو شہرت آج حاصل ہے اور جتنا لٹریچر اس کی شخصیت

اس کے ذاتی حالات، اس کے مذہبی، اخلاقی اور فلسفی خیالات پر گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں یورپ کی مختلف زبانوں میں لکھا جا چکا ہو اس کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب خانہ بن سکتا ہو۔

لیکن اب تک جو کچھ ہوا سب اہلِ مغرب کی تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہو مسلمان بلکہ خود اہلِ ایران جن کے لیے خیّام کے کمالات مایۂ ناز ہو سکتے تھے شروع ہی سے اس کی شخصیت کی طرف سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ فارسی یا عربی تذکرہ نویسوں نے مستقل طور سے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا، مورخوں نے اس کو بالکل پس پشت ڈالا، اس کی رباعیات کا کوئی ایسا نسخہ جس پر ذرا سا بھی اعتبار کیا جا سکے محفوظ نہیں رکھا گیا۔ اور سخت افسوس کا مقام ہو کہ اب بھی جب کہ یورپ خیام کو ہم سے روشناس کرا چکا ہو اور اس کی خوبیوں کو تمام و کمال ہمارے ذہن نشین کرا چکا ہو، ہماری بے توجہی بدستور چلی جا رہی ہو۔ ہر چند یہ ہمارے لیے شرم کی بات ہو کہ ہماری اپنی زبان اور اپنے ملک کی ادبیات کی تنقید میں اجنبی لوگ ہمارے مذاق کی رہنمائی کریں۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر شرمناک امر یہ ہو کہ ہم اُن کی رہنمائی کے ممنون نہ ہوں اور اس سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔ اپنی ذاتی تحقیق کا قدم آگے بڑھانا اور اپنے پیش رو محققوں کی غلطیوں کی تصحیح کرنا یا اُن کے ذخیرۂ انکشافات میں اضافہ کرنا ہر صاحبِ تصنیف کا فرض ہو لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس درجہ قابلِ الزام نہیں جتنا کہ یہ امر قابلِ اعتراض ہو کہ اُن معلومات کو جو پہلے سے مہیا کی جا چکی ہوں نظر انداز کیا جائے۔

یہی وہ اعتراض ہو جس کے مورد مولانا شبلی اپنی مشہور کتاب شعر العجم میں خیام کے حالات لکھنے میں ہوئے ہیں۔ مولانا شبلی اُردو ادیبوں میں واحد

شخص ہیں جنھوں نے اسلام کی تاریخ اور خصوصاً عجم کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی ہی۔ اُن کے فضل وکمال سے ہم کو توقع تھی کہ خیام جیسے بے نظیر صاحبِ کمال کے بارے میں جس کی شخصیت کے متعلق علمی دُنیا اس قدر گہری دلچسپی کا اظہار کر رہی ہی، ہماری معلومات میں اضافہ کریں گے اور اپنی فاضلانہ تنقید سے ان شکوک کو رفع کریں گے اور اُن غلط روایتوں کی تردید کریں گے جو خیام پرستوں کے اعتقادات میں شامل ہیں۔ لیکن شعرالعجم کو دیکھنے سے ہمیں مایوسی ہوتی ہی کہ جو تفاصیل خیام کے حالات میں ہم کو اس میں ملتی ہیں وہ اس کی رباعیات کے ہر معمولی دیباچہ نویس نے لکھی ہیں بلکہ کچھ زیادہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

خیام کے حالات میں سب سے پہلے مولانا شبلی نے وہ مشہور قصہ لکھا ہی جس میں بیان کیا جاتا ہی کہ حسن بن صباح، نظام الملک وزیر اور خیام تینوں ایک ہی مکتب میں ہم سبق تھے اور انھوں نے زمانہ طالب علمی میں عہد کیا تھا کہ ہم میں سے جو ترقی پاکر کسی بڑے منصب پر پہنچے وہ اپنے ساتھیوں کی دستگیری کرے۔ مولانا نے محض ایک مقبولِ عام روایت کو مختصر طور سے لکھ دینے پر قناعت کی۔ حالانکہ یہ قصہ معاً اس قدر عجیب اور اس درجہ موردِ شکوک ہی کہ ایک علمی تصنیف میں اس پر بہت لمبی چوڑی تنقید ہونی چاہیے۔

یہ قصہ تاریخ اور تذکرے کی متعدد کتابوں میں منقول ہی مثلاً تاریخ گزیدہ، روضۃ الصفا، حبیب السیر، اور تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی وغیرہ میں۔ لیکن قدامت کے اعتبار سے سب سے پہلے اس کو صاحب جامع التواریخ نے (جو آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں تصنیف ہوئی) لکھا ہی۔ اگرچہ جامع التواریخ ایک مستند کتاب ہی اور اس کے مصنف کی ثقاہت مسلمہ ہی تاہم یہ قصہ ایسا سیدھا سادہ نہیں ہی کہ ہم اس کو محض ایک مصنف کی ثقاہت کی وجہ سے قبول کریں۔

اس کے متعلق یورپ کے تمام مشہور فضلا نے جو فارسی زبان کے ماہر ہیں، تنقید کے طور پر کچھ نہ کچھ لکھا ہی لیکن سب سے زیادہ قابلِ وقعت وہ تنقید ہی جو چہار مقالہ نظامی عروضی کے شارح مرزا محمد قزوینی نے کتابِ مذکور کے حاشیوں میں لکھی ہی۔ چونکہ مرزا صاحب علاوہ عالم و ماہر ہونے کے اہلِ زبان اور خیام کے ہم وطن ہونے کا فخر بھی رکھتے ہیں اس لیے ان کی رائے اس بارے میں ہر طرح قابلِ اعتماد ہی۔ ہم ان کی عبارت کا ملخّص یہاں درج کرتے ہیں :۔

"رشید الدین فضل اللہ صاحب جامع التواریخ نے جو کہ ۷۱۸ھ میں مقتول ہوا اپنی کتاب میں عمر خیام، حسن بن صباح اور نظام الملک کی رفاقت اور ہم مکتبی کے زمانے میں عہد و فا باندھنے کی حکایت بیان کی ہی۔ یہ حکایت رشید الدین کے اپنے بیان کے مطابق اس نے کتاب "سرگزشت سیدنا" سے اخذ کی ہی جو کہ حسن بن صباح کے حالات میں لکھی گئی تھی اور جو اسماعیلی فرقے کے مشہور قلعے الموت کے کتاب خانے میں تھی۔ ہلاکو خاں تاتاری نے جب اس قلعے کو سر کیا تو علاء الدین عطا ملک جوینی صاحب تاریخ جہاں کشا کو مامور کیا کہ وہ قلعے کے اندر جاکر کتاب خانے کا ملاحظہ کرے اور جس کتاب کو وہ اپنی دانست میں محفوظ رکھنے کے قابل سمجھے، رکھے باقی کو جلا دے۔ من جملہ ان کتابوں کے جو علاء الدین نے محفوظ کرلیں یہ کتاب بھی تھی۔ لیکن تعجب یہ ہی کہ خود علاء الدین نے جس نے کہ اپنی تاریخ جہانگشا کا ایک مستقل حصّہ اسماعیلیوں اور قلعہ الموت کی تاریخ میں لکھا ہی، اس کتاب کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

تینوں ہم سبقوں کے عہد کرنے کی یہ داستان یورپ کے اکثر علما کے نزدیک جعلی ہی۔ نظام الملک کی تاریخ ولادت باتفاق مورخین ۴۰۸ھ ہی اور تاریخ وفات ۴۸۵ھ۔ عمر خیام اور حسن بن صباح کی پیدایش تو معلوم نہیں۔ لیکن ان

کی وفات کی تاریخ ۱۰۵۱۷ھ اور ۱۸۵ھ ہی۔ پس اگر خیام اور حسن نظام الملک کے ہم سن یا متقارب السن تھے جیسا کہ اس حکایت کا مقتضا ہو تو پھر ظاہر ہو کہ ان دونوں کی مدتِ عمر سو سو سال سے بھی زیادہ ہوئی اور گو یہ عادتاً محال نہیں تاہم مستبعد ضرور ہی۔ پھر اگر ان دونوں میں سے ایک کی عمر اس قدر بڑھی ہوئی ہوتی تو چنداں بعید الوقوع بات نہ تھی تعجب اس بات پر ہی کہ دونوں کے دونوں نے معاً اس قدر فوق العادت عمریں پائیں اور پھر ایک ساتھ مرے۔ علاوہ اس کے کہیں کسی کتاب میں بھی تصریحاً یا اشارۃً ان دو نامور اشخاص میں سے کسی ایک کا غیر معمولی عمر تک پہنچنا ثابت نہیں ہوتا۔[۵۱]"

نظامی عروضی مصنف چہار مقالہ جو خود خیام کا معاصر تھا اور جس کو متعدد دفعہ اس سے ملاقات کرنے کا موقع ملا ہی۔ خیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہی کہ ۵۰۸ھ میں بادشاہِ وقت نے پیغام بھجوایا کہ ہم شکار کو جانا چاہتے ہیں تم اپنی نجوم دانی کے ذریعے سے کوئی ایسی تاریخ مقرر کرو جو برف باری سے محفوظ ہو۔ چنانچہ اس نے حساب لگا کر ایک تاریخ تجویز کر دی۔ سردی کا موسم تھا ابھی تھوڑی دُور نکلے ہوں گے کہ بڑے زور کا بادل اُٹھا اور سرد ہوا چلنے لگی خیام ساتھ تھا بادشاہ نے اس کو سخت زجر و توبیخ کی۔ اُس نے کہا آپ ذرا صبر کریں ابھی مطلع صاف ہوا جاتا ہی اور پانچ دن تک بادل دکھائی بھی نہ دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس حکایت کو خود مولانا شبلی نے شعر العجم میں نقل کیا ہی[۵۲]۔ اگر ہم خیام کو نظام الملک کا ہم سن مانیں تو ۵۰۸ھ میں اس کی عمر سو برس کی ہونی چاہیے۔ اب

---

[۵۱] چہار مقالہ طبع یورپ صفحات ۲۱۶ و ۲۱۷،

[۵۲] دیکھو کتاب مذکور جلد ۱ صفحہ ۲۳۰

خیال کرنا چاہیے کہ ایک سو برس کے بڈھے پھوس کے لیے اعمال نجوم کے ذریعے سے پیشین گوئیاں کرنا اور پھر جاڑے اور برف باری کے عالم میں بادشاہ کی ہمراہی میں شکار کو نکلنا کہاں تک قرینِ قیاس ہی؟

اگر یہ مانا جائے کہ نظام الملک اپنے دوسرے ہم مکتبوں سے عمر میں بڑا تھا تو ہم کو اس کی عمر کی بڑائی کم از کم بقدر تیس برس کے ماننی ہوگی۔ اگر خیام اور حسن صباح نے اسی اسی پچاسی پچاسی برس کی بھی عمر پائی تو ظاہر ہی کہ ان کی ولادت ۴۳۵ھ کے قریب قریب ہونی چاہیے۔ اس صورت میں نظام الملک ان دونوں سے قریباً ستائیس برس بڑا ٹھیرا تو کیا یہ ممکن ہی کہ ایک چالیس برس کا سن رسیدہ آدمی بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس کے بچوں کا ہم سبق ہو جب کہ دوسری طرف ہم کو معلوم ہی کہ نظام الملک نے نوجوانی ہی میں ابوعلی شاذان گورنر بلخ کے ہاں بحیثیت کاتب کے ملازمت اختیار کر لی تھی[1]۔

اگرچہ یورپ میں کتاب چہار مقالہ شعر العجم کے بعد شائع ہوئی لیکن اوپر کی عبارت میں جو مطالب بیان کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "تاریخ ادبیات ایران" کی دوسری جلد (صفحہ ۱۹۰-۱۹۲) میں درج کیے ہیں اور پھر قریب قریب ان ہی مطالب کو وِن فیلڈ صاحب نے دیباچۂ رباعیات عمر خیام (طبع لندن ۱۸۸۲ء) میں تحریر کیا ہی۔ رباعیات کے اس اڈیشن کا ذکر خود مولانا نے کیا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ کتاب مذکور سے بخوبی واقف تھے۔ مولانا اگر انگریزی سے نابلد تھے تو کم از کم فرانسیسی اچھی طرح جانتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں میں متعدد دفعہ اس کا اعتراف کیا ہی۔ پروفیسر ہوتسما نے عماد الدین الکاتب الاصفہانی کی مشہور تاریخ زبدۃ النصرۃ

---

[1] دیکھو تاریخ ابن خلکان ترجمہ نظام الملک۔

(طبع لندن ۱۹۰۵ء) کے فرانسیسی دیباچے میں قریب قریب یہی باتیں ہوئی ہیں[51]۔ اور ساتھ ہی ایک دل چسپ حقیقت کو منکشف کیا ہے جو قابل تسلیم ہے۔ وہ یہ کہ در اصل خیام اور حسن بن صباح کا ہم مکتب نظام الملک نہ تھا بلکہ انوشیروان بن خالد تھا جو کہ منصب وزارت میں نظام الملک کے جانشینوں میں سے تھا۔ چنانچہ خود انوشیروان نے واضح طور سے اس کو لکھا ہے[52]۔

عموماً تاریخی روایتوں میں اور خصوصاً ایران کی تاریخی روایتوں میں ایسا اکثر ہوا کہ غیر مشہور لوگوں کے کارناموں کو مشہور لوگوں کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ یہاں بھی انوشیرواں بن خالد کے حالات زندگی نظام الملک کی طرف منتقل کیے گئے ہیں۔

اگر تحقیق کا قدم اور آگے بڑھایا جائے تو اسی حکایت کی تنقید کے لیے اس قدر مواد جمع کیا جا سکتا ہے کہ ایک مستقل تصنیف کی صورت بن سکتی ہے لیکن تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے فاضل ادیب نے ایسے اہم مسئلے کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کے حالات جن کتابوں سے اخذ کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی (۲) نزہۃ الارواح شہرزوری جس کو وہ تاریخ الحکما شہرزوری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ (۳) تاریخ الکامل لابن الاثیر (۴) تاریخ الحکما قفطی (۵) چہار مقالہ نظامی عروضی

ان پانچ کتابوں میں سے جو حالات اخذ کیے جا سکتے تھے وہ بے شک

---

۵۱ دیباچہ مذکور صفحہ یک و دیہ۔

۵۲ زبدۃ النصرۃ صفحہ ۶۶

انھوں نے اخذ کر لیے ہیں لیکن ان کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی تاریخی اور
ادبی کتابیں ہیں جن میں ضمناً خیام کا ذکر آگیا ہی جس کو اخذ کر کے ناظرین کے
سامنے پیش کرنا تذکرہ نویس کا فرض ہی۔ ہر فارسی داں اس بات کو جانتا ہی کہ
ایران کے جتنے نامور شاعر گزرے ہیں مثلاً فردوسی، انوری، حافظ، عطّار،
خیام وغیرہ۔ ان سب کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں اور جتنی کسی
کی شہرت زیادہ ہی اتنا ہی اُس کے متعلق معلومات کا ذخیرہ کم ہی حتیٰ کہ حافظ
اور فردوسی جیسے مایۂ ناز شعرا کی تاریخ ولادت و وفات تک محفوظ نہیں رکھی
گئی۔ ایسی حالت میں جب کہ ان اہل کمال کے حالات زندگی اس درجہ کمیاب
ہوں تو اُن کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں بھی جو اتفاقیہ طور سے تاریخی کتابوں
سے ہاتھ لگ جائیں ترک کر دینا یا ان کی طرف سے بے پروائی برتنا بہت
بڑے ادبی نقصان کا موجب ہو سکتا ہی۔ مولانا شبلی نے خیام کے ذخیرۂ حالات
میں سے جو ان کو بغیر کسی تلاش اور کاوش کے مہیّا مل سکتا تھا نصف کے قریب
بالکل چھوڑ دیا ہی جس سے اس کے سوانح عمری میں بہت بڑی کمی رہ گئی ہی۔
خیام کے متعلق پروفیسر ژوکوفسکی کا وہ فاضلانہ مضمون جو انھوں نے ۱۸۹۷ء میں
روسی زبان میں لکھا تھا اور جس کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر راس نے ۱۸۹۸ء میں
رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں شائع کیا تھا اس کا علم مولانا کو ضرور تھا
کیونکہ انھوں نے خود خیام کے تذکرے کے اخیر میں اس مضمون کا اور اس کے
انگریزی ترجمے کا ذکر کیا ہی۔ لیکن شاید وہ اتنی زحمت گوارا نہیں کر سکے کہ اس
کو منگوا کر ایک نظر دیکھ لیتے ورنہ اتنی بڑی فروگزاشت ان سے سرزد نہ ہوتی۔ اس
مضمون میں پروفیسر ژوکوفسکی نے ان تمام کتابوں کو جن میں خیام کے حالات
تھوڑے یا بہت مل سکتے تھے باعتبار قدامت یکے بعد دیگرے ترتیب دے کر

ذکر کیا ہی اور جو حالات ہر ایک کتاب میں سے میسر آئے ہیں اُن کو بھی جمع کیا ہی اس مضمون کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ علاوہ ان پانچ ماخذوں کے جن کا استعمال مولانا نے کیا ہی اور جن کا اوپر ذکر کر دیا گیا ہی پانچ کتابیں اور ہیں جن میں خیام کے حالات ملتے ہیں اور جو باعتبار ثقاہت کے کچھ کم قابلِ وقعت نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو 'مرصاد العباد' تالیف شیخ نجم الدین ابوبکر رازی معروف بہ "دایہ" ہی جو ۶۲۰ھ میں لکھی گئی۔ دوسری 'آثار البلاد' قزوینی ہی جو ۶۷۴ھ کی تصنیف ہی تیسری 'جامع التواریخ'، ہی جس کا اوپر ذکر آچکا ہی۔ چوتھی 'فردوس التواریخ' مصنفۂ مولانا خسرو ابرقوہی جو ۸۰۸ھ میں لکھی گئی اور پانچویں تاریخ الفی جو اکبر کے عہد کی مشہور تصنیف ہی۔

ان پانچ کتابوں میں سے خیام کے متعلق جو حالات اخذ کیے گئے ہیں ان کو ہم طوالت کے خوف سے یہاں دُہرانا نہیں چاہتے جس کو اشتیاق ہو وہ پروفیسر ژوکوفسکی کے مضمون کا انگریزی ترجمہ با کتاب چہار مقالہ (طبع یورپ) کے حواشی میں دیکھ لے۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کی رباعیات پر بلحاظ مضامین کے مفصل ریویو کیا ہی اور اس کی شاعری کے محاسن دکھلائے ہیں لیکن تنقیدی حیثیت سے یہاں بھی مولانا ایک بہت بڑی فروگزاشت کے مرتکب ہوئے ہیں خیام کی رباعیات کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے بڑی دقت جو پیش آتی ہی وہ یہ ہی کہ رباعیات کا کوئی صحیح نسخہ جو قابلِ اعتماد ہو سکے ہمارے زمانے تک محفوظ نہیں رہا۔ قلمی نسخے جو یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں ان میں رباعیات کی تعداد اور ترتیب اس قدر متفاوت ہی کہ ان سب نسخوں کا مقابلہ اور موازنہ کر کے مشترک رباعیوں کی ایک قابلِ اعتبار

تعداد کو نکالنا اور ان کو مناسب طور سے ترتیب دینا ممکن نہیں ان مختلف نسخوں میں رباعیات کی تعداد پندرہ سے آٹھ سو تک ہی اور بعض مطبوعہ نسخوں میں ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہی۔

خیام کی اپنی رباعیات کو متعین کرنا تو اس وقت تک ناممکن ہی جب تک کہ کوئی قدیم اور صحیح نسخہ دستیاب نہ ہو جو اعتماد کے قابل ہو۔ زبان کا معیار اس بارے میں کارآمد نہیں کیونکہ اول تو خیام کے اپنے صحیح انداز کا نمونہ ہمارے پیش نظر نہیں اور اگر ہو بھی تو بہت سے دوسرے اساتذہ مثلاً مولانا روم، عطّار حافظ، سنائی، انوری، بو علی سینا وغیرہ کی جو رباعیاں خیام کی رباعیوں کے ساتھ مخلوط ہو گئی ہیں، ان سب کا انداز قریب قریب یکساں ہی اور سب کے مضامین متحد اور مشابہ ہیں۔ لہذا ان میں تمیز کرنا اور صرف انداز بیان سے مصنف کا پتا لگانا محال ہی۔ پروفیسر ژوکوفسکی نے اپنے مضمون میں جس کا اوپر ذکر ہوا نہایت محنت اور تلاش سے خیام کی بیاسی رباعیوں کا کھوج لگا کر بتایا ہی کہ یہ رباعیاں دوسرے شعرا کے دیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں نیز ان شاعروں کی فہرست دی ہی جن کی تعداد چالیس سے زائد ہی اور اسی فہرست کو پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ کی دوسری جلد (صفحہ ۲۵۶ و ۲۵۷) میں نقل کیا ہی۔ ڈاکٹر نکلسن ماہرِ فارسی، رباعیات خیام (طبع لندن ۱۹۰۹ع) کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ پروفیسر ژوکوفسکی کے مضمون لکھنے کے بعد سے اب تک (یعنی ۱۸۹۷ع سے ۱۹۰۹ع تک) اس قسم کی رباعیوں کی تعداد بیاسی سے تجاوز کر کے ایک سو ایک تک پہنچ چکی ہی۔ اور اگر تلاش جاری رکھی جائے تو اور بھی اضافہ کیا جا سکتا ہی۔

غرض یہ ہی کہ حالاتِ موجودہ میں خیّام کی رباعیات کا متعین کرنا دشوار ہی۔ مولانا شبلی نے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کیا ہی اور ان امور پر بالکل کوئی

بحث نہیں کی کہ مثلاً وہ کون سی رباعیاں ہیں جو ممکن طور سے خیام کی اپنی کہی جا سکتی ہیں۔ اس کی رباعیوں کی شناخت ہو سکتی ہی یا نہیں۔ اگر ہو سکتی ہی تو کیونکر، کون سا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ زیادہ قابل اعتبار ہی۔ مذاق سلیم کو اس میں کہاں تک دخل ہو سکتا ہی۔ خیام کی رباعیات کا دوسروں کی رباعیات کے ساتھ مخلوط ہونے کا باعث کیا ہی اور کیا وجہ ہی کہ اس کا کلام محفوظ نہیں رہا وغیرہ وغیرہ۔

اس مبحث کو حسب ضرورت طول دیا جا سکتا ہی اور رباعیات کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے حد سے زیادہ دل چسپ ہو سکتا ہی بلکہ ہمارا خیال ہی کہ اُن کے لیے بے حد ضروری ہی کیونکہ جب تک محنت اور تحقیق کے ساتھ خیام کی اپنی رباعیاں متعین نہ ہو سکیں گی اس کی شخصیت شکوک اور قیاسات کے غبار میں ملفوف رہے گی۔

مولانا شبلی نے اتنا بھی بیان نہیں کیا کہ رباعیات خیام کا کونسا نسخہ اُن کے پیشِ نظر ہی جس میں سے وہ تنقید کے لیے رباعیات کا انتخاب کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہی کہ انھوں نے یہ فرض کر لیا ہی کہ ساری دُنیا میں فقط ایک ہی نسخہ جس کا متن متحد ہی دستیاب ہو سکتا ہی جس کی صحت میں کسی کو کلام نہیں لہذا پتا نشان بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جو رباعیاں مولانا نے تنقید کے لیے انتخاب کی ہیں ان میں سے دس ایسی ہیں جو پروفیسر ژوکوفسکی کی ان بیاسی رباعیوں میں سے ہیں جن کو انھوں نے اوروں کی طرف منسوب پایا ہی ان میں سے ہر ایک کا پہلا مصرع ناظرین کی دل چسپی کے لیے لکھ دیا جاتا ہی[1]:-

---

[1] افسوس ہی کہ ژوکوفسکی کا اصلی مضمون جو انھوں نے روسی زبان میں لکھا تھا دستیاب نہیں ہو سکتا ورنہ ہم یہ بھی بتا سکتے کہ ان میں سے ہر ایک رباعی کس کی طرف منسوب ہی۔ مضمون کے انگریزی ترجمے میں صرف رباعیاں بتائی گئی ہیں شعرا کا نام نہیں دیا۔

(۱) من بندۂ عاصیم رضاے تو کجاست

(۲) آنم کہ پدید گشتم از قدرتِ تو

(۳) اے چرخ زگردشِ تو خرسندنیم

(۴) گویند کہ فردوس بریں خواہد بود

(۵) جمعے متفکرند در مذہب ودیں

(۶) گر از پے شہوت وہو خواہی رفت

(۷) ایزد چو نخواست آنچہ من خواستہ ام

(۸) دریاب کہ از رُوح جدا خواہی رفت

(۹) در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد

(۱۰) با ایں دوسہ ناداں کہ چناں می دانند

خیام کی تصنیفات کے ذکر میں مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

"تصنیفات بہت کم ہیں۔ زیچ جو تیار کی تھی اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتا نہیں لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع کی ہو۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۳۰)

خیام کی کوئی زیچ آج تک یورپ میں شائع نہیں ہوئی۔ رباعیات کے علاوہ جو کتاب یورپ نے شائع کی ہو وہ دراصل اس کا الجبرا ہو جس کا عربی متن مع فرانسیسی ترجمے کے بمقام پیرس ۱۸۵۱ء میں چھاپا گیا ہو یہ الجبرا اور اس کے ساتھ تین تصنیفیں خیام کی اور ہیں جن کا مولانا نے ذکر نہیں کیا اور لطف یہ ہو کہ ان تین میں سے دو اس وقت قلمی نسخوں کی صورت میں موجود پائی جاتی ہیں ایک کا نام "رسالۃ فی شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" جس کا ایک نسخہ لیڈن کے کتب خانے میں ہو۔ دوسرے "رسالۃ فی الاحتیال لمعرفۃ مقداری الذہب

والفضۃ فی جسم مرکب منہما" جس کا نسخہ مقام گوتھا (جرمنی) کی لائبریری میں موجود ہو اور تیسرے "لوازم الامکنہ در فصول وعلت اختلاف ہوای بلاد واقلیم" [۱]
ایک دوسری جگہ مولانا نے لکھا ہو :-

"خیام مسائل فلسفیہ کے بیان کرنے میں نہایت بخل کرتا تھا۔ اس نے پہلے تو یہ کہ کر ٹالا کہ میں اس مسئلہ کو اپنی کتاب عرائس النفائس میں بتفصیل لکھ چکا ہوں" الخ (صفحہ ۲۲۹-۲۳۰)

کتاب عرائس النفائس جس کو مولانا نے خیام کی تصنیف بتایا ہو اس کے لیے انھوں نے کوئی سند نہیں دی ۔ شہرزوری کی اصل عبارت میں جس کا وہ ترجمہ کررہے ہیں اور جو بعینہ حواشی چہار مقالہ (صفحہ ۲۱۲) میں نقل کی گئی ہو عرائس النفائس کا کہیں ذکر نہیں، ظاہراً اتنی بات انھوں نے اپنی طرف سے بڑھادی ہو۔

جو مطالب اس مضمون میں بیان کیے گیے ان کے متعلق یہ کہ دینا ضروری ہو کہ ان میں کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی ۔ فارسی زبان کے جاننے والے جو بواسطۂ انگریزی تاریخ ایران کا مطالعہ کرتے ہیں، ان باتوں سے بالعموم واقف ہیں۔ البتہ اُردو میں شاید ابھی تک ان مطالب کی ترجمانی نہیں ہوئی اور یہی خیال اس مضمون کے لکھے جانے کا باعث ہوا۔ جب کہ شعر العجم جیسی بلند پایہ کتاب میں ان باتوں کو ترک کر دیا گیا ہو تو یہ فرض کر لینا کہ چھوٹے درجے کی تصانیف میں یہ مباحث لکھے جا چکے ہیں بعید از قیاس ہو۔

---

[۱] دیکھو حواشی چہار مقالہ صفحہ ۲۲۰ و ۲۲۱

اوحدالدین انوری

قولہ "محمد نام، اوحدالدین لقب، انوری تخلص، ابیورد کے علاقے میں بدہنہ ایک گانو ہی جو مہنہ کے مقابل واقع ہی، انوری یہیں پیدا ہوا"
یہ دولت شاہ کا بیان ہی۔ لیکن عرفی کہتا ہی ع
"انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز"

(شعرالعجم صفحہ ۲۶۴)

انوری کے کلیات کا جامع جس نے انوری کی وفات کے بہت جلد بعد اس کا کلام جمع کیا ہی اور اس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہی اس کا نام علی بتاتا ہی۔ صاحب دیباچہ کے الفاظ ہیں :-

"امیر حکیم امام ہمام اوحدالدین عماد الاسلام نادرۃ الفلک اعجوبۃ الزمان افصح فصحاء الدہر ملک الکلام والشعرا علی الانوری نور اللہ مرقدہٗ ومثواہ وعرف بفضلہ نزاہ"

البتہ محمد اس کے باپ کا نام تھا اس پر محمد عوفی اور شادی آبادی[1] متفق ہیں دادا کا نام اسحٰق تھا۔ انوری کے کلیات سے ثابت ہی شعر

زندہ اسلاف تو بتو چو بمن ۔۔۔ جدّم اسحٰق و جدت اسمٰعیل[2]

---

[1] شرح قصائد انوری از محمد بن داؤد بن محمد علوی شادی آبادی مصنف شادی آباد عرف مانڈو کا رہنے والا ہی اور سلطان ناصرالدین مالوی ۹۰۵ھ و ۹۱۶ھ کی فرمایش پر اس نے یہ شرح لکھی ہی۔ [2] کلیات انوری، طبع نول کشور صفحہ ۲۶۱ یہ کلیات نول کشور کے ہاں ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۷ء میں چھپ چکا ہی پہلی اشاعت میں ۶۷۰ اور دوسری میں ۶۶۰ صفحات ہیں۔ میں نے اس مضمون کے دوران میں پہلی اشاعت سے کام لیا ہی۔ بخیال اختصار آیندہ صرف شمار صفحات پر اکتفا کی جائے گی۔

وطن کے متعلق اگرچہ مورخین میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ خاوران ہے انوری خود ایک سے زیادہ مقام پر اپنے آپ کو خاوران کی طرف منسوب کرتا ہے قطعۂ ذیل اور اشعار ملاحظہ ہوں:-

بر سپہر صیت پیدا شد ز خاک خاوراں
تا شبانگاہِ ابد چار آفتاب خاوری

خواجہ چوں بوعلی شیدانی آں صاحب قراں
مفتی چوں اسعد شوجان نہ ہر شرکے بری

صوفی صافی چو سلطان طریقت بوسعید
شاعرے ساحر چو مشہور خراساں انوری[۵۱]

شعر

دے ز خاک خاوراں چوں ذرہ مجہول آمدہ
گشتہ امروز اندرو چوں آفتاب خاوری[۵۲]

چنداں کہ از زبانت بر آید بگیر زر
در خاوراں نیم کہ میسر نمی شود[۵۳]

کاندر اطراف خاوراں از دے
ہیچ کس را ہمی نیاید یاد[۵۴]

خاوراں ایک ناحیہ کا نام ہے جس میں مہنہ، نسا، ابیورد اور درگز شامل ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ خاوراں ناحیہ ہونے کے علاوہ ایک قصبے کا نام بھی ہے اور انوری اسی قصبے کی طرف منسوب ہے۔[۵۵]

قولہ "انوری نے اسی وقت تعلیم و تعلم کو خیرباد کہا اور رات بھر میں قصیدہ لکھ کر تیار کیا جس کا مطلع یہ ہے:-

گر دل و دست بحر و کاں باشد
دل و دست خدایگاں باشد

---

۵۱ ایضاً کلیات ص۱۲۷ ۵۲ ایضاً کلیات ص۲۰۳

۵۳ کلیات ص۲۴۴ ۵۴ ایضاً کلیات ص۱۲۳

۵۵ معجم البلدان از یاقوت حموی، نزہت القلوب حمد اللہ مستوفی ص۱۸۹ طبع ملک الکتاب ۱۳۱۱ھ بمبئی۔

صبح کو دربار میں جا کر قصیدہ پڑھا، سنجر نہایت سخن شناس تھا بہت محظوظ ہوا اور کہا نوکری چاہتے ہو یا صلہ، انوری نے آداب بجا لا کر عرض کی:

جز آستانِ توام درجہاں پناہے نیست
سرِ مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

سنجر نے منصب اور وظیفہ مقرر کر دیا، سنجر راد کان سے روانہ ہوا تو انوری بھی ساتھ تھا، راہ میں چند قصیدے لکھ کر پیش کیے جن میں سے ایک یہ ہے :۔

باز ایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را
ویں حال کہ نو گشت زمین را و زماں را

شعر العجم صفحہ ۲۶۴

شعر جز آستانِ توام الخ خواجہ حافظ کی غزل کا مطلع ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے اور انوری سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

رادکان سے روانگی کے وقت جو قصیدہ سُنایا جاتا ہے اور جس کا مطلع اوپر درج ہے بے شک انوری کا ہے لیکن سلطان سنجر کی تعریف میں نہیں بلکہ عماد الدین پیروز شاہ اور اس کے وزیر جلال الوزرا کی مدح میں ہے۔ کلیات (مطبوعہ) میں یہ سب سے پہلا قصیدہ ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں ممدوح کا نام موجود ہے ؎

پیروز شہ عادل منصور و مظفر   کز عدل دگر بارہ بنا کرد جہاں را
(کلیات صفحہ ۳)

اور یہ شعر بھی ؎

دستورِ جلال الوزرا کز درِ عالیش   انصاف رسانند ہر انصاف رساں را

قولہ "ہمارے تذکرہ نویسوں کی بے خبری دیکھو، یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں لیکن یہ کسی سے نہ ہو سکا جس قصیدے کو انوری کی شاعری کا دیباچہ کہتے ہیں اس کو کبھی اُٹھا کر دیکھ بھی لیا ہوتا، انوری خود اس قصیدے میں کہتا ہے ؎

خسروا بندہ را چہ دہ سال است   کہ ہمی آرزوے آں باشد
کز ندیمانِ مجلس ار نشود   از مقیمانِ آستاں باشد

اس میں صاف تصریح ہے کہ یہ قصیدہ ابتداءً نہیں، بلکہ دس برس کی امید داری کے بعد لکھا گیا ہے۔" (شعر العجم صفحہ ۲۶۵)

اگر واقعی سب سے پیشتر یہ اعتراض مولانا شبلی کو سوجھا ہے تو وہ تہ دل سے مبارک باد کے مستحق ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ علامہ موصوف اس معاملے میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کے مرہونِ منت ہیں اگرچہ بظاہر اس سے استفادہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر براؤن کے الفاظ ہیں:-

"امر فی الواقع یہ ہے کہ قصیدۂ مذکورہ خود ایسی شہادت پیش کرتا ہے کہ شاعر بڑی مدت پیشتر سے مشقِ سخن میں مصروف تھا۔ اشعار

خسروا بندہ را چہ دہ سال ست   کش ہمی آرزوے آں باشد"
کز ندیمانِ مجلس ار نشود   از مقیمانِ آستاں باشد"

(تاریخ ادبیاتِ ایران صفحہ ۳۸۰، طبع سنہ ۱۹۰۶ء)

قولہ "رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سنجر نے بہ آں جاہ و جلال دو دفعہ انوری کے مکان پر جا کر اس کی عزت افزائی کی۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۶۶)

دس سال کی امیدواری کے باوجود جیسا کہ گزشتہ اشعار سے واضح ہوتا ہی انوری سنجر کے دربار میں منادمت برطرف، مقیم آستاں بننے کا رتبہ بھی حاصل نہ کرسکا۔ اگر اسی رفتار سے اُس نے ترقی کی ہو تو سنجر کو اس کے گھر آنے کے لیے عمرِ نوح درکار ہو۔

میں سنجر اور انوری کے تعلقات کی بابت اسی مضمون کے ضمن میں کسی موزوں مقام پر گفتگو کروں گا یہاں اسی قدر کہنا مناسب معلوم ہوتا ہی کہ انوری کے گھر سنجر کے آنے کی روایت کی اصلیت صرف اس قدر ہی کہ ایک مرتبہ کوئی وزیر انوری کے مکان پر آیا تھا اور شاعر نے اس کے خیر مقدم میں قصیدہ قطعہ اور رباعی لکھے ہیں چنانچہ رباعی

منصوبۂ ہر گزت در آمد بضمیر — کاید بدرت موکب میمونِ وزیر
ہیں کوکبِ غنچہ گو بیا دست ببوس — ہاں دستِ چنار گو بیا دست بگیر

(کلیات صفحہ ۵۶۱ طبع نول کشور)

کسی اور قطعے میں کہتا ہی ؎

بجز نسے دیگر ایں تشریف را تشبیہہ نتواں کرد
حدیثِ مصطفٰے امیداں و بو ایوبِ انصاری (کلیات صفحہ ۱۴۷)

قطعہ ذیل بھی ملاحظہ ہو ؎

اے خداوندے کہ بنّاے جہاں یعنی خدائے — گوہرِ پاک ترا اصلِ نکوکاری نہاد
آستانِ ساحتِ جاہ ترا چوں برکشید — عقلِ کلّی پائے برخاکش بدشواری نہاد
فتنہ را خوابِ ضروری دیدہ از گیتی بخفت — چوں قضا در دیدۂ بخت تو بیداری نہاد
اے حیات نو نہادستے مرا در تن چنانک — باللہ ار در خاک ہرگز ابر آذاری نہاد
عذرآں اقدام چوں خواہم کہ خاکش را سپہر — سرمۂ چشمِ خداوندی و جبّاری نہاد

شاد باش اے مصطفٰے اسیرت کہ خلق شامت
بے تکلف بر تکبر داغ بیزاری نہاد
از شرف در عرض من عرنی نہادستے چنانک
مصطفٰے در نسل بو ایوب انصاری نہاد
(صفحہ ۶۴۹)

اسی سلسلے میں وہ قصیدہ لکھا گیا ہے جس کا مطلع ہے ؎

زہے از کلکت اندر چشمِ دولت کحل بیداری
بعونش کردہ مدتہا جہاں باناں جہاں داری

یہ عقیدہ کہ قصیدہ کسی وزیر کی تعریف میں ہے، رباعی بالا کے علاوہ ذیل کے ابیات سے بھی مفہوم ہوتا ہے ؎

مجیر دولت و دینی و اندر دیدۂ دولت
ز رائے تست بینائی ز بخت تست بیداری
تو آں صدری کہ عالم را کمال آمد وجود تو
نگر تا خویشتن را کمتر از عالم نہ پنداری

ناظرین اسی قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ کریں ؎

ترا لطف تو داعی بود اگر نہ کس ُ وا دارد
کہ رخت کبریا ہرگز بچوناں کلبۂ آری
نزولِ تَو ابہ نزد من مثل دانی چہ می آرم
نزولِ مصطفٰے نزدیک بو ایوب انصاری
(کلیات صفحہ ۳۶۹ و ۳۷۰)

قولہ "انوری جس طرح سنجر کے دربار میں پہنچا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ انوری مدت سے شعر و شاعری میں مشغول تھا، لیکن دربار میں رسائی حاصل نہیں ہوتی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا امیر معزی تھا اور وہ کسی کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، یعنی صرف ایک بار کے سننے میں وہ قصیدے کا قصیدہ یاد کرلیتا تھا۔ جب کوئی شاعر دربار میں آتا اور قصیدہ سناتا تو معزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ میری تصنیف ہے، چنانچہ قصیدے کا قصیدہ خود پڑھ کر سنا دیتا، شاعر خفیف ہو کر چلا آتا۔ انوری کو یہ

حالت معلوم ہوئی تو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر پاگلوں کی صورت بنا کر، معزی کے پاس گیا اور کہا کہ میں شاعر ہوں، بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھ کر لایا ہوں آپ پیش کرا دیجیے، معزی نے پوچھا کیا لکھا ہے پڑھ کر سناؤ، انوری نے پڑھا ؎

زہے میرو زہے میرو زہے میر
زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ

معزی نے کہا یوں کہتے تو مطلع ہو جاتا ؎

زہے ماہ و زہے ماہ و زہے ماہ
زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ

انوری نے بہکی بہکی باتیں کیں، معزی نے یہ سمجھ کر کہ دربار کا مسخرہ بنائیں گے، انوری سے کہا، کل آنا، انوری دوسرے روز پہنچا تو معزی خود ساتھ لے کر دربار میں آ گیا اور کہا کہ جو قصیدہ تم نے مدح میں لکھا ہے سناؤ۔ انوری نے شاعرانہ انداز میں پڑھا ؎

دل و دستِ خدایگاں باشد
گر دل و دست بحر و کاں باشد
در جہاں بادشہ نشاں باشد
شاہ سنجر کہ کمتریں خدمش

دو شعر پڑھ کر رک گیا اور معزی کی طرف خطاب کر کے کہا کہ اگر یہ قصیدہ آپ کا ہے تو باقی اشعار سنائیے۔ معزی چپ ہوا، انوری نے پورا قصیدہ سنایا سنجر نہایت محظوظ ہوا اور ندیمانِ خاص میں داخل کیا۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۶۵ و ۲۶۶)

پروفیسر براؤن نے اس قصے کو حبیب السیر سے بتمامہ نقل کر کے اس پر کوئی تنقید ظاہر نہیں کیا ہے۔ میں اس خیال میں پروفیسر موصوف کا تابع ہوں علامہ شبلی نے اس کے بعض خط و خال قلم انداز کر دیئے ہیں۔ میں اس روایت کے اس غیر معمولی پہلو سے جس میں ایک شخص کا حافظہ اس قدر قوی مان لیا جائے کہ

ایک مرتبہ کے سننے میں کامل قصیدہ ازبر کر سکتا ہے، اس کا فرزند دو مرتبہ کی سماعت میں یاد کر لیتا ہے اور ان کا غلام تین مرتبہ کی سماعت میں حفظ سُنا سکتا ہے اور حسن اتفاق سے ان بوالعجب ہستیوں کا اجتماع ایک ہی وقت میں اور ایک ہی خاندان میں ہوتا ہے قطع نظر کر کے اس قدر کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انوری کے معتقدین نے نہ صرف اس قصّے میں بلکہ اور موقعوں پر بھی امیر معزی کو بدنام اور مطعون کرنے کی کوشش کی ہے مثال میں انوری کا ایک شعر پیش ہے ؎

برسرِ من مغفری کردی کلہ واں برگذشت
بگزرد بر طیلسانم نیز دور معجبری

شادی آبادی اس شعر کی تشریح میں کہتے ہیں :-

" دریں بیت رمز آنست کہ امیر معزی بحضرت انوری از روے حسد تہمتے دروغ کردہ بود و پیش پادشاہ تعریض کردہ کہ انوری شہر بلخ را ہجو کردہ پادشاہ بدو منقلب شد و حکیم انوری را مقنعۂ زناں پوشانید و تشہیر کرد و خواست تا حضرت انوری را بر خر سوار کند و بگرد شہر بگرداند چوں حکیم مذکور ایں قصیدہ را گفت و پادشاہ را مع کبراے بلخ تعریف کرد باز داشتند و بخر سوار نہ کردند و مہربان شدند۔"

حالانکہ امیر معزی ۵۴۲ھ میں سنجر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے اور ہجو بلخ کا واقعہ سنجر (متوفی ۵۵۲ھ) کی وفات کے بہت عرصہ بعد طغرل تگین کے دَور میں ہوتا ہے۔ شادی آبادی نے ایک اور واقعہ انوری کے ایک اور شعر کی شرح میں لکھا ہے شعر یہ ہے ؎

کس نخواہد ازکابر بہ گردن کشانِ نظم کز اصریح خون دو دیوان بگردن رست

شادی آبادی کہتے ہیں :-

"امیر معزی کہ سر آمد شعرائے زمانہ بود وبیش سلطان سنجر مرتبہ وتقرب بسیار داشت از دیوان مولانا احمد معالی (ابلمعالی نحاس ؟) دزدیدہ است وہر دو دیوان را ہلاک کردہ است و دیوان خود ساختہ است"

علاوہ بریں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انوری کا سرپرست سلطان سنجر کا آخری وزیر ابو الفتح ناصر الدین طاہر ابن مظفر ابن نظام الملک (۵۲۸ھ و ۵۴۸ھ) تھا۔ کلیات میں اس وزیر کی مدح میں بیسیوں قصیدے اور قطعات ہیں اس لیے قوی احتمال کیا جاسکتا ہے کہ ایسے طاقتور وزیر کے مقابلے میں امیر معزی کی کوشش دربار میں انوری کی رسائی کے برخلاف چنداں سرسبز نہیں ہوسکتی تھی۔

قولہ "انوری کو علم نجوم میں کمال تھا، سنجر کے عہد حکومت میں اتفاق سے سبعہ سیارہ برج میزان میں جمع ہوئے، انوری نے اس بنا پر پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئے گا کہ تمام مکانات برباد ہو جائیں گے۔ لوگوں نے ڈر کر، تہ خانے اور سرد آب تیار کرائے اور تاریخ مقررہ پر ان میں چھپ کر بیٹھے، اتفاق سے اُس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گل ہوتا، سنجر نے انوری کو بُلا کر عتاب کیا، انوری نے کہا قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے۔ فرید کاتب نے اس پر قطعہ لکھا ؎

گفت انوری کہ از جہتِ بادہائے سخت

ویراں شود عمارت وکہ نیز بر سری

در سال (کذا) حکم او نوزیدست ایچ باد

یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

(شعر العجم صـ۶۶)

یہ سبعہ سیارہ کا اقتران نہیں تھا بلکہ پانچ ستاروں کا لیکن سلطان سنجر کے عہد میں نہیں کیونکہ اس کا انتقال ۵۵۲ھ میں ہوتا ہے اور ستاروں کا اجتماع بسندِ نزہت القلوب حمد اللہ مستوفی ۵۸۱ھ میں اور بسند کامل ابن الاثیر ۲۹ رجمادی الآخر ۵۸۲ھ کو ہوتا ہے۔ ان میں پچھلی تاریخ صحیح ہے۔

فی الواقع انوری نے اس طوفان کے متعلق اگر کوئی اشعار لکھے ہیں تو وہ ہم تک نہیں پہنچے۔ کلیات میں پسر میرداد کے مدحیہ قصیدے میں البتہ ایک تلمیح پائی جاتی ہے جس سے اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ انوری طوفان کی شدت کی اس نوعیت کا جو مولانا شبلی کے بیان سے مترشح ہے اور جس کو تمام تذکرہ نویس ایک مبالغہ آمیز طریق سے بیان کرتے آئے ہیں ہرگز ہرگز معتقد نہیں تھا۔ وہ اس طوفان کا ذکر نہایت بے پروایانہ انداز میں کرتا ہے۔ اور تلمیح شعر ذیل میں آتی ہے:۔

آباد دار نیمۂ خود از جہاں بداد   طوفانِ باد نیمۂ خود گو خراب خواہ

(کلیات ص۳۶۳)

مقطع میں یہی شعر کسی قدر تغیر کے ساتھ یوں لایا گیا ہے۔

آباد دار ملک زمیں خسروا بداد   طوفانِ باد ملک ہوا گو خراب خواہ

(ص۳۶۳)

طوفان کا ذکر[1] اکثر معتبر تاریخوں میں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قضیہ ان ایام میں بہت کچھ بحث و جدال اور مناظرات کا مورث ہوا ہے۔ اس بحث میں جیسا کہ پروفیسر براؤن نے ذکر کیا ہے ظہیر فاریابی نے سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ہے وہی قطعہ جو فرید کاتب کی طرف منسوب ہے قصائد ظہیر میں بھی موجود ہے وھوہذا۔

---

[1] طوفان سے متعلق اشارے، جیسا کہ آیندہ مذکور ہوگا نظامی گنجوی اور کمال اسمٰعیل کے ہاں بھی ملتے ہیں۔

می گفت انوری کہ شود بادہا چنانک | کوہ گراں ز پائے درآید چو لنگری
سالے گزشت و برگ نجنبید از درخت | یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

(قصائد ظہیر ص۱۳۵، طبع نول کشور ۱۸۸۰ء)

سیاروں کے اقتران کا ذکر ذیل کے اشعار میں آتا ہے:۔

اجتماع اختراں دانی کہ در میزاں چراست | خود نکو دانی کہ آں صنعت چہ نیکو کردہ اند
از برائے ذرۂ خاکِ کفِ پائے ترا | نقدِ ہفت اقلیم گردوں در ترازو کردہ اند

(قصائد ظہیر ص۱۶۵)

ظہیر نے طوفان کے بطلان میں کوئی رسالہ بھی لکھا ہے۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں:۔

رسالتے کہ ز انشائے خود فرستادم | بمجلس تو در ابطال حکم طوفانی
اگر در آں سخنم شبہتے ست و میخواہی | کہ از جریدۂ ایام نیز برخوانی
مرا چناں کہ بود ہم معیشتے باید | کہ بے غذا نتواں داشت روحِ حیوانی

(قصائد ظہیر ص۱۷۱)

ظہیر جن ایام میں طوفان کی نزاع میں مصروف تھا آذربایجان میں مقیم ہے۔ قزل ارسلان ۵۸۷ھ میں قتل ہوتا ہے اور نظامی کا ممدوح ابوبکر نصرۃ الدین اس کا جانشین ہوتا ہے۔ قطعۂ ذیل میں ظہیر کا مخاطب یہی نصرۃ الدین معلوم ہوتا ہے شاعر شکایت کرتا ہے کہ جس شخص نے اپنی پیشن گوئی میں کہا تھا کہ طوفان باد سے دنیا تباہ ہو جائے گی اس کو تم نے خلعت اور انعام سے سرفراز کیا لیکن میرے ساتھ جس نے اس کی پیشین گوئی کی تردید کی ہے اور ہی طرح کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔

شاہا ز کوہ گوشِ زباں راز دی نقط | بشنو ز من سوالے و تشریف دہ جواب
آنکس کہ حکم کردہ بطوفان باد و گفت | کا سیب آن عمارت گیتی کند خراب
تشریف یافت از تو و اقبال دید و جاہ | در بندِ آں نہ شد کہ خطا گفت یا صواب

من بندہ چوں خطا سے ذے ابطال کردہ ام   بامن چرا ز وجہ دگرمی رود جواب

(قصائد ظہیر ص ۱۶۲)

قولہ "انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور ترک ملازمت کرکے نیشا پور چلا آیا۔ اب اُس کی شہرت دُور دور پھیل گئی تھی، ہر طرف سے امرا و رؤسا کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجیے ۵۳۳ھ میں سلطان احمد پیروز شاہ نے اس کو خط بھیج کر بلایا اور ساتھ لے کر خوارزم کی طرف روانہ ہوا، انوری یہ سُن کر کہ دریائے جیحون راہ میں پڑتا ہے اس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچکر سلطان احمد سے معذرت چاہی اور وہیں رہ گیا، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آکر ایک قصیدہ لکھا اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا مطلب کی بات اس طرح ادا کی :-

ایں حال کہ در بلخ کنوں دارم   از خوف پریشانی و گمراہی

زیں پیش اگر وہم و گماں بردے   آں مخلطے کوتہ نظر ساہی

بر عبرۂ جیحوں نہ بآموزش   چوں بط بطبیعت شدمے راہی

سلطان احمد نے اس کو دربار میں طلب کیا اور معتمد خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لے کر آئے۔" (شعر العجم ص ۲۶۷)

یہ خیال کہ پیشین گوئی غلط ثابت ہونے کی بنا پر انوری سنجر کے دربار سے قطع تعلق کرکے نیشا پور چلا جاتا ہے۔ درست نہیں معلوم ہوتا سنجر اور انوری کے تعلقات میں کبھی کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔

سلطان احمد پیروز شاہ کے سوانح کے متعلق تاریخیں خاموش ہیں۔ کلیات اس قدر روشنی ڈالتا ہے کہ ابتدا میں وہ ایک خطا کی شہزادہ تھا اور سنجر کے عہد سے

آٹھ نو سال بعد خراسان کے بعض حصے جن میں بلخ اور ترمذ قابلِ ذکر ہیں اس کے تصرف میں آجاتے ہیں جن میں موخر الذکر مقام کو وہ اپنا پایۂ تخت بنا لیتا ہو وہ کوئی سلجوقی شہزادہ نہیں تھا انوری کے شعر سے واضح ہوتا ہو ؎

زشیرِ بیشۂ سلجوقیاں بیک جولاں
شکارئے کہ بصد سال کردہ بربودہ صـ ۲۶۳

لیکن خوارزم شاہیوں سے بھی اس کا کوئی علاقہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انوری اس کو خطائی مانتا ہو۔ بلخ پر پہلی مرتبہ قابض ہونے کے بعد بعض مصلحتوں کی بنا پر وہ اس کو چھوڑ دیتا ہو اس وقت تک ہمارے شاعر کے اس کے ساتھ گہرے تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کلیات میں ایک سے زیادہ موقعوں پر انوری پیروز شاہ کے بلخ چھوڑنے پر اپنا افسوس ظاہر کرتا ہو **شعر**

تو میری و زمین و زماں ہمی گویند
نہے زعدلِ تو خلقِ خدائے آسودہ

پیروز شاہ جس وقت ترمذ کو مستقلاً اپنا صدر مقام بنا لیتا ہو انوری جو اُن ایام میں بلخ میں قیام پزیر ہو اس کے دربار میں حاضری کا اشتیاق اپنے بعض قصائد میں ظاہر کرتا ہو۔ مثلاً:۔

قسم زخدمتِ تو بد دری چرا افتاد	گفت انوری بہانہ چہ آری گناہِ تست
گفتم کہ آبِ جیحوں گفت احتراز مکن	بگزر کہ عالمے ہمہ آب و گیاہِ تست
گفتم کہ طالعے خللے ہست گفت نیست	عیب از خیالہائے دماغِ تباہِ تست
یوسف نہ و بیژن اگر نہ بہ گفتمے	کاندر ازائے مجلسِ شہ بلخ چاہِ تست

(صـ ۵۵)

ایک اور قصیدے میں جو عماد الدین پیروز شاہ کے بلخ چھوڑنے کے ساتھ

ماہ بعد لکھا جاتا ہی انوری کہتا ہی ؎

خسروا من بندہ را در مدتِ این ہفت ماہ　　گر میسر گشتے اندر ہفت کشور یاورے

تا مرا از لجۂ دریائے حرماں دست دار　　فی المثل بر تختۂ بردے کشاں تا معبرے

ہستی از بس کہ سر بر آستانت سود می　　چوں دگر ابنائے جنسِ خویش اکنوں سرورے

لیکن از بس قصد این ناقص عنایت ور نگار　　ماندہ ام در قعرِ دریائے عنا چوں لنگرے ۴۲۸

پیروز شاہ آخر کار اپنے وزیر جلال الوزرا کو اس کی طلبی کا حکم دیتا ہی۔ وزیر انوری کے نام فرمانِ طلب روانہ کرتا ہی۔ جواب میں شاعر ایک قطعہ لکھتا ہی جس کے بعض اشعار حوالۂ قلم ہوتے ہیں ؎

مثالِ عالی دستور چوں بہ بندہ رسید　　قیام کرد و ببوسید و بر دو دیدہ نہاد

مرا بخدمت او خواندہ کہ خدمت او　　کند سپہر کہ ہست او زمانہ را بنیاد

عماد دولت و دیں آں کہ حصن دولت و دیں　　پس از وفور خرابی از و شدند آباد

شہ مظفر پیروز شہ کہ فتح و ظفر　　ز سایۂ علم و شعلۂ سنانش زاد ۴۳۱

علامہ شبلی شاعر کے طلب کیے جانے کی تاریخ ۵۳۳ھ بیان کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ انوری کا بیان اس کے متعلق بالکل صاف ہی۔ شعر

اندر آمد ز درِ حجرۂ من نیم شبے　　روزِ پنجشنبہ یعنی دوم بہمن ماہ

سال بُد پانصد و سی و سہ تاریخ عجم　　گفت برخیز کہ از شہر بروں شد ہمراہ ص ۴۵۷

شاعر کا مقصد یہاں سنِ یزدجردی سے ہی جو اُن ایام میں عام طور پر ایران میں رائج تھا سن ہجری اس وقت ۵۶۰-۶۱ھ کے مابین ہونا چاہیے۔

قولہ " اقسام سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی، ہجو میں وہ نہایت دل چسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا، جو شعر اس کی زبان سے نکلتا عالم میں پھیل جاتا، اس کے ساتھ

طبیعت میں تنگ ظرفی اور کم حوصلگی تھی، ذرا کسی سے رنج ہوا اور اس نے ہجو کا طومار باندھ دیا اس عادت کی وجہ سے اس نے سارے زمانے کو دشمن بنا لیا تھا۔"
(شعر العجم صہ ۲۶۹)

اس پر مجھ کو ایک انگریزی ضرب المثل یاد آتی ہے کہ "پہلے کتے کو بدنام کر لو، پھر شوق سے اس کو پھانسی دو۔" ایک شاعر کے کمالات سے انکار کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے کمترین اوصاف کو خوب چمکایا جائے اور اصلی کمال سے اغماض کیا جائے۔ چونکہ علامہ شبلی کے گوشۂ خاطر میں ظہیر فاریابی کے مبالغہ آمیز احترام نے اپنا گھر بنا لیا ہے اس لیے غریب انوری کو مشکل سے بیرونِ آستاں جگہ دی جاتی ہے۔ دو تلواریں، تمام دنیا جانتی ہے ایک نیام میں نہیں آتیں اسی لیے مجھ کو حیرت ہے کہ انوری کو شعر العجم کے مشاہیر میں کیوں داخل کیا گیا اور کیوں اس کے ساتھ بے مہر مادر کا سا سلوک جائز رکھا گیا۔

انوری کے کمالات سے جس نے اپنے وطن کی تاریخ کے بعض نہایت تاریک موقعوں پر اپنی شاعری کے ذریعے سے عظیم الشان کارنامے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور جس نے اپنی طبعی شرافت اور اخلاقی جرأت کا شاندار ثبوت دیا، مولانا کو اسی قدر یاد رہا کہ ہجو میں وہ نہایت لطیف مضامین پیدا کرتا ہے لیکن طبیعت کا دنی اور تنگ ظرف ہے۔

متقدمین کے بیانات نیز کلیات کے تتبع سے یہ امر متحقق نہیں ہوتا کہ انوری کو ہجو میں کوئی خاص شغف تھا ہجو اتفاقیہ انوری کے ہاں بھی پائی جاتی ہے جیسے اور شعرا کے کلام میں لیکن یہ کہنا کہ جہاں کسی سے ناراض ہوا ہجو کہہ دی اور اس طرح ساری دنیا کو اپنا مخالف بنا لیا میرے خیال میں واقعات پر مبنی

نہیں۔ انوری فرشتہ نہیں تھا انسان تھا، بعض معاصرین سے اس کی عداوت ضرور رہی ہی اور یہ تلخ تجربہ ہر شاعر اور ہر انسان کو ہوا کرتا ہی لیکن اس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے دوستوں اور مداحوں کا دائرہ وسیع تھا بڑے بڑے لوگوں سے اُس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ صدور اور امرا اس کی عزت کرتے تھے، سلاطین اور وزرا اُس کا احترام کرتے تھے ان میں سے بعض نے اس کے قطعات کے جواب میں قطعات لکھے ہیں۔ میں بعض کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) قاضی حمید الدین صاحب مقامات حمیدی (المتوفی ۵۵۹ھ) اس عہد کے نہایت مشہور شاعر فاضل اور ادیب ہیں۔ انوری سے اُن کا رشتۂ اتحاد بے تکلفی کی حد تک پہنچا ہوا تھا دونوں ایک دوسرے کے کمال کے معترف تھے اور دونوں نے مختلف موقعوں پر ایک دوسرے کے حق میں قطعات لکھے ہیں۔

انوری کے ایک قطعے کے جواب میں جس سے شبلی نے دو شعر نقل کیے ہیں، قاضی صاحب لکھتے ہیں:۔

مرا انوری آں چو دریا تونگر — ہمی از سخن زادۂ کاں فرستد
چو بے برگیم گشت او را مقرر — ز خلد بریئم ہمی خواں فرستد
جو ہر گنج را جائے ویرانی آمد — ازاں گنج خود سوئے ویراں فرستد
بماناد آں دوست کو دوستاں را — غذائے دل و راحتِ جاں فرستد

ایک موقعے پر قاضی صاحب انوری سے دریافت کرتے ہیں کہ خدا کا علم ہر شے پر محیط ہی اور تمام واقعات اس کے ارادے کے مطابق ظہور پزیر ہوتے ہیں لیکن خدا جب چاہے اس میں تغیر پیدا کر سکتا ہی کیونکہ وہ قادر مطلق ہی لیکن دیکھا جاتا ہی کہ اس کی مشیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی آخر اس کی

کیا وجہ ہی؟ ؎

اوحد الدین کہ در سوال و جواب | بدہد داد علم و بستاند
بہ بزرگی جواب ایں فتویٰ | بکند چون بفضل برخواند
آں کہ داند کہ حال عالم چیست | پس تواند کزاں بگمرداند
ہم برآں گر بماند از چہ بود | عقل ایں جا فرو ہمی ماند ص۶۶۵

الوری جواب دیتا ہی ؎

اے بزرگِ جہاں حمید الدین | کہ خرد مدح تو ہمی خواند
وانکہ از ہیچ روئے نتواں گفت | کہ نداند ہمی و نتواند
ماند یک چیز آں کہ خود نکند | گرچہ جاسے تواند و داند
زاں کہ بر بے نیاز واجب نیست | کہ پئے نفع کس قضا راند
لم در افعال او نیاید ازاں | کہ سبب در میانہ ننشاند
غنی مطلق از غرض دور ست | فعلِ او کی بفعلِ ما ماند
ہیچ تدبیر نیست جز تسلیم | خویش را بیش ازیں نرنجاند ص۶۶۵

(۲) شجاعی ایک شاعر ہی جو الوری کو لکھتا ہی :-

اے انوری توئی کہ بفضل و ہنر بوند
احرار روزگار و افاضل ترا رہی ص۷۵۲

اور جواب میں انوری لکھتا ہی :-

شجاعی اے خط و شعر تو دام و دانۂ عقل
ہزار مرغ چو من صید دام و دانۂ تو

یہ بخوفِ طوالت صرف ایک ایک شعر پہ قناعت کرتا ہوں، پورے قطعوں کے لیے کلیات ملاحظہ ہو۔

(۳) تاج الافاضل فخر الدین خالد بن ربیع المالکی سے انوری کی گہری دوستی تھی وہ کہتے ہیں ؎

سلام علیک انوری کیف حالک　　　مرا حال بے تو نہ نیک است بارے

(۴) ارشد الدین ایک اور شاعر ہی جس کے قطعے کے جواب میں انوری کہتا ہی ؎　　ہیچ دانی ارشد الدین کز کفِ طبعِ تو دوش

من چہ شربت ہائے آبِ زندگانی خوردہ ام ص۸۰

(۵) کمالی شاعر انوری کا معاصر ہی اُس کے قطعے کے جواب میں انوری لکھتا ہی ؎

شعر ہائے کمالی آں بہ سخن　　　پائے طبعش سپردہ فرق کمال

(۶) ایک اور شاعر انوری کو اپنے گھر بُلاتا ہی ؎

اوحدین انوری اے من مرید طبع تو　　　وے ہوائے عشق و مہرِ تو مراد طبع من

ہم بہ بینم دولتِ وصل تو اندر ربع خویش　　　گر محلِ دولت و اقبال گرد د ربع من ص۱۸

(۷) ایک اور شاعر جس کا نام معلوم نہ ہوسکا انوری کی مدح میں قصیدہ لکھتا ہی ؎

اے در ہنر مقدم اعیان روزگار　　　در نظم و نثر اخطل و حسانِ روزگار

آسان بر نفاذِ تو دشوار اختراں　　　پیداست بر ضمیرِ تو پنہانِ روزگار

حلم ترا کمانہ ہمی کرد ناگہاں　　　بگسست ہر دو پلۂ میزان روزگار

اخلاقِ تو سواد ہمی کرد لطفِ تو　　　پُر شد بیان دفتر و دیوان روزگار

با عقل ترساں ترساں گفتم کہ در ثنا　　　آنرا کہ ہست دیدۂ اعیانِ روزگار

لقمانِ روزگارش خوانم چہ گفت نے　　　جز انوری کہ زیبد لقمانِ روزگار ص۱۵۵

(۸) ایک اور شاعر لکھتا ہی ؎

فرخندہ اوحد الدین فرزانہ انوری ‏ اے آنکہ از دو عالم وحدت منورست

(۹) سراجی شاعر ترمذی کے خط کے جواب میں انوری کہتا ہی ؎

سراجی اے زمقیمان حضرت ترمذ ‏ رسید نامۂ تو ہچو نامۂ زبہشت ص۶۶۱

(۱۰) ایک وزیر دربار سے اُٹھ کر اپنے محل کی طرف جا رہا تھا دامن پانوں میں اُلجھا گر پڑا۔ انوری نے اس موقعے پر ایک قطعہ لکھ کر بھیجا جس کا ابتدائی شعر ہی ؎

صاحبا سقطۂ مبارک تو ‏ نہ ز آسیب حادثات رسید ص۶۳۸

وزیر قطعہ کا جواب قطعے میں دیتا ہی میں ابتدائی شعر پر قناعت کرتا ہوں ؎

گرچہ شب سقطۂ من ہر کہ دید ‏ پارۂ از روز قیامت شمرد ص۶۶۹

کلیات سے بعض ایسے واقعات معلوم ہوتے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہی کہ انوری نے زمانے کو اپنا دشمن بنانے کے بجائے ایسی کوشش بھی کی ہی کہ دشمنوں کو دوست بنایا جائے۔

فتوحی مروزی اس کا سخت ترین معاند مانا گیا ہی لیکن انوری اس کی طرف بھی اپنی دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے تیار ہی۔ چنانچہ کسی دوست کو لکھتا ہی ؎

آدم با غمے کہ جان ببرد ‏ گر ز لطف تو غمگسار آید

گر فتوحی ز دوست داری تو ‏ بندہ را نیز دوستدار آید

یا بنزدیک او روم روزے ‏ کہ بر وزیم یک دوبار آید ص۹۴۸

کسی اور موقعے پر شاعر اپنے کسی دشمن کی سفارش میں جس نے اس کو نقصان پہنچایا ہی کہتا ہی ؎

اے جواں بخت سرورے کہ ندید ‏ چوں تو فرزانہ چشم عالم پیر

بندہ را خصم اگر بہ پیش تو کرد ‏ نقش عنوان نامۂ تزویر

مالش آں بس کہ تا بحشر بماند | بے گنہ مست شربتِ تشویر
مہر امیدش از عطائے بزرگ | اے بزرگِ جہاں بجرم حقیر
زانکہ جز دست جود تو نکشد | پائے ظلم و نیاز در زنجیر
مادرے پیر دارد و دو سہ طفل | از جہان نفور جفت نفیر
ہمہ گریان لقمہ از امید | ہمہ عریان جامہ از تدبیر
غم دل کردہ بر رُخ ہر یک | صورتِ حال ہر یکے تصویر
دست اقبالت ار نہ بکشاید | بندہ ادبار ایں معیل فقیر
گاو دوشائے عمر او ندہد | زیں پس از خشک سال حادثہ شیر ص۱۵۲

انوری کا اگر زمانہ دشمن ہوتا تو اُس کو کیا ضرورت تھی کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ اس قدر فیاض جذبات کا اظہار کرتا۔ مولانا شبلی کی افراط و تفریط استعجاب انگیز ہے۔ کبھی تو انوری کو ایسا بلند پایہ مانتے ہیں کہ سنجر جیسا جلیل القدر سلطان دو مرتبہ اُس کے گھر جاتا ہے اور جب ناراض ہوتے ہیں تو اتنا کم ظرف اور بدحوصلہ بتاتے ہیں کہ تمام دُنیا کو اس کا دشمن بنا دیتے ہیں۔

قولہ "سلطان علاء الدین ملک الجبال سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے سلطان نے ملک طوطی کو جو مرو شاہجہان کا رئیس تھا، خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کر کے دربار میں بھیج دو۔ ملک طوطی نے فخر الدین مروزی کو جو اس کے دربار کا شاعر اور منشی تھا حکم دیا کہ انوری کو لکھو کہ میں آپ کے ملنے کا مشتاق ہوں۔ فخر الدین مروزی انوری کا بڑا دوست تھا اُس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا، لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں لکھ سکتا تھا اس لیے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا ؎

ھی الدنیا تقول بملاء فیھا حذار حذار من بطشی و فتکی

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے، تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوا۔"

(شعر العجم صد ۲۷)

مولانا شبلی اس موقعے پر پہلی مرتبہ محمد عوفی کی لباب الالباب کا حوالہ دیتے ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ یہ کتاب اس وقت تک ان کی نظر سے نہیں گزری تھی اس لیے کہ شبلی فخر الدین مروزی کو ملک طوطی کے دربار کا شاعر اور منشی بیان کرتے ہیں جو ملک طوطی کے خوف سے انوری کو اصل واقعے سے اطلاع نہیں دے سکتا حالانکہ لباب سے کوئی ایسا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا بلکہ قیاس میں آتا ہے کہ خود علاء الدین کے دربار سے اس کا تعلق تھا۔ اس موقعے پر لباب کی عبارت ہے :-

"بنزدیک ملک طوطی نبشت تا آں بلبل بستان فصاحت را بخدمت او فرستد و لطف مجالست درمیان آورد و چناں می نمود کہ او را بجہت تعہد و تلطف استدعا می کند و در ضمیر داشت کہ چوں بروے دست یابد او را انکال گرداند و امیر عمید فخر الدین را ازاں حال علم بود و صورت حال بنزدیک او نمی توانست نبشت چہ از سطوت قہر سلطان علاء الدین می اندیشید و مصادقت و دوستی باہمال رضا نمی داد۔" (لباب الالباب جلد دوم صد ۱۲۸)

ملک طوطی مرو شاہجہان کا رئیس نہیں ہے بلکہ قبائل غز کا سردار سنجر کے دربار میں غزوں کے دو ایلچی رہا کرتے تھے ایک کا نام قرغود تھا اور دوسرے کا طوطی۔ جب ۵۴۸ھ میں ان قبائل نے سنجر کو شکست دے کر اور اسیر کر کے تمام خراسان پر قبضہ کر لیا تو میاں طوطی کا طوطی خوب بولنے لگا اور

طوطی سے ملک طوطی بن گئے۔ انوری جو غزوں سے دلی نفرت رکھتا تھا شومیٔ قسمت سے غز انقلاب کے دور میں کچھ عرصے کے لیے ملک طوطی کے دربار میں توسل پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہی اور بضرورت وقت اس کی مدح و ثنا میں نظمیں بھی لکھتا ہی لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ تعریفوں میں درپردہ تعریض مقصود ہی۔ مثلاً یہ شعر:۔

طوطی اے آنکہ ز انصاف تو ہر نیم شبے | بلبل شکر بعیّوق برد زمزمہ را

دیکھو شاعر طوطی کے لیے بلبل لے آیا۔ اور یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:۔

خسروِ صاحبقراں طوطی کہ از انصاف او | باز را تیہو ہوا خواہ است و شاہین را حمام

شاعر نے پرندوں کا ضلع نہیں چھوڑا اور ذیل کی رباعی میں تو پورا چڑیا خانہ بھر دیا ہی۔ رباعی

اے زیر ہمائے ہمتت چرخ مدام | کبک از نظرت گرفتہ با باز آرام
اقبالِ تو شاہین و کبوتر ایام | سیمرغ نظیر خسرو طوطی نام ص۲۱۰

دیوان میں اگرچہ غوریوں کے متعلق کئی تلمیحات ملتی ہیں لیکن کوئی نظم ایسی موجود نہیں جس کو علاء الدین کی ہجو کے نام سے موسوم کیا جا سکے البتہ ایک شعر ایسا ہی جو علاء الدین کی ناراضی کے اسباب پیدا کر سکتا ہی:۔

کہ بسوراخ غور کینِ تو در | بمثل موش مادہ شیر نر است ص۷

قولہ "انوری کے مخالف شعرا نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ہجویں لکھ کر اُس کے نام سے مشہور کرتے تھے اور انوری کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بلخ میں آیا تو فتوحی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمایش سے بلخ کی ہجو لکھی اور انوری کے نام سے مشہور کردی اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

چار شہر ست خراساں را بر چار طرف | کہ وسط شاں بہ مسافت کم صد در صد نیست
گرچہ معمور و خرابش ہمہ مردم دارد | نہ چناں ہست کہ آبستن دام و دد نیست
بلخ را عیب اگر چند با و باش کنند | بر بہر بے خردی نیست کہ صد بخرد نیست
مصر جامع را چارہ نہ بود از بد و نیک | معدن زر و گہر بے سرب و بسد نیست
حبذا شہر نشاپور کہ در ملک خدائے | گر بہشت ست ہمین ست و گرنہ خود نیست

اہل شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو پکڑ کر تختہ کلاہ کیا اور اوڑھنی اُڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی، اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچتی لیکن قاضی حمید الدین جن کی تصنیف سے مقاماتِ حمیدی ہے اور جن کی شان میں انوری نے کہا ہے ؎

بمدح و ثنا گر کنم رائے نظمے | نہ دشوار گویم نہ آساں فرستم
ولیکن بہ مدح جناب حمیدی | اگر وحی باشد ہراساں فرستم

انھوں نے انوری کی حمایت کی اور اس کی جان بچ گئی، انوری نے ان واقعات کا اس قصیدے میں ذکر کیا ہے ع

اے مسلماناں فغاں از دور چرخ چنبری

چونکہ انوری کے بچانے میں ابو طالب نعیم، صفی الدین عمر، مفتی تاج الدین حسن محتسب، نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی، اس لیے قصیدے میں سب کا ذکر کیا ہے اور بلخ کی ہجو سے نہایت تبری کی ہے کہ بلخ قبۃ الاسلام ہے میں اُس کی ہجو کیوں کر کہہ سکتا ہوں''۔

(شعر العجم صفحہ ۲۷۰ و ۲۷۲)

ہجو بلخ کے اصل واقعات، ایسا معلوم ہوتا ہے ہم تک نہیں پہنچے۔ تذکرہ نگاروں کا ماخذ غالباً وہی قصیدہ ہے جو سوگند نامہ در باب نفی ہجو بلخ

کے نام سے مشہور ہے۔ میں بھی ان واقعات کے مطالعے کے وقت اسی سوگند نامے سے کام لوں گا۔

سنجر کی وفات کے بعد جب خراسان میں انقلاب پر انقلاب آرہے تھے اور آئے دن حکمراں بدل رہے تھے الوری بلخ میں سکونت اختیار کرچکا تھا۔ ان دنوں طغرل تگین کا عہدِ حکومت تھا جیسا کہ شاعر سوگند نامے کے مقطع میں کہتا ہے :-

حبذا تاریخ ایں انشا کہ فرماندہ بہ بلخ   رایت طغرل تگین بودہ است ؤ رائے ناصری

اس فرماندہ کے حالات سے ہم تاریکی میں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا زمانہ سنجر کے بعد ہے۔ چنانچہ الوری ؎

ملک اگر در دولتِ سنجر بآخر بیر گشت   شد جواں بار دگر در دولت طغرل تگیں

علیٰ ہذا ہجو بلخ کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں۔ بالعموم یہی خیال کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ الوری کے آخر حصۂ عمر سے تعلق رکھتا ہے جس کے بعد وہ عزلت نشین ہو جاتا ہے۔ پروفیسر براؤن اور میرزا محمد قزوینی اس واقعے کا ظہور الوری کے پیشین گوئی کے غلط ثابت ہونے کی پاداش میں بتاتے ہیں لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ وہ الوری کی عزلت گزینی سے بہت عرصہ پیشتر ظہور میں آیا ہے۔ الوری کی تشہیر سلطان سنجر المتوفی ۵۵۲ھ اور قاضی حمید الدین المتوفی ۵۵۹ھ کے سنین وفات کے درمیان کسی وقت عمل میں آئی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی حمید الدین شاعر کو بلخیوں کے ہاتھ سے نجات دلواتے ہیں۔

ہجو کے اصلی مصنف کے نام سے ہم ناواقف ہیں۔ سوگند نامے میں صرف "حسود" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ شعر

باز داں آخر کلام من ز منحولِ حسود   فرق کن نقش الٰہی را ز نقش آذری

اور ہمارے شاعر کے ساتھ اس کی عداوت دس سال سے چلی آرہی ہو:۔

غصۂ دہ سالہ را با من بصحرا آوری تا تو فرصت جوے گردی وز کمیں گاہ جسد

ہجو کا مصنف خواہ کوئی ہو حکیم انوری کے بیان سے صاف پایا جاتا ہی کہ صاحب 'خر نامہ' نے جو بقول شادی آبادی حکیم سوزنی ہو اس کی ہجو کی ہو سوگند نامہ **شعر**

چوں مر اورا واضع خرنامہ گیر دریش گاؤ گاو او درخرمن من باشد از ... خری

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ "ہجو بلخ" اور چیز ہو اور "خر نامہ" کوئی اور چیز ہو اور وہ نظم جس سے بلخی ناراض ہوتے ہیں، ہجو بلخ ہی نہ خر نامہ۔ شادی آبادی نے حکیم سوزنی کے کلیات سے خر نامہ کے چند اشعار نقل کیے ہیں چونکہ موجودہ مذاق کے معیار سے پست ہیں لہذا قلم انداز کیے جاتے ہیں، صرف وزن و ردیف کی خاطر ایک شعر یہاں لکھ دیا جاتا ہو ؎

پر مغز خر شود ہمہ دیوان دفترم آں سر خراں بجائے نماید سرخری

شادی آبادی سوزنی کے دیوان سے امیر معزی کی ہجو کے بعض اشعار نقل کرکے یہ غلط نتیجہ مترتب کرتے ہیں کہ ہجو بلخ کا واضع خود امیر معزی تھا لیکن امیر معزی سنہ ۵۴۲ھ میں وفات پاتا ہی، اثیر الدین فتوحی ان ایام میں زندہ تھا اور انوری سے اس کی مخالفت کا راز بھی طشت از بام ہی اسی لیے تذکرہ نگاروں نے ہجو کا قرعہ اس کے نام پر ڈالا ہی۔

آمدم بر سر قصہ، ہجو کا خمیازہ بے گناہ انوری کو اٹھانا پڑا تفصیلی واقعات کسی کو معلوم نہیں سوگند نامے میں شاعر نے اس قدر کہا ہی **بیت**

بگزرد بر طیلسانم نیز دور معجری بر سر من معزی کردے کلہ داں بر گزشت

اس شعر کی ترجمانی میں اہل تذکرہ نے قیاس دوڑایا ہو کہ بلخیوں نے

انوری کو تختہ کلاہ کیا اور عورتوں کی اوڑھنی اُڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی شادی آبادی کہتے ہیں کہ امیر معزی کی شکایت پر یہ تشہیر بادشاہِ عہد کے حکم سے وقوع میں آئی۔

لیکن ایک اور قصیدے سے جو مجدالدین کی مدح میں ہی اور جس کا مطلع ہی :-

اکنوں کہ ماہ روزہ بنقصان در اوفتاد آہ از حجاب حجرۂ دل بر در اوفتاد

اس قدر معلوم ہوتا ہی کہ یہ واقعہ رمضان میں ہُوا تھا۔ غوغائی اُس کے گھر پر چڑھ آئے تھے اور اس کی تخویف و توہین وہیں عمل میں آئی تھی۔ شاعر مجدالدین کو خطاب کرکے کہتا ہی ؎

الحق محال نیست کہ بندہ چو دیگراں از عشق خدمت تو بدیں کشور اوفتاد
ادرا کہ شکرہائے شکرریز شعرہاست زہرے بدست واقعہ در شکر اوفتاد
از حضرتے حشر بدرش حاضر آمدند نادیدہ مرگ در فزع محشر اوفتاد
تیمارش از تعرضِ ہر بے خبر فزود دستارش از عقیلۂ صد معجر اوفتاد
بشنو کہ در عذاب چگونہ رسید صبر بنگر کہ در عذاب چگونہ خر اوفتاد
با منکرانِ عقل دریں خطہ کار او داند ہمی خدائے کہ بس منکر اوفتاد
کافور در غذائش با فطار ہر شبے از جور او (؟) بمومن و بر کافر اوفتاد
از بس کہ بار داوری این و آں کشید او را سخن بحضرتِ ایں داور اوفتاد

اس ورطۂ بلا سے جن لوگوں نے انوری کو نجات دلوائی ہم ان کے ناموں سے مطلق بے خبر ہیں سوگند نامے میں جن بزرگوں کا نام بسبیل تذکرہ آیا ہی اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ وہ اس کے نجات دہندہ ہیں۔ شاعر کا مقصد صرف اس قدر ہی کہ جب بلخ میں ایسے ایسے مشاہیر فضلا و علما جمع ہیں

ان کی موجودگی میں بھلا میری کیا مجال ہو سکتی ہی کہ بلخ کی ہجو کا خیال بھی دل میں لا سکوں اس کے متعلق سوگند نامہ کے بیانات بالکل صاف ہیں۔

باچنیں سکّاں اگر از قدرِ شاں عقدے کشند فارغ آید چرخ اعظم از چہ از بے زیوری
ہجو گویم بلخ را ہیہات یا رب زینہار خود تواں گفتن کہ زنگارست زر جعفری

ان بزرگوں میں سب سے مقدم نظام الدین ہیں۔ شبلی ان کو نظام الدین احمدؒ مدرس کہتے ہیں۔ لیکن ان کا پایہ اس سے بدرجہا افضل و ارفع معلوم ہوتا ہی۔ شادی آبادی ان کو ضابط بلخ کہتے ہیں لیکن صحیح یہ ہی کہ وہ قاضی القضاۃ ہیں۔ سوگند نامہ :-

افتخار خاندان مصطفےٰ در بلخ و من کردہ ام در خدمتش حسّانی و ہم بوذری
آں نظام دولت و دیں کانتظام عدل او در دل اغصاں کند باد صبا را رہبری
در پناہ سدّہ جاہ رعیت پرورش بر عقاب آسماں فرماں دہد کبک دری
ہم نبوت در نسب ہم پادشاہی در حسب کو سلیماں تا در انگشتش کند انگشتری
مسند اقضی القضاۃ شرق و غرب افراشتہ آں کہ ہست از مسندش عباسیاں را برتری
آنکہ پیشِ کلک و طبعش آب و سحر آنکہ حلال صد چو من ہستند چوں گوسالہ پیشِ ساحری
آب و آتش را اگر در مجلسش حاضر کنند از میان ہر دو بر دارد شکوہش داوری

قاضی حمید الدین کے ذکر کے بعد انوری خواجہ صفی الدین عمر کا ذکر کرتا ہی شعر العجم میں انھیں "صفی الدین عم" کہا گیا ہی لیکن سوگند نامہ :-

خواجہ ملت صفی الدین عمر در صدر شرع آنکہ نبود دیو را در سایۂ او قادری

کلیات میں ان کی تعریف میں ایک اور قصیدہ موجود ہی جس کا مطلع ہی:-

زمانہ گزراں بس حقیر و مختصر است ازیں زمانۂ دوں در گزر کہ در گزرست

تاج الدین کے بعد مجد الدین ابو طالب کا نام آتا ہی غالباً یہ وہی بزرگ

ہیں جن کے مدحیہ قصیدے سے چند اشعار اوپر درج ہوئے ہیں۔ شبلی ان کو ابوطالب نعیم کہتے ہیں۔ سوگند نامہ :-

مجد دیں بوطالب آں عالم کہ رہ گم شد درو | عقل کل آں کردہ از بیرون عالم اطہری

شعر العجم میں ایک اور نام ملتا ہی "حسن محتسب" مگر سوگند نامہ اس سے واقف نہیں ہی۔

قولہ "بالآخر انوری نے تمام لغویات سے توبہ کی اور گوشہ گزیں ہوکر بیٹھا، سلطان غوری جہاں سوز نے دربار میں طلب کیا، لیکن اس نے انکار کیا اور یہ قطعہ جواب میں لکھا ؎

کلبۂ کاندرو بہ روز و بہ شب | جائے آرام و خورد و خواب من ست
جایگہ دارم اندرو کہ ازو | چرخ در عین رشک و تاب من ست
ہرچہ در مجلس ملوک بود | ہمہ در کلبۂ خراب من ست
رحل اجزاؤ نان خشک درو | گرد خوان من و کباب من ست
قلم کو تہ و صریر خوشش | زخمہ و نغمۂ رباب من ست
خرقۂ صوفیانۂ اطلس | از ہزار اطلس انتخاب من ست
ہرچہ بیروں بود ازیں کم و بیش | حاش للسامعین عذاب من ست
خدمت پادشہ کہ باقی باد | نہ بہ بازوئے آب و خاک من ست
زیں قدر راہ رجعتم بستہ است | آں کہ او مرجع و مآب من ست
دیں طریق از نمایش ست خطا | چکنم ایں خطا صواب من ست
نیست ایں بندہ را زبان جواب
جامہ و جائے من جواب من ست (شعر العجم صفحہ ۲۷۲)

علاء الدین غوری کی طلب کا واقعہ صحیح نہیں مانا جاسکتا کیونکہ بروایت مشہور

علاء الدین انوری سے صاف نہیں تھا۔ دوسرے یہ امر بھی خاطر نشین رہے کہ اگرچہ انوری کی گوشہ نشینی کا سال ہم کو معلوم نہیں لیکن کلیات سے اس قدر قطعی پایا جاتا ہی کہ حکیم انوری ۵۶۰-۶۱ھ میں سلطان عماد الدین پیروز شاہ کے پاس ترمذ جاتا ہی اور یہ بھی یقینی ہی کہ اس سن سے ایک عرصہ بعد تک وہ مدح سرائی اور شعر گوئی سے تائب نہیں ہوتا۔ کیونکہ کلیات میں متعدد قصائد اسی پیروز شاہ کی مدح و ثنا میں ملتے ہیں جو غالباً کئی سال کے عرصے میں لکھے گئے ہوں گے۔ لیکن علاء الدین جہاں سوز ۵۵۶ھ میں وفات پاتا ہی اس لیے انوری کی عزلت نشینی کے زمانے تک اس کا زندہ رہنا ناممکن ہی۔

قطعۂ بالا میں انوری جس بادشاہ[۵۱] کی خدمت سے دستکش ہوتا دیکھا جاتا ہی وہ کوئی اور بادشاہ ہی جس سے اس کے گہرے اور دیرینہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں اور جس کے دربار میں وہ عرصے تک رہ چکا ہی کیونکہ یہ طلبی کی تحریک ایک عرصے تک جاری رہی ہی اور کئی قطعات اس سلسلے میں لکھے گئے ہیں۔ ذیل میں انوری کا آخری جواب اور بادشاہ کی طرف سے اس کا جواب الجواب جس پر یہ تحریک ختم ہوجاتی ہی درج کیے جاتے ہیں:-

خسروا روزے ز عمرم گر سپہر افزوں کند	تا نگیرد بستہ مرگم چوں مگس را عنکبوت
گر توانم سجدہ گاہ شکر سازم ساحتش	چوں مسیح مریم از صفر حمل تا پائے حوت
پس چگوئی صرف یارم کرد بر درگاہ تو	ہر یکے زیں روزہا را از پئے کوزہ قوت
طالب مقصود را یک سمت باید مستوی	مرد را سرگشتہ دارد اختلافات سموت
من چو کرم پیلہ ام قانع بیک شاع از غذا	تو اماں باصبر چوں وتر حنیفی باقنوت

بادشاہ بھی اسی زمین میں جواب دیتا ہی لیکن وزن مثمن کے بجائے مسدس ہی۔

[۵۱] یہ بادشاہ غالباً عماد الدین پیروز شاہ ہی۔

اے بتو مخصوص اعجاز سخن　چوں بو تر آئی و در معنی قنوت
سمت درگاہت سعود چرخ را　گشتہ در دوراں گل خیر السموت
ماچو قرص ارزن و حوت غدیر　تو چو قرص آفتاب برج حوت
صعوہ ما مرغ سیمرغ تونیست　تو قوی بازو بفضل ومابقوت
پیش نظم چوں نسیج الوحد تو　چیست نظم ما نسیج العنکبوت
گرچہ در تالیف ایں ابیات نیست　بے سمیں غثی و قصیبے بے کروت
رائے عالی در جواب ایں مبند　لائق اینجا السکوت ست السکوت

قولہ "انوری نے حسب روایت دولت شاہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا"۔
(شعر العجم ص۲۷۳)

انوری کی وفات میں سخت اختلاف ہی پروفیسر براؤن، پروفیسر ژوکوفسکی کے حوالے سے یہ تاریخیں دیتے ہیں۔ آتش کدہ قلمی ۵۵۶ھ اور طبع بمبئی ۵۵۹ھ، تقویم التواریخ حاجی خلیفہ ۵۴۷ھ، مرات الخیال شیر خاں لودھی ۵۴۹ھ، ہفت اقلیم ۵۸۰ھ، مجمل فصیحی ۵۸۵ھ، خلاصۃ الاشعار تقی کاشی ۵۸۷ھ اور مرات العالم ۵۹۲ھ۔

دولت شاہ نے جو تاریخ دی ہی ہر صورت میں غلط ہی چونکہ طوفان باد کے سلسلے میں انوری کا نام بھی لیا جاتا ہی اور طوفان کی تاریخ ۵۸۲ھ ہی اس لیے انوری کی وفات اس سن کے بعد کسی وقت ماننا ہوگی۔

حمد اللہ مستوفی نزہت القلوب میں انوری کا مزار سرخاب، تبریز میں جہاں خاقانی اور ظہیر فاریابی وغیرہم دفن ہیں بتاتا ہی اور یہ کسی قدر حیرت خیز ضرور ہی اس لیے کہ شاعر کا اکثر حصۂ عمر بلخ میں بسر ہوا ہی۔ اواخر عمر میں تبریز

جا کر کیا کرتا۔

قولہ "انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہی اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا، ہجو میں اس نے نہایت اچھوتے، نادر، باریک اور لطیف مضامین پیدا کیے ہیں، ان ہجوؤں میں قوت تخئیل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہی صاف نظر آتی ہی لیکن افسوس اور سخت افسوس ہی کہ اس صنف میں اس کا جو کلام زیادہ نادر ہی، اسی قدر زیادہ فحش ہی، سیکڑوں اشعار ہیں لیکن (دو ایک کے سوا) ایک بھی درج کے قابل نہیں، کسی کو ایسا ہی شوق ہو تو آتش کدۂ آذر موجود ہی ہم اپنے دست و قلم کو اس سے آلودہ نہیں کرسکتے، ایک آدھ ہجو فحش سے خالی بھی ہی وہ حاضر ہی۔

پہلے ایک شخص کی مدح لکھی پھر صلے کا تقاضا کیا، اس کے بعد ہجو کی دھمکی دی، دیکھو کس لطیف طریقے سے ادا کیا ہی ؎

سہ بیت رسم بود شاعران طامع را　　یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی

اگر بداد، سوم شکر، ورنہ داد ہجا　　ازیں سہ بیت دو گفتم دگر چہ فرمائی"

(شعر العجم ص ۲۸۳)

انوری کی شاعری کے کئی پہلو ہیں مثلاً اوصاف نگاری یا مداحی، اخلاقیات: پند و حکم اور ہجاجات۔ اپنے ہم وطنوں میں انوری اپنے کمال قصیدہ نگاری کی بنا پر فردوسی اور سعدی جیسے شہسواران فن کا ہمعناں مانا گیا ہی۔ مولانا شبلی برخلاف مذہب جمہور اس کو ہجو گوئی کی نبوت کا منصب عطا فرماتے ہیں اور اس کے حقیقی کمال کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے نہ انھوں نے

قصیدہ گوئی کی اہم دقائق، مشکلات اور اس کی پیچیدگیوں کی داد دی ہو۔

مولانا نے انوری کا کلیات بچشمِ خود نہیں دیکھا۔ محض اس انتخاب کی بنا پر جو صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام کا دیا ہو یہ حکم صادر فرمایا ہو کہ انوری کا کلام جس قدر نادر ہو اسی قدر زیادہ فحش ہو سیکڑوں اشعار ہیں لیکن ایک بھی درج کے قابل نہیں۔ اب اگر صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام سے زیادہ تر ایسا نمونہ پیش کیا جو مولانا کے نزدیک مردود و مطرود ہو تو یہ صاحب آتش کدہ کی بد مذاقی کا قصور ہو جس نے صرف ایسا کلام پسند کیا یا خود مولانا شبلی کا جنھوں نے محض آذر کے انتخاب کی بنا پر ایک غیر موجہ اور عاجلانہ فیصلہ دے دیا جو حقیقت اور واقعیت سے کوسوں دُور ہو۔ ہمیں انوری کا کلام خود دیکھنا چاہیے وہ ابھی تک بازار میں دستیاب ہوتا ہو۔

کلیات میں ہر قسم کا ذخیرہ موجود ہو جس سے ہر مذاق کا شخص اپنے اپنے مطلب کے پھول چُن سکتا ہو۔ اس چمنستان میں جہاں ہجو اور فحش کے خار ہیں وہاں متین اور سنجیدہ کلام کے گل و ریاحین بھی کثرت کے ساتھ نظر افروز ہیں البتہ کانٹوں کی اس قدر بہتات نہیں جس کے مولانا شبلی مدعی ہیں اور یہ خیال تو قطعی غلط ہو کہ اس کا کلام جس قدر زیادہ نادر ہو اسی قدر زیادہ فحش ہو۔ انوری کی فحش گوئی صرف چند عریاں اور قابل اعتراض الفاظ کے استعمال پر منحصر ہو۔ دشنام دہی میں کسی لطافتِ خیال اور دقتِ نظر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اِس لیے اِس صنفِ سخن میں شاعر کی قوتِ تخیّل کے کارناموں کی تلاش کرنا میرے خیال میں بے سود ہو۔ انوری کی اوصاف نگاری سے قطع نظر کرنا اس کی فحش نگاری کی تعریف کرنا، اس کے اخلاقیات کو پس پشت ڈالنا اور اس کی ہجویات کو اُچھالنا ایک ایسی عجیب تحسین ہو جو کسی کے وہم و گمان

میں نہیں گزری ہوگی ؎

بخوں غلطیدہ دستِ تیغِ غازی ماند و بے تحسین
تو اول زیب اسپ و زینتِ برگستواں بینی

ہجو کی مثال میں جو قطعہ مولانا شبلی نے نقل کیا ہی اور جس کو میں اوپر درج کر آیا ہوں ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کو ہجو سے کس قدر حقیقی بُعد ہی۔ اس اچھے خاصے قطعے پر یہ کلنگ کا ٹیکا ناحق لگایا گیا۔ اگر اس قسم کی لطیفہ سنجی ہجو میں داخل کرلی گئی تو میرے خیال میں مولانا کی ثقاہت کے اعلیٰ معیار تک کوئی مشرقی اور مغربی شاعر نہیں پہنچ سکتا اور ظرافت و خوش طبعی کا وجود جس کے ایرانی شعرا بالعموم شیدائی نظر آتے ہیں شجر ممنوعہ قرار پاتا ہی۔

ذیل میں اسی ذخیرے سے جس کو مولانا شبلی رد کر چکے ہیں ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے چند مثالیں جو مذاقِ حال کی رو سے قابلِ اعتراض نہیں، پیش کی جاتی ہیں۔

جن ایام میں انوری سرخس میں مقیم تھا وہاں بو علی آبی نام کا ایک عہدہ دار رہا کرتا تھا۔ بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر شاعر اس سے ناراض ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ابو علی آبی کی ناک اس کے منہ پر بلحاظ تناسب کثیر الحجم واقع ہوئی تھی اور تمام چہرہ پر چھا گئی تھی۔ انوری اس شاندار ناک کی تعریف میں اپنے خیالات ذیل کی رباعی میں دیتا ہی رباعی

با بو علی آبی ار بہم بہ نشینی　　شخصے بینی شش جہتش ز و بینی
گر دیدہ بدیدن رخش چار کنی　　چنداں کہ از و بینی بینی بینی

ایک مرتبہ سرخس میں امساکِ باراں ہوگیا اور بارش دیر میں ہوئی۔ انوری نے آبی اور بے آبی کے انضمام سے یہ لطیفہ حاصل کیا ؎

سرخس از رنج بے آبی و آبی — دریغا روے دارد در خرابی
زبے آبی خلاصی یافت امسال — خداوندا خلاصش دہ ز آبی

یعنی سرخس بے آبی اور آبی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا۔ اس سال بے آبی سے اس کو نجات مل گئی الہٰی اس کو آبی سے بھی پاک کر۔

خواجہ ابوالفتح کے بخل کی تشہیر ؎

خواجہ بوالفتح از کمال حرص و بخل — سیم حاصل می کند بے فائدہ
وز پئے نانے ہمی گوید زنش — ربنا انزل علینا مائدہ

مدوح کو جس سے صلہ حاصل کرنے میں شاعر مایوس ہو چکا ہے یوں خطاب کرتا ہے ؎

خداوندا ہمی دانم کہ چیزے نیست در دستت — گرم چیزے ندادستی بدیں تقصیر معذوری
ولیکن گر کسے پرسد چہ دادستت و دادی — کہ گویم عشوہ اول روز و آخر روز دستوری

اگر آپ نے مجھے کچھ عطا نہ کیا تو معذور ہیں اس لیے کہ آپ کے پاس دینے کو کچھ نہیں لیکن جب لوگ مجھ سے پوچھیں کہ کیا دیا! تو کہیے کیا کہوں؟ کیا یہی کہ صبح کو فریب دیا اور شام کو رخصت دی۔

نجیب مشرف اور فرید عارض:

چہ خیر باشد در لشکرے کہ نیز درو — نجیب مشرف و عارض فرید لنگ بود
شکست پائے یکے، زود یا کہ دیر رسد — خبر، کہ دست دگر نیز زیر سنگ بود

ایک قران خواں قاری کی قرأت انوری کے لیے ناخوشنودی کے اسباب پیدا کرتی ہے اور شاعر اپنی ناراضی کا اظہار ذیل کے ابیات میں کرتا ہے ؎

دوش در خواب من پیمبر را — دیدمش کوز اُمّت آزردہ است
گفتمش اے بزرگ چیست بودہ است — طبع پاک تو از چہ پژمردہ است

گفت زیں مقریک ہمی جوشم   رونقِ دین ایزدی بردہ است
آں چہ این نان بمردمی خواند   جبرئیل آں بمن نیاوردہ است [ص ۱۱۳]

کسی وزیر کو جس سے انعام کی امید میں شاعر یاس سے ہمدوش ہی یہ مشورہ دیا جاتا ہی:-

تو وزیری و منت مدحت گوے   دستِ من بے عطا روا بینی
شو، وزارت بمن سپار و مرا   مدحتے گوئے تا عطا بینی [ص ۳۲۳]

تم وزیر ہو اور میں تمھارا مداح۔ سخت افسوس ہی کہ پھر بھی خالی ہاتھ رہوں۔ خیر! میں تجویز کرتا ہوں کہ وزارت تم میرے حوالے کرو اور شاعری میں تمھارے سپرد کردوں پھر تم قصیدے کہنا اور میں انعام دوں گا۔

تاج الدین عمزاد جب زیارت بیت اللہ سے واپس آتا ہی انوری اس کے خیر مقدم میں کہتا ہی۔

عمزاد زحج باز رسید است بنوی   با توبرۂ طاعت و انبان کرامت

انوری کے ہاں ہجو بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو دس بارہ آدمیوں سے زیادہ کی نہیں ملے گی ان میں چار اشخاص ایسے ہیں کہ متعدد موقعوں پر کلیات میں ان کی مذمت ملتی ہی۔ ان بدنصیبوں میں ایک قاضی طوس ہیں، نمبر دوم سدید الدین بیہقی، نمبر سوم تاج الدین عمزاد اور نمبر چہارم کافی ہروی ہیں۔ شاعر کہتا ہی ؎

چار کس یابی کہ در ہجو من اند   گر بجوئی از ثریا تا ثری
قاضی طوس و سدید بیہقی   تاجک عمزاد و کافی ہری [ص ۵۶۲]

قولہ "انوری کے دیوان میں چند ہجویں انوری کے بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہیں، عام لوگوں کا خیال ہی کہ انوری کو ہجو کا ایسا چسکا پڑ گیا

تھا کہ بیوی اور بیٹے کو بھی نہ چھوڑ سکا۔ لیکن اور شعرا نے یہ ہجویں
لکھ کر اس کے دیوان میں داخل کر دی ہیں اور چونکہ پبلک اُس کی
دشمن تھی وہ اسی طرح قائم رہ گئیں۔" (شعر العجم ص۲۸۵)

میں نہیں سمجھا کہ یہ عام لوگ کون ہیں اگر تذکرہ نگار ہیں تو باوجود متعدد
تذکرے دیکھنے کے مجھ کو اس قسم کا کوئی چرچا نظر نہیں آیا۔ بعض اشعار سے
پایا جاتا ہے کہ انوری نے شادی ہی نہیں کی تھی ؎

انوری زن ازاں سبب نہ کند
کہ مبادا زنش پسر زاید

کسی دوست کو جس نے شادی کے باب میں مشورہ دیا ہے جواب دیتا ہے:

بخدائے کہ بے ارادتِ او
خلق را رنج و شادمانی نیست
کاندریں روزگار زن کردن
بجز از محض قلتبانی نیست

انوری کے حالات
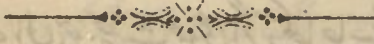
اوحدالدین انوری کا باپ محمود ایک شہزادی کریمۃ النساء رضیۃ الدین کی سرکار میں ایک قابل اعتماد منصب پر سرافراز تھا۔ یہ سرکار شعرا کی قدرداں تھی انوری اپنے باپ کی وفات کے بعد غالباً اسی سرکار میں توسل قائم کرنا چاہتا ہے۔ ایک خطابیہ قصیدے میں جس کا مطلع ہے ؎

اے فخر ہمہ نژادِ عالم — وے سیّدۂ زنانِ عالم

(کلیات صفحہ ۲۸۱)

شاعر اپنا مدعا یوں عرض کرتا ہے ؎

بودے پدرم بہ مجلسِ تو — یار سرہ و حریف محرم

تو شاد بزی کہ رفت ورزو ماند — میراث بہ ماندگانِ او غم

ارجو کہ رہی شود بمدحت — بر اغلب مادحاں مقدم[1] (ص ۲۸۲)

بلحاظ پایۂ علوم انوری اپنے زمانے کا غیر معمولی آدمی مانا جاسکتا ہے۔ اس کا حافظہ نہایت قوی تھا ؎

خاطرے دارم منقاد چناں کاندر حال — گویدم گیسر ہراں علم کہ گویم یکبار (ص [illegible])

نجوم میں اُستاد ہونے کے علاوہ منطق، فلسفہ اور ہیئت میں ماہر تھا، حکمت اور فلسفے میں اُس کا پایہ نہایت بلند تھا۔ طبعیات اور الٰہیات میں کافی

---

[1] یہ قصیدہ اگرچہ مطبوعہ کلیات اور بعض قلمی نسخوں میں موجود ہے، لیکن بعض وجوہ سے جو اس مضمون کے خاتمے میں ظاہر کیے گئے ہیں احتمال کیا جاسکتا ہے کہ وہ انوری کا نہو۔

لیاقت رکھتا تھا۔ شاعری جس کی بنا پر وہ دنیا میں مشہور و معروف ہی اس کے کمالات کا ایک ادنیٰ پایہ ہی۔ نثر میں بھی صاحب قدرت تھا ؎

اگر نامہ باید نوشتن نویسم
بکلک و بیاں دیبۂ خسروانی (کلیات صفحہ ۴۱۶)

ادبیات میں البتہ کمزور تھا ؎

در ادب گرچہ پیادہ است چو حشمت گہ عفو
درسخن ہست چو عقلت گہ ادراک سوار

وہ اعلیٰ درجے کا خطاط بھی تھا ؎

گویند کہ چیست حاصل تو
اے بے حاصل ز زندگانی
گویم خطکے و بیتکے چند
از دو لہتاے ایں جہانی

نرد و شطرنج خوب کھیلتا تھا ؎

دگر نرد و شطرنج خواہی بباز م
حریفانہ سحر حلال از روانی

ان بیانات سے واضح ہوتا ہی کہ انوری کی تعلیم و تربیت ایک خاص نصب العین کی بجا آوری کی غرض سے ہوئی تھی، یعنی یہ کہ بڑا ہو کر سلاطین کی منادمت کے قابل ہو سکے۔ ایسے درباروں میں جہاں علمی روایات اور تہذیب نے اپنا گہوارہ بنا لیا تھا منصب ندیمی ایک قابل اعتماد اور ذمہ دارانہ منصب شمار کیا جاتا تھا۔ ملک کے بہترین دماغ اس عہدے کے آرزومند رہتے تھے اور دربار سلطانی میں رسائی اُن کی غایت مرام ہوتی تھی۔ مگر ندیمی بجائے خود ایک دشوار گزار مرحلہ تھا۔ اس میں انسان کو مستجمع کمالات اور جہہ صفت موصوف ہونا ضروری تھا۔ ظریف، طبّاع اور حاضر جواب ہونے کے علاوہ ندیم کے لیے ضروری تھا کہ شاعر بھی ہو، طب، فقہ اور نجوم میں مہارت رکھتا ہو، شعرائے قدیم و جدید کا کلام اس کو مستحضر ہو، ادب سے آشنائی رکھتا

ہو، تاریخ اور محاضرات پر عبور ہو، قصے، لطیفے، اور چٹکلے خوب جانتا ہو، قدرتی خوش تقریر ہو، موسیقی داں ہو اور چنگ و رباب بجانا جانتا ہو، مختصر یہ ہے کہ علوم میں قاموس ہو، اور نرا زاہد خشک نہو۔

انوری فطرتاً، علماً و فضلاً اس ممتاز منصب کا مستحق تھا۔ اور اسی آرزو میں وہ سلطان سنجر سلجوقی کے دربار کا رُخ کرتا ہے۔ اِس مقصد کی تکمیل کی غرض سے اُس نے دربار کے اُمرا سے تعلقات قائم کیے ہوں گے لیکن اس سے قبل میں ایک ضروری مسئلے کو چھیڑتا ہوں۔

انوری کا صحیح زمانہ تعین کرنا ہمارے لیے ایک مشکل معما ہے۔ اُس کے ہاں بعض قصائد کسی وزیر نظام الملک صدر الدین محمد[۲] کی تعریف میں ملتے ہیں جو بظاہر مشہور نظام الملک طوسی کا نبیرہ اور فخر الملک کا فرزند مانا جا سکتا ہے۔ یہ شخص اپنے باپ کے قتل کے بعد ۵۰۰ھ سے ۵۱۵ھ تک سلطان سنجر کا وزیر رہا ہے، بلکہ ایک قصیدہ تو اُس کے منصب وزارت پر فائز ہونے کے عین موقع پر لکھا گیا ہے ؎

به نیک[۱] طالع و فرخنده روز و فرخ فال — به سعد اختر و میمون زمان و خرم حال
به بارگاهِ وزارت به فرخی بنشست — خدایگانِ وزیران و قبلهٔ آمال
نظامِ مملکت و صدرِ دین و صاحب عصر — سپهر رفعت و قدر و جهانِ جاه و جلال
محمد آں که به اقبال او خورد سوگند — روانِ پاک محمد[۲] به ایزد متعال

دوسرے قصیدے میں اُس کا نام یوں آتا ہے ؎

نظامِ مملکت سلطان و صدرِ دین خدا — خدایگان وزیران، وزیر خوب سیر

---

[۱] بہت ممکن ہے کہ یہ قصیدہ انوری کا نہ ہو اور کسی دوسرے شاعر کا ثابت ہو۔ اس کی زبان انوری کی زبان سے یقیناً مختلف اور سلیس و سادہ ہے۔

محمد آں کہ ز جاہش گرفت ملت و ملک ۔۔۔ ہماں نظام کہ دیں ز ابتدا بعدل عمر

اِن قصائد کے اعتبار پر انوری کی شاعری گویا قرن ششم کے آغاز میں شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس نظریے کے تسلیم کرنے میں کئی مشکلات مانع ہیں۔ اس کی وفات ۵۸۲ھ کے بعد، جب کہ ستاروں کا اقتران برج میزان میں ہوا تھا، مانی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ طوفان کی بحث وتحیص میں انوری نے بھی حصہ لیا تھا اور کہ وہ ان لوگوں میں تھا جو طوفان کے ظہور کے حق میں اعتقاد رکھتے تھے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ طوفان کے سلسلے میں ایک آدھ تلمیح جیسا کہ گزشتہ اوراق میں دیکھا جا چکا ہے، انوری کے کلیات میں پائی بھی جاتی ہے۔ اب یہ خیال کرنا کہ انوری برابر اسی سال تک شعر کہتا رہا واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کی عمر ایک صدی سے زیادہ تسلیم کرنی ہوگی، اور جہاں تک معلوم ہے اس کی درازیٔ عمر کی بابت کوئی روایت موجود نہیں۔

کلیات سے اس قدر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مدت شعرگوئی زیادہ سے زیادہ تیس سال رہی، اس کے بعد وہ تائب ہو کر عزلت نشین ہو جاتا ہے۔

سی سال در طریقِ تجرّد دلم بتافت ۔۔۔ اکنوں ز خدمتِ درِ تو برکراں رسید (ص ۱۲۲)

دیگر

کسے کہ مدت سی سال شعر باطل گفت ۔۔۔ خدائے بر ہمہ کامیش داد پیروزی (ص ۲۳۷)

رُباعی

سی سال درختِ بختِ من بار آورد ۔۔۔ چرخ ایں ستم برسرِ تیمار آورد

زان روئے برویم ایں قدر کار آورد تا دشمنم از دوست پدیدار آورد (ص ۲۱۲)

اب اگر سنہ ۵۰۰ھ انوری کی شاعری کا سال آغاز مانا جاتا ہی تو سنہ ۵۳۰ھ میں یہ مدت سی سالہ ختم ہو جاتی ہی۔ حالانکہ کلیات میں ان دو سالوں کے درمیانی زمانے کی ایک تلمیح بھی نہیں ملتی، اور اگر ملتی ہے تو سنہ ۵۴۰ھ کے بعد کی ملتی ہی۔

کلیات میں تاریخ و سال کی طرف جو متعدد اشارے ملتے ہیں ذیل میں علٰحدہ علٰحدہ دکھائے جاتے ہیں۔

سال	شعر	صفحہ
سنہ ۵۴۰ھ	بحکم دعوے زیج و گواہی تقویم شب چہارم ذیحجہ ز سنہ تامیم	(ص ۳۰۰)
سنہ ۵۴۱ھ	عدد سالہائے عمرش باد ہمچو تاریخ پانصد و چل و یک	(ص ۲۴۴)
سنہ ۵۴۲ھ	بودہ در نزدِ فرح نقشش بکام تا فرح تاریخ ایں نقش ست و نزد	(ص ۱۰۰)

(فرح = ۲۸۸، نزد = ۲۵۴ فرح + نزد = ۵۴۲)

سال	شعر	صفحہ
سنہ ۵۴۰ھ	(عددِ سالہائے مدتِ تو) ہمچو تاریخ پانصد و چل و اند	ص ۶۳۶
سنہ ۵۴۰ھ	عدد سالہائے عمرش باد ہمچو تاریخ پانصد و چل و اند	ص ۶۵۱
سنہ ۵۶۰ھ مطابق سنہ ۵۳۳ یزدجردی	سال بر پانصد و سی و سہ ز تاریخ عجم گفت برخیز کہ از شہر بروں شد ہمراہ	ص ۲۵۷

علاوہ بریں کلیات میں جو اور تلمیحیں واقعات تاریخی سے متعلق ملتی ہیں

سب کی سب ۵۴۶ھ کے بعد کے واقعات کے متعلق ہیں۔ مثلاً تسخیر ہزار اسپ ۵۴۲ھ، جنگ سلطان سنجر و علاء الدین غوری جہانسوز ۵۴۴ھ، فتن سنجر بعراق ۵۴۷ھ، وفات ابوالفتح ناصر الدین طاہر وزیر سلطان سنجر ۵۴۸ھ، فتنۂ غزاں ۵۴۸ھ، مقامات حمیدی ۵۵۱ھ، وفات سلطان سنجر ۵۵۲ھ۔

ان وجوہ کے زیر اثر یہ نظریہ قائم ہوتا ہے کہ انوری کی شاعری غالباً ۵۴۶ھ ہجری سے چند سال پہلے شروع ہوتی ہے اور یہ صدر الدین محمدؒ نظام الملک فخر الدین کا فرزند نہیں ہے بلکہ کوئی اور، جو اگرچہ وہی نام و خطاب اور منصب رکھتا ہے لیکن زمانے کے لحاظ سے صدر الدین محمدؒ مذکور الصدر سے بہت مؤخر ہے۔

سنجر کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کی غرض سے انوری سب سے پیشتر ابوالفتح ناصر الدین طاہر بن فخر الملک بن نظام الملک کے دربار سے جو جمادی الاول ۵۲۶ھ سے ۵۴۸ھ تک سنجر کا وزیر تھا، تعلق پیدا کرتا ہے۔ ایک عرصہ امیدواری کرنے کے بعد طاہر کو اپنی طرف توجہ دلاتے ہوئے گویا ہے۔

۵ اے بزرگے کہ از بزرگی و جاہ	ہر کہ بر خدمت تو یافت ظفر
گرد بیروں ز دست محنت پائے	بر دا ز دولتت بکیوان سر
بگزشت از فلک بمرتبہ آنک	کرد روزے بدرگہ تو گزر
بندہ نیز از بحکم امیدے	خدمتے گفت از دو عجب مشتہر
عاجزے بود کرد با تو پناہ	از بد روزگار بد گوہر
ہطلے بود دامن تو گرفت	از جفائے سپہر دوں پرور
طمعش بود کز خزانۂ جود	بے نیازش کنی بجامہ و زر
گرد داز دستِ بخشش تو غنی	یابد از فر دولتِ تو خطر

بمہد از نحوستِ انجم	بجہد از مساحتِ کشور
مدتے شد کہ تا بداں امید	چشم دارد براہ وگوش بدر
ہست ہنگام آں کہ باز کند	بر سرِ او ہمائے چترِ تو پر
حلقہ بر گوش چرخ کرد ہر آنک	کرد بر وے عنایتِ تو نظر
بندہ را گوشمال داد بسے	بعنایت یکے در و بنگر
صلہ دادن ترا سزاوار ست	زاں کہ آں دیدہ ز جدّ و پدر
بیخ کاں را نشاند دستِ قضا	شاخ آں جز کرم نیارد بر
نیست نادر زخاندانِ نظام	دانش و رادی و ذکا و ہنر
نور نادر نہ باشد از خورشید	بوے نادر نہ باشد از عنبر (ص ۱۵۹)

یہی عرضِ حال کسی قدر شکایت کے لہجے میں ذیل کے ابیات میں کیا گیا ہے۔

؎ صاحبا بندہ را دریں یک سال	در مدیح تو شعر ہاست متیں
و اندر ابیات آں معانی بکر	چوں خط و لفظِ تو خوش و شیریں
ہر کہ او را وسیلتے ست چناں	نہ ہمانا کہ حالتے ست چنیں
گہ ز خاک تحیرستش بستر	گہ ز خشتِ تو قفش بالیں
آخر ایں روزگار جانی را	کہ بجاہِ تو دارد ایں تمکیں
خود نہ پرسی یکے ز روے حساب	تا چہ می خواہد از من ایں مسکیں
وقتِ کوچ ست و عرصہ تنگ مرا	دل بہ تیمار خرچ راہ رہیں
نیست در سکۂ زمانہ کسے	کاضطراب مرا دہد تسکیں
تو کن احساں کہ ہر کہ جز تو بود	ننہد پا ازاں سوے تحسیں (صفحہ ۳۲)

لیکن ذیل کے اشعار میں یہ مودبانہ شکایت شکر مندانہ لہجے میں بدل جاتی ہے۔

بندہ سالے ست تا دریں خدمت | گہ بہنگام دگہ بہ بے ہنگام
دہد از جنس دیگرت زحمت | آرد از نوع دیگرت ابرام
آں ہمی بیند از تہاون خویش | کہ بداں ہست مستحق ملام
واں ہمی بیند از مکارم تو | کہ بشر حشں تو آں نمود قیام
شد کرم ز غایت کرمت | کرم الحق چنیں کنند کرام ص۲۹۳

دیگر

بندہ سالے ست کہ تا در کنف دولت تو | غم ایام نخوردست چہ اکثر چہ اقل
درنہ با او فلک آں کرد ازیں پیش ہمی | کآتش و آب کند با شکر و موم و عسل
گاہ باضربت سہمے ز سماک رامح | گاہ بانکبت عزلے ز سماک اعزل
رویش از غصۂ ایام بر دشمن و دوست | داشتے چوں گل خودرو اثر خوف و خجل
گوش کارہ شود از قصۂ او لا تسمع | ہوشش والہ شود از غصۂ او لا تسأل
بخت بیدار تو بود آں کہ بر انگیخت چنیں | دولت خفتۂ او را زچناں خواب کسل
للہ الحمد کہ تا حشر نمی باید بست | در قطار تعبش نیز نہ ناقہ نہ جمل
شد زفر تو ہمہ مغز چو تجویف دماغ | گرچہ شے بود ہمہ پوست چو ترکیب بصل ص۲۹۳

کلیات میں ابو الفتح طاہر کی تعریف میں قصائد کثرت سے ملتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلی تاریخی تلمیح ۵۴۸ھ سے تعلق رکھتی ہی جب کہ شاعر نے اِس کے خیر مقدم میں ایک قصیدہ لکھا ہو جس کا مطلع گزشتہ سطور میں درج ہو چکا ہی۔

دوسری تلمیح جو اشعار ذیل میں پائی جاتی ہی تسخیر ہزار اسپ سے تعلق رکھتی ہی۔ انوری ناصر الدین طاہر کو خطاب کر کے کہتا ہی۔ ؎

حصن ہزار اسپ اگرچہ بر در آں ملک | سد قدیم ست حصنہائے حصیں را

کعبۂ دہلیز شہ چو دید فصیلش — سجدہ کناں بر زمیں نہاد جبیں را
تیر سر یع شہاب کلک تو بس بود — رجم چناں صد ہزار دیو لعیں را
خود مدد تیغ پادشہ بچہ کاراست — خاصہ تہیّاے کار ہاے چنیں را
غیبت خوارزم شاہ کز پس شش ماہ — چشمۂ خوں کرد چشم حادثہ بیں را
دست بفتراک اصطناع تو در زد — معتصم ملک کرد حبل متیں را[1]

تسخیر ہزار اسپ کے واقعات یہ ہیں کہ جب ۵۳۶ھ میں سلطان سنجر، اتخان سپہ سالار گور خان سے جنگ میں مصروف تھا، اتسز خوارزم شاہ خراسان آکر مرو اور نیشاپور کو لوٹ لیتا ہے، سنجر اس کی اس حرکت پر جب فوج کشی کی دھمکی دیتا ہے تو خوارزم شاہ جواب میں ایک قطعہ لکھتا ہے جس کے دو شعر، ہیں ؎

اگر باد پایست رخش ملک — کمیت مرا پائے ہم لنگ نیست
تو ایں جا بیائی من آں جا روم — خدائے جہاں را جہاں تنگ نیست[1]

سنجر ۵۴۲ھ میں ہزار اسپ کا محاصرہ کرتا ہے، اثنائے تسخیر میں اوحد الدین انوری یہ رباعی لکھتا ہے ؎

اے شاہ ہمہ ملک زمیں حسب تراست — وز دولت و اقبال جہاں کسب تراست
امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر — فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

یہ رباعی ایک تیر کے ذریعے سے قلعے میں ڈلوادی گئی۔ محصورین کی طرف سے رشید الدین وطواط نے جواب میں ذیل کی رباعی لکھی رباعی

اے شہ کہ بجامت مئی صاف ست نہ درد — اعدائے ترا زغصہ خوں باید خورد
گر خصم تو اے شاہ بود رستم گرد — یک خرز ہزار اسپ تو نتواند برد

[1] راحت الصدور ص ۱۷۴ ، ۱۹۲۱ء۔

کچھ عرصے کے بعد قلعہ فتح ہوتا ہے، اور انوری سلطان کی زبان سے یہ رباعی لکھتا ہے ؎

اندیشۂ انتقام چوں حزم کنیم | وہن ہمہ دشمناں بیک حزم کنیم
با چرخ چو با اتسز اگر رزم کنیم | گردوں بسُم اسپ چو خوارزم کنیم

کلیات میں متعدد مقامات پر ایسے اشارے پائے جاتے ہیں، جن کی رُو سے کہا جاسکتا ہے کہ سنجر اپنے وزیر طاہر کو کچھ عرصے کے لیے معزول یا معطل کر دیتا ہے اور وزارت کسی اور کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ اس واقعہ کی اطلاع کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لیکن ذیل کے اشعار اس بیان کی تائید کے لیے کافی ہیں۔ ابیات

اگرچہ طائفۂ در حریم کعبۂ ملک | ورائے پایۂ خود ساختند مادی را
بہ پنج روزہ ترقی بہ سقف او بردند | جولات وعزی اطراف قلج ویدی را
شکوہ مصطفویت آخر از طریق نفاذ | نطاقہاشں در افگند لات عزی را
طریق خدمت اگر بسپرند باکے نیست | زمانہ نیک شناسد طریق اولی را

دیگر

خصم ار بکمال تو تشبہ نکند بہ | تا می چہ کند بازوے بید ست علم را
بخت نہ سمیں ست کہ رہ گم کند اقبال | گر نیل کشد دشمن بد بخت درم را
جبرہ است مگر خصم تو زیرا کہ نیاید | در ہیچ عمل منصب او بیش سہ دم را

دیگر

بو د بے بالش تو صدر وزارت خالی | بود بے حشمت تو کار ممالک مختل
خصم اگر دولتکے یافت بصد جہد آنرا | روز کے چند نگہداشت بہ تزویر و حیل
آخر الامر در آمد بسر اسپ حیلش | تا در افتاد بیک واقعہ چوں خر بوحل

اور مسند وزارت پر اس کے دوبارہ تقرر پر یہ قصیدہ لکھا ؎

شرفِ گوہرِ اولاد نظام ملک را باز شرف داد نظام

خواجۂ مملکت و حاکمِ عصر ناصر الدین و نصیرِ اسلام

بوالمظفر کہ بعونِ ظفرش عدل شد ظلم و ضیا گشت ظلام

ذیل میں کوشش کی جاتی ہی کہ انوری اور سلطان سنجر کے تعلقات پر کسی قدر روشنی ڈالی جائے۔

سلطان سنجر

یاد رہے کہ کلیات میں سلطان سنجر بن ملک شاہ ۵۱۱ھ و ۵۵۲ھ کی مدح میں بہت کم قصائد ملتے ہیں، عام روایات اگرچہ انوری کو سنجر کا خاص شاعر مانتی ہیں، اور یہ بھی بیان کرتی ہیں کہ سلطان کی نظروں میں انوری کی وقعت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ خود دو مرتبہ سنجر اس کے مکان پر جاکر انوری کی عزت افزائی کرتا ہی۔ لیکن کلیات ان بیانات کی تائید نہیں کرتا۔ اور نہ قصائد میں ایسے اشارے پائے جاتے ہیں جن کی بنا پر شاعر کے ساتھ سنجر کے نہایت گہرے تعلقات تسلیم کیے جائیں۔

قصائد کی زبان میں بالعموم ایک تصنّع اور تکلّف کی ادا شروع سے آخر تک ملحوظ ہی اور وہ بے تکلّفانہ لہجہ جو ایک دیرینہ مدّاح اپنے ممدوح کے حق میں اختیار کر لیتا ہی، بالکل مفقود ہی، نہ کہیں صلہ مانگا گیا، نہ عطیہ کا شکریہ ادا کیا گیا اور نہ کہیں عرضِ حال ہی، شاعر صرف دو موقعوں پر البتہ اپنے متعلق کچھ کہتا ہی پہلا وہی جہاں اپنی دہ سالہ امیدواری کی بابت کہتا ہی۔
نیز ایک قطعے سے جو راحت الصدور میں بھی دیا گیا ہی، اس قدر معلوم ہوتا

ہی کہ سنجر نے ایک مرتبہ اپنے سامنے بلوا کر اس کے اشعار سُنے تھے اور بیٹھنے کا حکم دیا تھا، وہ قطعہ یہ ہی ؎

انوری را خداَیگان جہاں | پیش خود خواند و دست داد و نشاند
بادہ فرمود و شعر خواست ازو | وندراں سحر کرد و دُر بفشاند
چوں بمستی برفت بار دگر | کس فرستاد و پیش تختش خواند
ہمہ بگزار، ایں نہ بس کہ ملک | نام او بر زبانِ اعلےٰ راند
پیش ازیں در زمانہ دولت نیست | ہیچ باقیش در زمانہ نماند

یہ امر قرین قیاس ہی کہ انوری سنجر کے دربار میں اس کے آخری ایام سلطنت میں پہنچتا ہی، پہلی تلمیح وہی ہی جو قلعہ ہزار اسپ کی تسخیر اور ۵۴۲ھ سے تعلق رکھتی ہی۔

دوسری تلمیح غالباً سلطان سنجر اور سلطان مسعود سلجوقی کی ملاقات سے علاقہ رکھتی ہی اور اشعار ذیل میں پائی جاتی ہی ؎

گفتم کہ حدیث عراق گویم | در خود ہمہ بیتے سہ چار باشد
چوں سلک معانی نظام دادم | تازاں سخنم آب دار باشد
الہام الٰہی چہ گفت، گفتا | آں را کہ خرد ہیچ یار باشد
چوں سایۂ مرا مدیح گوید | با ذکر عراقش چہ کار باشد
خسرو بسر تازیانہ بخشد | چوں ملک عراق ار ہزار باشد

سنجر ملک عراق کی بدنظمی کے حالات سُن کر جو اُن دنوں سلطان مسعود سلجوقی کے زیر نگیں تھا اواخر شعبان ۵۴۴ھ میں ری جاتا ہی۔ مسعود اِن دنوں ہمدان میں تھا چچا کی آنے کی خبر سُن کر اُس نے بالا بالا بغداد جانے کا قصد کیا لیکن شرف الدین موفق کے مشورے سے وہ اس ارادے سے باز آ کر سیدھا

چچا کی خدمت میں رَے پہنچ گیا۔ چچا بھتیجوں میں جو غلط فہمی تھی دُور ہوگئی اور جنگ کا خطرہ بالکل جاتا رہا۔ مسعود اٹھارہ روز تک برابر جب تک سنجر رَے میں رہا، چچا کی خدمت گزاری میں مصروف رہا۔

تیسری تلمیح سلطان سنجر اور علاء الدین غوری جہاں سوز کے مابین در اوبہ پر محاربے کے متعلق ہے۔ شاعر سنجر کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

بندہ دریں مختصر غرض کہ تو گفتی — آیتِ تحصیل آں چو روز مبین ست
قاعدۂ تہنیت ہمی نہ نہد زانک — خصم نہ فغفورِ چین و غور نہ چین ست
گرچہ ہنوز از غزیو لشکرِ خصمت — جمجمۂ کوہ پر صدائے انین ست
در چہ ز تیغ مبارزان سپاہت — سنگ بخونِ مخالفانت عجین ست
باچو تو صاحبقراں بذکر نہ سر زد — دیں سخن الہام آسمان برین ست (۴۵)

علاء الدین ۵۴۵ھ میں تخت نشین ہوکر اور بہرام شاہ بن مسعود پر فتح پاکر غزنین پر قابض ہو جاتا ہے۔ اور وہ اجناس جو ملوک غور ہر سال بطور خراج سنجر کو بھیجا کرتے تھے بند کر دیتا ہے۔ یہ استبداد دیکھ کر سنجر بقصد جنگ غور کی طرف بڑھتا ہے اور اَوبہ پر مقابلہ ہوتا ہے۔ عین جنگ کے وقت چھ ہزار سوار ترک، غز اور خلجی علاء الدین کو چھوڑ کر سنجر سے مل جاتے ہیں جس سے غوریوں میں بددلی پھیل جاتی ہے، تاہم وہ لڑتے ہیں اور شکست کھاتے ہیں، علاء الدین گرفتار ہو جاتا ہے۔ بقول نظامی عروضی یہ جنگ ۵۴۷ھ میں ہوئی تھی جس میں خود نظامی بھی شریک تھا۔

مجد الدین ابوالحسن عمرانی

سنجری دَور میں انوری کا سب سے عزیز ممدوح مجد الدین ابوالحسن

عراقی ہی۔ شاعر خلوص دل سے اس کا سپاس گزار معلوم ہوتا ہی، اس کا زمانہ معلوم نہیں، لیکن انوری نے ایک مقام پر اس قدر کہا ہی ؎

عدد سالہائے عمر شش باد
ص ۶۵۱
ہمچو تاریخ پانصد و چل داند

ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ابو الحسن کی جواں مردی اور فیاضی نے اس کے دل پر گہرا نقش بٹھایا ہی جب وہ اپنے عروج امارت پر تھا، انوری نے اس کی تعریف میں خوب خوب قصیدے لکھے جب وہ گرفتار ہو کر جیل میں بھیج دیا جاتا ہی، شاعر اُس کو نہیں بھولتا، بلکہ اپنے اشعار سے اُس کی تسلی کرتا ہی اور ڈھارس بندھاتا ہی۔ آخر ابو الحسن قتل کیا جاتا ہی، انوری اب بھی اس کے ساتھ وفادار رہتا ہی اور اس کے احسان اور خوبیاں اپنے ابیات میں بیان کرتا ہی۔ ابو الحسن کے قتل کے واقعے سے پندرہ سال بعد تک بھی اس کی یاد انوری کے صفحۂ دل سے محو نہیں ہوتی۔

ذیل میں ان نظموں سے بعض اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

(۱)
در احساں بگو کہ بکشاید
ص ۶۴۰
بو الحسن را چہ تختہ بند کنند

(۲) احتباس روزی خلق آسماں آغاز کرد — آدمی زاد از بقا یکبارگی مایوس شد
خلق را پیہ دعہ روزی عمر شاید بود نی — وجہ روزی از کجا چوں بو الحسن محبوس شد
اے جہاں را بود و بنیاد از طریق کرمت — چوں تو مستاصل شدی یکبارگی مندرس شد

قید خانے میں اس کی تسلی کے لیے یہ نظم بھیجتا ہی ؎

(۳) گر سپہر دور تو اے دریا دلی کاں دستگاہ — مدتے گرگاں شباں بودند و دزداں محتسب
داوراں دوراں کہ انصاف تو روے اندر کشید — فتنہا شد در شبیخوں قصد ہا شد در شغب

سایہ مفگن بر حدیثے انقلابے کاوفتاد — کان سناول حادثہ است از روے دورِ منقلب
کان و دریائی منہ در جبس دل بر اضطراب — زاں کہ کاں پیوستہ مجوست و دریا مضطرب

---

(۴)

ہیچ میدانی کہ در گیتی ز مرگ بوالحسن — چرخ جز قحط کرم دیگر چہ دارد فائدہ
اے دریغا آں کہ چوں یادش کند گوید جہاں — اے دریغا حاتم طائی و معن زائدہ
روزہ روزی در آمد خواجہ بے روزی مباش — بادمی کن ربنا انزل علینا مائدہ

---

(۵)

بس دور کہ چرخ و اختراں بگزارند — تا مرد وشے چو بوالحسن باز آرند
کو حیدر ہاشمی و کو حاتم طے — تا ماتم مردمی و مردی دارند

---

(۶)

تا حادثہ قصدِ آلِ عمراں کردہ است — کس نیست کہ او حدیثِ احساں کردہ است
احسان ز کسانِ بوالحسن بود مگر — کو ہمچو کسانش روئے پنہاں کردہ است

ان ہی ایام میں خواجہ مودود ابن احمد عصمی سے جو خاندان نظام الملک کا ایک رکن ہے، تعلقات ہو جاتے ہیں۔ متعدد قصائد خواجہ مودود کی مدح میں لکھے گئے ہیں لیکن خواجہ تھے بے فیض، انوری نے آخر کار جل کر لکھا ؎

مودود احمد عصمی عشوہ ایم داد — گفتم کہ او سرست و سر آخر ز تن بہ است
راغب شدم بخدمت او تا شدم چنانک — حالِ سگانِ بوالحسن از حال من بہ است

اب ہم اس دور میں آ جاتے ہیں جو تاریخ میں حادثۂ غز کے نام سے مشہور ہے۔ قبائل غز ترکمانوں سے علاقہ رکھتے تھے اور ختلان علاقۂ بلخ میں اُن کو مویشیوں کے لیے رمنے بتا دیے گئے تھے۔ وہ چوبیس ہزار بکریاں بطور خراج سالانہ سلطانی مطبخ میں دیا کرتے تھے لیکن خوان سالار سلطانی

کی زیادہ ستانی اور سخت گیری سے یہ لوگ تنگ آکر آمادہ جنگ ہو گئے، اور نذرانہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ امیر قماج والی بلخ نے آخر یہ معاملہ سلطان سنجر کے گوش گزار کیا۔ ان کی تنبیہ و تادیب کے لیے اجازت حاصل کی اور فوج کشی کر دی۔ اس مہم میں قماج اور اس کا فرزند علاء الدین مارے گئے اور فوج نے شکست کھائی۔ اب یہ مشورہ قرار پایا کہ سلطان بذات خود لشکر کشی کرے۔ غز سردار بہت بڑا تاوان دینے پر آمادہ تھے اور سنجر بھی قبول کرنا چاہتا تھا، لیکن امرائے دربار اس مصالحت کے بالکل خلاف تھے جن میں موید کا نام قابلِ ذکر ہے۔ بہر حال جنگ کی ٹھن گئی۔ اِدھر اہلِ لشکر جنگ کے خلاف تھے۔ انھوں نے کوئی تندہی نہیں دکھلائی، ادھر غز جان توڑ کر لڑے اور میدان ان ہی کے ہاتھ رہا۔ شاہی افواج کو شکست فاش ملی اور سلطان گرفتار ہو گیا[۱]۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مہم شروع ہی سے ایک غلطی تھی، اس ہزیمت اور اس کے خوفناک نتائج کا الزام شعرائے عہد اہلِ فوج کے سر تھوپتے ہیں، بلکہ اُن کو بے حمیتی، بزدلی اور جبن کا ملزم قرار دیتے ہیں، ان کی یہ رائے ہیں باور کر لینا چاہیے۔

حکیم کوشکی نے، جو اس عصر کا مشہور ہزال ہے، امرائے سنجری کے خلاف کئی نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں سے ایک یہاں نقل کی جاتی ہے ؎

ایا شمشیر زن ترکان پُر دل | بہ نسبت از فنی و تاتار و کاشاں
یکایک در خراساں پروریدہ | بہ ناز و نعمت و دولت تن آساں

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راحت الصدور صفحہ ۱۷۷ مرتبہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال طبع یورپ ۱۹۲۱ء۔

شمارا پادشاہِ ہفت کشور — رسانیدہ بسیری از نخاساں
بروز کودکی خفتہ کہ و مہ — بسے در پیش دکان رواساں
بہر شہرے زنامِ غز شنودن — شدہ چوں دیو از آہن ہراساں
فلک کفرانِ نعمتہائے سنجر — طلب کرد از شما ناحق شناساں
زہے درماندگانِ بے حمیت — زہے غز بندگانِ ناسپاساں
کسے خود زاد و بوم و ملکت اقطاع — چنین بیروں دہد از دست آساں
مُسلم بین کہ چوں بیروں کشیدند — بشمشیر از .... زن تاں خراساں

قاضی حمید الدین، صاحب مقاماتِ حمیدی نے ذیل کا قطعہ لکھا ؎

حکیم کوشنکی را بخواب دیدم دوش — زباں کشادہ بمدح مبارزانِ سپاہ
ز راہ طعنہ و طنز و تماخرہ می گفت — چہ گزاردہ ہر یک حقوق نعمت شاہ
فسوس زیرِ رکاب شما کمیت و سمند — دریغ بر بر و فرقِ شما قبا و کلاہ
زبیش کافرِ کفرانِ نعمت آوردہ — گریختید چو از پیش تو خیل گناہ
نہ دید گرد سپاہِ سیاہ پوشش ہنوز — کہ گشت صبح سپید شما چو شام سیاہ
زبس تعجب کفار جملہ می گفتند — زہے جماعتِ غز لا الٰہ الا اللہ

فتح کے بعد غزوں نے مرو کا رُخ کیا، یہ شہر اُن ایام میں عروس البلاد کا حکم رکھتا تھا اور داؤد چغری بیگ کے زمانے سے دار الملک رہا تھا۔ اِس کی دولت کی کوئی انتہا نہیں تھی، خزائن اور دفائن سے معمور تھا۔ غز تین روز تک شہر کو غارت کرتے رہے۔ اکثر باشندے گرفتار ہوئے اور طرح طرح کے شکنجوں میں ڈالے گئے تاکہ پوشیدہ خزانوں کا سراغ بتائیں، قتل و غارت اور خوں ریزی ایک وسیع پیمانے پر عمل میں آئی۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ انوری غالباً اِن ہی واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے ؎

بعلم تست کہ چندیں ہزار نفس نفیس | چہ زن چہ مرد چہ پیر و جواں چہ شاہ چہ دہ
باضطرار دریں ورطہ اوفتاد و نرست | بلے اگر چہ یکے را دریں نبود گناہ
زخون کشتہ چناں ست رود مرو ہنوز | کہ در گزار بمانند ماہیان بشناہ
بر شہاش زبس کشتہ بعد چندیں سال | عجب مدار کہ از خوں بود نمائے گیاہ

جب مرو کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تو غزوں نے نیشاپور کا رُخ کیا اب شاہی فوج کے نفر بھی ان کے شریک ہو گئے تھے۔ ابتدا میں شہریوں نے مدافعت کے لیے ہاتھ پانو مارے، لیکن غزوں کی کثرت سے بہت جلد مغلوب ہو گئے، جامع مسجد منیعی میں اکثر عورات، اطفال اور ذکور، جو بغرض پناہ، جمع ہوئے تھے، قتل کر دیے گئے، مسجد مطرز میں آگ لگا دی گئی اور اس کے شعلوں کی روشنی میں رات بھر شہر لٹتا رہا۔ شیخ محمد اکاف اور امام محمد بن یحییٰ جیسے پاک نفوس شکنجوں میں ڈالے گئے اور بیدردی سے ہلاک کیے گئے۔ خاقانی موخر الذکر کے مرثیہ میں کہتا ہے ؎

در دولت محمد مرسل نہ داشت کس | فاضل ترا ز محمد یحییٰ قبائے خاک
آں کرد روز تہلکہ دنداں فدائے سنگ | ویں کرد روز قتل دہاں را فدائے خاک

دیگر

گردوں سر محمد یحییٰ بباد داد | محنت نصیب سنجر مالک رقاب شد

دیگر

چرخ از سر محمد یحییٰ ردا ربود | دہر از سر سعادت سنجر کلاہ بُرد

خراسان کے اور امصار کے ساتھ بھی غزوں نے یہی سلوک روا رکھا صرف ہرات نے کامیابی کے ساتھ مدافعت کی، اور اس تباہی اور بربادی سے جس نے خراسان کو ایک دو نسلوں کے لیے بے چراغ کر دیا تھا،

ہراتیوں نے اپنی قوتِ بازو اور مردانہ جد و جہد سے رستگاری حاصل کی جہاں جہاں غزوں کا قدم گیا، اُن کے عقب میں قحط و وبا اور عالمگیر تباہی نے اپنا چہرہ دکھایا۔ غز ملک میں چاروں طرف پھیل چکے تھے اور اپنی تباہ کُن رسالت کے مقاصد انجام کو پہنچا چکے تھے۔ باشندے ان کے خوف سے جنگلوں، پہاڑوں اور کنوؤں میں چھپتے پھرتے تھے۔ سنجر کے جنرل اور کپتان جنھوں نے اس کے اقبال کے دَور میں بیسیوں میدان مارے تھے اور مشہور مہیں سر کی تھیں، ان غیر متمدن وحشیوں کے نام سے لرزتے تھے۔ خراسان میں جنگجو طبقے کی کمی نہیں تھی، لڑنے والے اور ملک کی حفاظت کرنے والے کافی تعداد میں میسر آ سکتے تھے، لیکن ان کو ترتیب دینے اور حیطہ انتظام میں لانے والا کوئی نہ تھا، مخلوق کی آنکھیں سنجر کو ڈھونڈھ رہی تھیں اور سنجر اُن میں موجود نہ تھا۔ اِن صورتِ حالات میں بعض وطن پرستوں نے خانِ سمرقند[1] کے نام ایک سفارت بھیجنا چاہی جس کے ذریعے سے وہ ملک کی حالتِ زار بیان کر کے خاقان سے امداد و استعانت اور مداخلت کے مستدعی ہوئے۔ خراسانی اس سفارت کے لیے یوں اور بھی آمادہ ہوئے کہ سال گزشتہ خاقان نے غزوں کے خلاف ایک مہم بھی سر کی تھی۔ یہ سفارت غالباً سنہ ۵۵۰ھ اور سنہ ۵۵۱ھ کے درمیان بھیجی جاتی ہی۔ خواجہ کمال الدین جو فضلائے عصر میں بے مثل عالم اور سنجر کے دربار میں بہت بڑا رتبہ رکھتے تھے، اس سفارت کے قائد اعظم تھے۔

یہ انوری تھا، جس نے سفارت نامہ کا مضمون نظم میں تیار کر کے دیا۔ خراسانیوں کا یہ فریاد نامہ ایک ایسی دستاویز ہی جو بلحاظ پاکیزگی جذبات، علوِ تخیل، اور صفائی زبان فارسی نظموں میں ایک بے مثل چیز ہی۔ اس میں عبرت، حسرت، تباہی اور مظلومی کے نقشے کو نہایت صحیح الفاظ میں کھینچا ہی،

[1] اس سے مُراد غالباً رکن الدین محمود خاں سوئم بن ارسلان سنہ ۵۲۶-۵۵۸ھ ہی جو سنجر کا محکوم تھا۔

واقعات کے بیان کرنے میں مبالغے سے کام نہیں لیا حقیقت و واقعیت کی لہر شروع سے آخر تک موج زن ہے۔ اگر انوری کا اور کلام ہم تک نہیں پہنچتا اور صرف یہی نظم اس کی یادگار رہتی تو تنہا اس نظم کے اعتبار پر اس کا شمار ایران کے بہترین شعرا میں کیا جا سکتا تھا۔ نظم کیا ہے، ایک سیلاب اشک ہے جو خراسان نے اپنے ایتام، شہدا، عصمت دریدہ عورات، سوختہ عمارات، غارت شدہ اماکن، بے چراغ بلاد، پامال شدہ حرمت، اور تلف شدہ دولت کے ماتم میں بہایا ہے۔

انوری کی پیغمبری کے ثبوت میں یہی معجزہ اکتفا کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک کو سرتاسر برباد ہوتا دیکھتا ہے، حب وطن اور عبرت کے جذبات اس کے قلب میں موجیں مارتے ہیں، درد اور حمیت اُس پر استیلا پاتے ہیں اور وہ اِن جذبات کو کامیابی کے ساتھ شعر کے پیکر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اس نظم میں شاعر نہ صنائع و بدائع کا منت کش ہے نہ لفظی دل فریبی اور آرایش عبارت کا ممنون احسان ہے، نہ استعارات کے اینچ پینچ ہیں نہ تشبیہات کی دھوم دھام ہے، سیدھے سادے جملوں میں ان خونیں واقعات کے بعض خط و خال بیان کر رہا ہے لیکن ہر جملہ درد میں ڈھلا ہوا ہے اور ہر فقرہ تاثیر کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔ تمہید کے اشعار ہیں ؎

بر سمرقند اگر بگزری اے بادِ سحر — نامۂ اہل خراساں ببرِ خاقاں بر

نامۂ مطلع آں رنجِ تن و آفت جاں — نامۂ مقطع آں دردِ دل و سوز جگر

نامۂ بر رقمش آہ عزیزاں پیدا — نامۂ در شکنش خون شہیداں مضمر

نقش تحریرش از سینۂ مظلوماں خشک — سطر عنوانش از دیدۂ محروماں تر

ریش گردد ممر صوت از و گاہ سماع — خوں شود مردمک دیدہ از و وقت نظر

تاکنون حالِ خراسان و رعایا بودہ است　　بر خداوندِ جہاں خاقاں پوشیدہ مگر

نے نبودہ است کہ پوشیدہ نباشد برِ وے　　ذرۂ نیک و بد نہ فلک و ہفت کشور

کارہا بستہ بود بے شک در وقت کنوں　　وقت آن ست کہ راند سوئے ایراں لشکر

خسرو عادلِ خاقانِ معظم کز جد　　پادشاہ ست جہاں دار ز ہفتاد پدر

دائمش فخر بدین ست کہ در پیش ملوک　　پسرش خواندے سلطان سلاطین سنجر

باز خواہد ز غزاں کینہ کہ واجب باشد　　خواستن کین پدر بر پسر خوب سیر

انوری کی شاعری کا ساغر مدح و قدح کی صاف و دود سے ہی لبریز نہیں ہی بلکہ اس کی سطح کے نیچے الم و درد و یاس کا عنصر بھی اپنا نشیمن بنائے ہوئے ہی، جو ضرورت کے وقت بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ سطح سے اُبھر کر فضائے بسیط میں طوفان یاس و حسرت بپا کرنے کی قابلیت رکھتا ہی۔ اِس کے کمال کے اِس پہلو کو، افسوس ہی ہمارے ہاں بالکل ہی فراموش کردیا گیا ہی۔

اب شاعر خاقان کو خطاب کر کے یوں عرض مطلب شروع کرتا ہی ؎

ای کیومرث بقا، بادشہِ کسریٰ عدل　　وی منوچہر لقا خسروِ افریدوں فر

قصۂ اہلِ خراساں بشنو از رہِ لطف　　چوں شنیدی، ز سرِ رحم در ایشاں بنگر

ایں دلِ افگار جگر سوختگاں می گویند　　کای دل و دولت و دیں را ز تو شادی و بطر

خبرت ہست کزیں زیر و زبر شوم غزاں　　نیست یک تن ز خراساں کہ نشد زیر و زبر

بر بزرگانِ زمانہ شدہ خرداں سالار　　بر کریمانِ جہاں گشتہ لئیماں مہتر

بر درِ دوناں احرار حزین و حیراں　　در کفِ رنداں ابرار اسیر و مضطر

شاد اِلّا بدرِ مرگ نہ بینی مردم　　بکر جز در شکمِ مام نیابی دختر

مسجد جامع ہر شہر ستوراں شاں را　　پایگاہی ست کہ نہ سقفش پیداست نہ در

خطبہ نکنند بہر خطہ بنام غز از آنک　　در خراساں نہ خطیب ست کنوں نے منبر

کشتہ فرزند گرامی را اگر ناگاہاں — بیند از بیم خروشید نیارد مادر
آں کرا صد رہ غز زر ستد و باز فروخت — دارد آں جنس کہ گوئیش خرید ست بز
بر مسلماناں زاں شکل کنند استخفاف — کہ مسلماں نہ کند صد یک ازاں با کافر
ہست در روم و خطا امن مسلماناں را — نیست یک ذرہ سلامت بمسلمانی در
خلق را زیں غم فریاد رس اے شاہ نژاد — ملک را زیں ستم آزاد کن اے پاک گہر

اگر یہی مقصد ہم عبارت میں ادا کرنا چاہیں تو غالباً اس کے بیسے ہیں زیادہ الفاظ کی ضرورت ہوگی اور اگر اسی قدر الفاظ سے کام لینا چاہیں تو شاید خوبی اور صفائی سے نہ ادا کر سکیں یہ اس قادر الکلام کا کمال ہی کہ نہ زیادہ الفاظ کو کام میں لایا، نہ حشویات کو داخل کیا اور اپنا مقصد خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر دیا، اور تاثیر بھی پیدا کر دی، جو دلوں کے گداز کرنے میں جادو کی خاصیت رکھتی ہی۔

شاعر عرض حال کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہی ؎

بخدائے کہ بیاراست بنامت دینار — بخدائے کہ بیفراخت بعزّت افسر
کہ کنی فارغ و آسودہ دل خلق خدائے — زیں فرومایہ غز شوم پی غارت گر
وقت آں ست کہ یابند ز رحمت پاداش — گاہ آں ست کہ گیرند ز تیغت کیفر
زن و فرزند و زر جملہ بیک حملہ چو پار — بردی، امسال رواں شاں بدگر حملہ بر
آخر ایراں کہ ازو بودے فردوس برشک — وقف خواہد بد تا حشر بریں شوم حشر
سوئے آں حضرت کز عدل تو گشتست چو خلد — خویشتن زیں جا کز ظلم غزاں شد چو سقر
ہر کہ پائے و خرے داشت بحیلت لفگند — چہ کند آں کہ نہ پایست مرادرا نہ خر
رحم کن رحم برآں قوم کہ نبود شب و روز — در مصیبت شاں جز نوحہ گری کار دگر
رحم کن رحم برآں قوم کہ جویند جوے — از پس آں کہ نخوردندے از ناز شکر

رحم کن رحم بر آنہا کہ نیابند بمند — از پس آں کہ از اطلس شاں بودے بستر
رحم کن رحم بر آں قوم کہ رسوا گشتند — از پس آں کہ بزیبائی بودند سمر
گرد آفاق چو اسکندر بر گرد از انک — توئی امروز جہاں را بدل اسکندر
از تو رزم اے شہ و از بخت موافق نصرت — از تو عزم اے ملک و از ملک العرش ظفر
ہمہ پوشند کفن چوں تو بپوشی خفتاں — ہمہ خواہند اماں چوں تو بخواہی مغفر
اے سرافراز جہاں بانی کز غایت فضل — حق سپردہ است بعدل تو جہاں را یکسر
بہرہ باید از عدل تو نیز ایراں را — گرچہ ویراں شدہ بیروں ز جہانش مشمر
تو چو خور روشنی و ہست خراساں اطلال — نہ بر اطلال بتابد چو بر آباداں خور
ہست ایراں بمثل شورہ و تو ابری و ابر — ہم بیفشاند بر شورہ چو بر باغ مطر
بر ضعیف و قوی امروز توئی داور حق — ہست واجب غم حق ضعفا بر داور

خواجہ کمال الدین کے ذکر میں گویا ہوئے

پیش سلطان جہاں سنجر کو پرورد ت — اے چنو پادشہ داد گر حق پرور
دیدہ خواجہ آفاق کمال الدین را — کہ نباشد بہ جہاں خواجہ از و کامل تر
نیک دانی کہ چہ و تا بہ کجا داشت برو — اعتماد آں شہ دیں پرور نیکو محضر
ہست ظاہر کہ برو ہرگز پوشیدہ نبود — ہیچ اسرار ممالک چہ ز خیر و چہ ز شر
روشن است آں کہ بر آں جملہ کہ خور گردوں را — بود ایران را سایش ہمہ عمر اندر خور
وندراں مملکت و سلطنت و آں دولت — چہ اثر بود از و ہم بسفر ہم بحضر
باکمال الدین ابنائے خراساں گفتند — قصہ ما بخداوند جہاں خاقاں بر
چوں کند پیش خداوند جہاں از سر سوز — عرضہ ایں قصہ رنج و غم و اندوہ و فکر
از کمال کرم و لطف تو زیبد شاہا — کز کمال الدین داری سخن ما باور
زو شنو حال خراسان و عراق اے شہ شرق — کہ مر او راست ہمہ حال چو الحمد از بر

یں نے اس نظم کے ذکر میں کسی قدر طوالت سے کام لیا ہے، صرف اس خیال کی بنا پر کہ ہمارے ہاں اب تک اسے قرار واقعی اہمیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ مولانا شبلی نے اُسے فراموش نہیں کیا ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اس سے بہتر توجہ کی مستحق ہے۔ یورپ میں اس کی وقعت ایک عرصۂ دراز سے معلوم ہے اور ایک سے زیادہ مستشرق نے اس کے ترجمے پر قلم اُٹھایا ہے۔

۵۵۱ھ میں قاضی حمیدالدین کی مشہور کتاب مقاماتِ حمیدی تصنیف ہوتی ہے، انوری قطعۂ ذیل اس کی تقریظ میں لکھتا ہے ؎

ہر سخن کاں نیست قرآں یا حدیثِ مصطفےٰ	از مقاماتِ حمیدالدین شد اکنوں ترہات
اشکِ اعمیٰ داں مقاماتِ حریری و بدیع	پیشِ آں دریاے مالا مال از آبِ حیات
شاد باش اے عنصرِ محمودیاں را روحِ نو	زاں کہ تو محمود عصری ما بتانِ سومنات
از مقاماتِ تو گر فصلے بخوانم بر عدو	حالے از نا منطقی جذرِ اصم یابد نجات
عقلِ کل خطے تامل کرد از دو گفت ای عجب	علمِ اکسیرِ سخن داند مگر اقضی القضات
دیر ماں اے قدر رایت عالم تایید را	آفتابے بے زوال و آسمانے بے ثبات

اِس کے دوسرے سال قاضی صاحب انوری کے نام ایک قطعہ بھیجتے ہیں۔ شاعر جواب میں قطعہ لکھتا ہے۔ میں پہلے شعر پر قناعت کرتا ہوں ؎

قطعۂ صدرِ اجل قاضی قضاتِ شرق و غرب

آں کہ بر عالم نفاذِ او قضاے دیگر است ص ۶۲۱

اِنہی ایام میں غزوں کے سردار ملک طوطی سے شاعر تعلق قائم کر لیتا ہے لیکن یہ تعلق نہ اصلی ہے اور نہ دیرپا۔

خراسان کا سیاسی مطلع فتنہ آشوب اور انقلاب کے گہرے بادلوں سے گھرا ہُوا تھا وہاں کسی چیز کو قیام نہیں تھا، جیسا کہ مشرقی ممالک کا دستور ہے۔

غز بھی جانے کے لیے ہی آئے تھے، وہ ایک طوفان بے تمیزی کی طرح اُٹھے خراسان، عراق، کرمان اور غزنہ پر چھا گئے اور کچھ عرصے کے بعد ہنڈیا کے ابال کی طرح بیٹھ گئے۔ لیکن اس سے قبل وہ عام بربادی اور عالم گیر تباہی کے کام کو خاطر خواہ تکمیل تک پہنچا چکے تھے۔ اب سنجر غزوں کی قید سے آزاد ہو کر وفات بھی پا چکا ہے، اور انوری شہر بلخ میں مستقل سکونت اختیار کر چکا ہے۔ ان ایام میں طغرل تگین بلخ کا حکمراں ہے اور آزاد حاکم معلوم ہوتا ہے۔

انوری کے کلیات میں دو تین قصیدے اور چند قطعات اس کی مدح میں ملتے ہیں، لیکن کوئی قابلِ ذکر تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ طغرل تگین کے دور میں انوری کی زندگی کا وہ ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے جسے ہجوِ بلخ کے نام سے پکارا جاتا ہے، اور جو کسی قدر تفصیل کے ساتھ دوسرے مقام پر بیان ہو چکا ہے۔ میں یہاں چند الفاظ انوری کے سوگند نامے کی بابت کہنا مناسب سمجھتا ہوں۔ یوں تو اس کی اکثر نظمیں چیدہ، منتخب اور لطیف ہیں لیکن یہ نظم اُس کی چوٹی کی نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ سوگند نامہ انوری کی اعجاز نگاری کی مثال میں بلا خوفِ تردید پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس نظم میں اس کی شاعری اپنے بہترین معیار اور انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے۔ موقع نہایت نازک تھا، دشمن اپنا کام کر چکے تھے اور ہجو کا الزام اس کے سر منڈھ دیا گیا تھا اور غضب یہ ہوا تھا کہ بلخیوں کے جذبات اس کے برخلاف مشتعل ہو چکے تھے، غوغائی اس کے گھر پر چڑھ آئے۔ اس کی بے حرمتی کا جوش ابھی فرو نہیں ہوا تھا، بالکل ممکن تھا کہ اور دست اندازی کی جاتی اور عزت کے ساتھ جان پر بھی حملہ ہوتا۔ انوری خود بے جا تہمت، پرتشنیع بے حرمتی کے رنج اور جان کے خوف جیسے مختلف جذبات کے اثرات سے مغلوب

ہو چکا تھا۔ آخر اس نظم کی شکل میں وہ اپنی بے گناہی کی آواز بلند کرتا ہے اس کے طاقتور قلم کی گونج دُور دُور سُنائی دیتی ہے۔ اور عوام کا جوش مخالفت ایک برف کے تودے کی طرح، جو تابشِ آفتاب کے سامنے پگھل کر اور پانی ہوکر بہہ جاتا ہے، فرو ہو جاتا ہے۔

اِس نظر سے دیکھتے ہوئے سوگند نامہ انوری کا اعجاز ہے۔ زرا اسس کی تمہید ملاحظہ ہو ؎

اے مسلماناں! فغاں زیں دورِ چرخِ چنبری!! — وز نفاق تیر و قصد ماہ و کید مشتری

کارِ آبِ نافع اندر مشربِ من آتش ست — شغل خاکِ ساکن اندر مسکنِ من صرصری

آسماں در کشتی عمرم کند دائم دو کار — گاہِ شادی بادبانی، وقت اندہ لنگری

گر بخندم، واں بہر عمر لیست، گوید "زہر خند" — در بگریم، کاں بہر روز یست، گوید "خوں گری"

بر سر من مغفری کردے کلہ واں بر گذشت — بگذرد بر طیلسانم نیستر دور معجری

روزگارا! گر ز عنقائی نیاموزی ثبات!! — چوں زغن تا چند سالے مادہ و سالے نری!!

از ستمہائے فلک چنداں کہ گوئی گنج ہست — دانستم زیرا کہ با من ہم بدیں گنبد دری

گوئیا تا آسماں را رسم دوراں آمدہ ست — دادہ اندے فتنہ را قطبی بلا را محوری

گر بگرداند بہ پہلو ہفت کشور مر ترا — یک دم از مہرت نہ گوید کز کدامیں کشوری

بعد ما کاندر لکد کوبِ حوادث چند سال — بخت شورم چنبری کردہ است و دورش خنجری

خیرہ خیرم کرد صاحب تہمت اندر ہجو بلخ — تا ہمی گویند کافر نعمت آمد انوری

قبۃ الاسلام را ہجو اے مسلماناں کہ گفت؟ — حاش للہ باللہ ار گوید جہود خیبری

آسماں ار طفل بودے بلخ کردے دایگیش — مکہ داند کرد معمورِ جہاں را مادری

ہجو کی افترا کے خلاف گویا ہے ؎

با چنیں سکاں کہ گر از قدر شاں عقدے کشند — فارغ آید چرخِ اعظم از چہ از بے زیوری

ہجو گویم بلخ را ہیہات یارب زینہار   خود تواں گفتن کہ زنگارست زرِ جعفری
باﷲ ار با من تواں بستن بمسمارِ قضا   جنس ایں بد سیرتی یا مثل ایں بدگوہری
خاتمِ حجت در انگشت سلیمانِ سخن   افترا کردن برو، درگیرد از دیو و پری
بازداں آخر کلامِ من ز مُنحولِ حسود   فرق کن نقشِ الٰہی را ز نقشِ آزری
مرد را چوں ممتلی شد از حسد کار افتراست   معدہائے بدمزاجاں را قے افتد ز پری
عیشِ من زیں افترا تلخی گرفت و تو ہنوز   چہرہ بگشا دہ بجناں چوں جانِ شیریں میخوری
آں نمی گویم کہ در سطےؔ زباں آوردہ ام   آں ہجا گر نزدِ من یابی بود از کافری
گر بخاطر بگزرانیدستم اندر عمرِ خویش   یا نیم چونانکہ گرگِ یوسف از تہمت بری
جاوداں بیزارم از ذاتے کہ بیزاری او   ہست در بازار دیں صرافِ جاں را بےزری
آں توانائے و دانائے کہ در اطوارِ غیب   دامِ بدبختی نہاد و دانۂ نیک اختری

اس طاقتور تردید کے سامنے دشمنوں کا افترا کب تک سرسبز رہتا آخر "نقشِ الٰہی" "نقشِ آذری" پر ظفریاب ہوا۔ اِس کے ترکش کے آخری تیر (جن میں چند، دشمنوں کے اوپر بھی برسائے گئے ہیں) ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں ؎

چوں مرا در بلخ ہم از اصطناعِ اہلِ بلخ   دقِ مصری چادری کہ دستِ رومی بستری
بر سرِ ملکِ چناں فارغ نہ باشد کس چو من   حبذا ملکے کہ باشد افسرش بے افسری
دے ز خاکِ خاوراں چوں ذرہ مجہول آمدہ   گشتہ امروز اندرو چوں آفتابِ خاوری
با چنیہا آں چناہا زاید از خاطر مرا   اے عجب کز آب خشکی زاید از آتش تری
ایں ہمہ بگزار آخر عاقلم در نفسِ خویش   کادمی را ہست عقل از ممکنات اکبری
پس چگونہ ہجو گویم خطہ را کز درش   گر در آید دیو بنہد از برون منکبری
تا تو فرصت جوئے گردی و زکمیں گاہ حسد   غصۂ دہ سالہ را با من بصحرا آوری

ہیچ عاقل ایں کند جز آں کہ یک سو افگند   اصل نیکو اعتقادی، رسم نیکو محضری
دشمناں را مایۂ ادنیٰ نزد من دانی کہ چیست؟   جمع کردن موش دشتی با پلنگ بربری
مستقیم احوال شو تا خصم سرگرداں شود   بس کہ پرکاری کند او چوں تو گردی مسطری
ایں دقائق من چناں دونم کہ از بے فرصتی   سکتہ گیرد این و آں بر بو فراس و بحتری
از عقاب و پوستینش گر نہ گوید بہ بود   گر ہمہ در دریا تواند کرد خربط گازری
چند رنجی کز قبولم تازہ شاخے می دمد   ہر کجا پنداری اے مسکیں کہ بیخے می بری
رو کہ از یاجوج بہتاں رخنہ ہرگز کے فتد   خاصہ در سدے کہ تائیدش کند اسکندری

اس واقعہ کے بعد انوری کچھ عرصے کے لیے بلخ چھوڑ دیتا ہی، اور بغداد پہنچ کر قطب الدین مودود بن زنگی (سنہ ۵۴۴ھ و سنہ ۵۶۴ھ) کے دربار میں رسائی حاصل کر لیتا ہی۔ اس موقعے پر شاعر نے کوئی مستقل تصنیف بھی مودود کے نام پر معنون کی ہی[1]

بریں نوید رسیدم دریں دیار ز من   بگوشش حضرت شاہ جہاں رسید خبر
مرا بحضرت عالی تقربے فرمود   برائے شاہ بپرداختستم یکے دفتر
ہزار فصل درو لفظہا ہمہ دل کش   ہزار عقد درو نکتہا ہمہ دلبر

یہاں وہ علمی مشاغل اور تصنیفات میں اپنی زندگی بسر کرنے کا ارادہ رکھتا ہی

بداں امید کہ شاہ جہاں شرف دہدم   شوم بدولت او نیک بخت و نیک اختر
بہر دو ماہ بسازم ز علم تصنیفے   برائے دولت منصور خسرو صفدر

---

[1] انوری کا بغداد پہنچ کر مودود بن زنگی کی مدح میں قصیدہ لکھنا اور پھر فوراً بعد واپس چلا آنا بظاہر نہایت عجیب معلوم ہوتا ہی۔ لیکن یہ قصیدہ انوری کے ایک قدیم کلیات (نوشتہ سنہ ۸۴۲ھ) میں بھی جو راقم کی ملک ہی موجود ہی۔

بریں مثال بود تازہ یاد تا عقبے　　　بریں نہاد بود زندہ نام تا محشر

بماند نام سکندر ہزار و ہفصد سال　　　مصنّفات ارسطو بنام اسکندر

مودود جو علمی فتوحات کی بجائے جوع الارض اور فتح البلاد کی تجاویز میں زیادہ منہمک تھا، انوری کے مقاصد کے ساتھ کوئی دل چسپی کا اظہار نہیں کرتا، اس لیے شاعر، شکستہ دل ہوکر اور اجازت لے کر بغداد کو خیرباد کہتا ہے۔

ولیک شاہ بفتح بلاد مشغول ست　　　نمی کند بہ پرستندگانِ خویش نظر

بمہر گفت کہ چوں نیستت بکام جہاں　　　دریں ہوس منشیں روزگار خویش مبر

بہ یک قصیدہ عنترا بخواہ دستوری　　　زبارگاہ خداوند تاج و زینت و فر

دیگر

خدایگانا امید داشت بندہ ہمی　　　کہ در ثنائے تو بر سروراں شود سرور

بہ بارگاہ تو ہر روز بیشش تر آید　　　کنوں برسم رہن تاب می شود بیستر

ز دخل نیست منالے و خرج او بے حد　　　ز نفع نیست نشانے و دوام او بے مر

اگر چناں کہ دہد شہریار دستوری　　　غلام وار دہد بوسہ آستانۂ در

بسوئے خانہ گراید زباں بشکر و ثنا　　　بیادِ ملک خداوند کردہ دائم تر

بغداد چھوڑنے کے بعد معلوم نہیں ہوتا کہ شاعر کہاں کہاں گیا اور کیا کرتا رہا، مگر کچھ مدت بعد واپس بلخ آجاتا ہے۔

عمادُ الدّین پیروزشاہ احمد

اب عماد الدین پیروزشاہ، خراسان کے افق پر ایک نئے ستارے کی کی طرح طلوع کرتا ہے، اور بلخ کے دروازے پر بحیثیت فاتح نمودار ہوتا ہے۔ وہ شہر کی غارت کا حکم دے چکا ہے، ابھی اس کی تعمیل میں کچھ وقفہ ہے کہ بلخیوں

کے مجمع سے جو نئے فاتح کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے ہیں، اوحدالدین آگے بڑھتا ہی اور بلخیوں کی حمایت میں قطعۂ ذیل سُناتا ہی ؎

اے تراگشتہ میسّر حشم دیو و پری ۔۔۔ کوشش تا آبِ سلیمانِ پیمبر ببری
زاں کہ در نسبت ملک تو کہ باقی بادا ۔۔۔ ہست امروز ہماں نوبت عدلِ عمری
توئی آں سایۂ یزداں کہ شب چتر تو کرد ۔۔۔ ایں کہ در سایۂ او، روزِ ستم شد سپری
نامۂ فتح تو سیّارہ بہ آفاق برد ۔۔۔ کہ بشارت گر فتح تو نشاید بشری
تو کہ صد سدِّ سکندر کنی از گرد سپاہ ۔۔۔ خویشتن را سزد ار صد چو سکندر شمری
رائے اعلاے ترا کشف شود حالت بلخ ۔۔۔ کہ بر حمت سوئے آباد و خرابش نگری
در زوایاش ہمہ طائفۂ منقطع اند ۔۔۔ ہمہ از خانہ برون و ہمہ از دانہ بری
تو سلیمانی و ایں طائفہ موران ضعیف ۔۔۔ بودہ خواہانِ تو عمرے بدعائے سحری
ظاہر و باطن ایشاں ہمہ پائے ملخ است ۔۔۔ چہ شود گز سر پائے ملخے در گزری

وہی انوری جس کی تذلیل میں چند سال پیشتر بلخیوں نے کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا، آج ان کے حق میں فرشتۂ رحمت بن کر نئے فاتح کے سامنے رحم و معافی کی درخواست کر رہا ہی. یہ واقعہ اس کی جبلی شرافت اور اخلاقی جرات کی ایک روشن مثال ہی۔ کیا ہم ایسے عالی ظرف اور بلند حوصلہ انسان کو "دنی الطبع" "تنگ ظرف"، اور "کم حوصلہ" کہنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں۔

بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر پیروز شاہ بلخ کا قبضہ ترک کرکے یکایک روانہ ہو جاتا ہی، انوری اس کی روانگی پر اپنا دلی تاسف ظاہر کرتا ہی۔ چنانچہ ؎

تو می روی و زمین و زماں ہمی گویند
زہے ز عدل تو خلق خدائے آسودہ

کچھ عرصے کے بعد وہ دوبارہ وارد ہوتا ہی اور شاعر اس کے خیر مقدم

میں ذیل کا قطعہ لکھتا ہے ؎

احمد مرسل زخاک مکّہ چوں ہجرت گزید — مدّتے آں خطہ بود انگشت نومیدی گزاں
باز چوں باز آمد از اقبال میموں سوکبش — تازہ شد چوں در سحرگاہاں گل از بادوزاں
بلخ را پیروزشہ احمد ہماں ہجرت نمود — تا فرد بارید از ہم ہمچو برگ اندر خزاں
باز چوں در ظلّ عالی رائیش آرام یافت — زندہ شد بار دگر چوں از صبا شاخ رزاں
شکر یزداں را کہ شد آباد و خرم تا حشر — قبّۂ اسلام ازین و کعبۂ اسلام ازاں

پیروزشاہ کا زمانہ ۵۵۱ تا ۵۶۰ھ سے تصوّر کرنا چاہیے۔ یہی پادشاہ انوری کا حقیقی ممدوح ہے اور اس میں شک نہیں کہ سنجر کے مقابلے میں اس کا دعویٰ نہایت زبردست ہے۔ شاعر نے بعض زبردست قصائد اسی پیروزشاہ کی تعریف میں لکھے ہیں۔ قصائد کی تعداد بھی کافی ہے اور ان کی زبان سے پایا جاتا ہے کہ شاعر کو اپنے ممدوح سے دلی اُنس ہے۔ انوری کی اصلی قدردانی بھی اسی دربار میں ہوئی۔ اس کے وزیر جلال الوزرا کی مدح میں بھی متعدد قصائد ملتے ہیں۔

مجدالدین ابوطالب نعمہ، انوری کا (قیام بلخ کے زمانے میں) ایک اور ممدوح ہے اس کے تعریفی قصائد بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ اور شاعر اس کا ممنون بھی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ کلیات غوریوں کے ساتھ انوری کے مراسم پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا نہ یہ ظاہر ہوتا کہ یہ مراسم کس زمانے میں قائم ہوئے، مگر نہ تو وہ دیرپا ہیں اور نہ گہرے۔

قرن ششم کے ساتویں عشرے میں ملوک غور غزوں کی طاقت کو برباد کر کے خراسان کے بعض حصوں پر قابض ہو جاتے ہیں، بعض رباعیوں میں ان کی طرف اشارے ملتے ہیں، امیر الجبال کے نام ایک قطعہ بھی ہے ایک پورا قصیدہ شہاب الدین اور حسن مودود کی تعریف میں ملتا ہے۔ یہ شہاب الدین اگرچہ مشہور شہاب الدین غوری

فاتح ہندستان نہیں ہی۔ اس قصیدے کا مطلع ہی ؎

عرصۂ مملکتِ غور چہ نا محدود ست

کہ دراں عرصہ چناں لشکر نامعدود ست

اِس قصیدے میں غوریوں کے نسب کے سلسلے میں ایک عجیب بیان ملتا ہی، جو تاریخی روایات کے بالکل منافی ہی۔ سلاطین غور کا نسب بروئے تاریخ ضحاک تازی سے ملتا ہی، اور طبقات ناصری میں یہ روایت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہی۔ لیکن انوری اُن کا سلسلۂ نسب حضرت داؤد پیغمبر علیہ السلام سے ملاتا ہی۔

غور کے ذکر میں وہ کہتا ہی ؎

رونقِ ملکِ سلیمان پیمبر دارد   عرقِ سُلطاں چہ عجب کز نسبِ داؤد ست

کلیات میں ایسے قصائد، جو مختلف سلاطین وصدور و امرا وعلما وغیرہم کے نام ایک ایک دو دو مرتبہ لکھے گئے ہیں بے شمار ہیں، ذیل میں صرف ان لوگوں کے اسما کی فہرست دے دی جاتی ہی:۔

(۱) سنجر اعلیٰ جلال الدین والدنیا   (۲) صفوۃ الدین مریم
(۳) کریمتہ النسا رضیتہ الدین۔   (۴) عصمت الدین
(۵) تاج الملوک بادشاہ   (۶) ملک یوسف
(۷) عز الدین   (۸) عضد الدین وناصر الملک
(۹) ملک شاہ معظم بن طغانشاہ   (۱۰) زین الدین عبد اللہ
(۱۱) عماد الملک جلال الدین ابو الفضل   (۱۲) علاء الدین محمدؐ
(۱۳) صاحب عادل عمر صدر دنیا   (۱۴) علاءُ الدولہ علاء الدین ابو علی حسن (خانوادہ نظام)
(۱۵) کمال الدین خال محمود صدری

(۱۶) کمال الدین ابی سعد مسعود
(۱۷) عزیز الدین طغرائی
(۱۸) ضیار الدین منصور
(۱۹) شرف الامرا اوحد الدین اسحٰق
(۲۰) پیروز شاہ بن طغان تگین
(۲۱) وزیر محمود
(۲۲) بہار الاسلام فخر الدین محمدؐ
(۲۳) تاج الدین ابراہیم
(۲۴) محمدؐ بن ابراہیم سری
(۲۵) فخر الدین ابو المفاخر
(۲۶) صدرِ جہاں علاء الدین محمود
(۲۷) شمس الدین اغلبک پہلوان لشکر
(۲۸) علاء الدین امیر اسحاق
(۲۹) فرزندان میسر داد
(۳۰) مودود شاہ ناصر الدین موید
(۳۱) کمال الدین محمدؐ (وزیر)
(۳۲) بہار الدین علی
(۳۳) شمس الدین بہروز
(۳۴) حسام الدین حسین
(۳۵) قوام الدین
(۳۶) فخر الزماں اسحاق
(۳۷) جمال اشراف
(۳۸) خواجۂ منصور عامر
(۳۹) خواجہ فخری (شاعر)
(۴۰) خواجہ اسفندیار
(۴۱) کمال الدین مسعود
(۴۲) اجل جمال الدین
(۴۳) تاج عمزاد
(۴۴) صفی موفق سبعی
(۴۵) الغ جاندار بک اینانج سنقر
(۴۶) مجد الدین عالی ابو المعالی ابن احمد
(۴۷) صدر الوزرا موید الملک
(۴۸) نصیر الملک محمدؐ بن عمر
(۴۹) مجد الدین علی ابن عمر
(۵۰) بدر الدین سنقر
(۵۱) موید الملک نظام الدین محمدؐ
(۵۲) نصیر الدین محمود وزیر
(۵۳) ابو المناقب ظہیر الدین ناصر
(۵۴) رضی الدین ابو رضا
(۵۵) فخر الدین اینانج خاصبک
(۵۶) ناصر الدین قتلغ شاہ
(۵۷) عماد الدین ملک شاہ معظم

(۵۸) ابوالمحاسن نصر بن نصر (۵۹) سراجی (ترمذی) شاعر
(۶۰) ارشد الدین (شاعر) (۶۱) خواجہ کمال الدین (شاعر)
(۶۲) شجاعی (شاعر) (۶۳) تاج الافاضل فخر الدین خالد بن ربیع المالکی (شاعر)
(۶۴) ملک طوطی (۶۵) کمال الزماں، مغنی سلطان سنجر (۶۶) فرید الدین کاتب۔

کلیات اس کے واقعاتِ زندگی پر کچھ روشنی نہیں ڈالتا، اتفاقیہ چند باتوں کا ذکر آگیا ہو وہ یہ ہیں کہ ایک مرتبہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا، ایک قصیدے میں جو کسی وزیر کے نام ہو، کہتا ہو ؎

تا دست شکستہ پائے جہدم — در جستن ناگزیر لنگ ست
دریاب مرا و زود دریاب — کیں دست شکستہ نیک تنگ ست (۲۰۲)

ایک مرتبہ بیماری رشتہ میں مبتلا ہوا تھا ؎

بدستِ حادثہ بندے نہاد بر پایم — کہ ہمچو حادثہ گاہے نہاں وگہ پیداست
سبک بصورتِ خوباں گراں بقوتِ طبع — کہ پشتِ طاقتم از بار او ہمیشہ دو تاست
نظر بحیلہ از اعضا جدا نمی کندش — کراست بند بر اعضا کہ آہنم از اعضاست
عصاست پایم و در وضع آفرینش خلق — شنیدۂ کہ کسے را بجائے پائے عصاست (۵۳)

دردِ نقرس کی تکلیف بھی اس کو ہو جایا کرتی تھی ؎

بزرگوارا دانی کز آفتِ نقرس — زہر چہ ترشی من بندہ می بپرہیزم (۴۵۲)

سفر میں ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ انوری اور اُس کے ہمراہیوں کو جو تعداد میں تیرہ تھے، جن میں تین شاعر، چھ خیاط اور چار منشی تھے، دو سواروں نے آکر گھیر لیا، اور بہت پریشان کیا ؎

من و سہ شاعر و شش درزی و چہار دبیر — اسیر و خوار بماندیم در کفِ دو سوار

دبیر و درزی و شاعر چگونہ جنگ کنند   اگرچہ چار دہ باشند در چہار ہزار ؎

ہمیں اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ وہ قزاق تھے، اور جب تک کہ انھوں نے اس جماعت کو اچھی طرح نہ لوٹ لیا ہوگا، نہ چھوڑا ہوگا۔

وہ ایک بڑے کنبے والا آدمی تھا، جس کے افراد کی تعداد پچاس کے قریب تھی سہ

بپذیرش کہ بندۂ تو سزد   او د پیوستگان او پنجاہ (۳۵۶ھ)

مصارف زیادہ تھے اور خود بھی اسراف کی حد تک فیاض تھا اِس لیے قرضے کی مصیبت میں گرفتار رہتا تھا۔

وہ طبیعت کا شریف، حوصلے کا بلند اور خوش اخلاق تھا، لیکن بلند نظری اور بے پروائی اس کے خصائل کا امتیازی جوہر ہے صاف گوئی اس کی ایک اور خصوصیت ہی۔

خطرے اور مصیبت کے وقت وہ زیادہ دلیر اور جری تھا، خطرہ جس قدر زیادہ ہوتا اس کی ہمت اتنی ہی زیادہ بلند اور حوصلہ مضبوط ہو جاتا، دوسروں کی آفت میں سینہ سپر ہونے سے دریغ نہیں کرتا اور عام طور پر بے خوف اور نڈر تھا۔

وہ قدرتاً خوش طبع، بذلہ سنج اور ظریف تھا، ایسا شخص ہمیشہ کثیر الاحباب اور ہر دل عزیز ہوتا ہی، اِسی لیے اس کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس کی صاف گوئی کی عادت نے بہتوں کو اس کا دشمن بھی بنا دیا تھا لیکن دشمنی کے اظہار میں وہ پہل نہیں کیا کرتا تھا، اِسی طرح ہجو میں بھی ابتدا نہیں کرتا بلکہ پہلے حریف کو جتا دیتا کہ اپنا رویّہ دُرست کرے ورنہ ہجو سے تواضع کی جائے گی اس کے ساتھ ہی وہ رحم دل اور بُردبار تھا، اور دشمنوں تک کو معاف

کر دیتا تھا۔

غرور جو تلامیذ الرحمان کا طغرائے امتیاز ہی، انوری میں بہت کم پایا جاتا ہی، تفاخر اس کا شیوہ نہیں۔

اگرچہ اس کی عمر دباروں میں اور قصیدہ خوانی میں گزری، جہاں خوشامد کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا، تاہم خوشامد سے اس کو دلی نفرت ہی، انسان، انسان، سب اس کی نظر میں مساوی ہیں اور اپنے جیسے انسان کی منت پذیری اس کے نزدیک بدترین فعل ہی۔

شراب وہ پیتا تھا، اُسے خود اقرار ہی۔ کلیات میں بیسیوں قطعات موجود ہیں جو صرف دوستوں سے شراب منگوانے کی خاطر لکھے گئے ہیں۔

شعرا میں وہ ابو الفرج کا زیادہ مداح ہی اور اسی کی تقلید بھی کرتا ہی۔ اور معاصرین میں عمعق، ادیب، صابر، اور معزی کا ذکر احترام سے کرتا ہی۔ باوجودیکہ خود مُسلّم الثبوت اُستادِ فن بلکہ پیغمبر فن ہی، لیکن شعر گوئی اس کے نزدیک ایک ذلیل اور قابل نفرت پیشہ ہی۔ شاعر اور حلال خور اس کی رائے میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں، نہیں بلکہ شاعر حلال خور سے بھی زیادہ کثیف ہی۔

علوم کا دل سے شیدائی ہی اور حکمت پر تو جان قربان کرتا ہی۔ قسمت کی بوالعجبی دیکھیے کہ بو علی سینا کا متعلم رودکی کا جانشین بنا دیا جاتا ہی۔ لیکن قلبی رجحان کا کیا کرتا، وہ قدم قدم پر نمایاں ہی، زرق برق درباروں اور گرم نشاط محفلوں میں یکایک وہ ایک آہ سرد کھینچتا ہی۔ ارسطو اور بو علی اُس کو یاد آتے ہیں اور دل پکڑ کر رہ جاتا ہی۔

انوری اگرچہ کنشت میں دیرنشینوں کا سرتاج ہی، لیکن کعبے کی محبت اس کے دل سے نہیں گئی، شاعری میں اس عزت کے باوجود وہ فردوسی سے مرتد ہی

اور بو علی کا کلمہ پڑھتا ہی، وہ شاہنامے کو رد کرتا ہی اور شفا کے آگے سر خم کرتا ہی، کہتا ہی ؎

در کمال بو علی نقصان فردوسی مگیر — ہر کجا آمد شفا شہنامہ گو ہرگز مباش

بو علی کے لیے یہ احترام اس کو سنائی کے خلاف اعتراض کرنے کی ترغیب دیتا ہی۔ حکیم سنائی نے ایک مقام پر لکھا تھا ؎

کہ یارب مر سنائی را سنائے دہ تو در حکمت — چناں کز وے برشک آید روان بو علی سینا

انوری نے جواب میں کہا ؎

سنائی گرچہ از وجہ مناجاتے ہمی گوید — بشعر اندر ز حرص آں کہ یابد دیدۂ بینا

ولیکن از طریق آرزو بگفتن خرد داند — کہ با بخت زمرد بس نیاید کوشش مینا

برو جانے مکن تن در مشیت دہ کہ دیر افتد — زیاجوج تمنا رخنہ در سد ولوشینا

اہل تصوف کو وہ پسند نہیں کرتا، اس دلیل کی بنا پر میں خیال کرتا ہوں کہ مصرع مشہور ع

چوں سنائی ہستم آخر گر نہ ہمچوں صابرم

میں انوری نے اپنے آپ کو حکیم سنائی کا مثیل نہیں کہا ہی بلکہ حکیم سمائی کا۔ ایک قلمی نسخہ نوشتہ ۵۴۲ھ میں یہی مصرع یوں درج ہی ع

از سمائی بیشم آخر گرچہ کم از صابرم

بقول محمد عوفی، سمائی کا پورا نام "الحکیم محمود ابن علی السمائی المروزی" ہی، اور طلحہ مروزی نے اس کا مرثیہ لکھا ہی۔

اس کی شاعری پر مخالف معاصرین نے کفر نگاری کا الزام لگایا ہی، فتوحی مروزی کہتا ہی ؎

گدیہ و کفر در اشعار شعارست ترا — کفر در مدحی و در گدیہ ہمہ کفرانی

صنعتِ کفر بشعر از تو در افزود چنانک   بق بق از فاضلی و طنطنه از خاقانی

قاضی نور اللہ شوستری شیعہ شعرا کی فہرست میں اس کا شمار کرتے ہیں لیکن کلیات میں کافی سے زیادہ شہادت موجود ہو کہ وہ مذہب سنت و الجماعت کا ایک رُکن تھا، اور غالباً شافعی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مسئلۂ جبر و قدر میں وہ اشاعرہ کا ہم زبان ہو، رویتِ باری کا وہ قائل ہو، "عدل عمرؓ" قدم قدم پر اس کے قصائد میں پایا جاتا ہو۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ در خلافتِ بوبکرؓ دم زنم بہ خلاف   نہ در امامتِ فاروقؓ در مجال و نطق

نہ در نشستن عثمانؓ چو رافضی بدگو   نہ در شجاعتِ حیدرؓ چو خارجی احمق

سر خوارج خواہم شگافتہ چو انار   دلِ روافض خواہم کفیدہ چوں جوزق

ان اشعار پر بھی لحاظ کیا جائے ؎

بسرِ مصطفیٰ شریف قریش   کہ ز جمع رسل عزیز تر ست

بوفا و صفائے صدقِ عتیق   کہ دل و جاں فروش و شرع خر ست

بدلیری و ہیبت عمری   کہ ظہور شریعت از عمر ست

بحیا و حیات ذو النورین   کہ حقیقت مولف سور ست

بکفِ ذو الفقار مرتضوی   کہ بحرب اندروں چو شیر نر ست

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واسطے کہتا ہو ؎

دین بعمرؓ شد قوی گرچہ پس از عہدِ او   باقی ناموسِ کفر خنجر حیدر شکست

معرکۂ مکر دیو ظلِ عمرؓ بشکند   چرخ کہ نظارہ بود دید کہ منکر شکست

ناظرین کو وہ قصہ یاد ہوگا جس میں عنصری، عسجدی، فرخی اور فردوسی ایک ایک مصرع بہم پہنچا کر رباعی تیار کرتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک قصہ انوری، رشید الدین وطواط، ادیب صابر، اور خود سلطان سنجر کی بابت ایک غیر مطبوعہ

تاریخ خلاصۃ التواریخ(؟) میں میری نظر سے گزرا ہی۔ موقع یہ ہی کہ عید کا چاند جس کا بیتابی سے انتظار کیا جا رہا تھا نظر آچکا ہی، ہلال کو دیکھ کر انوری کہتا ہی

ع ایں نیم قدح کہ در لب ایں طاس ست

رشیدی کہتا ہی ع گوئی کہ بدست پارۂ الماس ست

ادیب صابر کہتا ہی ع شکلِ مہ نو راست چو کج کارد بود

سلطان سنجر کہتا ہی ع نے نے غلطے گشت بقار اداس ست

انوری کی وفات پر اس کے کسی دوست نے ذیل کا قطعہ لکھا ہی ؎

(۱) انوری رفت و آرمید و گزید بر سرائے پلید عالمِ پاک

(۲) دوستاں در غمش ہمی گویند با رُخِ زرد و دیدۂ نمناک

(۳) کاے دریغا کہ چرخ سفلہ نہفت عالمِ علم را بمشتِ خاک

انوری کی شاعری

انوری اگرچہ طبعاً علم دوست واقع ہوا تھا، لیکن زمانے کے میلانِ عام اور اپنے عہد کی عیش پرستی اور ہرزہ پسندی، علوم کی بے قدری، معاش کی مجبوریاں اور زندگی کی تلخیاں محسوس کرکے علمی مشاغل کو خیرباد کہتا ہی اور شاعری اختیار کرتا ہی، تاہم وہ غالب کا ہمزبان ہو کر بلاخوف تردید کہہ سکتا ہی ؎

مانبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

اگرچہ شعر نے اس کی روحانی اولوالعزمیوں اور طبعی رجحان کو کوئی تسکین نہیں بخشی کیونکہ وہ اس سے ہمیشہ ملول اور دل گیر نظر آتا ہی۔ اُس کے شریف جذبات اس پیشے کے خلاف ہمیشہ سرگرم پیکار رہیں، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انوری نے اپنے سرسبز دماغ، عالمانہ روشِ تحریر اور نکتہ آفرینی سے

شعر کے درجے کو کئی پایہ بلند اور رفیع کر دیا ہے۔

انوری کا اعجاز اس کے قصائد مانے گئے ہیں، متقدمین کے نزدیک محاسنِ قصیدہ گوئی زیادہ تر شان و شکوہِ الفاظ، نادر تشبیہات اور صنائع بدائع پر ختم تھیں۔ لیکن انوری کی جدت پسند طبیعت نے اس میں مضمون داخل کیا۔ خیال بندی کا شوخ رنگ چڑھایا اور صنائع کا زور توڑ کر اس کو علمیت کے رنگ میں رنگ دیا۔ فارسی زبان اس کے یہاں ایک نئی کروٹ لیتی ہے، جدید خیالات اور نئے اسلوب وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں، وہ سیکڑوں بندشوں کا مبتدع ہے اور اس کے چھوٹے نوالوں کو متاخرین مزے لے لے کر چباتے ہیں۔ قریب قریب ہر شاعر نے اس کے اثرات میں اپنی قندیلِ سخن کو روشن کیا ہے، جن میں ظہیر، ابن یمین، عرفی اور قاآنی قابلِ ذکر ہیں۔ ہمارے لغات کا ایک بڑا جزو اس کی جدت طرازی کا مرہونِ منت ہے۔

صنائع میں وہ لف ونشر اور تجنیس کی طرف زیادہ مائل ہے، اور کلام حشو یا جملۂ معترضہ کے استعمال میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ وہ ادائے خیال کے لیے نازک اور خوبصورت لباس کے بجائے سنجیدہ اور متین پیرایہ تلاش کرتا ہے۔

انوری ایران میں ثالث ثلاثہ رسل مانا گیا ہے، اور یہ فیصلہ ابھی تک مسلم ہے متاخرینِ ہند میں اس کے خلاف بغاوت پھیلانے والوں میں سب سے پہلے ابوالفضل علامی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ابوالفضل کے بعد میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے مقلد آزاد بلگرامی ہیں اور مولانا شبلی کی رائے حقیقت میں آزاد سے ماخوذ ہے۔ مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے دَور میں قصیدہ گوئی کی حقیقی عظمت مُردہ ہو چلی تھی، اور تغزل نے عالمگیر قبولیت حاصل کر لی تھی۔ اِس لیے مذاق میں عام انقلاب جاگزیں ہو چکا تھا۔ عرفی جیسا

مسیح نفس بھی مردہ قصیدے کے جسم میں روح پھونک کر اس کا دورِ احیا نہ لا سکا۔

انوری کے دور میں غزل نے کوئی حقیقی اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔ منچلے شعرا کے سامنے جو میدان تھا وہ قصیدے کا تھا۔ اور اسی سرزمین میں وہ اپنے جوش طبیعت کی جولانیاں دکھاتے تھے۔ یہ عہد قصیدے کی تاریخ کا زریں دور مانا جانا چاہیے۔ شعرا کثرت سے موجود تھے، جن میں اکثر مشہور و معروف ہیں، مثلاً امیر معزی، ادیب صابر، عبدالواسع جبلی، حکیم روحانی حکیم سوزنی، فتوحی، سنجری، حکیم سنائی اور رشید الدین وطواط وغیرہ وغیرہ لیکن سب نے اپنے تفننِ طبع کے لیے قصیدہ نگاری ہی کو اختیار کیا تھا۔

ان میں جو انوری کے ہم چشم مانے گئے تھے، وہ فتوحی اور سنجری تھے۔

ایں کہ پرسد ہر زماں ایں... خران گاوریش
کانوری بہ یا فتوحی در سخن یا سنجری (عنہ)

گویا معاصرین کی نظرِ انتخاب میں انوری، فتوحی اور سنجری پر قرعۂ فال ڈالا گیا تھا۔ کوئی انوری کو ترجیح دیتا تھا، کوئی فتوحی کا معتقد تھا، اور کوئی سنجری کی افضلیت کا قائل تھا۔ گویا سعدی، امامی اور مجد ہمگر کی ترجیح کی بحث بہ تبدیل اسما ایک صدی پیشتر چھیڑ دی گئی تھی۔ لیکن غور کرو، آج فتوحی اور سنجری کو کون جانتا ہے؟ زمانے نے ان کے کلام کی طرح اُن کے ناموں کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور جو تھوڑا بہت ہم اُن کے متعلق جانتے ہیں، انوری کے طفیل میں جانتے ہیں۔ وہاں دُنیا نے سعدی کے حق میں فیصلہ دیا، یہاں انوری کے حق میں۔

متاخرین میں بعض نے ظہیر فاریابی کو انوری پر ترجیح دینا چاہی لیکن ان کی کوشش بار آور نہیں ہوئی۔ خود مولانا شبلی ظہیر کی افضلیت کے قائل

ہیں، لیکن انوری اور ظہیر میں کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ ظہیر کی شاعری اس وقت شروع ہوتی ہی، جب انوری کا زمانہ ختم ہوتا ہی۔ ظہیر کے قصائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ ظہیر انوری کا مقلد بھی ہی اور انوری کے جواب میں جو چند قصائد اس نے لکھے ہیں اُن میں کوئی ترقی نہیں دکھائی ہی۔ میں بخوفِ طوالت صرف چند امثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

انوری کا ایک قصیدہ ہی ؎

صبا بہ سبزہ بیاراست باغ دنیٰ را ... نمونہ گشت زمیں مرغزار عقبیٰ را

ظہیر نے اِسی زمین میں یہ مطلع بہم پہنچایا ہی ؎

سفر گزیدم و بشکست[1] عہد قربیٰ را ... مگر بہ حیلہ ببینم جمال سلمیٰ را

(ص ۳ قصاید ظہیر، طبع نولکشور ۱۲۹۶ء)

مَیں اُن میں انوری کے مطلع کو ہر اعتبار سے بہتر مانتا ہوں۔ لیکن اس قسم کا مقابلہ شاید بعض ناظرین کی رائے میں نامناسب ٹھیرے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہی کہ دونوں استادوں نے جہاں ایک ہی قافیہ باندھا ہو ان اشعار کا مقابلہ

---

[1] معطوف و معطوف علیہ کی حالت میں یہ تفاوت جو "سفر گزیدم و بشکست" کی ترکیب میں بجائے "سفر گزیدم و بشکستم" دیکھا جاتا ہو ایک ایسا اسلوب ہی جو سب سے پہلے قرن پنجم میں دیکھا جاتا ہی۔ انوری کے کلام میں یہ تغیر بہت عام ہی چنانچہ امثال ذیل ؎

(۱) جستم ز جا و پیش دوید و سلام کرد ... وآوردمش چو تنگ شکر تنگ در کنار ص ۱۹۶

(۲) القصہ باز گشتم و آمد بخانہ زود ... در باز کرد و باز بہ بست از بس استوار ص ۱۹۲

(۳) ہمچناں کردم و ایں شعر ادا کردم و رفت ... جاں ازاں رجعت فی الفور پر از واشوقاہ ص ۲۵۹

(۴) رفتی و با تو جائے کہ جہاں داشت برد ... گر جہاں را پس ازیں ناقص خوانیم سزاست ص ۵۶

(۵) آوردمش بجائے و نشاند و نشست پیش ... بہ دست بوسہ دادم و بر روے او گلاب ص ۲۸

کرلیا جائے، اس نقطۂ نظر سے ذیل کے اشعار پر ناظرین ایک نظر ڈال لیں ؎

انوری

روائحِ کرمت باسبزہ روئے طبع
خواص نیشکر آرد مزاج کسنے را

بہرچہ مفتی رایت قلم بدست گرفت
قضا برات نویسد جوابِ فتویٰ را

نسیم باد در اعجاز زندہ کردنِ خاک
برد آب ہمہ معجزات عیسیٰ را

زکنہِ رتبتِ تو قاصرست قوت عقل
بلے ز روز خبر نیست چشمِ اعمیٰ را

وجود جودِ تو رائج نشاد اگر نہ وجود
بہ نیم ناں ز قضا می فروخت اجریٰ را

شکوہِ مصطفویت آخر از طریق نفاذ
ز طاقباش برافگند لات و عزیٰ را

ظہیر

مزاجِ کودکی از روئے خاصیت بمذاق
ہنوز طعم شکری نہاد کسنے را

بدست خویش قلم درکشیدہ مفتیِ عقل
بیک اشارتِ رایت ہزار فتویٰ را

سخن چہ عرض کنم بر جماعتے کہ زجہل
زبانگِ خر نہ شناسند نطق عیسیٰ را

وجودِ او کہ جہاں را ز ابتدائے ظہور
بجائے نورِ بصر بود چشم اعمیٰ را

ہزار بار بدیوان رزق رد کردہ
جہاں ز بہر نشانت برات اجریٰ را

اگر صلابت او بانگ بر فلک بزند
بخالفی دہد استرار لات و عزیٰ را

انوری

خدائے عزّوجل گوئی از طریق نفاذ
بہ اعتدال ہوا دادہ جانِ معنے را

خیزید کہ ہنگامِ صبوحِ دگر آمد
شب رفت وز مشرق علمِ صبح برآمد

خورشیدِ مے اندر اُفق جامِ نکوتر
چوں لشکرِ خورشید بہ آفاق برآمد

نامِ تو بسے تربیتِ نامِ عمر کرد
زاں رُوئے کہ عدلِ تو چو عدلِ عمر آمد

نزدیک خروس از پئے بیداری مستاں
دیریست کہ پیغامِ نسیمِ سحر آمد

در امرِ تو امکانِ تغیّر نہ نہفتند
گوئی کہ مثالے ز قضا و قدر آمد

اوصافِ تو در نسبتِ آوازۂ ایشاں
وصفِ نفسِ عیسیٰ و آوازِ خر آمد

ظہیر

برائے تحفۂ نظّارگاں بیارایم
بہ حلیہ ہائے عبارت عروسِ معنے را

صبحِ دگر از مشرقِ اقبال برآمد
در گلشنِ ایام نسیمِ سحر آمد

آں وعدہ کہ تقدیر ہمی داد وفا شد
واں کار کہ ایام ہمی خواست برآمد

شاہنشہ ابی بکر محمّد کہ جہاں را
از حضرتِ او مژدۂ عدلِ عمر آمد

شمشیرِ تو در ظلمتِ شبہائے حوادث
چوں پرتوِ خورشید و طلوعِ سحر آمد

سر بر خطِ حکمِ تو نہد ہر کہ یکے روز
در دائرہ حکمِ قضا و قدر آمد

خصمت کہ پرستندۂ سمِ خرِ عیسیٰ است
اندر نظرِ عقل چو دنبالِ خر آمد

الوری

بر بوک دگر عمر گرامی مگزارید
خود محنت ما جملہ ز بوک و مگر آمد

ظہیر

آں مایہ ندانست کہ بر ہیچ نیاید
ہر کار کہ در معرضِ بوک و مگر آمد

ظہیر، الوری کی متانت اور دقتِ نظر کو نہیں پہنچ سکتا۔ زبان کی صفائی جو ظہیر کا امتیازی جوہر ہے، الوری سے مقابلے کے وقت اس کا صریحی تفوق ثابت نہیں کرتی۔ لیکن جب ہم اِن گوناگوں اور مختلف الموضوع مضامین کا خیال کرتے ہیں جو الوری نے اپنے اشعار اور نظموں میں روشناس کیے ہیں تو ظہیر کی شکست ایک بدیہی واقعے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ذیل کے اشعار پر بھی غور کیا جائے جو بلحاظ ترکیب و بندش دونوں استادوں کے ہاں متحد المضمون مانے جا سکتے ہیں، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ ایک صبح کا ذکر کرتا ہے اور ایک شام کا۔ اور نگاہِ انتخاب کا فیصلہ پھر الوری کے حق میں ہے۔ سہ

الوری

چوں وقتِ صبح چشمِ جہاں سیر شد ز خواب
بگسستہ شد ز خیمۂ مشکینِ شب طناب
بنمود روئے صورتِ صبح از کنارِ شب
چوں جوئے سیم برطرفِ نیلگوں سراب ؎

ظہیر

چوں بر زمین طلیعۂ شب گشت آشکار
آفاق ساخت کسوتِ عباسیاں شعار
پیدا شد از کرانۂ میدان آسماں
شکلِ ہلال چوں سرِ چوگانِ شہریار ؎

الوری کی شاعری میں گوناگوں واقعات اور معاملات پر بحث کی گئی ہے، اس کی تشبیب میں مختلف النوع موضوع پر قلم اُٹھایا گیا ہے، بہار و باغ،

گل و ریاحین کے علاوہ جوہر ایرانی شاعر کا ایک مقبولہ مضمون ہی انوری کے ہاں کہیں کہیں ذکرِ معشوق ہی، اُس کے فراق کا بیان ہی یا آمد کا ذکر یا مکالمہ ہی کہیں صبح کا نقشہ کھینچا گیا ہی، کہیں شام کا منظر دکھایا ہی، کبھی سرگرم سفر ہی، دشت و بیابان کوہ و صحرا کے مناظر پیش کرتا ہی، کہیں شب عید کے نظارے ہیں اور عیدگاہ پہنچنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، کہیں فلکیات کے ذکر میں مصروف ہی۔ برو ج اور سبعہ سیاروں پر قلم اُٹھاتا ہی، اور ہر ستارے کا جُدا جُدا حلیہ لکھ رہا ہی۔ یہ موضوع اُس کے ہاں بہت پسندیدہ ہی۔ کہیں زمانے کی ناقدری علم و ہنر کی کساد بازاری کا دُکھڑا بیان ہوتا ہی، تقدیر اور آسمان کی بوالعجبیاں دکھائی ہیں، صحن بستان وغدیر، قصر و ایوان، اُن کی نقاشی اور مختلف منظروں، شکارگاہوں اور رزم گاہوں کا خاکہ اُتارا ہی۔

صبح کا وقت ہی، صبوحی کی تلاش ہی، اور شراب سے لو لگ رہی ہی نخاس میں ایک ہندی کنیز دیکھی جاتی ہی، شاعر اُس پر عاشق ہو جاتا ہی، بات چیت کا موقع بھی مل جاتا ہی، عشق جتایا جاتا ہی، وہ مسکراتی ہی اور کہتی ہی، تمھارے کیسہ میں روپیہ بھی ہی، روپیہ سے سب کچھ ہو سکتا ہی۔ آسمان تک کے ستارے توڑے جا سکتے ہیں۔ یہ جواب دیتے ہیں ع

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

وہ کہتی ہی تو میرا کہا مانو اور میرے خیال سے درگزرو، یہ سُن کر آپ بیتاب ہو جاتے ہیں اور گریہ و بکا شروع کر دیتے ہیں، وہ رحم کھاتی ہی، اور جلال الوزرا کے پاس جانے، قصیدہ سُنانے اور رُپیہ حاصل کرنے کا مشورہ دیتی ہی۔ یہ اس رائے کو پسند تو کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں، میں جلال الوزرا کے سامنے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا، کنیز یہ بزدلی دیکھ کر

ناراض ہوتی ہی اور لاحول پڑھتی چلی جاتی ہی۔

حضرت اپنی بے زری پر تاسف کرتے ہوئے گھر آتے ہیں، اندر کی طرف سے دروازے کی دونوں زنجیریں چڑھالی جاتی ہیں۔ کمرے میں اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں، دروازے کی طرف پیٹھ کرلی جاتی ہی، اور دیوار کی طرف منھ، اور کہتے ہیں کہ آج تمام رات مجھے اپنی بے زری پر رونا چاہیے۔ آنسوؤں کا ایسا دریا بہایا جائے جس میں سفینۂ نوح تک غرق ہوجائے، نالے ایسے شرربار ہوں کہ فلک پر جاکر انجم رخشاں کی طرح چمکیں۔

قصہ مختصر حضرت سرگرمی کے ساتھ اس معرکہ خیز کام میں مصروف ہوجاتے ہیں، اتنے میں سپیدۂ سحری چمکتا ہی اور سیمرغِ سحر جوے شیر میں اپنی چونچ ڈال دیتا ہی۔ ان کی آنکھ لگ جاتی ہی خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ خود بدولت جلال الوزرا کے دربار میں کھڑے ہیں، وہ مسندِ زرتار پر بیٹھا ہی اور ان سے دریافت کرتا ہی کہ حضرت خیر ہی آپ آج کس فکر میں بوتیمار کی طرح خاموش ہیں۔ حضرت جرأت کرکے پیش قدمی کرتے ہیں اور کنیز کے ساتھ اپنے عشق اور بیتابی کا سارا ماجرا سنادیتے ہیں۔ جلال الوزرا اُسی وقت اپنے آدمی کو حکم دیتا ہی کہ جاؤ کنیز کو خرید لاؤ اور لاکر ان کے حوالے کردو، آدمی جاتا ہی کنیز خرید لاتا ہی، اور ان کے حوالے کردیتا ہی۔

عین اس وقت ان کی آنکھ کھل جاتی ہی، کیا دیکھتے ہیں کہ نہ جلال الوزرا کا دربار ہی، اور نہ وہ کنیز ہی۔ تنہا پڑے ہیں۔ خواب کی تعبیر کے لیے معبّر کے پاس جاتے ہیں، وہ تعبیر بیان کرتا ہی اور اجرت میں ان کی پگڑی پر قبضہ کرلیتا ہی۔

اس تشبیب میں انوری نے ظریفانہ پیرایہ اختیار کیا ہی۔ اور شروع سے آخر تک اس کو خوب نباہا ہی۔ یہی کیفیت ذیل کی تشبیب میں مشاہدہ کی جاتی ہی۔

عید کی صبح ہو، آپ چند دوستوں کے ساتھ عید دیکھنے کی غرض سے صحرا کا رُخ کرتے ہیں، چونکہ سواری کا شوق ہو اس لیے زیرِ ران ایک گھوڑا بھی ہو لیکن کمزور دُبلا اور مریل ۔ قدم قدم پر گرتا ہو، اس کے ساتھ یہ بھی گرتے ہیں، اور اُٹھ کر اُسے اُٹھاتے ہیں اور پھر سوار ہوتے ہیں، مختصر یہ کہ کبھی یہ اُسے اُٹھاتے ہیں اور کبھی وہ انھیں اُٹھاتا ہو۔ اور اس طرح راستہ طے ہو رہا ہو، یار لوگ چھیڑنا شروع کرتے ہیں، ایک کہتا ہو میاں ذرا رکابیں ڈھیلی کر لو تمھاری ٹانگیں لمبی ہیں، دوسرا کہتا ہو ذرا ایڑ تو لگاؤ دیکھیں تمھارے دُلدُل کی رفتار کیسی ہو۔ یہ چپ ہیں، شرمندہ بھی ہیں اور پریشان بھی۔ کبھی ادھر دیکھتے ہیں کبھی اُدھر جھانکتے ہیں کہ دیکھیں یہ کیا پھبتی سُناتا ہو اور وہ کیا آوازہ کستا ہو۔

اتنے میں ملازم دوڑا ہوا آتا ہو، یہ پوچھتے ہیں، بھئی گھر میں خیریت تو ہو؟ وہ کہتا ہو کیسی خیریت، تم تو گھوڑا اُڑائے عیدگاہ جا رہے ہو اور اس طرف اصلی عید (معشوق) گھر پر آئی ہو۔ یہ سُنتے ہی ان پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی ہو۔ اس سے کہتے ہیں، لا، گھر کی کنجیاں تو مجھے دے میں جاتا ہوں، اور تو اس مُردار پر سوار ہو جا اور آہستہ آہستہ گھر لے آ۔

قصائد میں بالخصوص اوصاف نگاری میں اس کی طرز زیادہ دقیق اور مشکل ہو۔ میں چند اشعار جو نہ زیادہ مشکل ہیں اور نہ آسان، اس کی ایک تشبیب سے نقل کرتا ہوں، ؎

اے تُرک بمے بیار کہ عید ست و بہمن ست ۔۔۔ ہنگام بادہ خوردن و شادی بہ زن ست
ایامِ خز و خرگہ گرم ست ازیں سبب ۔۔۔ خرگاہ آسمان ہمہ در خز آ دکن ست
خالی مدار خرمن آتش ز دود عود ۔۔۔ تا در چمن ز بیضۂ کافور خرمن ست
آں عہد نیست ایں کہ زالوانِ گُل چمن ۔۔۔ گوئی کہ کارگاہِ حریرِ ملوّن ست

سلطان دے بہ لشکرِ صرصر جہاں بکند — بینی کہ جورِ صرصرِ دے چون جہان کن ست

درخفیہ گر نہ عزم خروج ست باغ را — چون آب گیر ہا ہمہ پر تیغ و جوشن ست

نفس نباتی ار بہ عزب خانہ باز شد — عیبش مکن کہ مادر بستان سترون ست

بادِ صبا کہ فحل بنات نبات بود — مردم گیاہ شد کہ نہ مرد ست نہ زن ست

از جوشش نشو، دیگ نماتا فرونشست — از دودِ تیرہ بر سرِ گیتی نہنبن ست

الوری اس روشِ خاص کے لیے مشہور ہی، ان حالتوں میں وہ اکثر سنجیدہ اور متین نظر آتا ہی اور اسی عالم میں اس کی جدت طرازی کا اصلی جوہر نمایاں ہوتا ہی۔ میں ایک تشبیب سے اور مثال دیتا ہوں ؎

جرم خورشید چو از حوت در آید بحمل — اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

کوہ را از مدد سایۂ ابر و نمِ شب — پُر ظرائف شود اطراف چو ہامون و جبل

ساعد و ساق عروسانِ چمن را بینی — ہمہ بربستہ حلی و ہمہ پوشیدہ حُلل

پیش پیکانِ گل و خنجر برق از پے آنک — تا نہ سازند بکین و نسگالند جدل

بر محیط فلک از ہالہ سپر سازد ماہ — بر بسیط کرہ از خوید زرہ پوشد طل

وز پے آن کہ مزاجش نہ کند فاسد خون — سُرخ بید از ہمہ اعضا بگشاید اکحل

باد با آب سحر آن کند اندر بُستان — کہ کند باد رخ آئینہ بسوہان صیقل

بر کرانِ فصل دے از شغل نما عزلے داد — شحنۂ نفس نباتیش در آرد بعمل

مرغزارے شود اکنون فلک وابر درو — راست چون ناکہ تو گوئی ہمہ ناقہ است و جمل

میل اطفال نبات از جہت قوت و قوت — کرد یک رشتہ بہ اعلیٰ و دگر در اسفل

لیکن جوش و ہیجان، صدمہ اور ارتعاش کی حالت میں اس کی روش ملائم سریع اور سہل ہو جاتی ہی۔ کسی وزیر کی وفات کے موقع پر دیکھا جاتا ہی کہ شاعر فرطِ غم میں تکلف اور تصنع کے پردوں کو یک قلم اُٹھا دیتا ہی، اور ایک

سادہ مگر شیریں طرز اختیار کرتا ہی۔ خیالات وہی ہیں جو قدرتی طور پر انسان کے دل میں موجیں مارتے ہیں، جذبات کا ارتعاش اور کیفیت قلب کا اضطراب جو بالکل حقیقی ہی، ہر شعر سے ظاہر ہی۔ تمہید کے چند اشعار پر قناعت کی جاتی ہی۔

شہر پُر فتنہ و پر مشغلہ و پر غوغاست — سید و صدر جہاں یار نہ دادست کجاست
دیر شد دیر کہ خورشید فلک روئے نمود — چیست امروز کہ خورشید جہاں نا پیداست
بارگاہش ز بزرگان و ز اعیان پر شد — او نہ بر عادت خود روئے نہاں کردہ چراست
دوش گفتند کہ رنجور ترک بود آرے — بار نادادنش امروز بر آں قول گواست
پردہ دارا تو یکے درشو و احوال ببیں — تا چگونہ است بہش ہست کہ دلہا در واست
ور ترا بار بود خدمت ما ہم برساں — مردمی کن، بکن ایں کار، کہ ایں کار شماست
ور توانی کہ رہِ بار دہی بہ باشد — تا در آئیم و سلامے بکنیم ار تنہاست
ور چناں ست کہ حالیست نہ بر وفق مراد — خود مگو، برگ نیوشیدنِ ایں حال کراست
کہ تواند کہ بہ اندیشہ بر آرد ز جہاں — کز جہاں آں کہ جہاں صد یک از آں بود جداست
داں کہ برخاست از و رسم بدی تا بہ نشست — دامنِ عمر بیفشاند و بیک رہ برخاست
آفریدہ چہ کند گر نہ کشد بارِ قضا — کافرینش ہمہ در سلسلۂ بند قضاست
اجل از بارِ خدائے اجل اندر نہ گزشت — گر تو گوئی کہ ز من در گزر دایں ع داست

اسی طرح جب بحث و استدلال کی کیفیت اس پر طاری ہوتی ہی، وہ اسی سادہ روش سے کام لیتا ہی۔ ذیل میں تقدیر ایزدی کی ہمہ گیری اور انسانی مجبوری کے مسئلے پر گرم سخن ہی ؎

اگر محوّل حالِ جہانیاں نہ قضاست — چرا مجاری احوال بر خلافِ رضاست
بلے قضاست بہ ہر نیک و بد عنان کش خلق — بداں دلیل کہ تدبیر ہائے جملہ خطاست
ہزار نقش بر آرد زمانہ و نہ بود — یکے چناں کہ در آئینۂ تصور ماست

کسے ز چون و چرا دم نمی تواند زد — کہ نقشبند حوادث ورائے چون و چراست

بدستِ ما چو ازیں حل و عقد چیزے نیست — بعیش ناخوش و خوش گر رضا دہیم سزاست

آیندہ ابیات میں آفتاب غروب ہونے، رات آنے اور ستارے نکلنے کا ذکر ہی اور خلاف معمول تشبیہات سے زیادہ کام لیا گیا ہی ؎

نماز شام زصحنِ فلک نمود مرا — عروسِ چرخ کہ بنہفت روے در چادر

بداں صفت کہ شود غرق کشتیِ زریں — بطرف دریا چو بگسستہ شد از و لنگر

بگرد گنبدِ خضرا چناں نمود شفق — کہ گرد خیمۂ مینا کشیدہ شعشۂ زر

ستارگان ہمہ چوں لعبتانِ سیم اندام — بسوگ مہر بر افگندہ نیلگوں معجر

بناتِ نعش ہمی گشت گرد قطب چناں — کہ گرد حقۂ پیروزہ گوہریں زیور

بداں مثال ہمی تافت راہ کاہ کشاں — کہ بر بنفشہ ستاں بر کشیدہ صف عبہر

ز تیغ کوہ بتابید نیم شب پرویں — چناں کہ در قدح لاجورد ہفت دُرر

سپہر گفتی نقاش نقش مانی گشت — کہ ہر زماں بنگارد ہزار گونہ صور

ز برجِ جدی بتابید پیکرِ کیواں — بشکل شمع فروزندہ در میان شمر

ہمی نمود درخشندہ مشتری در حوت — چناں کہ دیدۂ خوباں ز عنبریں معجر

ز طرف میزاں می تافت صورت مریخ — بداں صفت کہ مۓ لعل رنگ در ساغر

چناں کہ عاشق و معشوق در نقاب کماں — بتافت تیر درخشاں و زہرۂ ازہر

برسم لعبت بازاں سپہر آئینہ رنگ — زماں زماں بنمودے عجائب دیگر

سفر کے محاسن ؎

سفر مربی مردست و آستانۂ جاہ — سفر خزانۂ مالست و اوستاد ہنر

دراں زمین کہ تو در چشم خلق خوار شوی — بشک سفر کن ازاں جا برو بجائے دگر

درخت اگر متحرک شدے زجائے بجائے — نہ جور ارہ کشیدے و نے جفائے تبر

بشہر خویش درون بے خطر بود مردم
بجان خویش درون بے بہا بود گوہر
بجرم خاک وفلک بر نگاه باید کرد
کہ ایں کجاست ز آرام وآں کجا ز سفر

دوستوں کی جدائی ؎

بدامن مژه رفتن ز طرف خانۂ خس
بہ پلک چشم ستردن ز روئے خارا غار
ہزار لقمہ بدنداں ربودن از دم شیر
ہزار عقدہ بدندان کشودن از سر مار
بقعر چاه فتادن ز آسمانِ بلند
بفرق بر شدن از دشت جانب کہسار
ازیں مخاطرہ گر صد ہزار آید پیش
بہ از جدائی یاراں ہزار بار ہزار

غزل

انوری کے ہاں تغزل کا ذخیرہ سنائی سے بہتر حالت میں پایا جاتا ہی اگرچہ تصوف کی چاشنی نے ان کی غزل کو زیادہ بامزہ بنا دیا ہی۔ انوری کے پاس عشقِ محض ہی جس میں سوز وگداز کی تاثیر غالب ہی، اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ایرانی ذہنیت کے نزدیک عشق کا اصلی سرمایہ سوز وگداز ہی، خمریات اور رندی کے مضامین صرف چند غزلوں میں نمودار ہیں۔ وہ تصوف کے کوچے سے قطعاً نابلد ہی۔ اس میں شک نہیں کہ غزل کے نہال کو سعدی پروان چڑھاتے ہیں لیکن ان سے پیشتر سنائی، انوری، خاقانی، عطار اور مولانا روم کی کوششوں نے اس کی آبیاری میں بڑا کام کیا ہی۔

میں انوری کی غزلوں کے بعض نمونے صرف تاریخی دلچسپی کے واسطے دیتا ہوں، کیونکہ عرصہ ہوا ہم اس پایہ کے مذاق کو خیرباد کہ چکے ہیں ؎

گر جان و دل بدست غم تو نہ دادمے
پاے نشاط بر سر کیواں نہادمے
گر ہیم زلفِ پرچشم تو نیستی مرا
من کارہاے بستۂ خود برکشادمے

در بر سرم نوشتہ نبودے قضائے تو — شہرے پُر از بتاں، بتو چوں اوفتادمے
گر بے تو خواست بود مرا عمر کاشکے — ہرگز نہ بودمے وز مادر نزادمے

بداں عزمم کہ دیگر رہ بہ بت خانہ کمر بندم — دل اندر وصل و ہجرانِ بتے بیدادگر بندم
بندی سر برافرازم بہ بادہ رُخ برافروزم — رہِ مے خانہ برگیرم در طامات بر بندم
گرم یار خراباتی بکیش خویش بفریبد — بزنارش کہ در ساعت چو او زنار بر بندم

تا رختِ دل اندر خم زلفِ تو نہادیم — بر رُخ ز غمِ عشق تو خونابہ کشادیم
در آرزوئے روئے تو از دست برفتیم — و اندر طلب وصل تو از پائے فتادیم
تو سر بخداوندیِ ما نیز فرود آر — در بندگی رضائے تو چوں داد بدادیم
تا بستۂ بندِ اجلِ خویش نہ گردیم — از بندِ غمِ عشق تو آزاد مبادیم
نے نے بہ اجل ہم نرہیم از غمِ عشقت — با عشق تو میریم کہ با عشق تو زادیم

باز دوش آں صنم عشوہ فروش — شہرے از ولولہ آورد بجوش
صبح دم بود کہ می شد بوثاق — چوں پری اندوش نہ بہُش نہ بہوش
دست بر کردہ بشوخی از جیب — چادر افگندہ زشنگی بر دوش
لالہ از تابش می پردیں پاش — زہرہ از بادِ سحر سنبل پوش
دامن از خواب کشاں در نرگس — دام دلہا زدہ از مرزنگوش
پیش کارش قدحے بادہ بدست — او یکے چنگ خوش اندر آغوش
اے بسا شربتِ خوں کز غمِ او — دوش گشتست بر آوازش نوش
روستائی بچۂ شہر بسوخت — کس دریں فتنہ نہ باشد خاموش

مست از درم در آمد دوش آں مہ تمام
دربر گرفتہ چنگ و بکف بر نہادہ جام

گوئی کہ لعل ناب و عقیق گداختہ است
در جام او ز عکس رُخ او شراب جام

بنشست بر کنارِ من و بادہ نوش کرد
آں ماہ سرو قامت وآں سرو کش خرام

باچنگ در کنار بد اندر کنار ایں
مخمور تا بصبح سپید از نماز شام

در گوشۂ کہ کس نہ بُد آگہ ز حال ما
زاں عشرتِ بغایت وزاں مستیِ تمام

نے مطرب و نہ ساقی و نے یار و نے حریف
او بود، انوری و مئے لعل والسّلام

شعرا غزل کے مقطع میں بالعموم اپنا تخلص لایا کرتے ہیں، یہ دستور سنائی اور انوری کے دَور سے پابندی کے ساتھ رائج ہی۔

بدیہہ گوئی اور بذلہ سنجی

انوری کی شہرت کا راز زیادہ تر اس کی بدیہہ گوئی میں مضمر ہی، اس پر اگر اس کی لطیفہ خوانی اور بذلہ سنجی جس کے لیے اس کی موزوں طبیعت ہر وقت حاضر اور آمادہ تھی، اضافہ کی جائے تو اس کی غیر معمولی شخصیت کا جوعلم و فضیلت کے اوصاف سے آفتاب نصف النہار کی طرح ضیا بار تھی کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہی۔

یورپ میں موجودہ زمانے میں SCRAP BOOKS. کا رواج ہی جنہیں سفینہ یا بیاض کے نام سے پکارا جا سکتا ہی۔ شائقین اپنے احباب اور ملنے والوں سے کوئی نظم یا لطیفہ بطور یادگار اس میں لکھواتے ہیں۔ خواتین میں یہ شوق زیادہ ہوتا ہی، وہ ہر واقف ناواقف سے فرمایش کرتی ہیں، معلوم ہوتا ہی کہ انوری کے عہد میں بھی یہ دستور کسی حد تک جاری تھا۔ ایک دن وہ خواجہ فخری سے ملنے جاتا ہی۔ خواجہ اپنا سفینہ دے کر اس سے نظم کی فرمایش

کرتا ہی، انوری وہیں بیٹھا بیٹھا بیس بیت کا ایک قطعہ لکھ دیتا ہی۔ میں یہاں بخوف طوالت قطعہ کے پہلے شعر اور آخری دو بیتوں پر قناعت کرتا ہوں ؎

اے برادر گر مزاج از فضلہ بروں آمدے — آدمی پس یا ملک یا دیو بودے یا پری

خواجہ فخری اے شامت بوے حکمت یافتہ — گر حکیمی زیں معانی زنگ ہاں تا نا وری
آنچہ حالے در خیال آمد ہمیں ابیات بود — کاندریں محضر بخط خویش بنوشت انوری

یورپ میں کسی سے ملنے جاتے ہیں تو اطلاع کی غرض سے کارڈ بھیج دیا جاتا ہی۔ انوری ایسے موقعوں پر اشعار سے کام لیتا تھا۔ میں ایک آدھ مثال یہاں درج کرتا ہوں ؎

اے خداوندے کہ از ایام اگر خواہی بیابی — جز نظیر خویش دیگر ہرچہ آں از خاطر برآید
کمترین بندگانت انوری بر در ستادہ — چوں حوادث باز گردد یا چو اقبال اندرآید

اے خاک درت سرمہ شدہ چشم وفے را — از بس کہ کفِ پاے تو بر خاک درآید
بر درگہ تو بندہ ستادہ است بخدمت — دستوریِ تو چیست رود یا کہ درآید

اس کی لطیفہ خوانی کی بعض مثالیں اس سے قبل دی جاچکی ہیں، یہاں چند اور اضافہ کی جاتی ہیں۔

کمال الزماں سنجر کے عہد کا نہایت مشہور مغنّی ہی، انوری نئے ڈھنگ سے اس کا مرثیہ لکھتا ہی ؎

ہرگز گماں مبر کہ کمال الزماں بمرد — کو روح محض بود بجسم فنا پذیر
میداں کہ ساکنان فلک سیر گشتہ اند — از مطربی زہرہ بریں چرخ گندہ پیر
خواہش گری بنزد کمال الزماں شدند — کو بود در زمانہ دریں علم بے نظیر

گفتند زہرہ راز فلک دور کردہ ایم اے رشکِ جان زہرہ بیا جاے او بگیر

ممالک اسلام میں محتسب کا فرض ہوتا ہے کہ عوام میں ظاہری بداخلاقی اور کھلّم کھلا بے حیائی کے جرائم کا انسداد کرے۔ اس قسم کے قانون شکنوں کو بغرض عبرت کسی چوک یا بازار میں سزا دی جاتی تھی۔ شعرا کے طبقے میں محتسب ہمیشہ غیر ہردل عزیز رہا ہے اور وجہ ظاہر ہے کہ شعرا مذہب سے آزاد ہوتے ہیں اور محتسب مذہب کا حامی۔

انوری بازار میں ایک حسین عورت کو دیکھتا ہے، جس کو محتسب کسی جرم کی پاداش میں سزا دے رہا تھا۔ یہ واقعہ ذیل کے قطعے میں منظوم ہوتا ہے

ے دی محتسبے براہ دیدم در دست گرفتہ چوب بارزن
مہ روز نکے گرفتہ مے زد نظّارہ بروز بام و برزن
پرسیدم ازآں میاں یکے را ق کاں چوب چرا زند براں زن
گفتا زنکے ست روسپی تن دیں محتسبے ست روسپی زن (۶۱۹)

پنج ارکان اسلام اور مسئلہ ابتہاج ے

یکے ز پنج دہی وز بیست نیسے دگر قدرت بود فرسنگلے چند
چو زیں بگزشت ما و مطرب و مے گنہ از بندہ و عفو از خدا وند (۶۲۰)

تقاضائے صلہ ے

شعرے بسانِ دیبۂ زربفت بافتم واں گہ ببوئے صدر مجیری شتافتم
گر پرسدم کسے کہ زجودش چہ یافتی اے آفتاب خواجہ چہ گویم چہ یافتم (۶۲۱)

صلہ نہ ملنے کا گلہ ے

شعر تر و خوب بندہ گوید انعام نصیب غیر باشد
ایں رسم نو آمدہ است امسال انشاء اللہ کہ خیر باشد

حسنِ طلب ؎

شد مدّتے کہ عہدِ زمیں بوس تازہ کرد
در خدمتِ مبارکِ میمونت انوری

واکنوں بر آستانۂ میمونت روز و شب
کش آستانہ باد پُر از ماہ و مشتری

از لطفِ شاملِ تو طمع دارد ایں قدر
کا خر چہ می کنی و کجائی، چہ می خوری (۴۹۴)

شراب یا سرکہ ؎

بزرگوارا دانی کز آفتِ نقرس
زہر چہ ترشی من بندہ می بپرہیزم

شراب خواستم و سرکۂ کہن دادی
کہ گر خورم بقیامت مصوص برخیزم

شراب دارِ تو آخر کجاست، تا قدحے
بگوشش و بینی آں قلتباں فرد ریزم (۲۶۸)

ایک خشک جواب ؎

مرا پیام فرستی کہ من بہ پرسشِ تو
چو چشم دارم برمن سلام چوں نہ کنی

کشند پائے بدامن درون بلے شعرا
چو دست بخششت از آستیں بروں نہ کنی

اخلاقیات

اخلاقی تعلیم کا ذخیرہ انوری کے ہاں کم ہو، لیکن جو کچھ ہو اس پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا کہ اس دائرے میں بھی اُس نے اپنی زبردست شخصیت کی مُہر لگادی ہو اور نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ہو۔ اس کا درس جو مذہبیت کے اثر سے معرا ہو اور نہ دوسرے شعرا کی طرح قومی یا ملکی رسوم و قیود کی روایات کا پابجولاں ہو، صرف انسانی آزادی، حرمتِ نفس اور خودداری کا نصب العین پیش کرتا ہو۔

انوری اد بستان ذکر کا موسس ہو جسے ابن یمین نے اپنی نظموں

میں بہت کچھ نشو و نما اور ترقی دی، لیکن جس کو ہماری مشرقی آب و ہوا نے کبھی فروغ اور اشاعت کا موقع نہیں دیا۔ ابن یمین اس میں شک نہیں اس موضوع کی نشر و اشاعت میں ایک بڑی حد تک انوری کا مرہونِ منت ہے۔

انوری کہتا ہے انسان کا اصلی لباس آزادی ہے، لیکن امید و بیم نے خلق کو خلق کا مسخر اور مقید کر دیا۔ اپنے جیسے انسان کے پاس امید لے کر جانا اپنی عزتِ نفس کو خوار کرنا ہے۔ یاد رکھو احسان اُٹھانا کاہشِ روح ہے۔ عذاب برداشت کرنا یا جہنم میں پھینک دیا جانا سوال کی ذلت اُٹھانے اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے ہزار بار قابلِ ترجیح ہے۔

اپنی آنکھوں کے خون میں روٹی ڈبو کر کھانا دوسرے کے گھر سے سرکہ مانگ کر کھانے سے بہتر ہے۔ آدمی کو چاہیے دوسرے کا متوسل اور دست نگر نہ ہو جو شخص کسی کا دست نگر نہیں وہی آدمی ہے ورنہ کس اور خس میں کچھ فرق نہیں۔ تم میں اگر کچھ دینے کی طاقت نہیں تو کچھ پروا نہیں لیکن کوشش کرو کہ نہ لینے کی طاقت برقرار رہے۔ دوسرے کا احسان اُٹھا کر اگر تم مال دار بھی ہو گئے تو کیا اس سے تمھیں روحانی نقصان نہیں پہنچے گا۔

آئینِ حکومت ہر قوم کا ذہنی و عقلی نصب العین رہا ہے اور ہر قوم نے اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق اس کی حرمت اور تائید میں آرا کا اظہار کیا ہے لیکن انوری نے انسانی آزادی اور استغنا کے اصول کو اُس کے انتہائی مدارج تک پہنچاتے ہوئے اس آئین کو گدائی کی اقسام میں شامل کیا ہے۔ وہ گویا ہے کہ "بادشاہی کیا ہے؟ گدائی ہے، بادشاہ ہر شخص کا محتاج ہے۔ اس کا سامانِ سلطنت، تمھیں معلوم نہیں، کہاں سے آیا ہے؟ سنو! اس کے گلے کے موتی ہمارے بچوں کے آنسو ہیں، اور لعل و یاقوت ہمارے یتامیٰ کا خون ہے،

وہ ہمارا پانی پیتا ہی اور ہماری روٹی کھاتا ہی، عشر اور خراج کیا ہی؟ گدائی ہی! کیا ایک چیز کے دس نام نہیں ہوتے، مختصر یہ کہ ہر قسم کی ضرورت گدائی ہی اور مانگنے والا عام اس سے کہ حضرت سلیمان ہوں یا قارون، فقیر ہی۔

کسی کو دینا بے شک طریقِ احسان ہی، لیکن نہ لینا اِس سے بھی بڑا احسان ہی، اور مشکل بھی ہی۔ دینے میں جس قدر مروّت ہی نہ لینے میں ہزار درجہ زیادہ مروّت ہی۔ خدا پر بھروسا رکھو اور کسب حلال سے روزی پیدا کرو، جاہل صوفیوں کی طرح روزینہ دار نہ ہو۔"

آدمی کو بے نیاز اور آزاد بنانے کے لیے انوری کی یہ تلقین ہی، اور اس کا آخری قول ہی ؎

آزادگی ست حلۂ مردان و انوری
آں دست گاہ کو کہ من آزاد مردے

اور معاملات میں کہتا ہی کہ صبر و شکر ایسی نعمتیں ہیں جو سلاطین کو بھی نصیب نہیں۔ جب ہمیں اس قدر مل رہا ہی جو ہماری ضروریات کو اکتفا کرتا ہی تو اس پر قانع رہنا چاہیے، قناعت بہترین کیمیا ہی۔ تمھارے پاس اوصافِ اضافی مثلاً دولت و مال نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، کوشش کرو کہ تمھارے طبعی اوصاف یعنی اخلاق دُرست ہوں۔ تمھارا سلوک بنی نوع کے ساتھ ایسا ہو کہ وقت پر سب تمھارے رنج کو اپنا رنج سمجھیں۔ دو باتوں میں سے ہمیں ایک کام کرنا چاہیے یا دوسروں کو فائدہ پہنچائیں یا اُن سے فائدہ اُٹھائیں۔

لیکن اب وقت آگیا ہی کہ میں اس کی اخلاقی شاعری کا نمونہ ناظرین کے سامنے پیش کروں۔

صفائی اخلاق سے

صفحۂ را نقش می بستند استادانِ چین — بشنو ایں معنیٰ اگر زیں خوشتر حدیثے نشنوی
اوستادے سینہ را کردہ ہمچوں آئینہ — اوستادے سینہ را کردہ نقشِ مانوی
اے برادر خویشتن را صفحہ داں ہمچناں — ہم بہ سقفِ نیک عالی ہم بہ بنیادِ قوی
بارے از آں سینہ پر نقش نتوانی شدن — جہد آں کن تا اگر آں سینہ دیگر شوی

شاہی و گدائی سے

آں شنیدستی کہ روزے زیرکے با ابلہے — گفت کیں والیِ شہرِ ما گدائے بے حیاست
گفت چوں باشد گدا آں کز کلاہش تکمہ — صد چو ما را روز ہا بل سالہا برگ و نواست
گفت اے ناداں غلط اینک ازیں جا کردہ — آں ہمہ برگ و نوا دانی کہ آنہا از کجاست؟
دُرّ و مروارید طوقش اشکِ اطفالِ من است — لعل و یاقوتِ ستامش خونِ ایتام شماست
آں کہ تا آبِ سبو پیوستہ از ما خواستہ است — گر بجوئی تا بمغز استخوانش نانِ ماست
خواستن گدیہ است خواہی عشر خواں خواہی خراج — زاں کہ گر دہ نام باشد یک حقیقت را رواست
چوں گدائی چیزے دیگر نیست جز خواہندگی — ہر کہ خواہد گر سلیمان است و گر قاروں گداست

رنج و راحت کی بے ثباتی سے

در حدود رے یکے دیوانہ بود — روز و شب گردے بسوئے دشت گشت
در تموز و در بہار و در خزاں — سوئے بازار آمدے از سوئے دشت
گفتے اے آنانکہ عیشش آمادہ اید — ہر زمانے زیر ایں زرّینہ طشت
قاقم و سنجاب در سرما سہ چار — توزی و کتاں بگرما ہفت و ہشت
گر شما را با نوائی بد چہ شد — ور چہ ما را بے نوائی بد چہ گشت

راحت ہستی و رنج نیستی
بر شما بگزشت و بر ماہم گزشت

ص ۶۰۳

حسنِ معاشرت ؎

درجہاں با مرداں دانی کہ چوں باید گذاشت — آں قدر عمرے کہ یابد مردمِ آزادمرد
کاستینہا در غمِ او تر کنند از آبِ گرم — فی المثل گر بگذرد بر دامنِ او بادِ سرد

سوال و طمع کی ذِلّت ؎

بودن اندر عذاب چوں جرجیس — یا شدن در جحیم چوں ابلیس
بہترست از سوال کردن و طمع — وایستادن بہ پیشِ مردِ خسیس

قناعت سب سے بہتر کیمیا ہے ؎

کیمیائے ترا کنم تعلیم — کہ در اکسیر و در صناعت نیست
رو قناعت گزیں کہ در عالم — کیمیائے بہ از قناعت نیست

منت پذیری کے خلاف تلقین ؎

آلودۂ منّتِ کساں کم شو — تا یکشبہ در وثاق تو نانست
اے نفس برستۂ قناعت شو — کانجا ہمہ چیز نیک ارزانست
تا بتوانی حذر کن از منت — کین منتِ خلق کاہشِ جانست
زیں سود چہ سود اگر شود اکنوں — در مایۂ نفس عینِ نقصانست
در عالمِ تن چہ میکنی ہستی — چوں مرجعِ تو بعالمِ جانست
چنداں کہ مروت ست در دادن — در ناستدن ہزار چنداں ست

وقت کی قدر ؎

روز را رائگاں ز دست مدہ — نیست امکانِ آں کہ باز رسد

راحت میں شکر نہ کرنا اور تکلیف میں شکایت کرنا انصاف پسندی نہیں ؎

روزے کہ فلک بتہ در ریش گرفتے — از فضلۂ زنبور برو دوختمے جیب
اکنوں ہمہ شب منتظرم تا بفروزند — شمعے کہ بہر خانہ چراغے نہد از غیب

آں روز فلک را چو دراں شکر نہ گفتم امروز دریں زشت بود گر کنمش عیب (۱۲)

یعنی پہلے میں اس قدر مال دار تھا کہ جب وصوب نہ ہوتی اور آفتاب غائب رہتا تو میں مومی شمعیں جلا لیتا اب اس قدر غریب ہوں کہ گھر میں روشنی کے لیے چاند کا منتظر رہتا ہوں۔

خدا پر بھروسا ؎

خدائے کار چو بر بندۂ فرو گیرد
بہر چہ دست زند رنج دل بیفزاید

دگر بطمع شود زود نزد ہمچو خودے
زہر چیزے خوار و نژند باز آید

چو اعتقاد کند کز کسش نیاید خیر
خدائے قدرتِ والاے خویش بنماید

بدست بندہ ز حل و زعقد چیزے نیست
خدائے بندد کار و خدائے بکشاید (۱۲)

کوئی واقعہ بیان کر کے اس کی استدلالی قوت کے اعتماد پر اخلاقی نتیجہ ترتیب دینا معلمین اخلاق کا پرانا دستور رہا ہے۔ اس طریق میں وصف یہ ہے کہ مستمع پر اس قسم کی نصیحت کا محض سرسری موعظت کے مقابلے میں زیادہ اثر ہوتا ہے، جس طرح ڈاکٹر کڑوی گولیوں کو شکر میں ملفوف کر کے ہمیں آسانی سے کھلا دیتا ہے اسی طرح معالج اخلاق ان فرضی قصوں کے ذریعے سے پند و موعظت کی تلخی کو قند و نباتات بنا دیتا ہے۔ انوری کی تلقین میں یہ وصف زیادہ نمایاں ہے جیسا کہ گزشتہ امثال سے ظاہر ہے۔ یہاں ایک اور مثال دی جاتی ہے جو شاعری کی مذمت سے علاقہ رکھتی ہے۔

انوری کا شمار شعر کے اقالیم ثلاثہ میں کیا جاتا ہے، لیکن باوصف اس کے وہ شاعری کا زبردست مخالف ہے۔ اس کی رائے میں شاعر کا پیشہ خاکروب کے پیشے سے بھی زیادہ ذلیل اور کثیف ہے؛ وہ کہتا ہے ”میں نے ایک حلال خور سے دریافت کیا کہ بھائی ہمارا تمھارا پیشہ جیسا کچھ ہے، معلوم ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنے پیشے میں کامیاب ہو اور میں ناکام ہوں۔ خاکروب

کہتا ہو کہ اس ناکامی کی وجہ یہ نہیں کہ میں تمھارے مقابلے میں زیادہ باکمال ہوں یا تم میرے مقابلے میں بے ہُنر ہو، اصلی وجہ قدر دانی ہو، میرے آقا کو میرے ہنر کی قدر ہو اس لیے میرے کام کو رونق ہو، لیکن تمھارے آقا کو تمھارے کام کی کوئی قدر نہیں، وہ یہی سمجھتا ہو کہ تمھارا کام وہی معمولی ہو جو سدا سے ہوتا آیا ہو، پھر وہ یہ بھی خیال کرتا ہو کہ ان عالم لوگوں کے کارنامے بازاری جنس کی طرح بالکل عام ہیں اس لیے وہ کیوں قدر کرنے لگا۔ اس کو تمھاری کاوشِ جگر کی کیا خبر۔

بلیکے مردک کناس ہمی گفتم دوش ... توچہ دانی کہ زغبن تو دلم چوں خستہ است
صنعت و پیشۂ ما ہر دو، ہمی دانی چیست ... آں چرا تیز رود، ویں زچہ رو آہستہ است
گفت از عیب خود و از ہنر ما شناس ... زیں کہ ما را زچنار آتش و از نے جستہ است
کارفرمائے دہد رونقِ کارِ من و تو ... داند آں کس کہ شمے با من و تو بنشستہ است
کارفرمائے مرا پایۂ من معلوم ست ... لاجرم کارِ من از بند تقاضا رستہ است
باز چوں گاو خراس از تو و از پایۂ تو ... کارفرمائے ترا دیدہ چناں بربستہ است
کہ چناں ظن برد او کانچہ تو ترتیب کنی ... کردۂ دائم و پرداختۂ پیوستہ است
یا چناں داند کایں عمر عزیز علما ... ہمچو روز و شب جہّال متاع رستہ است
او چہ داند کہ دراں شیوہ چہ خوں باید خورد ... کہ ترا از سر بیداد دراں نے خستہ است
انوری ہم ز تو برتست کہ بر شاخ درخت ... عقل داند کہ ستمہائے تیر از دستہ است (صفحہ ۵)

بوعلی اور فردوسی ۵

انوری بہر قبول خلق تا کے ننگ شعر ... راہ ہمت رو قبول عامہ گو ہرگز مباش
وقت ہنگام غزل گفتن دگر سرودی مکن ... راویاں را گرمی ہنگامہ گو ہرگز مباش
تاج حکمت بالباس عافیت باشد بپوش ... جاں چو کامل شد طراز جامہ گو ہرگز مباش
درکمال بوعلی نقصان فردوسی مگیر ... ہر کجا آمد شفا شہنامہ گو ہرگز مباش

(کلیات قلمی)

شعر اور شرع ؎

کسے کہ مدت سی سال شعر باطل گفت | خدائے بر ہمہ کامیش داد پیروزی
کنوں کہ روئے نہد جملہ در حقیقت شرع | چہ اعتقاد کنی باز گیر دش روزی
بروکہ عاقل ازیں اختیار آں بیند | کہ کشتِ تشنہ نہ بیند زابر نوروزی
ز شعر نقش تو آں بارہا ئے عار کشید | کہ چوں ہلال بطفلی در آمدش کوزی
ز شرع جانِ تو آں شعلہ ہائے نور زند | کہ تو بہر فلکے آفتابے افروزی
تو لائے شرع بہ آخر بری ہمی خطاست | چو عین شعر بہ آخر بری بیاموزی

جس وقت انوری کا آفتاب شاعری طلوع ہوا ہے خراسان کا سیاسی مطلع انتہائی تاریکی میں تھا۔ اس دورِ انقلاب میں انسانی قسمت کا ساغر آلام و آزار اور شدائد کی شراب سے لبریز تھا۔ عنانِ حکومت غیر متمدن اور وحشی اقوام کے ہاتھ میں چلی گئی تھی جن کے اوضاع و اطوار سباع کے اوضاع و اطوار سے کم نہ تھے۔ پُرانے درباروں کے چراغ گل کر دیے گئے تھے، ان کے بجائے ایسے دربار قائم ہوئے تھے جن کے راس الرؤسا اکثر نو کاسہ اور نو کیسہ تھے۔ اُن کے مشاغل اور مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھے۔ ندیمی کا قابل عزت پیشہ اجلاف اور اراذل کے ہاتھ میں چلا گیا تھا، جن کے نزدیک ندیم اور مسخرہ ایک ہی معنی رکھتا تھا۔ اہلِ علم و اربابِ کمال ہر طرف خوار پھرتے تھے اور کوئی پوچھتا تک نہیں تھا۔ ہزّال، رُنود اور مطربوں کی گرم بازاری تھی۔ انوری ان واقعات اور جذبات عصری کا مرقع اپنی مختلف نظموں میں کافی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ

اہلِ عصر کی بدتمیزی ؎

ربع مسکوں آدمی را بود دام و دد گرفت | کس نمی داند کہ در آفاق انسانے کجاست

دَور دورِ خشک سال و قحطِ دینؔ دانش ست — چند گوئی فتح بابے کو دبارانے کجاست
من ترا بنمایم اندر حال صد بوجہل جہل — گر مسلمانی، تو تعیین کن مسلمانے کجاست
آسمان بیخِ کمال از خاکِ عالم بر کشید — تو زرِ نخ می زن کہ درمن گنجِ نقصانے کجاست
خاکِ طوفاں اگر غسلے دہد وقت آمدہ است — اے دریغا داعی چوں نوح و طوفانے کجاست

منصب ندیمی کی توہین سے

نشاید بہرِ آدابِ ندیمی — دگر بر جان و دل زحمت نہادن
زباں کردن بنظم و نثر جاری — زخاطر نکتہ ہائے بکر زادن
کہ باز آمد ہمہ کارِ ندیماں — بسیلی خوردن و دشنام دادن

مسخروں اور مطربوں کی قدر اور علوم کی بے قدری سے

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلبِ علم — تا در طلبِ راتبِ ہر روزہ نمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز — تا دادِ خود از ہر کس و ناکس بستانی

کمال کی کساد بازاری سے

ہر کس کہ جگر خورد و بردی ہنر آموخت — در دَورِ قمر گو بنشیں خونِ جگر خور
نزدیک کسانے کہ بصورت چو کسے اند — با صورت ایشاں نفسے برزن و برخور
پیغام زنے آر و ہمہ اطلس و خز پوش — یا مسخرہ باش و ہمہ حلوائے شکر خور

شعر کی بے قدری سے

خاطرے چوں آتشم ہست و زبانے ہمچو آب
فکرتِ تیز و ذکا، نیک و شعرے بے خلل
اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
وے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

مذکورۂ بالا اشعار کی روشنی میں ہم اُن ایام کی اخلاقی پستی اور ابتذال کا

کسی قدر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی انوری کے دلی جذبات کا حال بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ ایسے خیالات کے مالک کو ہم کسی حالت میں دنی الطبع سفلہ مزاج اور تنگ ظرف نہیں کہہ سکتے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ مولانا شبلی کی نگاہ میں انوری کے اخلاق کا معیار نہایت پست ہو اس کی ہجاجات کی بنا پر مولانا نے اس کی نسبت ایک نہایت مذموم رائے قائم کی ہو۔ لیکن اصل یہ ہو کہ ہجو اس کے ہاں ایک اتفاق ہو۔ اس کا اخلاقی معیار معاصرین سے نہایت بلند تھا۔ بیس سال تک وہ ایک ثقہ متین اور سنجیدہ شاعر کی زندگی بسر کرتا ہو، لیکن معاش کی طرف سے ناکام رہتا ہو، اس لیے کہ اس کے اخلاقی تفوق نے اس کے اور اس کے معاصرین کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی تھی آخر وہ یہ راز معلوم کر لیتا ہو اور آیندہ کے لیے اپنے نصب العین میں تبدیلی کا عازم ہوتا ہو چنانچہ کہتا ہو ؎

چہ آبروے بیفزایدم ز مدح و غزل — چرا باتش حسرت ہمی بکاہم روح
بیاد بوک و مگر بست سال بر دادم — مرا خداے نہ داد ست زندگانی نوح
عنان طبع ازیں پس کشیدہ خواہم داشت — اگر گشادہ نہ بینم در قبول و فتوح
دگر عطا نہ دہندم برآرم از پس مدح — بلفظ ہجو دمار از سر چنیں ممدوح

یہ قرارداد اس کی اخلاقی بندشوں کی بہت سی گرہیں کھول دیتی ہو اور مستقبل اس میں وہی تغیر دیکھتا ہو جو عبید زاکانی بہ اقتضاے وقت و زمانہ انوری سے دو قرن بعد اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اخلاقی انقلاب آیندہ زندگی میں اس کو کامیابی کی شاہراہ پر لگا دیتا ہو۔

کلیاتِ انوری طبع نول کشور

یہ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ باوجود فارسی زبان کی قدر اور رواج کے فارسی کتب کی طبع کا انتظام ہمارے ہاں نہایت ناقص ہے۔ اس کے لیے ہم یورپ اور ایران میں کافی بدنامی اُٹھا چکے ہیں اور اُٹھا رہے ہیں، لیکن اب تک ہمیں فارسی کتابوں کا صحیح چھاپنا نہیں آیا۔ گزشتہ قرن میں کلکتہ۔ لکھنؤ، کان پور اور دہلی سے بلحاظ طباعت و صحت اعلیٰ معیار کی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مگر ہم نے ایک صدی بعد ترقی معکوس کی ہے اور یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہیں کہ موجودہ صدی میں کتاب اسی قدر زیادہ غلط چھپتی ہے جس قدر قرن ماسبق میں صحیح چھپتی تھی۔

کلیات انوری سب سے پہلے تبریز میں سنہ ۱۲۶۶ھ میں چھپا تھا، دوسری مرتبہ لکھنؤ سے سنہ ۱۲۹۷ھ میں نول کشور پریس سے شائع ہوا۔ اسی اشاعت کی دوبارہ تجدید اسی مطبع سے سنہ ۱۲۹۷ھ میں ہوئی۔

منشی نول کشور کی پہلی اشاعت تبریزی نسخے سے منقول ہے، اس کے علاوہ اس میں منشی برج موہن لال خلف بابو بہاری لال متوطن دہلی کے ایک قلمی نسخے سے بھی امداد لی گئی ہے۔ اِس کلیات میں اہلِ مطبع ایک عجیب غلطی کے شکار ہو گئے ہیں اس میں بعض ایسے قصائد بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو انوری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور نہ انوری کے وطن اور عہد میں لکھے گئے بلکہ ہندستان میں۔

یہ قصائد جن کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں، سلطان شمس الدین التمش سنہ ۶۰۷ و ۶۳۳ھ اور اس کے فرزند سلطان رکن الدین فیروز کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک قدیم ہندی شاعر 'تاج ریزہ' نامی کی یادگار ہیں جو بلحاظ زمانہ امیر خسرو دہلویؒ سے مقدم ہے۔ اس عہد کے ہندی نژاد شعرا کا سراغ

اگرچہ کافی تعداد میں موجود تھے بہت کم ملتا ہی اس لیے میں اس غلطی کا جس نے ہمیں ہمارے وطن کے ایک قدیم شاعر کا پتا دیا، بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔

اس قسم کی غلطی متاخرین کے ہاتھوں نہیں ہو سکتی، بلکہ قدیم زمانے میں عمل میں آئی ہوگی۔ فہرست (کتب قلمی فارسی) برٹش میوزیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہی کہ ان کے ہاں بھی انوری کے ایک کلیات میں یہی غلطی موجود ہی۔

ذیل میں ان قصائد کی ایک فہرست دی جاتی ہی، جو اس قدیم شاعر کی یادگار ہیں ؎

(۱) مژدہ عالم را نہ عالم آفریں آوردہ اند | زانکہ شہ را از خلیفہ آفریں آوردہ اند
ناصر الاسلام مستنصر کہ طوقِ طاعتش | زآسماں در گردنِ اہلِ زمیں آوردہ اند

قصیدۂ ہذا شاعر نے اس وقت لکھا ہی جب سلطان شمس الدین التمش کے پاس خلیفہ المستنصر باللہ ۶۲۳ھ و ۶۴۰ھ کا سفیر دہلی آتا ہی اور اس کی آمد کی خوشی میں تمام شہر میں آئین بندی کی جاتی ہی۔ طبقاتِ ناصری سے معلوم ہوتا ہی کہ سفیر دوم ربیع الاول ۶۲۶ھ کو دہلی پہنچتا ہی۔

قصیدے سے واضح ہوتا ہی کہ تحائف میں بادشاہ کے لیے خلعت اور ایک تازی گھوڑا بھی تھا، طبقات ناصری میں گھوڑے کا ذکر نہیں ہی ؎

شادی عام ست در شہر ایں کہ بہر شہریار | خلعتِ خاص امیر المومنین آوردہ اند
خلعتے یارب چگونہ چوں عروس آراستہ | راست بر بالائے شاہ را آئین آوردہ اند
مرکبے کاندر روانی آب را ماند رواں | یا مگر بادِ صبا را زیر زیں آوردہ اند
مرکبے زیں ساں مبارک، خلعتے میموں چنیں | از برائے ظلِ یزداں شمس دیں آوردہ اند

حامیِ آفاق التتمش[1] کہ عزم و حزم او   گرد بر گرد جہاں حصن حصین آوردہ اند

آئین بندی کا ذکر ذیل کے اشعار میں آتا ہی ؎

خسروا از رشک صور[2] تہا کہ بر ایوان تست   چیں در ابروے نکو رویانِ چیں آوردہ اند
صحن در گاہت بہ نزہت گلستانے شد کزو   خار خارے در دل خلد بریں آوردہ اند
شہر را از شش جہت در زر و زیور بستہ اند   قبہا سر بر سپہر ہفتمیں آوردہ اند

---

(۲)

ساقی بیا کہ وقت مئے لعل روشن ست   میدانِ خاک تیرہ کنوں سبز گلشن ست

یہ قصیدہ غیاث الدین محمد شاہ کی تعریف میں ہی، چنانچہ ؎

عادل غیاث دیں کہ بیک تن گہ وغا   از بہر قصد جان عدو صد تہمتن ست
فرماں دہ زمانہ محمد شہ آں کہ ملک   از رائے او چو روے عروساں مزین ست

انوری کے عہد میں دو غیاث الدین گزرے ہیں، پہلا غیاث الدین محمد سلجوقی المتوفی ۵۵۴ھ دوسرا غیاث الدین محمد غوری برادر معظم شہاب الدین غوری، لیکن میں اِن دونوں سے اعراض کرکے التتمش کے فرزند غیاث الدین کے نام یہ قصیدہ مانتا ہوں۔ ذیل کے شعر میں سیر اور من ہندی الفاظ ہیں، اور ان ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ ؎

خیز از مئے قدیم مرا سیر کن بر طل   بگزر ازیں حدیث کہ یک سیر و یک من ست

انوری کا ان الفاظ سے واقف ہونا مشکل معلوم ہوتا ہی۔

---

[1] صحیح تلفظ التتمش ہی جیسا کہ شعر ہذا میں مذکور ہی نہ التمش جیسا عام طور پر مشہور ہی۔

[2] مکانات پر نقاشی کا رواج ایران میں غزنوی اور سلجوقی دور میں عام تھا۔ اس شعر سے معلوم ہوتا ہی کہ مسلمانوں کے ساتھ یہ رسم ہندستان میں بھی آگئی تھی۔

ساقی بیار بادہ کہ نوروز عالم ست
(۳) ص ۸۳
روز خجستہ چوں رُخِ شاہ معظم ست

قصیدۂ ہذا رکن الدین فیروز بن سلطان شمس الدین التمش کی تعریف میں ہی چنانچہ شعر ؎

فیروز شاہ کعبۂ اقبال رکنِ دیں کز خاک پاے اوا ثر آب زمزم ست

افزود باز رونقِ ہر مرغزار گل
(۴) ص ۲۶۳
چوں زیر یافت نالۂ ہر مرغزار گل

یہ قصیدہ بھی التمش کے فرزند غیاث الدین محمدؐ کی مدح میں ہی اور اس کا نام موجود ہی۔

لے رہستی کہ در دلِ لبل دہنار یافت
(۵) ص ۸۱
تاکہ ز اعتدال مزاج بہار یافت

یہ بھی رُکن الدین فیروز مذکور الصدر کی ستایش میں ہی اور اس کا نام مذکور ہی۔

ایں منم کز دیدہ یاقوت رواں آوردہ ام
(۶) ص ۳۰۷
بیدلاں را از سخن قوتِ رواں آوردہ ام

یہ بھی رکن الدین فیروز شاہ کی تعریف میں ہی۔

بیدلاں را روے تو آئینۂ جاں آمدہ است
(۷) ص ۸۷
وز لبِ دنداں تو لؤلؤ و مرجاں آمدہ است

یہ قصیدہ نظام الملک قوام الدین محمد جنیدی کی تعریف میں ہی جو شمس الدین التمش اور رکن الدین فیروز شاہ کا وزیر رہا ہی۔ اس کا نام ان ابیات میں آتا ہی:-

آصفِ ثانی نظام الملک دستورِ جہاں — کز کمالِ کامگاری چوں سلیماں آمدہ است

صاحب عادل قوام الدین محمد کز شرف — چوں محمدؐ زبدۂ ترکیبِ ارکاں آمدہ است (ص ۸۹)

اِس کا جنیدی ہونا اس شعر سے ظاہر ہی ؎

گوہرِ آلِ جنیدی وز کرامتہائے تو — مالکِ دینار شد ہر کو سخنؔ داں آمدہ است (ص ۹۰)

شاعر اپنی ہندی نژادی کا ذکر یوں کرتا ہی ؎

مولد و منشا ببیں در خاکِ ہندستاں مرا — نظم و نثرم بیں کہ بر آبِ خراساں آمدہ است

ص ۸۹

---

(۸) صبح خیز انیکہ وصفِ آں خط و خد کردہ اند
در رہِ فکرت نوشتن جہد بیجد کردہ اند ص ۱۳۶

یہ قصیدہ بھی نظام الملک جنیدی کی تعریف میں ہی' اور قصیدے کے ذیل میں اس کا نام بھی موجود ہی۔

(۹) بفریاد آمدم ایں جا بفریاد — گر شاہِ جہاں دادم دہد داد ص ۱۳۵

یہ قصیدہ کسی شخص کی شکایت میں لکھا گیا ہی، جس سے شاعر کا جھگڑا ہوتا ہی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی ہی۔ شاعر نہایت غیظ کی حالت میں ہی اور کہتا ہی کہ اگر بادشاہ نے میری فریاد نہیں سُنی تو مَیں بغداد جاکر امیر المومنین کے دربار میں شاکی ہوؤں گا، اور اپنے آنسوؤں سے بغداد میں ایک نیا دجلہ جاری کردوں گا وہاں بھی سماعت نہیں ہوئی تو خانۂ کعبہ جاکر اور پردۂ کعبہ پکڑ کر خدا کی جناب میں فریاد و زاری کروں گا۔ بعد میں گویا ہی کہ غالباً مجھے اس انتہائی کارروائی پر عمل درآمد کی ضرورت نہیں ہوگی، کیونکہ ہمارا بادشاہ خود

خود عادل و منصف ہی، اور وہ رکن الدین والدنیا ہی، یعنی رُکن الدین فیروز۔

---

(۱۰) اے فخر ہمہ نژادِ آدم وے سیدۂ زنانِ عالم ص۲۸۱

قصیدۂ ہذا کسی شہزادی کی تعریف میں ہی جس کا خطاب کریمۃ النسا اور نام رضیۃ الدین ہی چنانچہ ؎

سلطانت کریمۃ النسا خواند شد ذاتِ شریفِ تو مکرّم
راضی ز تو اے رضیۃ الدین حق قادر و ذوالجلال اکرم ص۲۸۱

بادشاہ سے اس کے تعلقات یوں بیان کیے گئے ہیں۔ ابیات

اقبالِ تو بر فزونست ہر روز از دولتِ خسرِو معظم
آں پادشہے کہ خسرواں را از ہیبتِ او فرو شود دم
از ورد دعائے تو سحر گاہ (کذا) بنیاد بقائے اوست محکم ص۲۸۲

رضیۃ الدین کی سرکار میں شعرا کی آمد و رفت بھی تھی ؎

در مدح و تہنات شاعراں را تشریف و صلات وخزمعلم ص۲۸۲

میں ایک مدت تک اس قصیدے کو سلطان رضیۃ الدین بنت سلطان شمس الدین التتمش کی مدح میں مانتا رہا، لیکن انوری کے ایک قلمی کلیات میں، جس سے گزشتہ' بالا الحاقی قصائد ترک کر دیے گئے ہیں، یہ قصیدہ داخل ہی۔ اس شہادت کی بنا پر میں اپنے نظریے سے دست کش ہو گیا ہوں، اگرچہ مطمئن نہیں ہوں۔

نظامی گنجوی

قولہ "الیاس یوسف نام، ابو محمد کنیت، نظام الدین لقب، نظامی تخلص باپ کا نام موید تھا"

(شعر العجم صفحہ ۲۶۹ طبع الناظر پریس ۱۹۱۷ء)

شیخ نظامی کا نام دراصل الیاس ہی اور اس کے لیے یہ شعر سند ہی۔ لیلیٰ مجنوں ؎

والیاس کالف بری زلامش ۔۔۔ ہم باء نود و نہ است نامش[1]

(خمسہ نظامی صفحہ ۲۰۸ طبع مطبع مظفری بمبئی ۱۳۲۶ھ[2])

ایک اور شعر سے معلوم ہوتا ہی کہ ان کا نام اویس بھی تھا۔ لیلیٰ مجنوں ؎

یارب تو مرا کا ویس نام ۔۔۔ در عشق محمدی تمام

زاں شہ کہ محمدی جمال است ۔۔۔ روزیم کن آنچہ درخیال است

(خمسہ صفحہ ۲۰۴)

یوسف ان کے والد کا نام تھا، زکی دادا کا اور مؤید پردادا کا لیلیٰ مجنوں ؎

گر شد پدرم بہ نسبت جد ۔۔۔ یوسف پسر زکی موید

(خمسہ صفحہ ۲۰۹)

قولہ "قم کے اضلاع میں تفرش ایک ضلع ہی۔ اصل وطن یہاں تھا لیکن چونکہ قم صدر مقام ہی اس لیے انتساب میں تفرش کے بجائے قم کا نام لیتے ہیں۔" (شعر العجم صفحہ ۲۶۹)

---

[1] الیاس کے اعداد ایک سو دو سے الف اور یا کے اعداد کے تخرجے سے ننانوے بچتے ہیں۔
[2] اس مضمون کے دوران میں صفحات کے حوالے اسی خمسے سے دیے گئے ہیں۔

کہا جا سکتا ہی کہ وہ سنہ ۶۰۰ھ ہجری کے بعد تک زندہ تھے۔

قولہ "اس زمانے کے تمام بڑے بڑے سلاطین نے ان کی قدردانی کو لازمۂ سلطنت سمجھا، اور فرمایش کرکے ان سے اپنے نام پر کتابیں لکھوائیں اسباب اس کے مقتضی تھے کہ سب سے پہلے قریبی دربار سے تعلق پیدا ہوتا لیکن یہ سعادت دُور والوں کی قسمت میں لکھی تھی سب سے پہلے جس کو یہ عزت نصیب ہوئی وہ بہرام شاہ تھا۔ نظامی نے مخزن اسرار ۵۵۹ھ ہجری میں اسی کے نام پر لکھی اور صلے میں اس نے پانچ ہزار اشرفیاں ایک قطار شتر اور انواع و اقسام کے بیش قیمت کپڑے بھیجے" (شعر العجم صفحہ ۲۹۰)

یہ خیال کہ بہرام شاہ کی فرمایش پر مخزن اسرار لکھی گئی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ نظامی نے اپنی خواہش سے اُسے بہرام[1] شاہ کے نام پر معنون کیا ہی۔ چنانچہ مخزن سے

برہمہ شاہاں ز پے ایں جمال | قرعہ زدم نامِ تو آمد بفال

مخزن اسرار کے اکثر نسخوں میں اگرچہ تاریخ تصنیف ۵۵۹ھ ہجری ملتی ہی جیسا کہ مولانا شبلی نے اوپر ذکر فرمایا ہی اور اس کی سند یہ اشعار ہیں:

بود حقیقت بہ شمار درست | بست و چہارم ز ربیع نخست

از گہِ ہجرت شدہ تا ایں زماں | پانصد و پنجاہ و نہ افزوں براں

---

[1] ملوک ارزنجان کے مفصل حالات تاریخوں میں نہیں ملتے۔ بانیٔ خاندان منگوجک کے بعد اس کے دو فرزند اسحٰق اور داؤد یکے بعد دیگرے برسر حکومت آئے۔ داؤد کا فرزند الملک السعید فخر الدین بہرام شاہ سنہ ۵۵۵ھ میں جانشین پدر ہو کر بقولے سنہ ۶۱۵ھ میں اور بقولے سنہ ۶۲۲ھ میں وفات پاتا ہی۔

لیکن بعض قدیم نسخوں میں پنجاہ و نہ کی بجائے ہشتاد و دو ملتا ہو مگر میرے خیال میں "ہفتاد و دو" زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہی۔ اس خیال کا موید یہ قرینہ ہو کہ نعت سوم میں نظامی نے ایک موقع پر ۵۷۰ھ کا ذکر کیا ہو۔

پانصد و ہفتاد بس ایام خواب   روز بلند است بمجلس شتاب

نیز اس وقت ان کی عمر چالیس سال سے کم یعنی سینتیس اڑتیس سال کی تھی۔ چنانچہ مخزن اسرار سے

طبع کہ با عقل بہ دلالگیست   منتظر نقد چہل سالگیست

مخزن کے انعام کے متعلق سب سے قدیم وہ بیان ہو جو ابن بی بی نے مختصر سلجوق نامے میں دیا ہو۔ میں بجنسہ یہاں اس کو نقل کرتا ہوں :-

"ملک فخر الدین بہرام شاہ صاحب سیرت نیکو و علو ہمت و فرط مرحمت بود و در ایام پادشاہی او مملکت ارزنجان در کمال خورسندگی بود و کتاب مخزن الاسرار را نظامی گنجہ بنام او کرد و بخدمتش تحفہ فرستاد پنج ہزار دینار و پنج سر استر راہوار جائزہ فرمود"[1]

انعام کی روایت اس میں شک نہیں نہایت عام ہو لیکن میں نظامی کے ان بیانات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو شیریں خسرو میں محفوظ ہیں اور گزشتہ بیانات کے بالکل منافی ہیں۔ نظامی بار بار رامشگر کے حق میں خسرو پرویز کی داد و دہش اور اپنے زمانے کی ناقدردانی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں سے

چو عالی ہمتی گردن بر افراز   طناب بر زہ از گردن بینداز
بخورسندی طمع را دیدہ بردوز   زچوں من قطرۂ دریائی آموز

---

[1] منقول از راحۃ الصدور مرتبۂ ڈاکٹر محمد اقبال حاشیہ صفحہ ۲۰۷

که چندیں گنج بخشیدم بشاہے | وزاں خرمن نجستم برگ کاہے
بہ بے برگی سخن را راست کردم | نہ او داد و نہ من درخواست کردم
مرا ایں بس کہ پرکردم جہاں را | ولی نعمت شدم دریا و کاں را

(خمسہ صفحہ ۱۰۸)

مخزن کے بعد ہی شیریں خسرو تصنیف ہوتی ہو اور مخزن کے صلہ نہ ملنے کی شکایت قدرتاً شیریں خسرو میں کی جاسکتی ہو۔ اشعار بالا سے صرف یہی ایک نتیجہ نکلتا ہو کہ بہرام شاہ نے کوئی صلہ نہیں دیا۔

قولہ "مخزن کی تصنیف کے وقت نظامی کا سن تقریباً ۲۵ برس کا تھا۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۹۱)

خود نظامی کے اپنے بیان سے واضح ہوتا ہو کہ ان کی عمر چالیس سال سے کسی قدر کم تھی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

طبع کہ با عقل بدلالگیست | منتظر نقد چہل سالگیست
تا بچہل سال کہ بالغ شود | خرج سفر باش مبالغ شود
یار کنوں بایدت افسوں بخواں | ورس چہل سالگی اکنوں بخواں

(خمسہ صفحہ ۱۴)

قولہ "اسی وقت گھوڑے پر سوار ہوے اور دشت و بیابان طے کرتے ہوئے قریباً ایک مہینے میں پایۂ تخت میں پہنچے" (شعر العجم صفحہ ۲۹۳)

مولانا نظامی کے بیان سے پایا جاتا ہو کہ اتابک قزل ارسلان گنجہ سے صرف تیس فرسنگ کے فاصلے پر ٹھیرا ہوا تھا جب اس نے نظامی کی طلبی کے لیے اپنا قاصد روانہ کیا۔ نظامی کو یہ فاصلہ طے کرنے کے لیے ایک ماہ کے سفر کی ضرورت نہیں۔ خسرو شیریں ؎

کار شبے[1] روزے سفر کن کانکہ ازراہ بہ سی فرسنگ آمد موکب شاہ

قولہ "ان میں علم و فضل کی قدردانی کے لحاظ سے سب سے ممتاز منوچہر خاقان کبیر جلال الدنیا والدین شاہ آخستان تھا جو سلاطین شروانیہ کا درۃ التاج تھا، یہ خاندان خالص ایرانی نسل یعنی بہرام چوبین کی یادگار تھا، منوچہر نہایت علم دوست اور علم پرور تھا... منوچہر نے اپنے ہاتھ سے نظامی کو دس پندرہ سطروں کا خط لکھ کر بھیجا کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان نظم کیجیے۔"
(شعرالعجم صفحہ ۲۹۵)

لیلیٰ مجنوں کے لیے خاقان کبیر منوچہر نے فرمایش نہیں کی وہ اس عہد سے ایک دراز مدت قبل وفات پا چکا ہو۔ یہ کتاب منوچہر کے فرزند ابوالمظفر جلال الدین اخستان کی فرمایش پر لکھی گئی ہو جو ان دنوں والی شروان تھا۔ چنانچہ ابیات سہ

خاقان جہاں ملک معظم مطلق ملک الملوک عالم
صاحب جہت جلال و تمکیں یعنے کہ جلال دولت و دیں
تاج ملکاں ابوالمظفر زیبندۂ ملک ہفت کشور
شروان شہ آفتاب سایہ کیخسرو کیقباد پایہ
شاہ سخن اخستاں کہ نامش مہریست کہ مہر شد غلامش
بہرام نژاد و مشتری چہر دُر صدف ملک منوچہر

(خمسہ صفحہ ۲۰۴)

قولہ "نظامی نے اس مثنوی کے صلے میں بادشاہ سے یہ خواہش کی

---

[1] بعض نسخوں میں "بیسے روزے سفر کن" الخ ملتا ہو جس کو غالباً مولانا شبلی نے "بہ سی روزے سفر کن" الخ پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ یہ سفر ایک ماہ میں طی ہوا۔

کہ ان کے صاحبزادے ولیعہد سلطنت کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل کیے جائیں۔" (شعر العجم صفحہ ۲۹۶)

حقیقت یہ ہو کہ نظامی نے لیلیٰ مجنوں میں شاہ اختساں کے بعد اس کے فرزند کو جس کا نام دادا کے نام پر منوچہر رکھا گیا ہو علیحدہ خطاب کیا ہو جس کے ضمن میں کہا ہو کہ میرے فرزند نے مجھ سے درخواست کی ہو کہ میں اس کو تمھارے حوالے کردوں تاکہ تمھاری حفاظت میں آجائے اور ہم درس بھی ہو جائے۔ ابیات

آں گوہرِ کاں کشادۂ من | پشت من و پشت زادۂ من
گوہر بکلاہ وکاں بر افشاند | وز گوہر کان شہ سخن راند
کیں بیکس را بعہد و سوگند | برکش بہ پناہ آن خداوند
بسپار مرا بعہدش امروز | کو نو قلم است و من نو آموز
تاچوں گہرش کمال گیرد | اندرز ترا ایغال گیرد
کاں تخت نشین کہ اوج سیست | خوردست و لے بزرگ رائیست
آں یوسف ہفت بزم دہ مہد | ہم والی عہد و ہم ولی عہد
زمجلس و نو نشاط و نو مہر | فرزند شہ اختساں منوچہر

(خمسہ صفحہ ۲۰۶)

اور تعریف کے بعد اصل مدعا کا اظہار یوں کیا گیا ہو:-

دارم بخدا امید داری | کز غایت ذہن و ہوشیاری
آنجات رساند از عنایت | کآمادہ شوی بہر کفایت
ہم نامۂ خسرواں بخوانی | ہم گفتۂ بخرداں بدانی
ایں گنج نہفتہ را دریں درج | بینی چو مہ دو ہفتہ در برج

دانی کہ چنیں عروس عہدے | ناید ز قران ہیچ عہدے
گر در پدرش نظر نیاری | تیمار برادرش بداری
از راہ نوازش تمامش | رسمے ابدی کنی بنامش
تا حاجتمند کس نباشم | سرپیش و نظر ز پس نباشم
ایں گفتم و قصہ گشت کوتاہ | اقبال تو باد و دولت شاہ

(خمسہ صفحہ ۲۰۷)

قولہ "قزل ارسلان کے مرنے کے بعد، اس کا بھتیجا یعنے محمد بن ایلدگز کا فرزند ارجمند ابوبکر نصرۃ الدین ۵۸۷ھ میں مسند آرا ہوا۔ نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا اس وقت تک انھوں نے جو کتابیں لکھی تھیں سلاطین وقت کی فرمایش سے لکھی تھیں، لیکن سکندر نامہ اپنی خواہش سے لکھا اور ابوبکر نصرۃ الدین کے نام موسوم کیا۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۹۶)

سکندر نامے کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہی کہ یہ کتاب خود نصرۃ الدین کی فرمایش سے لکھی گئی تھی۔ چنانچہ:

نشاط از تو دارد گہر سفتنم | سزاوار تست آفریں گفتنم
خرد کاسمانرا زمیں می کند | بریں آفریں آفریں می کند
چو فرماں چنیں آمد از شہریار | کہ برنام ما نقش بند ایں نگار
بگفتار شہ مغز را ترکنم | بگفت کساں مغز در سر کنم
فرستم عروسے بداں بزمگاہ | کزو چشم روشن شود بزم شاہ

(خمسہ صفحہ ۱۲)

(دیگر) چو فرمود شہ باغے آراستن | سمن کشتن و سرو پیراستن

بسر سبزی شاہ روشن ضمیر | بہ نیروے فرہنگ فرماں پذیر
یکے سرو بیراستم در چمن | کہ بریاد او مے خورند انجمن

(خمسہ صفحہ ۲۵۵)

قولہ "کتاب لکھ کر پیش کی تو مقررہ رقم کے علاوہ سواری کا گھوڑا بیش قیمت کپڑے خلعت وغیرہ عطا ہوا۔ (شعر العجم صفحہ ۲۹۶)

اور حاشیے میں اضافہ فرمایا ہی :-

"لیکن تعجب ہی کہ نقد رقم صرف ہزار لکھی ہی۔ اگر یہ ہزار دینار بھی فرض کر لیے جائیں تب بھی ایسی رقم ہی جو نہ نظامی کے شایاں ہی نہ ایک مشرقی بادشاہ کے چہرے پر کھلتی ہی۔"

اس کے متعلق شیخ نظامی کا بیان حسب ذیل ہی :-

چو شہ دید در گوہر دل پسند | پسندیدہ شد کار گوہر بلند
ازاں نقد رومی کہ باشد درست | ہزارم پذیرفتہ بود از نخست
چو من نزل در خورد او ساختم | بپائے وے ایں در بر انداختم
ہزارم پذیرفتہ را داد زود | بسے چیزہا نیز بروے فزود
ز مرکوب و دیبا و صد گونہ چیز | ہماں خلعت پادشاہانہ نیز
دو صد نقد دیگر ز دیوان بہر | نوشتم بادرار دیوان دہر
بداں تا رسانندگاں جو بجو | رسانند ہر سالے از نو بنو

(اقبال نامۂ قلمی)

گویا جس وقت بادشاہ نے فرمایش کی تھی اس وقت ایک ہزار اشرفی (درست) صلہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا جب کتاب ختم ہو کر پیش ہوئی زر موعود ان کو مل گیا۔ اس کے علاوہ اسپ و خلعت اور دیبا کے تھان عنایت ہوئے

اور دو سو اشرفی سالانہ نقد پنشن مقرر ہو گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی لحاظ رہے کہ یہ انعام صرف اقبال نامہ یعنے سکندر نامہ بحری کے لیے عطا ہوا ہے۔ شرف نامہ اس سے تین سال قبل لکھا جا چکا ہے، اس کا صلہ اس انعام میں شامل نہیں۔ جب خود نظامی نے اس عطیہ کو دلی مسرت اور دُعا آشنا الفاظ کے ساتھ قبول کر لیا تو ہمیں چاہیے کہ اسی پر قناعت کریں اور مشرقی فیاضی کے خلاف شکوہ سنج نہ ہوں۔ نظامی انعام کے ذکر کو ان ابیات پر ختم کرتے ہیں:۔

خدایا جہاں را بدیں گنج بخش — برافروز چوں دیدہ را از درخش
فلک را بحشمت گرایندہ دار — بدو داد و دیں ہر دو پایندہ دار

(اقبال نامہ قلمی)

قولہ "اساتذہ سے میں نے سُنا ہے کہ سلاطینِ وقت نظامی کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ ایک بادشاہ نے اپنی لڑکی ان کے بیٹے سے بیاہ دی تھی، میں نے کسی کتاب میں یہ واقعہ نہیں دیکھا، لیکن سکندر نامۂ بحری کے خاتمے سے اس قدر بہ تصریح ثابت ہوتا ہے کہ نظامی نے اپنی صاحبزادی اور اپنے فرزند محمدؐ کو نصرۃ الدین کی خدمت میں بھیجا تھا کہتے ہیں:۔

دو گوہر بر آمد ز دریائے من — فروزندہ از روئے شاں رائے من
یکے عصمت مریمی یافتہ — یکے نور عیسیٰ بر و تافتہ
فرستادہ ام ہر دو را نزد شاہ — کہ یاقوت را درج دارد نگاہ
عروسے کہ دُور از و زمادر بود — بہ از پردہ دارش برادر بود
بباید چو آید بر شہریار — چنیں پردگی را چناں پردہ دار
بجو من نزل خاص تو جاں دادہ ام — جگر نیز با جاں فرستادہ ام

آخری شعر سے صاف یہ راز کھل جاتا ہی" (شعر العجم صفحہ ۲۹۷)

میں علامۂ شبلی کے اس عجیب و غریب انکشاف کو ہرگز ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ یہ امر میری سمجھ سے باہر ہی کہ نظامی اپنی صاحبزادی کو نصرۃ الدین کے ہاں کیوں بھیجتے اور صاحبزادی وہاں کیا کرتیں۔ اگر کسی رشتہ داری کے خیال سے بھیجی گئی تھیں تو بہتر تھا کہ علامۂ شبلی اس کی وضاحت کر دیتے۔ لیکن میں یہ دعویٰ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ نظامی کے کوئی صاحبزادی نہیں تھیں۔ ان کے صرف ایک اولاد تھی یعنے محمد جن کے لیے فرمایا ہی بیت

یک دانۂ اوّلیں فتوحم　　　یک پیالۂ آخریں صبوحم

نہ اشعار بالا سے کوئی ایسا قیاس مترتب ہو سکتا۔ بات صرف اتنی ہی کہ انھوں نے سکندرنامہ اپنے فرزند محمد کے ہمراہ بھیجا ہی اور یہی سکندرنامہ وہ صاحب زادی ہی۔

دُو گوہر سے مولانا نظامی کی مُراد اُن کے فرزند صلبی محمد اور فرزند روحانی سکندرنامہ ہیں۔ "عصمتِ مریمی" میں بھی شاعر نے پھر اسی نظم کی طرف تلمیح کی ہی گویا فکر بکر کے مقبولہ خیال کو "عصمتِ مریمی" کے جدید پیرایہ میں ادا کیا۔ عروس سے مُراد وہی نظم ہی اور "مادر" سے مقصد مفروضہ صاحبزادی کی والدہ نہیں ہیں بلکہ شاعر نے اپنی ذات مراد لی ہی جو لوگ نظامی کی شاعری سے واقف ہیں وہ میرے اس بیان سے اتفاق کریں گے کہ شیخ نظامی بعض اوقات اپنے ضمیر یا طبیعت کو عورت فرض کر لیتے ہیں اور اپنی نظم کو عروس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں اس قسم کی بعض مثالیں دی جاتی ہیں:-

(۱) ضمیرم نہ زن بلکہ آتش زن است　　　کہ مریم صفت بکر و آبستن است
تقاضائے آتش‌ے چوں آیدش　　　کہ از سنگ و آہن بہ‌دروں آیدش

(۲) عروس مرا پیش گوہر شناس — کند تازہ روئی بلسے اقتباس

(خمسہ صفحہ ۲۵۴)

(۳) بگفتار شہ مغز را تر کنم — بگفت کساں مغز درسر کنم
فرستم عروسے بداں بزم گاہ — کزو چشم روشن شود بزم شاہ
عروسے چنیں شاہ را بندہ باد — بدیں مہر آفاق فرخندہ باد

(خمسہ صفحہ ۱۲۹)

(۴) ایں گنج نہفتہ را دریں درج — بینی چو مہ دو ہفتہ در برج
دانی کہ چنیں عروس مہدے — ناید ز قران ہیچ عہدے
گر در پدرش نظر نیاری — تیمار برادرش بداری

(خمسہ صفحہ ۲۰۷)

انہی ابیات سے جو مولانا شبلی نے نقل کیے ہیں ایک شعر ترک کردیا گیا ہی جس سے ہر قسم کی بدظنی رفع ہو سکتی ہی۔ وہ بیت یہ ہی:-

بنو بتگہ شہ دو ہندوے بام — یکے مقبل و دیگر اقبال نام

(خمسہ صفحہ ۳۳۱)

'مقبل' سے مراد اُن کے فرزند محمد اور 'اقبال' سے مُراد اقبال نامہ ہیں۔

قولہ "اس کتاب (سکندر نامہ) کی تصنیف کے وقت ان کی عمر ۶۳ برس کی تھی چنانچہ جہاں اور حکما کے مرنے کا الگ الگ عنوان قائم کیا ہی۔ اپنے نام کی بھی سرخی قائم کی ہی اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:-

نظامی چو ایں داستاں شد تمام — بعزم شدن تیز برداشت گام
فزوں بودشش مہ ز شصت و سہ سال — کہ بر عزم رہ بر دہل زد دوال

اس کتاب پر ان کی شاعری اور عمر دونوں کا خاتمہ ہوا یعنی سالِ وفات

میں سخت اختلاف ہی۔ دولت شاہی میں ۵۹۶ھ ہجری لکھا ہی لیکن
یہ خود نظامی کی تصریح کے خلاف ہی۔ تقی کاشی نے ۶۰۶ھ لکھا ہی
جامی ۵۹۲ھ بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس قدر قطعی ہی کہ ۵۹۹ھ ہجری
کے بعد ان کی وفات ہوئی ہی اور غالباً چھٹی صدی سے آگے نہیں بڑھے"

(شعر العجم صفحہ ۲۹۷ و ۲۹۸)

حکماے یونان کی وفات کے ذکر کے ساتھ اپنی وفات کا عنوان قائم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نظامی نے اسی عمر میں یا چھٹی صدی کے اندر اندر انتقال فرمایا۔ بحیثیت عاشق رسول اس میں شک نہیں کہ اس عمر میں انتقال کرنے کے لیے آرزو مند ضرور تھے۔ دوسرے انھوں نے حکماے یونان کے ساتھ اپنی ذات کو بھی شریک بنانا چاہا ہی۔ جہاں انھوں نے ان حکما کے مقالات کا ذکر کیا ہی اپنے مقالات بھی علیحدہ عنوان کے تحت میں دیدیے ہیں۔ اسی طرح ان کی وفات کے ساتھ اپنی وفات کا عنوان بھی باندھ دیا لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اس عہد سے ایک عرصے بعد تک زندہ رہے۔

بعض سکندر ناموں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پایا جاتا ہی کہ نظامی نہ صرف ساتویں صدی کے آغاز میں موجود تھے بلکہ اس کے پہلے عشرکا ایک معتد بہ حصّہ کم از کم طی کر چکے ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں :-

طرف دار موصل بہ مردانگی   قدر خان شاہاں بفرزانگی
سرِ سرفرازان و گردنکشاں   ملک عزّ دیں قاہرِ شہ نشاں
بطغرلے دولت چو طغرل تگیں[۱]   ابو الفتح مسعود دین نور دیں

نور الدین ارسلاں شاہ والیِ موصل سنہ ۶۰۷ ہجری میں وفات پاتا ہی

---

[۱] طغرل تگین انوری کا ممدوح ہی۔

اس کا فرزند الملک القاہر عزالدین مسعود اسی سال تخت نشین ہو کر ۶۱۵ھ
میں فوت ہوتا ہی (جامع التواریخ)۔ ان اشعار سے ثابت ہوتا ہی کہ نظامی نے
سکندر نامے کو عزالدین مسعود کے نام کے ساتھ بھی منسوب کیا ہی اور اس
احتمال کے لیے پوری گنجایش ہی کہ یہ انتساب نصرۃ الدین ابوبکر کی وفات
کے بعد جو ۶۰۷ھ ہجری میں واقع ہوتی ہی، عمل میں آیا ہوگا جب کہ دربار
اتابکی سے نظامی کے تعلقات منقطع ہو چکے ہیں۔

قولہ "قصیدے بہت ہیں لیکن ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔ سنائی
کا انداز ہی، اخلاق اور تصوف کو ترکیب دے کر کہتے ہیں۔ لیکن
سنائی کے بہت پیچھے ہیں، اس لیے مقبول نہ ہو سکے، البتہ ایک قطعہ
نہایت صاف شستہ اور پُر لطف کہا ہی جس کا آج تک جواب نہ
ہو سکا۔

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود — می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود
یا نبد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار — یا کہ من ہیچ کسم، ہیچ کسم در نکشود
پاسے از شب بگزشت (کذا) بیشترک یا کمتر — رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر است! دریں وقت کرا میخواہی — بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا، گفت برو ہرزہ مگو — کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود
ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند — کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش آئی زود
ایں خرابات مغان ست درو رندانند — شاہد و شمع و شراب و شکر و نای و سرود
ہرچہ در جملۂ آفاق دریں جا حاضر — مومن و برہمن و گبر و نصاریٰ و یہود
گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشاں بزنی — خاک پائے ہمہ شو، تا کہ بیابی مقصود

عصمت بخاری اور عرفی نے قوافی بدل کر اس کا جواب لکھا ہی لیکن

جواب نہ ہو سکا۔ (شعر العجم صفحہ ۳۰۰ و ۳۰۱)

نظامی کے قصائد اگر کبھی انھوں نے لکھے تھے، اب نہیں ملتے۔ آتشکدہ میں صرف دو قصیدوں سے بعض چیدہ اشعار نقل کیے گئے ہیں، یہ قطعہ جس کو غزل کہنا زیادہ صحیح ہوگا اس میں شک نہیں عام طور پر نظامی کی طرف منسوب ہی۔ آتشکدہ میں چنانچہ ان ہی کے نام پر دیا گیا ہی۔ بعد کے مولفین صاحب آتشکدہ کے پیرو ہیں۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اس باب میں مصنفین کو مغالطہ پیش آیا ہی، راقم کے پاس مولانا عراقی کا ایک دیوان ہی جو کم از کم آٹھویں قرن ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہی۔ اس دیوان میں یہ قطعہ جزوی اختلاف کے ساتھ مع عراقی کے تخلص کے موجود ہی جس کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہی:-

بخرابات شدم دوش مرا بار نبود — میزدم نعرہ و فریاد و زمن کس نشنود
یا نبد ہیچکس از بادہ فروشاں بیدار — یا خود از ہیچکسی ہیچکسم در نکشود
چونکہ یک نیمہ زشب یا کم یا بیش برفت — رندے از غرفہ برد ل کرد سر و رخ بنمود
گفت خیرست دریں وقت تو دیوانہ شدی — مغز پرداختی آخر بنگوئی کہ چہ بود
گفتمش در بگشا گفت برو ہرزہ مگوی — تا دریں وقت زبہر چو توے در کہ کشود
ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشائیم — تا تو اندر دوی و اندر صف پیش آئی زود
ایں خرابات مغانست و درو زندہ دلاں — شاہد و شمع و شراب و غزل و رود و سرود
(سر کوشان عرفانست و سراشان کعبہ — عاشقاں ہمچو خلیلہ و رقیباں نمرود)[۱]
زر و سر را نبود ہیچ دریں بقعہ محل — سود شاں جملہ زیانست و زیاں شاں ہمہ سود
ای عراقی چہ زنی حلقہ بریں در شب و روز — زیں ہمہ آتش خود ہیچ نہ بینی جز دود

---

[۱] یہ شعر داخل متن نہیں ہی بلکہ بعد میں کسی نے پہلوے غزل میں ایسے خط میں لکھا ہی جو دسویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہی۔

نظامی کے مقابلے میں عراقی کو اس غزل کا زیادہ مستحق مانا جا سکتا ہی میری دلیل صرف یہی ہی کہ اول تو وہ ایک ایسے نسخے[1] میں ملتی ہی جو اب سے تقریباً چھ سو سال پیشتر کا مرقومہ ہی اور یہ بھی ظاہر ہی کہ کتاب جس قدر قدیم ہی اسی قدر زیادہ معتبر ہی۔ علاوہ بریں اس غزل میں واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کیا گیا ہی یعنے خرابات۔ بادہ فروش۔ رند۔ مغاں۔ شاہد شمع۔ شراب اور سرود وغیرہ کا حقیقی اطلاق متصوفین کے نزدیک کچھ اور ہی جو ان الفاظ کے اصلی معنوں سے ظاہر نہیں ہوتا۔ مغربی فرماتے ہیں :-

---

[1] اس دیوان کے رسم الخط کی بعض خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں :- جب حرف ماقبل حرف علت ہی یا حرف صحیح متحرک ہی دال کو بالعموم ذال لکھا جاتا ہی مثلاً دیدی، شاد، باد، یابد، آمد اور بداں کو دیذی، شاذ، باذ، یابذ، آمذ اور بذاں مرقوم کیا ہی۔ است کا الف اکثر اوقات حذف کر دیا گیا ہی مثلاً خوش است۔ خیراست اور مسکین است کو خوشست۔ خیرست اور مسکینست لکھا ہی۔ آنچہ۔ چنانکہ اور آنکہ کو آنچ۔ چنانک اور آنک عام طور پر لکھا ہی۔ تا و یا کے نقاط پہلو بہ پہلو ایک ہی سطح پر ملا کے نہیں لکھے جاتے بلکہ علیحدہ علیحدہ مختلف سطحوں پر مثلاً ت اور ی کو یوں لکھا ہی ' ٽ '، ' ڍ '۔ علاوہ بریں یائے تحتانی کے اوپر نقاط لگانے کی رسم بھی جاری ہی مثلاً دیدی۔ دمیدی اور خمیدی کو دیذیٖ، دمیذیٖ، اور خمیدیٖ لکھا گیا ہی۔ کاف بیانیہ ہائے مختفی کے علاوہ یائے تحتانی کے ساتھ بھی لکھا جاتا ہی۔ جیم دکاف وبائے فارسی اور عربی میں کچھ امتیاز نہیں۔ جب با و یا یا نون و تا ساتھ آ گئے اُن کے نقاط کو بلا امتیاز ایک ہی جگہ لکھ دیا ہی مثلاً تنگنائے اور بپردں کو تنکنائے اور پبردں لکھا ہی۔ میم و دال مہملہ سین مہملہ و رائے مہملہ پر بعض اوقات التزاماً جزم دیا ہی اور ہائے ہوز کے شوشہ نہیں دیا جاتا۔

اگر بینی دریں دیوان اشعار | خرابات و خراباتی و خمار
بت و زنار و ناقوس و چلیپا | مغ و ترسا و گبر و دیر و مینا
شراب و شاہد و شمع شبستان | خروش بربط و آواز مستاں
مے و مے خانہ و رند خرابات | حریف و ساقی و مرد مناجات
خط و خال و قد و بالا و ابرو | عذار و زلف پیچاں پیچ گیسو
مشو زنہار ازاں گفتار درتاب | برو مقصود ازاں گفتار دریاب
مپیچ اندر سرو پائے عبارت | بہ بیں اشعار ارباب اشارت
کہ ہریک را ازیں الفاظ جانیست | بزیر ہر یکے پنہاں جہانیست

جذبات عرفاں کو مجاز کی زبان میں ادا کرنے کا طریقہ سب سے پیشتر سنائی سے شروع ہوتا ہو لیکن حقیقت یہ ہو کہ فارسی میں اس طریق کو مقبول بنانے والے شیخ فرید الدین عطار ہیں۔ ان کے ہاں اسرار عرفاں رندانہ طریق سخن میں ادا کیے گئے ہیں۔ گویا حقیقت کو مجاز کے پردے میں اور کعبہ کو صنم خانے کے آغوش میں چھپا دیا گیا ہو۔ عطار کے بعد مولانا روم اور ان کے بعد شیخ عراقی یہی رنگ اختیار کرتے ہیں۔ نشۂ عشق ان پر چھایا ہوا ہو۔ رندی اور سرمستی ان کی شاعری کی رُوح ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہر غزل اسی قسم کے جذبات سے معمور ہو۔

شیخ نظامی کے رزمیہ اشعار کی مثال میں مولانا شبلی نے ذیل کے دو شعر بھی درج کیے ہیں۔

ز سم ستوراں دراں پہن دشت | زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
فرو رفت و بر رفت روز نبرد | نم خوں بماہی و بر ماہ گرد

(شعر العجم صفحہ ۳۴۱)

درست یہ ہی کہ دونوں شعر فردوسی کے ہیں اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ شاہناموں میں ملتے ہیں۔ بیاض بندہ علی خاں میں فردوسی کے منتخب کلام میں یہ اشعار بھی موجود ہیں۔ اب بھی اگر کسی صاحب کو شبہہ ہو تو ذیل کا لطیفہ مخزن الغرائب[۵۱] سے جو سرخوش[۵۲] کے حالات میں درج ہی ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہی۔ واضح رہے کہ صاحب مخزن الغرائب سرخوش سے اس کے عجیب انداز خودستائی کی بنا پر ناراض ہیں لکھتے ہیں اور سرخوش کی عبارت نقل کرتے ہیں:۔

می گوید "شبے درخواب دیدم کہ روح من در سیر سماوات است شورے در گوش من می آید کہ احسنت و آفریں باد۔ ہیچ صورتے بہ نظر در نمی آید من پرسیدم کہ تحسین چہ چیز می کنند۔ گفتند بیتے از ملا نظامی گنجوی مقبول ملاء الاعلیٰ افتادہ کہ گفتہ:۔

زسم ستوراں دراں پہن دشت زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

گفتم شعر خود بلند است اما رزمیہ است ایں جا چہ مناسبت دارد۔ اینجا باید کہ شعر توحید و نعت درجۂ قبول یابد در خواب خندہ می کنم و می گویم کہ راست گفتہ اند کہ معلوم شد شعر فہمی عالم بالا۔" اس پر صاحب مخزن الغرائب ذیل کے الفاظ اضافہ کرتے ہیں "دروغ گو را حافظہ نباشد۔ ایں عزیز شعر فردوسی را بہ شیخ نظامی قرار دادہ و فرشتگان را بہ نسیاں منسوب نمودہ کہ شعر فردوسی را بنام شیخ نظامی گویند"۔

قولہ "۱۴ رمضان ۵۹۳ھ ہجری میں سلطان غیاث الدین کرب ارسلان علاء الدین اقسنقری کی فرمایش سے ہفت پیکر لکھی جس میں بہرام گور کا قصہ ہی"۔

(شعر العجم صفحہ ۲۹۶)

---

۵۱ احمد علی سندیلہ کی تصنیف ہی۔ ۵۲ کلمات الشعرا کا مصنف۔

نظامی نے اس بادشاہ کا نام علاء الدین کرب ارسلان دیا ہی۔ چنانچہ:-

عمدۃ المملکت علاء الدین حافظ و ناصر زمان و زمین

شاہ کرب ارسلان کشور گیر بہ ز البپ ارسلان بتاج و سریر

اس سے معلوم ہوتا ہی کہ لقب "غیاث الدین" اس کے نام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

یہ علاء الدین امیر مراغہ ہی وہ آقسنقر احمدیلی کے اسباط سے ہی جس کو باطنیوں نے ۵۲۷ھ میں قتل کیا ہی۔ خود علاء الدین کے متعلق اسی قدر معلوم ہی کہ ایتوغمش نے ۶۰۲ھ میں اس کا محاصرہ کیا تھا۔ راحت الصدور میں اس کو اتابک علاء الدین خداوند مراغہ لکھا ہی اور سلطان طغرل کے حالات میں دو مرتبہ اس کا ذکر آیا ہی۔

اگرچہ عام خیال ہی کہ بہرام نامہ علاء الدین کی فرمائش پر لکھا گیا ہی لیکن میرا عقیدہ ہی کہ نظامی نے اپنی خواہش سے اس کے نام پر منسوب کیا ہی۔ میرے مؤید یہ اشعار ہیں:-

چوں من الحق شناختم بہ قیاس کاہل فرہنگ را تو داری پاس

نخری زرق کیمیا سازاں نہ پزیری فریب طنازاں

نقش ایں کارنامۂ ابدی بر تو بستم بہ طالع اسدی

(ہفت پیکر طبع نول کشور صفحہ ۱۱ ۱۳۲۲ھ ہجری)

دیگر:-

ایں چنیں نامہ بر تو شاید بست کز تو جاے بلند نامی ہست

چونکہ شد لعل بستہ بر تاجش بر تو بستم ز بیم تاراجش

گر بسمع تو دل پسند بود چوں سریر تو ارجمند بود

(ہفت پیکر صفحہ ۱۱۳ طبع نول کشور ۱۳۲۲ھ ہجری)

نظامی نے یہ کتاب ایک خط کے ساتھ علاء الدین کے پاس جب وہ روئیں دژ میں مقیم تھا بھیجی تھی۔

قولہ "قصیدے میں ان کی یہ خصوصیت لحاظ کے قابل ہو کہ اگرچہ ان کو مختلف درباروں سے تعلق تھا اور جس قدر مثنویاں لکھیں سب کسی نہ کسی فرماں روا کے نام پر لکھیں تاہم قصیدے کو انھوں نے مداحی سے آزاد رکھا اور یہ بتایا کہ شعر کی اس عمدہ صفت سے اور بھی مفید کام لیے جا سکتے ہیں لیکن افسوس ہو کہ ان کے نقش قدم پر کوئی نہیں چلا۔"
(شعر العجم صفحہ ۳۰۲)

جب مثنوی کے میدان ہی میں شیخ نظامی سلاطین کی مدح سرائی سے باز نہیں آتے تو قصائد کے میدان میں خدا جانے کیا قیامت ڈھاتے ہوں گے۔ خود مولانا شبلی فرماتے ہیں "مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جن کے آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں .... پادشاہوں کے سامنے اپنے آپ کو جس حیثیت سے پیش کرتے ہیں وہی ہوتی ہو جو گدا پیشہ شاعروں کا انداز ہی۔ یعنی حضور کا نمک خوار ہوں، غلام ہوں، بندۂ درگاہ ہوں، حضور کی ذرا سی توجہ سے میرے کام بن جائیں گے۔"

(شعر العجم صفحہ ۹۸-۲۹۹)

لیکن سوال یہ ہو کہ انھوں نے قصائد لکھے بھی ہیں یا نہیں۔ عوفی کا بیان ہو کہ مثنویاں یادگار ہیں باقی جنس کلام سُنی نہیں گئی۔ خود نظامی کے بیان سے معلوم ہوتا ہو کہ غزلیں اور ضرورتاً قصائد بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے اپنے دیوان کا ذکر بھی کیا ہو لیکن آج سب ذخیرہ ناپید ہو۔ (لیلی مجنوں)

گر سازکنم قصائد چیست — او بیش نہد قلائد سست

(ہمیشہ صفحہ ۱۲۳)

قزل ارسلان کے دربار میں قصیدہ لکھ کر لے گئے ہیں۔ (خسرو شیریں)

ثنائے کاں بساط از گنج شد پر ۔۔۔ درآمد راوی دبر خواند چوں در (خسرو صفحہ ۱۹۲)

بہرحال قصیدے جو کچھ لکھے آج نہیں ملتے اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ قصیدوں میں اُن کا انداز مداحیہ تھا یا حکمیہ۔ ایک قصیدہ جس کی ابتدا ہو مصرع ملک الملوک فضلم بفضیلت معانی الخ البتہ ان کی طرف منسوب ہو۔

نظامی کے حالات

نظامی کے حالات و مقولات سے اگرچہ مجھ کو کافی مزاولت نہیں تاہم سرسری مطالعے میں جو جو باتیں میری نظر سے گزریں۔ یہاں ذکر کرتا ہوں:۔

شیخ کی کم سنی میں ان کے والد یوسف کا انتقال ہوگیا ہو۔ ان کی ایک نصیحت کتاب شیریں خسرو میں قلم بند کی ہو ؎

مرا پیرانہ پندے داد مشہور ۔۔۔ پدر کز من روانش باد پُر نور

وطن در کوے صاحب دولتاں گیر ۔۔۔ کہ از بید ولتاں بگریز چوں تیر

(خمسہ صفحہ ۱۸۳)

والدہ ایک کُرد خاندان کی رئیسہ تھیں اور ان ہی نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ (لیلیٰ مجنوں)

مادر صفتانہ پیش من مرد ۔۔۔ گر مادر من رئیسہ کُرد

گرداب فزوں ز قد مردست ۔۔۔ غم بیشتر از قیاس خوردست

(خمسہ صفحہ ۱۴)

ایک ماموں بھی تھے جن کا نام خواجہ حسن یا عمر[1] تھا۔ یہ ان کی بیشتر

[1] لیلیٰ مجنوں طبع نول کشور ۱۳۳۲ھ ہجری میں خواجہ عمر لکھا ہو۔

ضروریات کے کفیل تھے۔ (لیلیٰ مجنوں)

کو خواجہ حسن کہ خال من بود | خالی شد نقش وبال من بود

(خمسہ صفحہ ۲۰۹)

ازواج کے متعلق یہ یاد رہے کہ ان کی تین بیویاں تھیں اور اگر زائد بھی ہوں تو تعجب نہیں۔ لیکن یہ سب کنیزیں تھیں اور سب کا انتقال ان کی زندگی میں ہوا۔ زیادہ بدنصیبی کی بات یہ ہی کہ مثنویاں بیویوں کے حق میں منحوس ثابت ہوئیں۔ پہلی کنیز[1] جن کو شاہ دربند نے ان کی خدمت میں بھیجا تھا 'شیریں خسرو' کی ولادت پر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئیں۔ شیریں کی وفات کے موقعے پر شیخ نے ان کا مرثیہ لکھا ہی :۔

سبک رو چوں بت خفچاق من بود | گماں افتاد خود کافاق من بود
ہمایوں پیکرے نغز و خردمند | فرستادہ بہ من دارائے دربند
چو ترکاں گشتہ سوئے کوچ محتاج | بہ ترکی دادہ رختم را بہ تاراج

(خمسہ صفحہ ۱۱۸)

دوسری بیوی لیلیٰ مجنوں کی تصنیف کے دَور میں داغِ مفارقت دے گئیں۔ (اقبال نامہ)

چو بر گنج لیلیٰ کشیدم حصار | دِگر گوہرے کردم آنجا نثار

(خمسہ صفحہ ۲۶۷)

شرف نامے کے اختتام کے بعد تیسری بیوی رحلت کر گئیں۔ اقبال نامے

---

[1] محمد ان ہی کے بطن سے معلوم ہوتے ہیں ؎

اگر شد ترکم از خرگہ نہانی | خدایا ترک زادم را تو دانی

(خمسہ صفحہ ۱۱۸)

میں مرثیہ موجود ہی :-

فلک پیشتر زانکہ آزادہ بود ازاں بہ کنیزے مرا دادہ بود
ہماں مہر و خدمتگری پیشہ داشت ہماں کاردانی در اندیشہ داشت
پیادہ نہادہ رخش ماہ را فرس طرح کردہ بسے شاہ را
خجستہ گلے خون من خورد او بجز من نکس در جہاں مرد او
چو چشم مرا چشمۂ نور کرد زچشم منش چشم بد دور کرد
رباینده چرخ آں چنانش ربود کہ گفتی کہ تا بود ہرگز نبود
بخوشنودی کاں مرا بود ازو چگویم خدا باد خوشنود ازو

(خمسہ صفحہ ۲۶۶)

خود فرماتے ہیں کہ بیویوں کے معاملے میں بڑا بدقسمت ہوں جہاں ایک نئی مثنوی لکھنے بیٹھا ایک بیوی کی قربانی دینی پڑی:-

مرا طالع طرفہ ہست از سخن کہ چوں نوکنم داستانِ کہن
در آں عہد کاں شکر افشاں کنم عروس شکر خندہ قرباں کنم
ندانم کہ با داغ چندیں عروس چگونہ کنم قصۂ روم و روس

(خمسہ صفحہ ۲۶۶)

اولاد میں صرف ایک فرزند کا ذکر کرتے ہیں جن کا نام محمد تھا۔ ان کے سوا کوئی اور اولاد نہ تھی۔ شیریں خسرو میں سب سے پہلے ان کا ذکر آتا ہی جب سات سال کے تھے۔

ببیں اے ہفت سالہ قرۃ العین بمقام خویشتن در قاب قوسین
منت پروردم و روزی خدا داد نہ بر تو نام من نام خدا باد

(خمسہ صفحہ ۱۷۸)

لیلیٰ مجنوں کی تصنیف کے وقت ان کی عمر چودہ سال تھی:

اے چاردہ سالہ قرۃ العین | بالغ نظرے علوم کونین
آں روز کہ ہفت سالہ بودی | چوں گل بہ چمن حوالہ بودی
واکنوں کہ بچاردہ رسیدی | چوں سرو باوج سرکشیدی

(خمسہ صفحہ ۲۰۰)

سکندر نامہ کی ابتدا کے وقت محمد سترہ سال کے تھے:

وزیں ہفدہ خصل آوریدن بدست | شدہ ہفدہ سالہ بدینساں کہ ہست

محمد عوفی نے لباب الالباب میں نظامی کے اشعار ان کے فرزند کے مرثیہ سے نقل کیے ہیں۔ جو یہ ہیں ؎

اے شدہ ہمسر خوبانِ بہشت | آں چناں عارض و آنگہ برخشت
برنخ عمر بسر کردن خوش | دوزخی ناشدہ رفتی بہ بہشت
خط نیاوردہ بتو عمر ہنوز | ایں قضا برسرت آخر کہ نوشت
چہ عجب گر شود اے جان جہاں | خاک از دیدۂ من خوں آغشت
سبزہ زار خطت اندر خاکست | آب کے باز تواں داد بکشت

(لباب الالباب طبع یورپ صفحہ ۳۹)

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمد ہی ہیں جو نوجوان انتقال کرتے ہیں۔ لیکن ان کی وفات کا حادثہ اقبال نامہ کے اختتام کے بعد تصور کرنا چاہیے۔ شیخ نظامی مثنویات کے مشغلے اور عزلت گزینی سے قبل ایک زمانے تک دربار داری کرتے رہے ہیں۔ (بہرام نامہ)

منکہ سرسبزیم نماند چو بید | لالہ زرد و بنفشہ گشت سفید
باز ماندم زنا تنومندی | از کلہ داری و کمربندی

خدمتے مرد وار می کردم راستی را کنوں نہ آں مردم
روزگارم گرفت و بست چنیں عادت روزگار ہست چنیں
نافتادہ شکستہ بودم بال چوں فتادم چگونہ باشد حال
(خمسہ صفحہ ۱۱)

مخزن اسرار کے وقت ان کی عمر از روے حساب سینتیس سال ہونی چاہیے کیوں کہ میرے خیال میں یہ نظم سنہ ۵۷۲-۷۳ھ ہجری میں لکھی گئی ہو۔ شیریں خسرو کے وقت پورے چالیس سال کے تھے۔ چنانچہ:

پس از پنجاہ چلہ در چہل سال مزن پنجہ بریں حرف ورق مال
(خمسہ صفحہ ۵۹)

دوسرے موقع پر کہا ہے ؎
چو در عہد چہل سال از کم وبیش رسد گوئی چناں را آں چناں پیش
(خمسہ صفحہ ۵۷)

بچاس سالہ عمر کی طرف بھی اس میں اشارے موجود ہیں ؎
بدیں پنجاہ سالہ حقہ بازی بدیں یک مہرہ گل تا چند بازی
نہ پنجہ سال اگر پنجہ ہزار است قلم درکش کہ ہم ناپایدار است
(خمسہ صفحہ ۳۲)

لیلیٰ مجنوں کے وقت انچاس سال کے تھے۔ بہرام نامہ کے وقت جو سنہ ۵۹۳ ہجری میں اختتام پذیر ہوتا ہو ان کی عمر اٹھاون سال کے قریب ہونی چاہیے۔

شرف نامہ سنہ ۵۹۶ھ میں اور اقبال نامہ سنہ ۵۹۹ ہجری میں ختم ہوتے ہیں۔ اس تصنیف نے سب سے زیادہ وقت لیا ہو۔ بچاس برس کی عمر میں

اس کو شروع کرتے ہیں اور ترسٹھ سال کے سن میں انجام کو پہنچاتے ہیں۔
پچاس سالہ عمر کی طرف اشارہ یہ ہی:

چو تاریخ پنجہ در آمد بسال   دگر گونہ شد بر شتابندہ حال

(خمسہ صفحہ ۱۲۳)

ستاون سال کی طرف تلمیح شعر ذیل میں موجود ہی۔ اقبال نامہ:

ہنوزم بہ پنجاہ و ہفت از قیاس   درم بر ترازو نہد حق شناس

(خمسہ صفحہ ۳۳۲)

ساٹھ سال کا ذکر یوں کیا ہی۔ اقبال نامہ:۔

بہ شصت آمد اندازۂ سال من   نگشت از خود اندازۂ حال من

(خمسہ صفحہ ۳۳۲)

اور سب سے آخر تریسٹھ برس کی عمر کا بیان ملتا ہی۔ اقبال نامہ:

فزوں بود شش مہ ز شصت و سہ سال   کہ برعزم رہ بر دہل زد دوال

(خمسہ صفحہ ۳۳۰)

اس طرح دیکھا جاتا ہی کہ نظامی نے پچیس چھبیس سال خمسہ کی تصنیف پر صرف کیے ہیں لیکن اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ وہ بغیر کسی اور مشغلے کے مسلسل اسی کام پر مصروف رہے۔ یہ صورت بھی واقع ہوئی ہی کہ ابھی ایک کتاب ختم ہونے ہنیں پائی ہی کہ دوسری کی داغ بیل ڈال دی اور پھر دوسری کو چھوڑ کر پہلی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شیریں خسرو لیلیٰ مجنوں سے اور سکندر نامہ بہرام نامے سے بہت پہلے شروع کیے جاتے ہیں لیکن ان کے اختتام کے ایک عرصے بعد تکمیل پاتے ہیں۔

شیریں خسرو ایک ایسی کتاب ہی جس کی تاریخ تصنیف اچھی طرح

معلوم نہیں۔ ایک شعر سے ۵۷۶ھ ہجری دیا گیا ہے:

گزشتہ پانصد و ہفتاد و شش سال ۔۔ نزد بر خط خوباں کس چنیں فال

(خمسہ صفحہ ۱۸۹)

اور خیال کیا گیا ہے کہ یہ خاتمے کی تاریخ ہے لیکن یہ عقیدہ درست نہیں یہ اس مثنوی کی ابتدا یا اس کی پہلی اشاعت کی تاریخ ہے۔ طغرل بن ارسلان ۵۷۱ھ ۔ ۵۷۰ھ ہجری کی تخت نشینی کے ساتھ ساتھ اس کتاب پر قلم اُٹھایا جاتا ہے:

ملک طغرل کہ دارائے وجود است ۔۔ سپہر دولت و دریائے جود است

بسلطانی بتاج و تخت پیوست ۔۔ بجائے ارسلاں بر تخت بنشست

من ایں گنجینہ را در می کشادم ۔۔ اساس ایں عمارت می نہادم

(خمسہ صفحہ ۵۴)

ابتدا میں ان کا ارادہ تھا کہ ایک نسخہ طغرل کی خدمت میں بھیجیں اور اس سے اتابک شمس الدین ابو جعفر محمد کے نام سفارش کرائیں:

بداں لفظ بلند گوہر افشاں ۔۔ کہ جان عالم است و عالم جاں

اتابک را بگوید کاے جہانگیر ۔۔ نظامی واں گہے صد گونہ تقصیر

کہ آمد وقت آں کو را نوازیم ۔۔ ز کار افتادۂ را چارہ سازیم

چنیں گویندۂ در گوشہ تاچند ۔۔ سخندانے چنیں بے توشہ تاچند

کنوں عمر یست کیں مرغ سخن سنج ۔۔ بشکر نعمت ما می برد رنج

بداں سر کز سریر عرش بیش است ۔۔ کہ گر ہنو ز لیتی بجائے خویش است

(خمسہ صفحہ ۵۴)

کتاب ختم ہونے کے بعد وہ کچھ مدت طغرل کی خدمت میں پیش کرنے

کے لیے منتظر بھی رہے:

بدیں نیکو کہ مقصود دل آمد — بکم مدت مرادم حاصل آمد
درنگ از بہر آں افتاد درراہ — کہ تا فارغ شود از شغل ہا شاہ
بفتح ہفت کشور سر بر آرد — سر نہ چرخ را در چنبر آرد
تنکوہش چتر بر گردوں رساند — سمندش گرد بر جیحوں جہاند

(خمسہ صفحہ ۵۴)

معلوم ایسا ہوتا ہی کہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور کچھ عرصے کے بعد خود ہی کتاب لے کر اتابک شمس الدین کے دربار میں حاضر ہوئے اور مدعاے دلی اِن اشعار میں ادا کیا:-

بدستوری حدیثے چند کوتاہ — بخوانم من اگر فرماں دہد شاہ
من شب خیز کز پیکانِ راہم — جرس جنباں ہاروناں شاہم
بہ عرض بندگی دیر آمدم دیر — اگر دیر آمدم شیر آمدم شیر
چہ خوش گفت آں سخن گرگے جہانگرد — کہ دیر آے و درست آے جوانمرد

غیر حاضری کی معافی اس لیے مانگی جارہی ہی کہ گنجہ کچھ عرصے قبل اتابک کے قبضے میں آچکا ہی:

زگنجہ فتح خوزستان کہ کرد است — زعمّاں تا باصفاہاں کہ خورد است

(خمسہ صفحہ ۵۵)

اور نظامی اس وقت سے اب تک اس کے دربار میں حاضر نہیں ہوئے ہیں۔ کتاب پیش کرتے وقت کہتے ہیں:

دریں اندیشہ بودم مدتے چند — کہ نزلے سازم از بہر خداوند
نبودم تحفۂ جے پال و فغفور — کہ پیش آرم زمیں را بسم از دور

بدیں مشتے خیالے فکرت انگیز — بساط بوسہ گہ کردم شکر ریز
اگر چہ مور قرباں را نشاید — مگس نزل سلیماں را نشاید
نبود آبے جزیں در مغز میغم — وگر بودے نبودے ہم دریغم

(خمسہ صفحہ ۵۶)

چونکہ کتاب قزل ارسلان کے بڑے بھائی اتابک محمد کے نام معنون کرتے ہیں، قزل ارسلان سے اس کی معذرت میں کہتے ہیں:

کہ گر بودم زخدمت دور یک چند — نبودم فارغ از شغل خداوند
کمر بستم بہ تعلیم فسانہ — بدیں خدمت ترا کردم نشانہ
چو شد پرداختہ در سلک اوراق — مسجل شد بنام شاہ آفاق

اس انتساب کی وجہ صرف یہ ہو کہ چونکہ آپ ہر ایک چیز اپنے بھائی کے نام کے ساتھ نسبت دینے کے خواہش مند ہیں اس لیے میں نے پیش بینی کرکے اس کو انہی کے نام پر معنون کیا:

چو دانستم کہ ایں جمشید ثانی — کہ بادش تا قیامت زندگانی
اگر یک برگ گل بیند دریں باغ — بنام شاہ آفاقش کند داغ
مرا ایں رہنمونی بخت فرمود — کہ تا شہ باشد ازیں بندہ خوشنود

(خمسہ صفحہ ۵۷)

اتابک محمدؒ نے شیریں خسرو کے صلے میں دو گانو تجویز کیے تھے۔ لیکن ابھی سند تیار نہیں ہوئی تھی کہ اتابک کا ۵۸۲ھ ہجری میں انتقال ہوگیا۔ قزل ارسلان ان حالات سے باخبر تھا لہٰذا اس نے تخت نشینی کے بعد ایک موقع پر جب گنجہ سے ۳۰ فرسنگ کے فاصلے پر خیمہ زن تھا۔ قاصد بھیج کر ان کو بلایا۔ جب دربار میں آئے بڑا احترام کیا اور موضع حمدونیاں

انعام میں دے دیا۔ نظامی کی یہ خواہش تھی کہ ایک گانو سلطان دے اور دوسرا شہزادوں سے دلوائے۔

یکے دہ زاں دو، شہ را داد باید خود از شہزادگاں دیگر کشاید

(خمسہ صفحہ ۱۲۵)

دوسرا گانو ان کو شاید کبھی نہیں ملا۔ اسی اثنا میں قزل ارسلان ایک شب اپنے بستر پر مقتول پایا جاتا ہی اس کے جسم پر چھریوں کے پچاس زخم تھے۔ یہ واقعہ بقول صاحب جامع التواریخ شوال ۵۸۷ھ میں پیش آیا:

بسلطانی چو شہ نوبت فرو کوفت غبار فتنہ از گیتی فرو روفت
تنگوہش پنج نوبت بر فلک زد نفاذش گرد ہفت اقلیم را خورد
خروش طبل گفتی تا دو میل است کہ میدانست کاں طبل رحیل است
بداں اورنگش آرام اندکے بود چو برقش زادن و مردن یکے بود
برے ناخوردہ ز ایامِ جوانی چو ذوالقرنین ز آبِ زندگانی
شہادت یافت از زخم بداندیش کہ باشد آں جہانش زیں جہاں بیش

(خمسہ صفحہ ۱۹۳)

قزل ارسلان صرف پانچ سال یعنے سنہ ۵۸۲ ہجری سے ۵۸۷ھ تک حکومت کرتا ہی۔ شاعر نے اس کو پنج نوبت کے نام سے اور اس کے مارے جانے کے واقعے کو 'شہادت یافت' سے تعبیر کیا ہی۔ نصرۃ الدین ابوبکر ۵۸۷ھ و ۶۰۷ھ ہجری اس کا قائم مقام ہوتا ہی اور شاعر بھی اپنی تصنیف کو اسی نئے اتابک کے ذکر پر ختم کرتا ہی:

گر اورا سوئے گوہر گرم شد جائے نسب دارانِ گوہر باد بر پائے

خصوصاً وارث اعمار شاہاں | نظرگاہ دعاے نیک خواہاں
مؤید نصرۃ الدین کافرینش | ز نام او پزیرد نقش بینش
پناہ خسرواں اعظم اتابک | فریدوں وار بر عالم مبارک
ابوبکر محمدؐ کز سر داد | ابوبکر و محمدؐ زوشدہ شاد

(خمسہ صفحہ ۹۳-۹۴)

اسی طرح سکندرنامے کی بھی مختلف اشاعتیں مختلف سلاطین کے نام ہیں۔ سب سے قدیم وہ اشاعت ہی جو ملک عزالدین مسعود خلف قطب الدین مودود والی موصل ۵۷۶ھ و ۵۸۹ھ کے نام پر منسوب ہی چنانچہ یہ اشعار:

ملک عزدیں آنکہ چرخ بلند | باو داد اورنگ خودرا کمند

اس عقیدے کا موید یہ امر ہی کہ نظامی اپنی عمر بچاس سال اور اپنے فرزند محمدؐ کی عمر سترہ سال بتاتے ہیں۔ باپ بیٹوں کی عمر کی طرف اشارے سے ظاہر ہی کہ سکندرنامے کی بنیاد سنہ ۵۸۵-۵۸۷ ہجری کے مابین رکھی جاچکی ہی۔ یہی کتاب بعد میں جلال الدین اختسان کے فرزند سے منسوب ہوئی ہی:

اگر شد بہی سروشہ اختسان | تو سرسبز بادی دریں گلستان
گر او داشت از نعمتم بہرہ مند | رساند از زمینم بچرخ بلند
تو زاں بہتر و برترم داشتی | در باغ را بستہ نگذاشتی
مرا از کریمان صاحب زماں | توئی ماندہ باقی کہ باقی بماں

(شرف نامہ خمسہ صفحہ ۱۹۶)

اس کی آخری اشاعت اتابک نصرۃ الدین ابوبکر کی خدمت میں

پیش کی جاتی ہی اور سنہ ۶۰۷ ہجری میں اس کی وفات کے بعد نظامی اسی کتاب کو نورالدین ارسلان شاہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں جیسا کہ گزشتہ سطور میں گزارش ہوچکا ہی۔

سنہ ۵۹۰ ہجری میں عراق میں ایک خوفناک زلزلہ آیا تھا جس سے بے شمار جانیں تلف ہوئیں اور مختلف شہروں کی عمارات کو نقصان پہنچا نظامی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ (اقبال نامہ)

ازاں زلزلہ کاسماں را درید — شدہ شہرہا در زمیں ناپدید
چناں لرزہ افتاد بر کوہ و دشت — کہ گرد از گریبان گردوں گزشت
زمیں گشت چوں آسماں بے قرار — معلق زن از بازیٔ روزگار
برآمد یکے صدمہ از نفخ صور — کہ ماہی شد از کوہہ گاہ دور
فلک را سلاسل زہم بر گسست — زمیں را مفاصل بہم در شکست
جہاں را چناں درہم افشرد سخت — کز افشردگی کوہ شد لخت لخت
زبس گنج کانروز برباد رفت — شب شنبہ را گنجہ از یاد رفت[1]
زچنداں زن و مرد و برنا و پیر — بروں نامد آوازۂ جز نفیر
بکم مدت آں مرز ویران و بوم — بفر تو آباد تر شد ز روم

(خمسہ صفحہ ۲۵۸)

ان کے ہاں طوفانِ باد کی طرف بھی تلمیح ہی۔ قزل ارسلان کی مدح میں اپنی ذات کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر طوفان بادی سہمناک است — سلیمانے چنیں داری چہ باکست
ضعیف ایں قراں مارا چہ بیم است — کہ دارا دادگر داور رحیم است

---

[1] اس مصرع کا ایک نسخہ یوں بھی ہی "شہنشاہ را گنج از یاد رفت"

قرانے را کہ با ایں داد باشد | چو فالِ او مبارک، باد باشد
(خمسہ صفحہ ۵۷)

دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

نگہ دارم بہ چندیں اوستادی | چراغے را دریں طوفان بادی
(خمسہ صفحہ ۱۹۰)

یہ طوفان جس کے سلسلے میں انوری متاخرین میں ناحق بدنام ہے۔ ۲۹ جمادی الثانی ۵۸۲ھ ہجری میں توقع کیا جا رہا تھا۔ زیادہ تر اہل تنجیم اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں لیکن شعرا بالعموم اس کے معتقد نہیں ہیں۔ مثلاً انوری۔ظہیر۔نظامی اور کمال اسمٰعیل۔

سلطان محمود اور فردوسی کے واقعات کی طرف ایک سے زیادہ موقعے پر نظامی نے اشارہ کیا ہے۔ شیریں خسرو میں فرماتے ہیں ؎

گرت خواہیم کردن حق شناسی | نخواہی کردن آخر ناسپاسی
وگر با تو رہ ناساز گیریم | چو فردوسی ز مزدت باز گیریم
فقاعے را تو دانی سر کشادن | توانی مہر تیغ از زر کشادن
(خمسہ صفحہ ۵۳)

بہرام نامے کی تمہید میں اشارہ ہوا ہے:۔

در سخا و سخن چو می پیچم | کار بر طالع است من ہیچم
نسبت عقربی است یا قوسی | بخل محمود و بذل فردوسی
اسدی را کہ جود او بنواخت | طالع و طالعے بہم در ساخت
(خمسہ صفحہ ٦)

شرف نامے کے خاتمے میں ممدوح کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے:

زر بیلوار از تو مقصود نیست | کہ بیل تو چوں بیل محمود نیست

اقبال نامہ میں فرماتے ہیں:-

بیاد نظامی یکے طاس کو | غوری ہم بآئین کاؤس کو
ستانی بایں طاس طوسی نواز | حق شاہ نامہ ز محمود باز
دو وارث شمار از دو کان کہن | ترا در سخا و مرا در سخن
بوامی کہ نا دادہ باشد نخست | حق وارث از وارث آید درست

(خمسہ صفحہ ۲۵۹)

ان ابیات سے اگرچہ کوئی نئی اطلاع بہم نہیں پہنچی - تاہم اتنا پتا چل گیا کہ نظامی کے عہد میں فردوسی کی ناکامی کا افسانہ عام طور پر رائج تھا اگرچہ سلطان کی بیل بار انعام بخشیوں کے قصّے بھی ساتھ ساتھ مشہور تھے۔ فردوسی کے سلسلے میں اسدی کے ذکر سے یہ بات صاف ہی کہ نظامی کا مقصد صاحب گرشاسپ نامے سے نہیں ہی بلکہ اسدی کلاں سے - گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ ہجری میں ابو دلف والیٔ اراں کے لیے لکھا گیا ہی اور سلطان محمود سے اس کتاب کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا - اسدی کلاں کے حق میں محمود کی فیاضی کا قصہ ہم تک نہیں پہنچا ہی اور گردش ایام کے دراز سفر کے مراحل میں تاریخ کی یادداشت سے محو ہو گیا ہی -

یہ خیال کہ نظامی ہمیشہ گوشۂ عزلت میں مقیم رہے اور سلاطین کے دربار میں نہیں گئے صحیح نہیں معلوم ہوتا[۱] - اوّل تو ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیے

---

[۱] اگرچہ اس عقیدے کے خلاف یہ شعر ہیں - بہرام نامہ:-

چوں بعہد جوانی از بر تو | بر درکس نرفتم از در تو
ہمہ را بر درم فرستادی | من نمی خواستم تو میدادی

کہ مثنوی نگاری کا سلسلہ وہ اپنی عمر کے سینتیسویں سال سے شروع کرتے ہیں۔ اس سے پیشتر آخر وہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے؟ اگرچہ ظاہر ہی کہ ایسے اعلیٰ دماغ اور روشن طبیعت کا شخص اتنی عمر تک بغیر کسی شغل کے نہیں رہ سکتا۔ بعض ابیات سے جو اس سے پیشتر مرقوم ہو چکے ہیں، پایا جاتا ہی کہ کسی نہ کسی دربار سے ان کا تعلق ضرور رہا ہی۔ سکندر نامہ کے ایک بیت سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہی:

زشاہان گیتی دریں غار ژرف کرا بود چون من حریفے شگرف

زمانۂ عزلت میں بھی سلاطین سے تعلق رکھنا اسی امر کی دلیل ہی کہ ایام شباب میں ایک عرصے تک مجلس سلاطین کے حاشیہ نشین رہے ہیں۔

جیساکہ ان کے ابیات سے پایا جاتا ہی۔ اتابک محمدؐ اور اس کے بھائی قزل ارسلان کے ہاں حاضر ہوئے ہیں۔ فخر الدین بہرام شاہ کے دربار میں گئے ہیں اور پھر جانے کا قصد کر رہے ہیں کہ اتنے میں دشمن کی فوجوں نے گنجہ کا محاصرہ کر لیا اس لیے انھیں اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا (مخزن اسرار)

بود بسیجم کہ دریں یک دو ماہ تازہ کنم عہد زمیں بوس شاہ

گرچہ دریں حلقہ کہ پیوستہ اند راہ بروں آمدنم بستہ اند

پیش تو از بہر فزوں آمدن خواستم از پوست بروں آمدن

باز چو دیدم ہمہ رہ شیر بود پیش دلیسم دشنہ و شمشیر بود

لیک دریں خطۂ شمشیر بند بر تو کنم خطبہ بنامم بلند

(خمسہ صفحہ ۱۲)

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ طبعاً گوشہ پسند تھے (شیریں خسرو)

چو مشک از نافِ عزلت بو گرفتم بہ تنہائی چو عنقا خو گرفتم

لیکن عمر کے پچاس مراحل طے کرنے کے بعد بھی کبھی کبھی باہر نکلنے اور لوگوں سے ملنے کا ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے :-

بروں آرے زیں پردۂ ہفت رنگ
که زنگی بود آئینه زیر زنگ

نہ گوگرد سرخی نہ لعل سپید
کہ جوینده باشد ز تو نا امید

(خمسہ صفحہ ۱۲۲)

دیگر

توانم در زہد بر دوختن
ببزم آمدن مجلس افروختن

(خمسہ صفحہ ۱۲۴)

لیکن پھر اپنے طبعی رجحان سے مجبور ہو جاتے ہیں۔ (شرف نامہ)

ولیکن درخت من از گوشہ رست
ز جا گر بجنبم شود بیخ سست

(خمسہ صفحہ ۱۲۴)

بعض لوگوں نے اُن کے کلام کی دزدی بھی کی ہے اور لطف یہ ہے کہ ان کی متاع کے سارقوں نے خود انھیں سارق مشہور کر دیا۔ (لیلیٰ مجنوں)

دزد در من بجاے مرد است
بد گویدم ایں چہ جاے درد است

دزداں چو بکوے دزد پویند
در کوے دوند و دزد گویند

گر دزدیِ من حلال باشد
بد گفتن من وبال باشد

او دزد و منش گزارم از شرم
دزدے خجل است آں بہ آزرم

نے نے چو بگدیہ دل نہادہ است
گو خیز و بیا کہ در کشادہ است

گنج دو جہاں در آستینم
در دزدے مفلسی چہ بینم

واجب صدقہ ام بزیر دستاں
گو خواہ بدزد و خواہ بستاں

(خمسہ ۲۰۷)

ایک اور مقام پر فرمایا ہے۔ (شرف نامہ)

برین چار سو چوں نہم دستگاہ | کہ ایمن نباشم ز دزدان راہ
چو دریا چرا ترسم از قطرہ دزد | کہ ابرم دہد بیش ازاں دستمزد
سیاہاں کہ تاراج رہ می کنند | بدزدی جہاں را سیہ می کنند
بروز آتشے بر نیارند گرم | کہ دارد ہمی دیدہ از دیدہ شرم
دبیراں نگر تا بروز سفید | قلم چوں تراشند از مشک بید
نہان مرا کاشکارا برند | زگنجیست اگر تا بخارا برند
بہ ارمن گزارم کہ خود روزگار | بہر نیک و بد باشد آموزگار

(خمسہ صفحہ ۱۲۲)

کلام پر تبصرہ

نظامی نے اپنی طبیعت کی رنگینی اور مشکل پسندی سے مثنوی گوئی کو ایک ایسے معراج کمال تک پہنچایا ہی جس تک نہ قدما کے پیک تخیل کی رسائی ہوئی اور نہ متاخرین کا طائر وہم پہنچ سکا۔ امیر خسرو اور مولانا جامی نے اس مقام تک پرواز کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن حق یہ ہی کہ نظامی کے ایوان بلند تک نہیں پہنچ سکے۔

منکہ دریں مرحلہ شاں ماندہ ام | قدرے ازاں بیشترک راندہ ام

ان کا طرز وہی ہی جو منوچہری۔ قطران تبریزی۔ قوامی مطرزی اور خاقانی کا ہی۔ یہ دلبستانِ شعرا جس کو عراقی دبستان کہا جا سکتا ہی اپنے بلند تخیل، غیر ضروری تکلف، مشکل پسندی، صنائع و بدائع، شوکت الفاظ اور مستعار گوئی کے لیے مشہور ہی۔ لیکن نظامی کی جدت یہ ہی کہ انھوں نے قصیدے

کی زبان کو مثنوی کے میدان میں کامیابی کے ساتھ برتا۔ صنعت پرستی، نئی نئی ترکیبوں، جدید تشبیہات، کنایات و استعارات نے ان کے کلام کو دقیق اور مشکل کر دیا ہی۔ وہ ایک خیال کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرنا نہیں جانتے بلکہ پیچ دے کر اس کو ایک دل فریب پیرائے میں ادا کرتے ہیں۔ تلاش اور موشگافی قدم قدم پر نمایاں ہی جس کے اثر میں بعض اوقات الفاظ و معنی میں تصادم ہوجاتا ہی اور شعر ایک معابن کررہ جاتا ہی۔

آورد کے ذوق میں آمد سے بالکل بیزار ہیں۔ ان کی رائے میں شعر وہی ہی جو بے حد تلاش اور جگر کاوی کے بعد دستیاب ہو۔ (شرف نامہ)

سخن گفتن و بکر جاں سفتن است ‏ ‏ نہ ہر کس سزائے سخن گفتن است

بدیں دل فریبی سخنہائے بکر ‏ ‏ بسختی تواں زادن از راہ فکر

(خمسہ صفحہ ۱۲۵)

دیگر (مخزن اسرار)

از پئے لعلے کہ برآرد زکاں ‏ ‏ رخنہ زند بیضۂ ہفت آسماں

بہ کہ سخن دیر پسند آوری ‏ ‏ تا سخن از دست بلند آوری

(خمسہ صفحہ ۱۳)

دیگر (شیریں خسرو)

سخن کو از سر اندیشہ ناید ‏ ‏ نوشتن را و گفتن را نشاید

سخن گوہر شد و گوینده غواص ‏ ‏ بسختی در کف آید گوہر خاص

(خمسہ صفحہ ۵۸)

زر کے عوض کلام بیچنا ان کے نزدیک ذلت میں داخل ہی (مخزن اسرار)

سیم کشانے کہ چو زر مردہ اند ‏ ‏ سکۂ ایں کار بزر بردہ اند

هر کہ بزنکتۂ چوں روز داد | سنگ ستد لعل شب افروز داد
میوۂ دل راکہ بجائے دہند | کے بود آبے کہ بنانے دہند

(خمسہ صفحہ ۱۳)

اسی لیے ان کو قصیدہ گو شعرا پسند نہیں ہیں بلکہ خود امیر معزّی کو جو ملک شاہ اور سنجر کے عہد کا ملک الشعرا ہی ناپسند کرتے ہیں۔

(مخزن اسرار)

آنکہ سرش زرکش سلطاں کشید | باز پسیں لقمہ ز آہن چشید
دانکہ چو سیماب غم زر نہ خورد | نقرہ شد و آہن سنجر نہ خورد

(خمسہ صفحہ ۱۳)

فرماتے ہیں کہ سخن دانی ایک چشمۂ حکمت ہی پیٹ کی خاطر اس چشمۂ پاک کو گندہ کرنا سخت ظلم ہی۔ شعر اسی قسم کا کہنا چاہیے جس کی شرع اجازت دے۔ ان قابل ستایش خیالات کو اپنا بدرقہ بناکر نظامی شاہراہ سخن پر گامزن ہوتے ہیں۔ اگر ان کا بس چلتا اور فارغ البال ہوتے تو وہ اپنے اعلیٰ معیار معنیٰ پرستی کے مطابق اسی قسم کا ادبیات پیدا کرتے جس کا نمونہ ہم مخزن اسرار میں دیکھتے ہیں اور ممکن تھا کہ اس سے بھی بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑتے۔ ان کی اخلاقی رفعت اور شان تقدس سے اسی طرح کی امید کی جا سکتی تھی لیکن دیکھا جاتا ہی کہ اقتضاے وقت اس طلسم کشاے حقیقت کو شہرستان مجاز کا چمن آرا بنا دیتا ہی۔ ضرورت اور مجبوری کا روسیاہ یہ ہاروت فن جو شاہد سخن کو مصا[illegible]ب سے آزاد کرکے صومعہ میں آباد کرنا چاہتا تھا، شیریں کے قصر کا مزدور اور لیلیٰ کا محمل آرا بنایا جاتا ہی وہ اپنی قدرت معنی آفرینی کو خسرو کی آرایش دیہیم اور بہرام

کے تاج کی زینت کے لیے وقف کر دیتا ہی۔ باغ سخن کا یہ نخلبند اپنے گلشن کے بہترین پھول جمع کرتا ہی اور ہار بنا کر سکندر کے گلے میں پہناتا ہی۔ آخر یہ کیوں صرف اس لیے کہ ملک کو نظامی کے تقدس کی بہ نسبت عشقیہ افسانوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ یہ فرشتہ خصلت بالآخر اس پست معیار پر اُتر آتا ہی لیکن خدا جانے کس قدر قلق اور قربانی کے بعد۔ فرماتے ہیں۔ شیریں خسرو۔

مرا چوں مخزن الاسرار گنجے — چہ باید در ہوس پیمود رنجے
ولیکن در جہاں امروز کس نیست — کہ اورا در ہوس نامہ ہوس نیست

(خمسہ صفحہ ۵۸)

مخزن اسرار لکھی، دُنیا نے کوئی صلہ نہیں دیا۔ شیریں خسرو لکھی اور گانو مل گیا۔ ضرورت نے اگرچہ انھیں مصطبہ نشین بنا دیا تاہم اس خرابات کی فضا میں وہ اپنی معنویت کو نہ بھولے۔ حسن و عشق کی معرکہ آرائیوں کے ضمن میں دانش و حکمت کا درس دینا نہیں چھوڑا۔ لیلیٰ کے ناز اور شیریں کی عشوہ گری کے پہلو میں اخلاقیات کے موتی دائیں بائیں بکھیر دیے ہیں اور دُور از کار واقعات کے گرد و پیش میں تہذیب نفس اور تعلیم انسانی کے دقائق اور نکات بیان کیے ہیں۔ مختصر یہ ہی کہ دیر میں حرم کا اور خرابات میں صومعہ کا ماحول پیدا کر دیا ہی۔ چنانچہ آج اگر کوئی ان موتیوں کو رولنا چاہے اور خمسہ کا انتخاب کرے تو اس سے حکمت و دانش کی ایک بڑی کتاب مدون ہو سکتی ہی بلکہ ان کی معنویت کے جُرعہ نوشوں نے خلاصۃ الخمسہ کے نام سے ایک علیحدہ تالیف تیار کی ہی جس طرح نظامی اخلاق اور زندگی کا اعلیٰ معیار پیش کرنے میں پیش پیش ہیں اسی طرح انھوں نے

اپنی زندگی بسر کی ہے۔

فلاسفہ نے ہر ہر شے کا علیحدہ علیحدہ ربّ النوع مانا ہے۔ نظامی نے شاعر کے طبعی فیضان یا مبدع فیاض کو مختلف ناموں سے پکارا ہے۔ کبھی اس کو سروش اور ہاتف کہا۔ کبھی سلیمان اور کبھی طغان شاہ۔ کہیں ہاتف دل کہا ہے۔ (شیریں خسرو)۔

مرا چوں ہاتف دل بود دم ساز　　　برآورد از رواق ہمت آواز

(خمسہ صفحہ ۵۸)

کہیں اس کو خضر کے نام سے یاد کیا ہے۔ (شرف نامہ)

مرا خضر تعلیم گر بود دوش　　　برازے کہ آمد پذیرائے گوش

خمسہ صفحہ ۱۲۶

اور اس شعر کی بنا پر سکندر نامے کے شارحین میں وہ قصّہ مشہور ہوگیا ہے جس میں نظامی کو حضرت خضر کا شاگرد تسلیم کیا گیا ہے لیکن شعر ذیل سے تمام معمّا حل ہو جاتا ہے۔ (اقبال نامہ)

ہمانا کہ آں ہاتفِ خضر نام　　　کہ خار اشگاف است و خضر اخرام

(خمسہ صفحہ ۲۸۴)

فردوسی اور نظامی

میری رائے میں فردوسی اور نظامی کا مقابلہ کرنا اور ایک کو دوسرے پر تفضیل دینا سخت ظلم ہے۔ نظامی فردوسی سے پورے دو سو سال بعد پیدا ہوتے ہیں اس عرصے میں فارسی زبان بے حد ترقی کر چکی تھی۔ بدیع الزماں

اور عتبیؔ کے اثرات میں فارسی میں وہ رنگینی پیدا ہوگئی تھی جو فردوسی کے دور میں نامعلوم تھی۔ نظم و نثر کے ایوان پر صنعت پرستی نے اپنی رنگ آمیزی شروع کردی تھی۔منوچہری۔ اسدی۔قطران۔ انوری۔نصراللہ عبدالحمید مستوفی اور قاضی حمیدالدین کی سحر کاریوں نے گلزار سخن کو ہر ہفت کردیا تھا۔
جب نظامی پیدا ہوتے ہیں فارسی کا گلشن پوری بہار پر تھا انھوں نے اس باغ میں جو پھول کھلائے رنگت کے اعتبار سے زیادہ شوخ اور بوٗ کے اعتبار سے زیادہ دِل رُبا تھے۔ اس کام کے لیے ان کی طبیعت بے حد موزوں واقع ہوئی تھی۔نظامی کو ان کی خدا داد ذہانت، علمیت اور بلند تخیل نے اپنے معاصرین پر ایک قابل رشک تفوق بخش دیا ہی۔ صنعت پرستی سے قدرتی لگاؤ رکھتے ہیں۔خیالات کو رنگین بنانے میں کمال حاصل ہی۔عین عالم جوانی میں بزم شعر میں آتے ہیں۔قدر دانی ہاتھ پکڑتی ہی سلاطین عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور معاش کی طرف سے ایک حد تک فارغ البال ہیں اور اسی صنف سخن پہ ہاتھ ڈالتے ہیں جس میں نام پیدا کرنے اور سرخروئی حاصل کرنے کی گنجایش دیکھتے ہیں۔اگر کہیں قصیدے کی بزم میں پہنچتے تو شاید اور معاصرین سے بازی نہ لے جاتے۔
اِدھر فردوسی کو دیکھیے عین موسم پیری میں یہ پہلوان سخنوری کے میدان میں آتا ہی جوانی جو عمر اور شاعری کا خوش ترین دوٗر ہی پیچھے چھوڑ آیا ہی۔ پچاس اڑتالیس برس کی عمر میں شاہنامے کی ہفتخوان میں پہلا قدم رکھتا ہی۔ نامۂ خسروان اور اس کی پراگندہ داستانوں کی تلاش میں خاصہ وقت صرف کردیتا ہی۔ ادبیات میں کوئی اعلیٰ نمونہ اس کے پیش نظر نہیں صرف ایک دقیقی اس کی رہنمائی کرتا ہی ورنہ جس طرف دیکھیے سناٹا نظر آتا

ہی اور ہُو کا عالم ہی۔ قدامت کے ذوق میں وہ نامۂ خسروان کے ترجمے
کے وقت زیادہ تر تحت اللفظی ترجمہ کا پابند ہو جاتا ہی جس کی وجہ سے اکثر
اوقات شاعری کے جذبات کا خون کرنا پڑتا ہی۔ اس پر تاکید یہ ہی کہ وفات
سے پیشتر شاہنامے کے سر پر اختتام کا سہرا بندھا دیکھ لوں۔ سرپرستوں کے
بارے میں بالکل بدنصیب ہی۔ بڑھاپے کے آلام و امراض کے علاوہ
افلاس اور تنگ دستی نے بوڑھے شاعر کو علیحدہ پریشان کر رکھا ہی جوان
بیٹے کی وفات اور بھی اس کی کمر توڑ دیتی ہی۔ ان مخالف ہواؤں کے باوجود
یہ دُھن کا پکا شاہنامے کی کشتی کو ساحل تک پہنچا دیتا ہی ؎

شوق ہی ساماں طراز نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

لیکن ایسے ماحول میں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہی فردوسی اپنی
شاعری کے کیا گُل کھلاتا اور کیا گلدستے بناتا۔ ان سب باتوں کے باوجود
اگر مقابلہ کرنا مقصود ہی تو میں کہتا ہوں کہ فردوسی کے نشتروں کا نظامی
کے نشتروں سے مقابلہ کر لیا جائے۔ اس صورت میں دیکھ لیا جائے گا کہ نظامی
بااین ہمہ رنگینی و آرایش، شان و شکوہ و بلند آہنگی و سرمایۂ جانگدازی
فردوسی کے مقابلہ میں نمایاں طور پر بازی نہیں لے جا سکتے۔ اور میں
کہتا ہوں فردوسی کا پلہ پھر بھی بھاری ہی۔ ناصر خسرو کے الفاظ قطران تبریزی
کے حق میں، فردوسی بغیر کسی تردد کے نظامی کے لیے استعمال کر سکتا ہی
اور کیا اس میں کوئی شک کر سکتا ہی کہ ہم نظامی کی تصانیف سے خالص
فارسی نہیں سیکھتے۔

فردوسی کا فیضان نظامی پر اس قدر صریح اور نمایاں ہی کہ اس کے

دام سے نظامی کبھی سُبک دوش نہیں ہو سکتے اور اس میں بھی شک نہیں کہ شیخ، فردوسی کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ جب کبھی اس کا ذکر کرتے ہیں ایسے الفاظ میں کرتے ہیں جن سے خلوص اور عقیدت ٹپکتی ہی۔ کبھی وہ اس کو دانائے طوس کہتے ہیں۔ کبھی دانائے پیشینہ اور کبھی بادشاہِ شعرا۔ بعض اوقات اپنی مستانہ خرامی کی ادا میں اس کے وارث بن جاتے ہیں اور اپنے ممدوح سے فردوسی کا وہ قرضہ طلب کرتے ہیں جو حسب روایت شعرا سلطان محمود کے ذمّے واجب الادا ہی۔ نظامی کا یہ جوش عقیدت اس میں شک نہیں فردوسی کے حق میں اہل سنت وجماعت کے ہاں ایک بڑی حد تک عزت و احترام کا مورث ہوًا ہی جو اس لیے بدنام تھا کہ اس نے شاہنامہ لکھ کر مجوسیوں کی خدمت کی ہی۔

متعدد موقعوں پر دیکھا جاتا ہی کہ نظامی بلا تکلف فردوسی کے مقولے باندھ جاتے ہیں۔ لیکن مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہی کہ نظامی کی تصنیفات سے میری ناآشنائی اس بارے میں زیادہ روشنی ڈالنے سے مجھ کو قاصر رکھتی ہی۔ چند مثالیں بہرحال ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

(۱) چہ خوش گفتہ است فردوسی طوسی — کہ مرگ خر بود سگ را عروسی
(خمسہ صفحہ ۱۹۵)

(۲) مثل زد دریں آنکہ فرزانہ بود — کہ برناید از ہیچ ویرانہ دود
(خمسہ صفحہ ۲۵۵)

(۳) نگر آنکہ دانائے پیشینہ گفت — کہ بر در نشاید دو سوراخ سفت
(خمسہ صفحہ ۱۲۶)

(۴) چنیں زد مثل شاہ گویندگاں — کہ یابندگانند جویندگاں
(خمسہ صفحہ ۱۲۶)

بعض ماہرینِ فن امیر خسرو اور مولانا جامی کو الزام دیتے ہیں کہ ان بزرگواروں نے مولانا نظامی کے خانۂ شاعری کو بالکل تاراج کر دیا ہے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے (خدا کرے اس میں مبالغہ نہ ہو) کہ ان دونوں بزرگوں کی مثنویات میں کوئی ایسی داستان نہیں جس میں نظامی کا مصرع یا شعر بعینہ یا کسی قدر تبدیلی کے ساتھ نہ پایا جائے[۱]۔ امثال میں یہ ابیات نقل کیے ہیں جو معاً نظامی سے ماخوذ بتائے جاتے ہیں۔

نظامی

مرا اے کاش کے مادر نزادے دگر زادے بخورد سگ بدادے

جامی

مرا اے کاش کے مادر نمی زاد وگر می زاد کس شیرم نمی داد

نظامی

دو کار است با فر و فرخندگی خداوندی از تو زما بندگی

خسرو

اے صفتت بندہ نواز ندگی از تو خدائی و زما بندگی

نظامی

زن از پہلوے چپ گویند برخاست نیاید ہرگز از چپ راستی راست

جامی

زن از پہلوے چپ شد آفریدہ کس از چپ راستی ہرگز نہ دیدہ

یہ ہماری کوتاہ نظری اور فردوسی کے حق میں بے انصافی ہو اگر ہم

---

[۱] احسن القواعد صفحہ ۸۵-۱۸۶ مطبع مجتبائی ۱۹۲۳ء، مخزن الفوائد صفحہ ۱۰۷ مطبع سنگین۔ ہفت آسماں صفحہ ۴۶-۴۷ اشاعت ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔

نظامی کو ان خیالات کا مخترع یا موجد مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہی کہ امثال بالا میں خسرو۔ جامی اور نظامی۔ فردوسی کے خرمن کی خوشہ چینی کر رہے ہیں ذیل میں فردوسی کے اشعار جن سے نظامی کے اشعار ماخوذ ہیں درج ہوتے ہیں۔

فردوسی

نزادے مرا کاش کے مادرم — دگر زاد مرگ آمدے بر سرم

(صفحہ ۲۱۹)

مرا مادرم گر نہ زادے زبن — نہ فتے زمن نیک یا بد سخن

(صفحہ ۳۴۸)

نزادے مرا کاش کے مادرم — نگشتے سپہر بلند از برم
پذیرفتہ بادا ترا زندگی — ترا شہر یاری مرا بندگی
چو دختر ز پہلوئے چپ شد پدید — از و راستی در جہاں کس ندید

نظامی

مرا اے کاش کے مادر نزادے — دگر زادے بجز ور سگ بدادے
دو کار است با فرد فرخندگی — خداوندی از تو ز ما بندگی
زن از پہلوے چپ گویند برخاست — نیاید ہرگز از چپ راستی راست

سخن آرائے گنجہ پر فردوسی کا کس قدر احسان ہی۔ اس سوال کے جواب کے لیے ایک طویل مطالعے کی ضرورت ہی جس کا موقعہ سردست مجھ کو میسر نہیں تاہم بعض امثال یہاں حوالۂ قلم ہیں :۔

فردوسی	نظامی
نوشتند نامہ بہر کشورے	فرستاد نامہ بہر کشورے
بہر نام دارے و ہر مہترے	بہر مرز بانے و ہر مہترے

فردوسی

بہ آواز گفتند ما بندہ ایم
بفرمان و رایت سرافگندہ ایم

بخور ہرچہ داری فزونی بدہ
تو رنجیدۂ بہر دشمن منہ

سپاہ پراگندہ را گرد کرد
زمیں آہنیں شد ہوا لاجورد

زمیں گر کشادہ کند راز خویش
نماید سرانجام و آغاز خویش

کہ گر دو برادر نہد پشت پشت
تن کوہ را خاک ماند بمشت

نباشی بس ایمن ببازوے خویش
خورد گاؤ ناداں زپہلوے خویش

نخندد زمیں تا نگرید ہوا
ہوا را نخوانم کفِ بادشا

درشتی زکس نشنود نرم گوے
سخن تا توانی بآزرم گوے

سیہ مار چنداں دمد روزِ جنگ
کہ از کام دریا برآید نہنگ

ز بہر درم تند و بدخو مباش
تو باید کہ باشی درم گو مباش

نظامی

نہادند سرہا کہ تا زندہ ایم
بدیں عہد و پیماں سرافگندہ ایم

بخور چیزے از مال و چیزے بدہ
زبہر کساں نیز چیزے بنہ

پراگندۂ چند را گرد کرد
کہ از آب دریا برآورد گرد

زمیں گر بضاعت بروں آورد
ہمہ خاک در زیر خوں آورد

دو دل یک شود بشکند کوہ را
پراگندگی آرد انبوہ را

مکن تکیہ بر زور بازوے خویش
نگہ دار وزن ترازوے خویش

زشیراں بود روبہاں را نوا
نخندد زمیں تا نگرید ہوا

سخن تا توانی بآزرم گوے
کہ تا مستمع گردد آزرم جوے

سیہ شیر چنداں بود کینہ ساز
کہ از دور دنداں نماید گراز

زبہر درم تند و بدخو مباش
تو باید کہ باشی درم گو مباش

فردوسی	نظامی
که او چون من و چون تو بسیار دید	جہاں در جہاں خلق بسیار دید
نخواهد همی با کسے آرمید	رمید از همه با کسے نارمید
که شاه جہاں از گماں برتراست	که شاه جہاں از گماں برتراست
چو بر تارک مشتری افسراست	جہاں کان گوہر شد او گوہراست
که شیرے نترسد زیک دشت گور	یکے گرگ را کو بود سہمناک
نتابد فراواں ستاره چو هور	ز بسیار رمے گوسفنداں چه باک
بکام تو بادا سپہر بلند	بکامِ تو بادا سپہر بلند
ز چشم بدانت مبادا گزند	ز چشم بدانت مبادا گزند
که دانست کیں کودک ارجمند	که دانست کیں کودک خورد سال
بدیں سال گردد چو سرو بلند	شود با بزرگاں چنیں بدسگال
جہاں را بلندی و پستی توئی	پناه بلندی و پستی توئی
ندانم چۂ ہر چہ ہستی توئی	همه نیستند آں چه ہستی توئی
که مُرغے که زرّیں همه خایه کرد	زمانه دگر گونه آئیں نہاد
بمرد و سر باغ بے مایه کرد	شد آں مرغ کو بیضه زریں نہاد
چو از سرو بن دور شد آفتاب	چو رخت از سر کوه برد آفتاب
سر شہریار اندر آمد بخواب	سر شاه شاہاں در آمد بخواب
چنیں است گیتی و زیں ننگ نیست	دریں پرده بر آسماں جنگ نیست
ابا کردگار جہاں جنگ نیست	که ایں پرده باکس هم آہنگ نیست
یکے خیمۂ داشت افراسیاب	نہے بارگاہے که چوں آفتاب
ز مشرق بمغرب کشیده طناب	ز مشرق به مغرب رساند طناب

فردوسی	نظامی
بنا کردم از نظم کاخے بلند	نہ حرفے کہ عالم زیادش برد
کہ از باد و باراں نیابد گزند	نہ باراں بشوید نہ بادش برد
چو دانا ترا دشمن جاں بود	دشمن دانا کہ غم جاں بود
بہ از دوست مردے کہ ناداں بود	بہتر ازاں دوست کہ ناداں بود

تنقید شعر العجم

حِصّہ دوم

قولہ "اس کے بعد چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو بن تولی بن چنگیز خاں تخت نشین ہوا۔ ہلاکو نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا، رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کر لیا، یہاں تک کہ اس کا بیٹا نکودار دار خواجہ شمس الدین وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ہو گیا اور اپنا نام احمد رکھا۔ ترک اس پر بگڑ گئے اور ارغون خاں (ہلاکو خاں کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خاں کو گرفتار کر کے ۶۸۰ھ میں قتل کر دیا۔"

(شعر العجم حصہ دوم، صفحہ ۲ معارف پریس اعظم گڈھ)

محقق طوسی کی وزارت کا قصہ کسی اصلیت پر مبنی نہیں، تاریخیں متفق ہیں کہ ہلاکو کا پہلا وزیر امیر سیف الدین بتیکچی بہادر بن عبد اللہ خوارزمی ہی جو بحیثیت وزیر ۶۵۳ھ میں ہلاکو کے ساتھ ہی ایران میں آتا ہی اور فتح بغداد کے بعد نجف اشرف کی حفاظت کے لیے ہلاکو سے سو مغولی سپاہی مانگتا ہی۔ ۶۶۱ھ میں جب ہلاکو برکہ خاں پادشاہ قبچاق کی جنگ کے لیے جاتا ہی، وزیر موصوف دشمنوں کی بدگوئی کی بنا پر خان کے حکم سے ہلاک کر دیا جاتا ہی۔ اس واقعے کے

بعد صاحب دیوان شمس الدین محمدؒ جوینی منصب وزارت پر سرفراز ہوتے ہیں اور مستقلاً ۲۲ سال برابر یعنے باقی ایام ہلاکو و کامل عہد اباقاخان و سلطان احمدؒ اس عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہتے ہیں۔ خود محقق طوسی نے کتاب اوصاف الاشراف صاحب دیوان کے نام پر اور کتاب ترجمۂ ثمرۂ بطلیموس ان کے فرزند خواجہ بہاء الدین محمد حاکم اصفہان کے نام پر لکھی ہو۔ سلطان احمدؒ کا اصلی نام تنکدار، تُوکدار یا تکودار ہو۔ نہ نکو دار دار۔ وہ ۶۸۳ھ میں قتل نہیں کیا جاتا کیونکہ ۶۸۱ھ میں تخت نشین ہوتا ہو اور دو سال اور دو ماہ حکومت کرنے کے بعد ہلاک کیا جاتا ہو۔ ترکوں کی مخالفت سلطان احمدؒ کے ساتھ مذہبی بنا پر نہیں تھی، بلکہ زیادہ تر سیاسی تھی۔ اگر مذہب کا سوال درمیان میں ہوتا تو شاید احمد کو تخت ہی نصیب نہ ہوتا کیونکہ وہ تخت نشینی سے پیشتر ہی حلقہ بگوش اسلام تھا اور دربار کے تمام شہزادے اور طاقتور امیر کافر تھے۔ دوسرے دعویداروں کے باوجود سب کے اتفاق سے سلطان احمدؒ بادشاہ بنایا جاتا ہو۔ ارغون، ہلاکو خاں کا سب سے بڑا پوتا اور اباقاخان کا فرزند اکبر ہو وہ باپ کے تخت کا دعوے دار رہا۔ احمدؒ نے کئی لڑائیوں کے بعد بصد خرابی بصرہ اس کو گرفتار کیا اور قتل کرنے کے بجائے قید کر دیا۔ ارغون کے طرف داروں نے جن کی ایک طاقت ور جماعت دربار میں بھی موجود تھی، قید کی پہلی ہی رات سازش کر کے اُس کو آزاد کر دیا اور احمد کے طرف داروں کو قتل کر کے ارغون کو بادشاہ بنا دیا۔

قولہ "سلطان ابو سعید کے عدل و انصاف اور نظم و نسق کے قواعد اور آئین، مساجد اور مدارس پر کندہ ہو کر مدتوں قائم رہے، یہاں تک کہ اوحدی کرمانی نے جو مشہور صوفی گزرے ہیں۔ اپنی مثنوی

جام جم میں ابو سعید کی اس طرح مدح سرائی کی ہے :۔

دو جہاں را صلائے عید زدند سکہ برنام بوسعید زدند
در چمن گفتہ بلبل و قمری مدح ایں گلبن اولوالامری"

(شعر العجم صفحہ ۲)

مصنف جام جم کے "مشہور صوفی" ہونے کا اندازہ اس ایک امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود علامہ شبلی اس سے ناواقف ہیں۔ شیخ اوحدی کرمانی (اوحدالدین حامد کرمانی) ۶۹۷ھ ہجری میں بعہد غازان خاں وفات پاتے ہیں۔ مثنوی جام جم ۷۳۳ھ ہجری میں تصنیف ہوتی ہے، چنانچہ شعر :۔

چوں بتاریخ برگرفتم فال هفتصد رفته بود سی وسه سال

(جام جم قلمی)

درحقیقت اس مثنوی کے مصنف رکن الدین اوحدی مراغی ثم الاصفہانی ہیں جو شیخ اوحدالدین کرمانی کے مُرید ہیں اور ۷۳۸ھ ہجری میں انتقال کرتے ہیں۔ 'اوحدی' تخلص انھوں نے اپنے مُرشد اوحدالدین حامد کرمانی کے لقب کی یادگار میں رکھا ہے۔

قولہٗ "تاتار کے قتل عام میں جو بے شمار جانیں ضائع ہوئیں اُس نے مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کو فنا کر دیا، اس کا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئیں، شاعری کے فرائض پورے کرنے کے لیے متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں مثلاً :۔
ہمائے ہمایوں خواجوے کرمانی ، آئینہ اسکندری امیر خسرو سکندرنامۂ جامی ، تیمورنامۂ ہاتفی ، شاہنامۂ قاسم گونابادی اکبرنامۂ فیضی ۔ لیکن صاف نظر آتا ہے کہ کہنے والے منہ چڑھاتے

ہیں، دل میں کچھ نہیں"۔ (شعر العجم صفحہ ۳)

اِس سے پیشتر سامانی، غزنوی اور سلجوقی دَوروں کا مذکور ہو چکا ہی۔ اِن دَوروں میں مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کا شاعری پر کوئی اثر نہیں دکھایا گیا، جس کا اب تاتاری قتلِ عام سے فنا ہو جانا بیان کیا جاتا ہی۔ مولانا نے اب تک صرف تین رزمیہ کتابوں یعنے شاہنامہ، گرشاسپ نامہ اور سکندر نامہ کا زیادہ تر ادبی حیثیت سے ذکر کیا ہی اور میں یقین نہیں کرسکتا کہ ان کتابوں نے مسلمانوں کے جنگی و قومی جذبات کو برانگیختہ کرنے، یا اُن کے بیدار رکھنے میں کوئی مدد کی ہو، کیونکہ ان کی تمام داستانیں غیر مذاہب کے جنگ آزماؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ رستم سیستانی تھا، کیخسرو کیانی، سکندر یونانی اور نوشیرواں ساسانی۔

فارسی میں رزمیہ شاعری محض اتفاقیہ رائج ہوئی ہو، ایرانیوں کو اپنے قومی افسانے اور تاریخ سے شغف تھا، فردوسی نے اُس کو نظم کردیا۔ اسدی نے ایک اور داستان جس کے واسطے وہ کہتا ہو کہ: فردوسی کو نہیں ملی، گرشاسپ نامے کے نام سے نظم کردی۔ ملکی، و مذہبی اثرات میں ہمارے ہاں تقلید پسندی کا زور رہا ہی، چنانچہ اسلامی ادبیات کے تمام دوروں میں یہی ایک اصول یعنے تقلید صراحت کے ساتھ نمایاں ہی۔ شاعر اپنے تفننِ طبع کے لیے کسی نہ کسی کا ضرور تتبع کرتے رہے ہیں۔ نظامی کے دَور تک، فردوسی کی تقلید کرتے رہے، چنانچہ بہمن نامہ، شہریار نامہ وغیرہ شاہنامے کی تقلید میں لکھے گئے۔ جب نظامی نے اپنی طرز کا اعلیٰ معیار پیش کیا تو تمام صنعت پرست اُن کی طرف جُھک گئے۔

چنگیزیوں کے بعد تو مقابلتاً زیادہ رزمیہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مولانا

کی فہرست ابھی ناتمام ہی اور میں ذیل کے نام اضافہ کرتا ہوں :۔

مفتاح الفتوح امیر خسرو، جس میں جلال الدین فیروز شاہ خلجی کی جنگ کا ذکر ہی۔ خاور نامۂ ابن حسام (۸۳۰ھ ہجری)، تغلق نامۂ بدر چاچی، جس میں بیس ہزار کے قریب اشعار تھے، فتوح السلاطین عصامی اور بہمن نامۂ آذری۔

فتوحات جمالی ششتری (۹۹۴ھ ہجری)، شاہ رُخ نامۂ قاسمی گونابادی، ظفر نامۂ حمداللہ مستوفی ۷۳۵ھ ہجری۔ شہنشاہ نامۂ احمد تبریزی ۷۳۸ھ ہجری، ظفر نامہ کے اشعار کی تعداد پچھتر ہزار ہی، یعنے شاہنامۂ فردوسی سے بھی پندرہ ہزار اشعار زائد ہیں۔ تاہم مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ " رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لیے معدوم ہوگئیں اور انھوں نے محض شاعری کے فرائض ادا کیے ہیں"۔ خسرو، حمداللہ مستوفی، جامی اور ہاتفی کے لیے یہ کہنا کہ محض منہ چڑایا ہی، کسی حالت میں صحیح نہیں مانا جاسکتا۔ مولانا کے نزدیک رزمیہ شاعری کے ضروری اوصاف یہ ہیں :۔ (۱) واقعہ مہتم بالشان ہو۔ (۲) لڑائی کے ہنگامے کا بیان پُر رعب ہو (۳) جنگ کے سازوسامان، رزم آزماؤں کی لڑائی کے تمام داؤں پیچ بتائے جائیں وغیرہ۔ میں کہتا ہوں کہ گزشتہ بالا شعرا میں سے ہر ایک نے قریب قریب ان فرائض کو ادا کیا ہی، لیکن پھر بھی مولانا شبلی فرماتے ہیں :۔

اگرچہ شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

"ہمائے ہمایوں" ایک عشقیہ نظم ہی جس میں شہزادۂ ہمائے، والیِ خاور اور شہزادی ہمایوں دختر فغفورِ چین کے عشق و محبت کا فرضی قصّہ ہی،

اِس کا رزمیہ نظموں سے کوئی تعلق نہیں۔

قولہ "جنگی جذبات کے فنا ہونے نے طبیعتوں میں انفعالی اثر زیادہ پیدا کیا، جو تصوف کے سوا ایک اور رنگ میں ظاہر ہوا، یعنے غزل گوئی۔ یہ مسلم ہی کہ غزل جس چیز کا نام ہی اس کی ابتدا شیخ سعدیؒ اور ان کے معاصرین سے ہوئی"

(شعر العجم صفحہ ۴)

جنگی جذبات کی معدومیت اگر ایران میں غزل کے وجود کی ذمہ دار ہی تو آخر اس عہد کے ہندستان کو کیا ہُوا تھا؟ یہ ملک چنگیزی سیلاب سے بالکل مامون رہا ہی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی خسرو اور حسن دہلوی جیسے غزل گو موجود ہیں۔ تصوف مغولوں کی آمد سے پیشتر اکثر ممالکِ اسلام میں موجود تھا، البتہ ان کی آمد نے اس کی ترقی کی رفتار کو تیز کر دیا اور یہ تصوف ہی، جس نے غزل گوئی کو حقیقی ترقی دی۔

قولہ "کم از کم پچاس ساٹھ لاکھ آدمی ایک دم سے فنا ہو گئے، ان امور نے دُنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا جو مدت تک آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا، اس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار میں آنے لگے۔ شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ کے ہاں ان مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہی، ان لوگوں نے یہ سماں خود آنکھوں سے دیکھا تھا، وہی زبان پر آیا"

(شعر العجم صفحہ ۴)

دنیا کی بے ثباتی، مشرق کے اکثر مذاہب کا ایک وسیع موضوع رہا ہی جس کو ان ممالک کی غیر مستقل طرز حکومت نے اور بھی ممتاز حیثیت دے دی

ہے۔ اسلام میں اِس کی تلقین کی آیات کلام پاک میں موجود ہیں۔ تصوف نے اپنے اصولوں کو اسی مضمون کی اساس پر قائم کیا ہے۔ ایرانی شعرا میں سب سے پیشتر محمد بن وصیف سجزی اس موضوع کو اپنی شاعری میں روشناس کرتا ہے۔ رودکی، ناصر خسرو، سنائیؔ، انوری اور خاقانی بغیر کسی استثنا کے یہی بولیاں بول رہے ہیں، لیکن یہ فردوسی، خیام اور عطار ہیں جن کے ہاں قدم قدم پر یہی درسِ عبرت دیا گیا ہے۔ سعدی، ابن یمین اور خواجہ حافظ اس بارے میں کسی خاص امتیاز کے مستحق نہیں۔ درحقیقت اگر کوئی شاعر اس انقلاب سے کسی قدر اثر پذیر ہُوا ہے تو وہ کمال اسمٰعیل ہے۔

شیخ فرید الدین عطّار

مَیں رفع تشکیک کی غرض سے ابتدا ہی میں گزارش کیے دیتا ہوں کہ علامہ شبلی، شیخ عطار کو بار بار خواجہ عطار لکھ رہے ہیں۔ ہم خواجہ کا لفظ آج کل بھی ہر شخص کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ اُن ایام میں۔ قدما میں خواجہ کے واسطے کسی قسم کی تعمیم نہیں مانی گئی، وہ خاص خاص طبقے کے لوگوں کے نام کے ساتھ ملتا ہے، مثلاً :- اربابِ مناصب و دبیرانِ سلطانی کے ناموں کے ساتھ۔ علاوہ بریں "خواجہ عطار" کے لقب سے ایک اور بزرگ جو نویں صدی ہجری میں وفات پاتے ہیں ممتاز ہیں، ان کا پورا نام خواجہ علاء الدین عطار ہے۔

فقیر کے واقعہ کے ذکر کے بعد جس کی ناگہانی وفات سے متاثر ہو کر شیخ فرید الدین عطار اپنی دکان لٹا دیتے ہیں، مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

"لیکن افسوس ہی کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے خود خواجہ صاحب کی
تصنیفات نہیں پڑھیں، ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہی کہ تصوف
اور فقر کے کوچے میں آنے کے بعد وہ اپنے قدیم پیشے میں مشغول
رہے اور اُسی حالت میں اسرار و عرفان کی حقائق پر کتابیں لکھتے
رہے"۔ (شعر العجم صفحہ ۸ مطبع معارف اعظم گڑھ)

مَیں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ شیخ عطار کی عمر میں تصوّف و عرفان سے ذوق آشنا ہونے کا انقلاب کسی بیرونی تحریک یا واقعے کی بنا پر نہیں ہُوا۔ نہ یہ تبدیلی ان کی عمر کے کسی خاص وقت میں ہوئی، بلکہ وہ ابتدا ہی سے بنابر تقاضاے طبیعت حضرات صوفیہ کے معتقد اور منازل سلوک و عرفان کے سالک تھے، چنانچہ تذکرۃ الاولیا کے دیباچے میں ارشاد کرتے ہیں:۔

"دیگر باعث آں بود کہ بے سببے از کودکی باز دوستی ایں طائفہ در جانم موج می زد و ہمہ وقتے مفرح دل من از سخن ایشاں بود، برائے آنکہ المرء مع من احب"

(تذکرۃ الاولیا صفحہ ۵ مرتبہ پروفیسر نکلسن)

رہا فقیر کا قصّہ، وہ صرف اس کی اپنی نوعیت کی بنا پر تسلیم یا رَد کیا جا سکتا ہی، لیکن یہ خیال کرنا کہ تمام اہلِ تذکرہ اس پر متفق ہیں، صحیح نہیں کیونکہ محمّد عوفی اور حمد اللہ مستوفی اس کا ذکر نہیں کرتے۔ عطار کے عہد سے قریباً ڈھائی سو سال بعد سلطان حسین مرزا کے عہد کے مصنّفین، جن میں مولانا جامی اور دولت شاہ قابلِ ذکر ہیں، اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور بعد کے تذکرہ نگار ان کے مقلّد ہیں لیکن خود مولانا جامی اور دولت شاہ اس قصّے کے ضمنی واقعات اور سوال و جواب پر متفق نہیں ہیں۔ بہرکیف میرے نزدیک شیخ عطار کے سوانح

میں اِس قصّے کے لیے کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا، کیونکہ اوّل تو وہ خود ہی ایّامِ طفلی سے اصحابِ ذوق و عرفان کی صحبت کے مائل تھے۔ دوسرے جہاں تک معلوم ہو جیسا کہ مولانا بھی معترف ہیں، شیخ عطار فقر و تصوّف کے ساتھ ساتھ مطب اور دارو خانہ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے "دل بیار و دست بکار" پر عامل رہے۔

قولہ "خواجہ صاحب کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس عالم میں انھوں نے مدت تک سیّاحی بھی کی ہو۔ لسان الغیب میں کہتے ہیں :-

"چار اقلیم جہاں گردیدہ ام ....

سر برآوردہ بہ محبوبیِ عشق	سیر کردہ مکہ، و مصر و دمشق
کوفہ، و ری تا خراساں گشتہ ام	سیحن و جیحونش را ببریدہ ام
ملک ہندستان و ترکستاں زمیں	رفتہ چوں اہلِ خطا از سوے چیں
عاقبت کردم بہ نیشاپور جاے	اوفتاد از من بعالم ایں صداے
در نشاپورم بہ کنجِ خلوتے	با خدائے خویش کردم وحدتے"

(شعر العجم صفحہ ۱۰)

میرا عقیدہ ہو کہ مولانا شبلی نے لسان الغیب بچشمِ خود نہیں دیکھی ہو، بلکہ ابیاتِ بالا مرزا محمّد بن عبدالوہاب کے دیباچۂ تذکرۃ الاولیاء عطار، مرتّبہ پروفیسر نکلسن سے نقل کر لیے ہیں اور ایسے اشعار کو ترک کر دیا جن سے شیخ عطار کی شیعیت کا گمان ہو سکے۔ مثلاً :-

"شہر نشاپورم تولدگاہ بود	در حرم گاہ رضا ام راہ بود
مرقد اثنا عشر رستم بچشم	می زنم بر دشمنانش سنگ لشم"

اس دیباچے میں اِسی لسان الغیب سے میرزا محمّد نے عطار کی شیعیت کے

ثبوت میں یہ اشعار بھی حوالۂ قلم کیے ہیں :-

شیعۂ پاکست عطار اے پسر جنس ایں شیعہ بجانِ خود بجز
ما ز فاروق التجا برکندہ ایم پے ز نوزین شما بریدہ ایم
بو حنیفہ را ز دست بگزار تو خود برو اندر پئے کرار تو

(تذکرۂ اولیا طبع بریل ۱۳۲۲ھ ہجری صفحہ یب)

لسان[۵] الغیب اگرچہ میری نظر سے نہیں گزری، تاہم اس قدر عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمیں اس کتاب کو عطار کی طرف منسوب کرنے میں بہت کچھ تامل اور تردد سے کام لینا چاہیے۔ یہ کتاب اس قدر نامعلوم ہو کہ جب تک ڈاکٹر ایتھے نے انڈیا آفس کے کتب خانے کی فہرست ترتیب دے کر شائع نہ کی، اس وقت تک کوئی اس سے واقف نہ تھا۔ سب سے پہلے میرزا محمد قزوینی نے اس کا ذکر کیا اور علامہ شبلی دوسرے شخص ہیں جو اس کا نام لیتے ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہو کہ لسان الغیب کے مصنف نے اپنی شیعیت کے اظہار میں ایک کتاب مظہر العجائب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام پر لکھی تھی، جس میں ان کی مدح میں مبالغے کے علاوہ، نواصب، روافض و خوارج پر، جن سے اس کی مراد اہل سنت و جماعت ہیں، جا و بیجا حملے کیے تھے۔ کسی فقیہ نے جو سمرقندی ہو، مصنف پر رفض کا الزام لگا کر مظہر العجائب کو جلوا دیا اور خود اس پر قتل کا فتویٰ لگا کر سزا دہی کا حکم دیدیا۔

---

[۵] اس تنقید کے چند سال بعد لسان الغیب کے دو نسخے میرے ہاتھ آئے۔ اس کے مطالعے کے بعد میں بدستور اپنی رائے پر قائم ہوں کہ لسان الغیب اسی شیعہ مصنف کی تالیف ہو جس نے مظہر العجائب لکھی ہو اور عطار کی طرف اس کا انتساب ایک ناپاک افترا ہو۔

عوام الناس ایک لاکھ کی تعداد میں جمع ہو گئے، اُس کا گھر لوٹ لیا، اُس کے فرزند کو قید کر دیا اور قریب تھا کہ اس کی جان ضائع ہو جائے، اتنے میں خدائے تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ایک برہان دکھائی، غیب سے اس کے کانوں میں آواز آئی کہ: اے عطار خوف نہ کھا، اِن ظالموں کے ہاتھوں سے تو فوراً رہا ہو جائے گا۔ اِس الہام کے بعد اس کے پر پرواز پیدا ہو گئے اور مصنف شہباز تیز پرواز کی طرح اُڑتا ہوا لوگوں کی آنکھوں سے غائب ہو گیا:۔

بالہامم ندا در داد یزداں | کہ اے عطار تو خود را مترساں
خلاصی ایں زماں از دست ایشاں | ازیں معنیٰ مکن خاطر پریشاں
پریدم از میاں شاں چشم کن باز | بالہام الٰہی ہمچو شہباز

(مظہر العجائب قلمی)

اس واقعے کے بعد مصنّف وطن سے آوارہ ہو کر مکّہ چلا جاتا ہی اور وہاں کتاب لسان الغیب تصنیف کرتا ہی:۔

ایں لساں از پیش احمدؐ گفتہ ام | در مقام مکّہ اش بنوشتہ ام

(از مقدمۂ مرزا محمدؐ قزوینی)

لسان الغیب گویا اس ماحول میں پیدا ہوتی ہی، اب اس کو شیخ فریدالدین عطار کی طرف منسوب کرنا جو مذہب سنت وجماعت کے پیرو ہیں جیسا کہ اُن کی تصنیفات سے ظاہر ہی، مَیں کہتا ہوں سخت ظلم ہی۔ علیٰ ہذا اس کتاب کی بنا پر شیخ کی سیاحی کا دعویٰ بھی میرے نزدیک ناقابل قبول ہی کیونکہ وہ اِس حصّۂ ادبیات مجعول سے تعلق رکھتی ہی جو شیخ عطار کے نام پر موضوع ہوا ہی۔ لیکن اس کے متعلق آیندہ بحث ہو گی۔

قولہ "خواجہ صاحب نے اگرچہ سب بزرگوں سے فیض اُٹھایا تھا لیکن جیسا کہ دولت شاہ نے لکھا ہی، خرقۂ فقر مجدالدین بغدادی سے حاصل کیا تھا۔ مجدالدین بغدادی قطب الدین خوارزم شاہ کے طبیب خاص تھے۔"

(شعرالعجم صفحہ ۱۰)

شیخ مجدالدین بغدادی سے خرقۂ فقر حاصل کرنے کی روایت پر اگر زرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک کمزور اساس پر قائم ہی۔ تذکرۂ عطار میں ایک فقرہ آتا ہی کہ :۔

"ومن یک روز پیش امام مجدالدین خوارزمی در آمدم او را دیدم کہ می گریست۔ گفتم "خیرست"۔ گفت "زہے سپاہ سالاراں کہ دریں امت بودہ اند بمثابۂ انبیا علیہم السلام کہ علمار امتی کانبیار بنی اسرائیل"۔ پس گفت "ازاں می گریم کہ دوش گفتہ بودم کہ خداوندا کارِ تو بعلّت نیست، مرا ازیں قوم یا از نظارگیان ایں قوم گرداں کہ قسمے دیگر را طاقت ندارم، می گریم کہ بود کہ مستجاب شدہ باشد۔"

(تذکرۃ الاولیا صفحہ ۶ طبع لیڈن)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہی کہ آیا یہ امام مجدالدین خوارزمی جو عالم ہیں اور شیخ مجدالدین بغدادی جو نجم الدین کبریٰ کے مرید ہیں ایک ہی شخص ہیں۔ دوسرے شیخ عطار جو کہا جاتا ہی : ۵۱۳ھ ہجری میں ولادت پاتے ہیں، شیخ مجدالدین سے عمر میں بہت اقدم ہیں۔ شیخ مجدالدین کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ علار الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶ھ ہجری و ۶۱۷ھ ہجری) کے عہد میں ہوئی ہی۔ اب کیا عطار اسّی تراسی سال تک بے پیرے رہے ؟ بالخصوص

ایسا شخص جو مشائخ کی صحبت کا بچپن ہی سے شیفتہ تھا۔ شیخ مجدالدین جو ۶۱۳؁ ہجری میں قتل کیے جاتے ہیں، اپنی وفات کے وقت غالباً جوان ہی تھے۔ اب شیخ عطار تصوف میں اس قدر شہرت اور تصنیفات کے باوجود اسّی سال کی عمر میں ایک جوان شخص کے جو شہرت اور قابلیت میں کچھ بھی درجہ نہیں رکھتا، مُرید بنائے جاتے ہیں۔ شیخ مجدالدین کی شہرت ان کے خونِ ناحق کی وجہ سے ہوئی ہے۔ حمداللہ مستوفی کہتا ہے:۔

"شیخ مجدالدین بغدادی در سنہ ثلث و عشر وست مائتہ بعہد ناصر خلیفہ بہ تہمت آنکہ با مادر خوارزم شاہ معاشرت ورزیدہ، بحکم خوارزم شاہ شہید شد۔ بعد از قلش خوارزم شاہ پشیمان شد، بخدمت شیخ نجم الدین کبریٰ رفت وگفت "چنیں خطائے از من صادر شد، دیت خون او چہ باشد"۔ شیخ گفت "جان من و تو و اکثر اہل جہاں بجہت خون او نشاید۔ چوں ناکردنی کردہ شد، تدارک نتواں کرد۔"

حقیقت میں عطار کے مرشد[۱] ہونے کے مستحق خواجہ ابو الفضل سعدالدین شافعی المذہب ہیں، جو وزارتِ خراسان سے دست بردار ہو کر طبقۂ صوفیہ میں شامل ہوتے ہیں اور تیس سال سے زیادہ عرصے تک گوشۂ عزلت میں مقیم رہے ہیں۔ شیخ عطار نہایت پُرجوش اور معتقدانہ الفاظ میں "خسرو نامے" میں منقبت کے بعد اُن کا ذکر کرتے ہیں۔ میں چند ابیات یہاں نقل کرتا ہوں:۔

---

[۱] ہفت اقلیم میں، اس سلسلے میں شیخ رکن الدین اکاف کا نام بھی دیا ہے اور مثنویات میں کئی موقعوں پر عطار نے ان کی حکایات درج کی ہیں۔ لیکن شیخ مجدالدین کا نام کہیں نہیں آتا۔

خدا را آنکہ محبوب و حبیب است
ابو الفضل جہاں پیرِ لبیب است

دل دیں خواجہ سعد الدیں کہ امروز
دل اوست آفتاب عالم افروز

خراساں را وزارت داشت بالش
و لے انداخت او تا برد آلش

جو ابراہیم ادہم ملک بگزاشت
کہ چوں لستی خلافت یک جو انگاشت

سریک موے او عالم نداند
کہ داند قدر او ادہم نداند

بحق امروز قطب اولیا اوست
حریم خاص را خاص خدا اوست

گر اوتادند، گر ابدال امروز
از و دارند کشف حال امروز

چو بود او در شریعت شافعی دوست
طریقت را علی الحق شافعی اوست

شدہ سی سال تا و ے بر سخنہا
بخلوت روئے آوردہ است تنہا

خدایا قادری دمی توانی
با وج ہمت خویشش رسانی

مرا در خرمن او خوشہ چیں دار
ز نور او دِلم را راہ بیں دار

کہ تا ایں بندہ ہم پئے برپئے شاں
بیا بد بار بر درگاہِ سلطاں

(خسرو نامۂ عطار صفحۂ ۴۵ طبع ثمر ہند لکھنؤ)

آخری دو شعروں سے صاف ظاہر ہوتا ہی کہ عطار خواجہ سعد الدین کے مُرید ہیں۔

شیخ مجدالدین اور قطب الدین خوارزم شاہ معاصر نہیں ہیں قطب الدین خوارزم شاہ (سنہ ۴۹۰ و سنہ ۵۲۱ ہجری) خوارزم شاہیوں کا دوسرا سلطان ہی اور جس بادشاہ کے حکم سے شیخ مجدالدین ہلاک ہوئے، وہ علاء الدین محمد خوارزم شاہ (سنہ ۵۹۶ ہجری و سنہ ۶۱۷ ہجری) ہی۔

قولہ "فقرا کا ایک تذکرہ لکھا ہی، جو تذکرۃ الاولیا کے نام سے مشہور ہی اور حال میں مسٹر براؤن نے اس کو شائع کیا ہی۔ عبدالوہاب

قزوینی نے، جو مسٹر برون کے شاگرد ہیں، ایک محققانہ دیباچہ لکھا ہے"
(شعرالعجم صفحہ ۱۱ و ۱۲)

عطار کا یہ تذکرہ جس کا مولانا ذکر فرماتے ہیں، حقیقت میں پروفیسر نکلسن نے مرتب کر کے ۱۹۰۵ء میں شائع کیا ہے۔ علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی، پروفیسر براؤن کے شاگرد نہیں ہیں، بلکہ شریکِ محنت فاضل۔ جن سے براؤن استفادہ کرتے رہے ہیں۔

قولہ "صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں: سنائی، اوحدی، مولانا روم اور خواجہ فریدالدین عطار"
(شعرالعجم صفحہ ۱۲)

اس فہرست میں اوحدی کے نام کا داخلہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوحدالدین کرمانی شاعر نہیں ہیں نہ اوحدی اُن کا تخلص ہے۔ اگر مولانا شبلی کی مراد اوحدی مراغی سے ہے تو اُن کے پایے کے، بلکہ ان سے بہتر درجنوں صوفی شعرا کا نام لیا جا سکتا ہے۔

شیخ عطّار کے حالات

تذکرہ نگاروں نے بہت کم حالات دیے ہیں اور جو کچھ دیے ہیں، شبہ سے خالی نہیں کیونکہ اُن کے نام پر اور لوگوں نے کتابیں تصنیف کر کے ان کے حالات کے مرقع کو اور بھی دُھندلا بنا دیا ہے۔ ان کا نام محمد ہے۔ فریدالدین لقب فرید اور عطّار تخلص ہے:-

من محمّد نامم و ایں شیوہ نیز ختم کردم چوں محمّد اے عزیز
(مصیبت نامہ قلمی)

وطن نیشاپور ہی کیونکہ ان کا معاصر محمدؐ عوفی اِن کو نیشاپوری بیان کرتا ہی۔ خود عطار نے اپنے وطن کا ذکر نہیں کیا۔ جس شعر میں نیشاپور کا ذکر کیا ہی اس سے ان کی وطنی خصوصیت واضح نہیں ہوتی :۔

بود مجنونے بہ نیشاپور در ‏ ‏ زو ندیدم در جہاں رنجور تر

تاریخ ولادت ۵۱۳ھ ہجری بتائی جاتی ہی لیکن یہ قرین قیاس نہیں، کیونکہ اُن کے ہاں ایسے بزرگ جو اُن کے قریب العہد ہیں، ایسے ہیں جو سنجر متوفی ۵۵۲ھ کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا ذکر شیخ عطار بصیغۂ ماضی بیان کرتے ہیں مثلاً سلطان سنجر، مہستی ندیمہ سنجر، عباسہ ایک باخدا خاتون جن کا سلطان سنجر معتقد ہی۔ خواجہ رکن الدین اکّاف اور احمد غزالی۔ سب سے حیرت خیز امر یہ ہی کہ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں اپنے کسی معاصر کا ذکر نہیں کرتے۔ البتہ مظہر العجائب میں شیخ مجد الدین اور شیخ نجم الدین کبریٰ کا ذکر آتا ہی، لیکن میں اس تصنیف کو شیخ عطار کی تسلیم نہیں کرتا۔ البتہ ان کی شاعری کا زمانہ معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس دو ذرائع ہیں: پہلا یہ ہی کہ منطق الطیر کے بعض نسخوں میں اِس کی تاریخ تصنیف ۵۸۳ھ ملتی ہی، چنانچہ :۔

روز سہ شنبہ بوقت استوا ‏ ‏ بیستم روزے بُد از ماہ خدا

پانصد و ہفتاد و سہ بگزشتہ سال ‏ ‏ ہم ز تاریخ رسول ذوالجلال

جس سے معلوم ہوتا ہی کہ عطار اس سن میں تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں۔ دوسرا ذریعہ یہ ہی کہ خروجِ مغول کے متعلق اُن کے ہاں ایک دو حوالے ملتے ہیں۔ مثلاً :۔

ہر کو بخلاف پشت بر دیں آرد ‏ ‏ در وقت زکوٰۃ بر جبین چیں آرد

مستوجبِ حد گردد و جبار جہاں برحد زدنش ترک زمابیں آرد

(از دیوان قلمی)

دیگر

کافر زرہ خطا ببازی ماند در راہ حقیقی نہ مجازی ماند
یا آنکہ مرا ریش شہیدانہ نبود یا خود زخطا کافر غازی ماند

اُن کا خاندان نہایت مذہبی تھا اور مذہبی ماحول میں ان کی تربیت اور نشو ونما ہوئی۔ شیخ کے والد کا بڑی عمر میں انتقال ہوتا ہے۔ اسرار نامہ میں ان کی وفات کا ذکر آتا ہے:۔

بپرسیدم در آندم از پدر من کہ چونی؟ گفت چونم اے پسر من
زحیرت پائے از سر می ندانم دلم گم گشت دیگر می ندانم
نگردد ایں کمان کار دیدہ بباز وے چو من پیرے کشیدہ
چنیں عالم کہ دریا میزند جوش زخونم قطرۂ بر ناورد جوش
بدو گفتم کہ چیزے گوے آخر کہ سرگرداں شدم چوں گوے آخر
جوابم داد کاے دانندہ فرزند! بفضل حق بہر نامے ہنرمند
زغفلت خود نمائیدم ہمہ عمر چہ گویم تراژ خائیدم ہمہ عمر
بآخر دم چنیں گفت آں نکوکار کہ یارب مر محمّد رانگہ دار
پدر ایں گفت و مادر گفت آمیں وزاں پس زو جدا شد جان شیریں
خدایا گفت ایں ہر دو گرامی بفضلت مہر بر نہ بر تمامی
اگرچہ گردنم زیر گنا ہست دعاے ایں دو پیرم حرز راہست
بہ بیں یارب دو پیر ناتواں را بدیشاں بخش جان ایں جواں را

والدہ سے بے حد محبت کرتے تھے، جو زہد و اتقا میں لاثانی تھیں۔

انھوں نے بھی دراز عمر پائی اور اٹھائیس برس تک بے چادر اور بے موزہ رہیں اور ترک دنیا کر کے، گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر، دن رات عبادت الٰہی میں مصروف رہیں۔ خسرو نامہ میں اُن کے مرثیے میں فرماتے ہیں :-

مرا گر بود اُنسے در زمانہ — بمادر بود او رفت از میانہ
اگرچہ رابعہ چندیں بفر بود — ولیک ایں ثانیہ آں شیر نر بود
نبود او زن کہ مرد معنوی بود — سحرگاہاں دعاے او قوی بود
ز سال بست و ہشت اکنوں زیادت — کہ نے چادر نہ موزہ بود عادت
ز دنیا فارغ و دولت گزیدہ — گرفتہ گوشۂ و عزلت گزیدہ
چناں پشتم قوی داشت آں ضعیفہ — کہ ملک شرع را روے حنیفہ
اگرچہ عنکبوتے ناتواں بود — ولیکن بر سرِ من پہلواں بود
نہ چنداں ست بر جانم غم او — کہ بتواں کرد ہرگز ماتم او
چو محرم نیست ایں غم با کہ گویم؟ — مرا او بود محرم تا چہ گویم
اگر بر سم باد یا او بگویم — غمے کز مرگ او آمد بر ویم

(خسرو نامہ مطبع ثمر ہند صفحہ ۶۰۲)

خسرو نامہ انھوں نے ساٹھ سال کی عمر کے کئی سال بعد لکھا ہی اس عمر میں بھی وہ والدہ کو اِس طرح یاد کرتے ہیں جیسے کوئی بچہ کر رہا ہو، لیکن یہ سب اسی مذہبی تعلیم کا نتیجہ ہی جس کی فضا میں عطار نے پرورش پائی تھی۔

عطار اس قدر گم نام رہنا چاہتے ہیں کہ باوجود تصنیفات کثیرہ اپنے ذاتی حالات بہت کم دیے ہیں۔ اسرار نامہ میں اپنی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے غزا میں شریک ہونے کا اتفاقیہ ذکر کر دیا ہی :-

بہر دکان کسے پرّد پریدیم	بہر کم کاں کسے پوید دویدیم
گہے با رند در مے خانہ بودیم	گہے رُخ بر در مے خانہ سودیم
گہے زنار ترسایاں بہ بستیم	گہے در دیر ترسایاں نشستیم
گہے باکافراں در جنگ بودیم	گہے با آتش اندر سنگ بودیم
گہے سجادہ بر دوش آوریدیم	گہے در بحر دل جوش آوریدیم
گہے سر بر سر زانو نہادیم	گہے در ہاؤ ہو اندر فتادیم

ان کی طبیعت میں انتہائی مسکنت اور کسر نفسی جاگزیں تھی۔ ایک دن ایک دوست نے اُن سے بیان کیا کہ فلاں شخص بطریق حلال روزی کماتا ہے، یعنے یہودیوں سے جزیہ وصول کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے - اِس سے اچھی کمائی اور کیا ہو سکتی ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ مَیں اِس کے متعلق کچھ نہیں جانتا، صرف اتنا جانتا ہوں کہ مَیں ننگ دو جہاں ہوں، اگر سو یہودی بھی مجھ سے جزیہ لیں تو کم ہے":-

رفیقے گفت بامن کاں فلانے	حلالے می خورد قوت جہانے
کہ جزیہ از یہوداں می ستاند	وزآں جامی خورد بہ زیں کہ داند؟
بدو گفتم کہ من آن می ندانم	من آں دانم کہ از ننگ جہانم
کہ باید صد جہود بس پریشاں	کہ تا خواہند از من جزیہ ایشاں

(کلیات عطار - الٰہی نامہ صفحہ ۸۷۸ - نول کشور)

ان کا پیشہ طب تھا اور ساتھ ہی دارو خانہ کھول رکھا تھا اور مطب بڑی رونق پر تھا۔ ایک حکایت میں کہتے ہیں :- "ہمارے شہر میں ایک مال دار بخیل بیمار تھا، جس کے پاس پچاس ہزار دینار نقد موجود تھے۔ مجھے اُس کے علاج کے لیے ایک آدمی لینے آیا۔ مَیں نے جا کر دیکھا کہ وہ بیس

کا پیر فرتوت ہی جو بوجہ مرض بالکل گھُل چکا ہی اور موت کے گھاٹ آ لگا ہی۔ اِس کے پہلو میں ایک سر بمہر عرق گلاب کا شیشہ رکھا ہوُا تھا۔ مَیں نے تیمار دارو سے کہا کہ شیشہ کھول کر تھوڑا سا گلاب مریض پر چھڑک دو۔ مریض نے جو نیم غشی کی حالت میں تھا، فوراً آنکھ کھول دی اور کہنے لگا: خبردار! گلاب نہ چھڑکنا! مَیں اِس کے صرف کیے جانے کے مقابلے میں اپنا مرنا آسان سمجھتا ہوں۔ بوڑھا بخیل یہ الفاظ ختم کرنے بھی نہ پایا تھا کہ اُس کا دم نکل گیا"۔ اِس حکایت کا ابتدائی شعر ہی :۔

بشہر ما بخیلے گشت بیمار — کہ نقدش بود پنجہ بدرہ دینار

(اسرار نامہ صفحہ ۱۷۷ طبع طہران ۱۲۹۸ھ ہجری)

تصنیفات میں ساٹھ برس کی عمر سے لے کر نوّے سال تک کی طرف اشارے ملتے ہیں :۔

(۱) سی سال بصد ہزار تگ بدویدیم — تا از رہِ نو بدرگہت برسیدیم
سی سال دگر گرد درت گردیدیم — چو یک زنِ بام وعسس دربودیم

(کلیات۔ مختار نامہ صفحہ ۹۵۲)

(۲) اگر من پشت را سازم کمانے — چو سالم شصت شد نبود امانے
مرا در شست افتادہ است ہفتاد — چنیں صیدے کرا در دست افتاد
ز شست آں کماں تیرے شود راست — ز شصت من کماں کو ز برخاست
ازاں شست و کماں قوت شود بیش — ازیں شصت و کماں دل می شود ریش

(اسرار نامہ۔ قلمی)

(۳) تو غافلی و بہفتاد پشت تو چو کماں
تو خوش بخفتہ و عمرت چو تیر رفتہ ز شست (دیوان قلمی)

(۴) چوں بہفتاد بہفتاد ی واین نیست عجب
عجب اینست کہ این نفس تو ہردم براست (دیوان قلمی)

(۵) مرگ در آدر دپیش وادیِ صد سالہ راہ عمر تو انگند شست در سر ہفتاد واند

(دیوان قلمی)

(۶) گر وصل منت باید اے پیر نود سالہ ہم خرقہ بسوزانی، ہم قبلہ بگردانی

(دیوان قلمی)

تمام عمر گوشۂ قناعت میں بسر کردی اور آستانۂ ملوک سے کوئی سروکار نہیں رکھا:۔

چہ خواہم کرد طول وعرض دنیا کبودئ سما وارض دنیا
مرا ملکے کہ من دارم بسنداست وگر در بایدم چیزے بسنداست
چو در ملک قناعت پادشاہم توانم کرد دائم ہرچہ خواہم

(کلیات۔الہی نامہ صفحہ ۹۳۳)

دوسرے موقعے پر فرماتے ہیں:۔
شکر ایزد را کہ ادباری نیم بستۂ ہر ناسزاواری نیم
من زکس بر دل چرا بندے نہم نام ہر دونے خداوندے نہم
نے طعامے ہیچ ظالم خوردہ ام نے کتابے را تخلص کردہ ام

(منطق الطیر۔کلیات۔صفحہ ۱۱۶۲۔ نول کشور)

ایک اور مقام پر فرمایا ہو:۔
نے زہمت میل ممدوحے مرا نے زظلمت خلوت روحے مرا
نے ہوائے لقمۂ سلطاں مرا نے قفائے سیلئِ درباں مرا

(منطق الطیر۔ کلیات ۔ صفحہ ۱۱۶۳)

دربارداری کے سلسلے میں اس قدر کہا جا سکتا ہی کہ کسی بادشاہ کی خدمت میں عید کی مبارک باد کا ایک قصیدہ لکھ کر لے گئے ہیں۔ اس کا نام کہیں ظاہر نہیں کرتے، لیکن وہ بادشاہ بھی اُنھیں کے ڈھب کا معلوم ہوتا ہی۔ اُس نے تین ماہ برابر روزے رکھے ہیں اور شیخ مبارک باد میں قصیدہ لکھتے ہیں اور ردیف بھی روزہ لاتے ہیں۔ مدح نگاری چونکہ اُن کو راس نہیں ہی اِس لیے اِس قصیدے میں ایسے شعر خام پیدا کیے ہیں کہ قصیدے کا جوہر شناس اُن کو دیکھ کر دنگ رہ جائے گا۔ گریز کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

خدایگان فلک قدر آنکہ ہر رمضان ، زخوان او بکشا داست قرص غم ز روزہ
سہ ماہ روزہ چو او داشت نور روزۂ او ، مدام در دو جہاں گشت نامور روزہ
ز بہرہ روزۂ شہ نہ سپہر جشنے ساخت ، کہ بو کہ شہ بکشاید بدیں قدر روزہ

دعا کے وقت کہا ہی :۔

خدایگانا شعر لطیف را عطار ، ردیف کرد بمدح تو سر بسر روزہ
منم کہ ختم سخن بر منت ز بہرہ کراست ، کہ صد سخن بکشاید بدیہہ بر روزہ
ہمیشہ تا شب و روز است عید روزی باد ، ہزار عیدت و عیدیت باد ہر روزہ

(دیوان قلمی)

، نامہ عطار کی تصنیف مانا جاتا ہی، جو بحر ہزج، مسدس محذوف خاتمے پر بحر منسرح میں مثنوی کے کچھ اشعار ملتے ہیں۔

ند ضیاء الدین یوسف کو پند دیتا نظر آتا ہی:۔

تو دیدۂ بختم بجمالت گرد
روے نو دی نو لبِ از شصت سال

سال تو چار است بوقت شمار — چار تو چل باد و چلت باد چار

نام تو شد یوسف مصر وفا — باد لقب دولت دیں را ضیا

من کنم از خامۂ حکمت نگار — بہر تو ایں مایۂ حکمت نگار

گرچہ ترا نیست کنوں فہم تند — چوں بحد فہم رسی کار بند!

فرماتے ہیں، جب تک تمھارے منہ پر خط نہ نکل آئے گھر سے باہر قدم مت دھرنا :۔

تا نشود بر قمع روے تو موے — پا منہ از خانہ ببازار و کوے

سلسلہ بند قدم خویش باش — حبس نشین حرم خویش باش

ہیچ گہ از صحبت ہم خانگاں — رخت مکش بر در بیگانگاں

تعلیم اور مکتب نشینی کے سلسلے میں جو نصیحتیں کی ہیں، ان کے ضمن میں کہا ہے کہ اُستاد کی مار کھانا اگرچہ سعادت ہے، لیکن تم کوشش کرو کہ اس سعادت سے محروم رہو :۔

سیلیٔ او گرچہ فضیلت دہ است — گر تو بسیلی نرسانی بہ است

قرآن پاک بچپن ہی میں حفظ کر لینا کیونکہ بچپنے میں جو چیز یاد ہو جاتی ہے انسان بڑا ہو کر نہیں بھولتا :۔

حرف نوشتہ بدل طفل خورد — کز لک نسیاں نتواند سترد

خط پاکیزہ لکھنے کی کوشش کرنا۔ شعر گوئی اگرچہ ایک قسم کا کمال ہے لیکن اس میں عیب بھی ہیں۔ گاہے ماہے لکھو تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن میری طرح اس کو اپنا پیشہ نہ بنا لینا :۔

درچہ فتد گہ گہے اندیشہ اش

کوش کہ چوں من نکنی پیشہ اش

مختلف بلبل ناموں کے خاتمے میں اشعار[۵] بالا میری نظر سے گزرے ہیں تاہم مجھ کو یقین نہیں آتا کہ یہ عطار کے قلم سے نکلے ہوں۔

مذہباً سنت جماعت ہیں اور ظن غالب ہی کہ حنفی ہیں۔ قریب قریب اپنی ہر تصنیف میں اصحاب اربعہؓ کی مدح میں قلم اُٹھایا ہی۔ قاضی نور اللہ شوستری اور میرزا محمد ابن عبد الوہاب قزوینی ان کو شیعہ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کا یہ عقیدہ محض ایسی تالیفات پر مبنی ہی جو بعد میں شیخ عطار کی طرف منسوب کردی گئی ہیں۔ ورنہ عطار نے ایک سے زیادہ موقعے پر اصحاب ثلاثہ کے مخالفوں کو تشنیع کی ہی۔ اُن کے نزدیک چاروں صحابہ کا رُتبہ برابر ہی:۔

دوئی باشد کجا در چار اے خام | یکے بینی در آغاز و در انجام
گر ایں ہر چار را باہم نداری | تو یک عالم ز دو عالم نداری

(خسرو نامہ صفحہ ۱۴۱ و ۱۴۲، طبع ثمر ہند)

مصیبت نامے میں تعصب کرنے والوں کو خطاب کرکے فرماتے ہیں:۔

اے تعصب بند بندت کردہ بند | چند گوئی چند از ہفتاد واند
در سلامت ہفت صد ملت ز تو | لیک ہفتاد و دو بر علت ز تو
ہست کیش و راہ ملت بے شمار | تا تو نشماری نیابی روزگار
گر تو ہستی پس رو صدیق را | یا علی آں عالم تحقیق را

---

۵ نظر ثانی کرتے وقت معلوم ہوا کہ بلبل نامہ کے اشعار مذکورۂ بالا مولانا جامی کے قلم سے نکلے ہیں اور ان کی مثنوی تحفۃ الاحرار (مقالۂ بستم در ہندوادن فرزند ارجمند) میں موجود ہیں۔ ضیاء الدین یوسف جامی کے فرزند کا نام ہی۔ انہی کے نام پر نصاب ضیائی مولانا جامی نے تصنیف کیا ہی۔

بے تعصب گرد و بے تقلید شو — شرک سوز و غرقۂ توحید شو

چوں صحابہ یک بیک آزادہ اند — در ہدایت چوں نجوم افتادہ اند

گر کسے در یک تن آں قوم پاک — کرد طعنے بر ستارہ ریخت خاک

(مصیبت نامہ، قلمی)

اور حضرت ابو بکرؓ کے حق میں لکھتے ہیں :-

از صحابہ سی ہزار و سہ ہزار — از میان جانش کردند اختیار

او کجا در بند آب و جاہ بود — کآب و جاہ او ہمہ اللہ بود

آں کہ از عرش و فلک فارغ بود — شک نباشد کز فدک فارغ بود

(مصیبت نامہ، قلمی)

منطق الطیر میں بھر یہی استدلال پیش کیا گیا ہے :-

اے گرفتار تعصب آمدہ — دائما پُر بغض و پُر حب آمدہ

گر تو لاف از عقل و از لب میزنی — پس چرا دم از تعصب می زنی

در خلافت میل نیست اے بے خبر — میل کے آید ز بو بکرؓ و عمرؓ

میل اگر بودے در آں دو مقتدا — ہر دو کردندے پسر را پیشوا

بہتریں چوں نزد تو باشد بتر — کی تواں گفتن ترا صاحب نظر

کی روا داری کہ اصحاب رسول — مرد ناحق را کنند از جاں قبول

یا نشانندش بجاے مصطفےٰؐ — از صحابہؓ نیست ایں باطل روا

اختیار جملہ شاں گر نیست راست — اختیار جمع قرآں پس خطاست

بلکہ ہر چہ اصحاب پیغمبر کنند — حق کنند و لائق و درخور کنند

گر کنی معزول یک تن را ز کار — می کنی تکذیب سی و سہ ہزار

خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے بارے میں کہتے ہیں :-

در عمرؓ گر میل بودے ذرۂ ‏ کی پسر کشتے بزخم درۂ
گر خلافت بر خطا می داشت او ‏ ہفدہ من دلقے چرا می داشت او
چوں بجامہ دست دادش نے گلیم ‏ بر مرقع دوختہ پارہ ادیم
آنکہ زینساں شاہیے خیلے کند ‏ کی روا داری کہ او میلے کند
آنکہ گاہے خشت وگاہے گل کشد ‏ ایں ہمہ سختی نہ بر باطل کشد
گر خلافت بر ہوا می راندے ‏ خویشتن بر سلطنت بنشاندے
شہر ہاے منکراں ہنگام او ‏ شد تہی از کفر در ایام او
گر تعصب می کنی از بہر آں ‏ نیست انصافت بمیر از قہر آں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق گویا ہیں :-

چند گوئی مرتضیٰ مظلوم بود ‏ از خلافت راندن محروم بود
چوں علیؓ شیر حق است و تاج سر ‏ ظلم نتواں کرد بر شیر اے پسر
مرتضیٰ نامے مکن از خود قیاس ‏ زاں کہ در حق غرق بود آں حق شناس
گر چہ تو پر کینہ بودے مرتضیٰ ‏ جنگ جستے پیش خیلِ مصطفےٰ
او ز تو مردانہ تر آمد بسے ‏ پس چرا جنگے نکرد او با کسے
گر بناحق بود صدیقؓ اے عجب ‏ او چو بر حق بود حق کردے طلب
پیش حیدر خیل ام المومنین ‏ چوں شدہ بہ منوال دیں جستند کیں
لاجرم چوں دید چنداں جنگ و شور ‏ دفع کرد آں قوم را حیدر بزور
آں کہ با دختر تو اند جنگ کرد ‏ داند او سوے پدر آہنگ کرد
اے پسر تو بے نشانی از علیؓ ‏ عین و لام و یا بدانی از علیؓ

حضرت عمرؓ کے حق میں کہتے ہیں :-

اگر بر دل ز فاروقت غباریست ‏ ترا در راہ دیں آشفتہ کاریست

چه بر خیزی بخصمیٔ چراغے | که روشن زوست چوں فردوس باغے
عجم ز اول جهود و گبر بودند | از و گوئے مسلمانی ربودند
کسے کا جدادش ایماں از عمرؓ یافت | ز مهر او چرا امروز سر تافت

(خسرو نامہ قلمی)

کلام پر تبصرہ

سادگی اور سلاست شیخ عطار کے کلام کا سب سے نمایاں وصف ہی۔ ان کا اصلی مقصد شاعری نہیں ہی، بلکہ شعر کو اپنے خیالات و جذبات و واردات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہی۔ محاسنِ شاعری کا کہیں نام کو بھی سُراغ نہیں۔ سیدھی سادی زبان میں جو کچھ کہنا ہوتا ہی کہہ گزرتے ہیں۔ تصنع اور آورد کا سایہ تک نظر نہیں آتا۔ الفاظ کی تلاش یا ان کے انتخاب کی ضرورت انھیں کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ اور مضامین ہیں کہ بادل کی طرح اُمڈے چلے آتے ہیں۔ لکھنے سے نہ اُن کا قلم تھکتا اور نہ دماغ خستگی محسوس کرتا ہی۔ عطار پُرگوئی کے لیے مشہور ہیں اور خود انھیں اس کا اعتراف ہی، بلکہ شکایت ہی کہ میں ایک مضمون کی خواہش کرتا ہوں اور ایک کے بجائے دس آجاتے ہیں:

چنانم قوت طبع است در فکر | که یک معنی بخوانم صد دہد بکر
در اندیشه چناں مست و خرابم | که دیگر می نیاید ہیچ خوابم
نیابم خواب شب بسیار واندک | ازیں پہلو ہمی گردم بداں یک
ہمی رانم معانی را ز خاطر | که یک دم خواب یابم بو که آخر
یکے را گر برانم ده بر آید | بتر را گر برانم به بر آید

زبس معنی کہ دارم در ضمیرم خدا داند کہ در گفتن اسیرم
(اسرار نامہ۔ صفحہ ۴ - ۱۹۵ طبع طہران)

پُر گوئی کے باوجود اعلیٰ درجے کی پختگی موجود ہی۔ گھلاوٹ اور تاثیر غالب ہی۔ تمام کلام صاف اور ہموار ہی اور حشو و زوائد سے پاک خیالات متین اور سنجیدہ ہیں جن میں خلوص اور پاک اعتقادی کی لہر شروع سے آخر تک دوڑ رہی ہی۔ اِنھیں اوصاف نے اُنھیں ایران کے مشاہیر اور اعلیٰ اساتذہ کی صف میں کھڑا کر دیا ہی - اُن کے اپنے زمانے میں ایک بڑی جماعت ان کی شیدائی اور معتقد تھی۔ اپنے ایک دوست کا ذکر کرتے ہیں جس کی فرمایش پر انھوں نے خسرو نامہ تصنیف کیا ہی کہ اس کو ان کا پورا مختار نامہ، سو قصیدے، ایک ہزار غزلیں اور قطعات یاد تھے۔ اس ایک بیان سے ان ایّام میں عطار کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہی۔

قدما کے مقابلے میں انھوں نے غزل کو بے حد ترقی دی ہی۔ جو غزل صاف نکل آتی ہی وہ سعدی کی غزل کے ہم پلّہ ہی۔ غزل میں انھوں نے رندی اور مستی کے مضامین روشناس کر دیے ہیں۔ خمریات میں خیّام کا سارنگ ہی، لیکن اُس کے ہاں شراب محض ہی اور اِن کے ہاں شراب معرفت ہی۔ اس میدان میں وہ صوفیا کے نبی غیر مرسل شمار ہونے چاہییں۔ حقیقت کو مجاز کی زبان میں بیان کرنے کی بُنیاد حکیم سنائی ڈالتے ہیں لیکن یہ عطار ہیں جو اس بنیاد پہ عالی شان عمارت تیار کرتے ہیں۔ مے و جام، پیمانہ و مے خانہ، رند و خرابات، زنار و بت، ترسا و کنشت جو فارسی غزل گویوں کے دستمایۂ ناز ہیں۔ اصل میں ان کے

مقبول بنانے والے فریدالدین عطار ہیں۔ غزل میں عشق کی چاشنی کا رنگ عطار سے بیشتر موجود تھا۔ مگر جوشش و سرمستی، محویت و استغراق عطار سے قبل نامعلوم کیفیت تھی۔ سنائی تصوف کے کوچے میں آنے کے باوجود نرے زاہد خشک رہے، ان کے ہاں شریعت پہلے ہے اور طریقت بعد میں مثلاً فرماتے ہیں :۔

زراہ دیں تواں آمد بصحرائے نیاز آرے   بمعنی کی رسد مردم گزر ناکردہ براسما

دیگر

چو جاں از دیں قوی کردی تن از خدمت مزیّن کن

کہ اسپ غازی آں بہتر کہ با برگستواں بینی

دیگر

دولت دیں نی و برجاں نقش حکمت دوختن

نوح و کشتی نی و در دل عشق طوفاں داشتن

لیکن عطار زہدیت سے گزر کر، عشق و محویت اور فنا کی منازل میں مقیم ہیں۔ چنانچہ :

گر سر عشق خواہی از کفر و دیں گزر کن

کانجا کہ عشق آمد چہ جائے کفر و دین است

دیگر

لب دریا ہمہ کفر است و دریا جملہ دیں داری

ولیکن گوہر دریا ورائے این و آں باشد

دیگر :۔

زکفر و دین و زنیک و زبد زعلم و عمل

بروں گزر کہ بروں زیں بسے مقامات است

اسی غزل کے باقی اشعار بھی ملاحظہ ہوں، خصوصاً مطلع جو بالکل حافظ کے رنگ میں ہی:-

بیا کہ قبلۂ ما گوشۂ خرابات است
بیار بادہ کہ عاشق نہ مرد طاماتست
مگو ز خرقۂ و تسبیح زانکہ ایں دل مست
میاں بہ بستہ بزنار در خراباتست
چہ داند آنکہ نداند کہ چیست لذتِ عشق
ازاں کہ لذت عاشق ورلے لذاتست
مقام عاشق و معشوق از دو کوں بیرونست
کہ حلقۂ در عشاق تا سمٰواتست
بنوش دُرد و فنا شو اگر بقا خواہی
کہ زاد راہِ فنا دُردی خراباتست
بکوے نفی فرد شو چنانکہ برنائی
کہ گرد دائرۂ نفی عین اثباتست
زہر دو کون فنا شو دریں رہ اے عطار
کہ فانیِ رہِ عشاق فانی الذاتست

الغرض عشق و سرمستی اور فنائیت کا جذبہ غالب ہی۔ یہ اشعار بھی پیش نظر رہیں:۔

گم شدم در خودنمی دانم کجا پیدا شدم
شبنمے بودم ز دریا غرقہ در دریا شدم
سایۂ بودم زاوّل بر زمیں افتادہ خوار
راست کاں خورشید پیدا گشت ناپیدا شدم

واردات عشق

ترسا بچہ ام افگند از زہد برسوائی — اکنون من و زنارے در دیر بہ تنہائی

دے زاہد دیں بودم، دریائے یقیں بودم — سجادہ نشیں بودم، سر دفتر دانائی

امروز اگر ہستم دُردی کش و سرمستم — در بتکدہ بنشستم دیں دادہ بہ ترسائی

نہ محرم ایمانم، نہ کفر ہمی دانم — نہ اینم و نہ آنم، درماندہ برسوائی

دوش از غم کفر و دیں یعنی کہ نہ آن و ایں — بنشستہ بُدم غمگیں شوریدہ و سودائی

ناگہ ز درون جاں درداد ندا جاناں — کاے عاشق سرگرداں تا چند زشیدائی

روزے دو اگر از ما ماندی تو چنیں تنہا — باز آے سوے دریا چوں گوہر دریائی

ہرچند کہ بے دردی، کز محرم ما گردی — فانی شو اگر مردی، تا محرم ما آئی

عطار چہ دانی تو، دیں قصہ چہ خوانی تو — گر ہیچ نمانی تو ایں جا شوی آں جائی

دیگر

دے بامداد کاں صنم آفتاب روے — برمن گزشت ہمچو مہ اندر میان کوے

گفتم: "مگر عزیمت خمار کردہ" — گفتا: "بلے تو نیز بیا باکسے مگوے"

چوں ساعتے برآمدہ من نیز در شدم — او در درون و خلق زبیروں بگفت و گوے

دیدم بناز تکیہ زدہ برکنار حوض — ہمچوں گلے کہ تو بدمد برکنار جوے

می کرد آب را تن و اندام او خجل — می زد شراب از لب او سنگ بر سبوے

گیسوے مشکبوے سپر درفگندہ بود — موے میانش گم شدہ اندر میان موے

چوں دید کآب دیدۂ من گرم می رود — شستے گلم بداد کہ دست از دلت بشوے

دست از دلم بشستم و آں گاہ گفتمش — کاے جان نازنین! دل عطار را بجوے

وحدتِ وجود۔ ان سے پہلے فارسی نظم میں اس کا بہت کم پتا چلتا ہے۔

(مستزاد) :-

نقد قدم از مخزن اسرار برآمد خود گنج عیاں شد
خود بود کہ خود بر سرِ بازار برآمد بر خود نگراں شد
در کسوت ابریشم و پشم آمد و پنبہ تا خلق بپوشند
خود بر صفت جبہّ و دستار برآمد لبس ہمگاں شد
در موسم نیساں ز سما شد سوے دریا در کسوت قطرہ
در بحر بشکل دُر شہوار برآمد در گوشش بتاں شد
در عین بتاں خواست کہ خود را بپرستد خود را بپرستید
خود گشت بت و خود بپرستار برآمد خود عین بتاں شد
خود بر سر خود تیغ جفا زد ز سر قہر خود مرہم خود جست
خود بر صفت خستہ ببازار برآمد خود فاتحہ خواں شد
خود بزم شد و مے خور و ساغر شد و ساقی خود پیر خرابات
خود مے شد و خود از خم خمار برآمد خود کوزہ کشاں شد
اشعار مپندار اگر چشم سرت ہست رازیست نہفتہ
آنچہ بزباں از دلِ عطار برآمد ایں بود کہ آں شد

قصائد اکثر برباد ہو گئے، اب جو ملتے ہیں تیس چالیس سے زیادہ نہیں۔ ان میں دنیا کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کی ناپایداری کی تمام دلائل لاکر ہم کو روحانیت کی طرف دعوت کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم سب فانی ہیں اور دورانِ حیات میں عاجز و ناتواں۔ افلاک و ایام کی آغوش میں بسنے والا انسان جو تقدیر کی زنجیروں میں سخت جکڑا ہوا ہے

دنیا میں آکر پابندِ غفلت اور محوِ خواب بن گیا ہی حالانکہ اس کا بار گراں ہی، اس کی منزل دراز ہی اور موت اُس کی گھات میں ہی۔ کہتے ہیں انسان کا دیباچہ و تمتِ حیات خون و خاک ہیں۔ وہ خون جو رحم مادر میں قرار پکڑتا ہی اور وہ خاک جو بعد حیات اس کو جگہ دیتی ہی۔ انسان اگر دیدۂ غور سے زمین پر نگاہ ڈالے تو مشرق سے مغرب تک اس کو نظر آئے گا کہ چپّہ چپّہ مقام پر اس کے ابنائے جنس محوِ خواب عدم ہیں:۔

کز شرق تا بہ غرب سراپائے خفتہ اند — خورد و بزرگ و پیر و جوان و شہ و گدا

دیگر:۔ زیرِ خاک از حدِّ مشرق تا بہ مغرب خفتہ اند
بندہ و آزاد و شہری و غریب و شیخ و شاب

زمانہ ماہِ نو کی داس (درانتی) بناتا ہی اور اِس داس سے اس بے بس گھاس یعنے انسان کو کاٹتا اور چھانٹتا رہتا ہی:۔

چو داس ماہِ نو از بہرِ آں ہمی آید — کہ تا چو خوشہ سرِ خلق می زند زقفا
گیا ہمی دمد از خاک گور و غم اینست — کہ نیست ہیچ غمے داس را ز رنج گیا

فردوسی یہی خیال ان الفاظ میں ادا کرتا ہی:۔

بیابان و آں مرد با تیز داس — گیاہ تر و خشک از و در ہراس
تر و خشک را او ہمی بدرود — وگر لابہ سازی ہمی نشنود
درو گر زمانست و ما چوں گیا — ہمانش نبیرہ ہمانش نیا

ایام حیات میں جو لوگ گلاب کی طرح شگفتہ تھے اب ان کی خاک پر ابر گلاب برساتا ہی، سنبل کی طرح جن کی زلفیں تابدار تھیں خاک تاریک نے نہ وہ عارض چھوڑے اور نہ وہ زلفیں۔ اِس خاک پر اِتراتے نہ چلو کیوں کہ تمھارا راستہ حسینوں کی آنکھوں پر سے گزرتا ہی۔ لالہ میں جو یہ سُرخی

دیکھتے ہو یہ تمھارے عزیزوں ہی کا خون ہی جو خاک پر بہا یا گیا۔ اس موقعے پر عطار بالکل خیام کی بولی بولنے لگتے ہیں :-

داں کہ رویش ہمچو گل بشگفتہ بودے ایں زماں
ابر می ریزد بزاری بر سر خاکش گلاب
داں کہ زلفش ہمچو سنبل تاب در سر داشتے
خاک تاریکش نہ سر بگزاشت نے زلف و نہ تاب

دیگر

جملۂ زیر زمیں گر بحقیقت نگری
شکنِ طرۂ مشکین و لب چوں شکراست
چشمِ دل باز کن از مردمِ نیک بداں
مردم چشمِ بتانست کہ ترا رہگزراست

دیگر

از غبار خاک رہ مفشاں سر دست اے عزیز
زاں کہ آں فرق عزیزاں بد کہ ایں جا شد غبار
خون دلہاے عزیزاں ست در گلِ ریختہ
آں ہمہ سرخی کہ می بینی بروئے لالہ زار
جملۂ زیر زمیں در خاک برہم ریختہ ست
زلفہاے تابدار و لعلہاے آبدار

دیگر

فصیح در سخن آمد بہ پیش من آں خم
کہ بودہ ام تن مردے ز مردمان کبار
ہزار بار خم و کوزہ کردہ اند مرا
ہنوز تلخ مزاجم ز مرگ شیریں کار

(دیوان قلمی)

خیام کا یہ انداز عطار کو بے حد پسند ہی۔ غزلیات میں بھی بعض

وقت یہی رنگ اختیار کیا ہی مثلاً

یک شربت آب خوش نتواں خورد درجہاں
کیں کوزہا ز خاکِ تنِ دوستانِ ماست

(بیاض بندہ علی خاں)

قصہ مختصر، اِس قسم کا استدلال ہی جو عطار ہم کو دُنیا سے دل گیر اور اُداس بنانے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ یہ خیالات اگرچہ جدید نہیں کیوں کہ اُن کو قریب قریب ہر ایرانی شاعر کے ہاں دیکھا جاتا ہی لیکن ان کے ہاں یہ خیالات محض اتفاقیہ ہیں اور کوئی مقصد و غایت نہیں رکھتے مگر عطّار کے ہاں وہ ان کے فلسفۂ تصوف کی مبادیات میں داخل ہیں۔ سالک کو دنیا کی طرف سے برداشتہ خاطر کرنے کے بعد وہ حقیقت کی دعوت دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے دل کی صفائی اور طہارت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ بات اشکِ گرم اور آہِ سرد سے حاصل ہوگی یعنے شب زندہ داری اور نالہ و زاری سے۔ ؎

بادہانِ خشک و چشمِ تر قناعت کن از انک
ہر کہ قانع شد بخشک و تر شہِ بحر و بر است

دیگر :-

ز اشکِ گرم و دمِ سرد خود بکن خمے خشک
کہ معتدل تر ازیں نیست ہیچ آب و ہوا

عطّار نے انسانی زندگی کی بے اعتباری اور بے حقیقتی پر نادر مضامین نکالے ہیں، فرماتے ہیں :-

قطرۂ بیش نہ چند ز خود اندیشی | قطرہ چیست اگر گم شد اگر دریا شد

بود و نابود تو یک قطرۂ آبست ہمی — کہ ز دریا بکنار آمد و در دریا شد

(بیاض بندہ علی خاں)

خسرو نامہ میں کہتے ہیں:-

در آمد پشۂ از لاف سرمست — دمے بر فرقِ کوہ قاف بنشست

چو برجست و از انجا باعدم شد — چہ افزود اندراں کوہ و چہ کم شد

فردوسی کے ہاں یہ خیال بہتر پیرایہ میں ادا ہوا ہی:-

یکے مرغ بر کوہ بنشست و خاست — بر آں کہ چہ افزود ازاں کہ چہ کاست

تو آں مرغی و ایں جہاں کوہ تست — چو رفتی جہاں را چہ اندوہ تست

(بیاض بندہ علی خاں)

مختار نامہ میں یہی مطلب یوں ادا ہوا ہی:-

خلقے کہ دریں جہاں پدیدار شدند — در خاک بعاقبت گرفتار شدند

چندیں غم خود مخور کہ ہمچوں من و تو — بسیار در آمدند و بسیار شدند

(کلیات عطار صفحہ ۹۹۵ طبع نول کشور)

قصائد اگرچہ اکثر زہد و حکمت و پند و موعظت کے مضامین پر شامل ہیں لیکن ذیل کے اشعار میں کسی قدر رنگ بدلا ہی اور نظارۂ گل و ریاحین میں مصروف ہیں:-

بادِ شمال می وزد جلوۂ یاسمن نگر — وقتِ سحر ز عشقِ گل بلبل نعرہ زن نگر

سبزۂ تازہ روے را نو خطِ جوئبار بیں — سنبل شاخ شاخ را مو رچہ چمن نگر

سوسنئ لطیف را ہمچو عروسِ بکر بیں — بادِ مشاطۂ فعل را جلوہ گرِ سمن نگر

خیریِ سرفگندہ را در غمِ عمر رفتہ بیں — سوسنِ شیر خوارہ را آمدہ در سخن نگر

لعبتِ شاخ ارغواں طفلِ زباں کشادہ بیں — ناوکِ چرخ بوستاں غنچۂ بیدہن نگر

تا کہ بنفشہ باغ را صوفیے فوطہ پوش کرد
از پئے رہزنی او طرۂ یاسمن نگر
خیز و بیا بوقتِ گل بادہ بدہ کہ عمر شد
چند غمِ جہاں خوری شادیٔ انجمن نگر
تا گل پادشاہ وش تخت نہاد در چمن
لشکریانِ باغ را خیمۂ نسترن نگر

بادِ شمال اور لشکریان باغ سے یکایک منہ موڑ کر پھر وہی قدیمی سرودِ فنا چھیڑ دیا ہی :-

اے دلِ خستہ عمر شد تجربہ گیر از جہاں
زندگیٔ بدست کن مردنِ مرد و زن نگر
از سرِ خاک دوستاں موج در یغ می زند
بر گزر روز خاک شاں حسرت تن بہ تن نگر
فکر کن و بچشمِ دل حال گزشتگاں بیں
ریختہ زیرِ خاکہا طرۂ پر شکن نگر
از سرِ خاک دوستاں سبزہ دمید خوں گری
ماتم خویشتن بگیر مردن خویشتن نگر

غزلیات و قصائد کے مقابلے میں ان کی رباعیات کا درجہ بلند ہی، تمام مختار نامہ سرتاسر رباعی ہی، جس میں پانچ ہزار رباعیاں ہیں - اصل میں چھ ہزار تھیں لیکن ایک ہزار خود مصنف نے کمزور سمجھ کر نکال دیں - ان کے علاوہ چار سو کے قریب اور رباعیاں دیوان میں شامل ہیں - مختار نامہ کلیات کے ساتھ نول کشور کے ہاں چھپ گیا ہی -

کامل بننے کی تلقین :-

گر خاص نہٗ تو عام می باید بود
ور پختہ نہٗ تو خام می باید بود
در کفر نہٗ تمام و در ایماں ہم
در ہر چہ دری تمام می باید بود

یہی خیال مثنوی میں یوں ادا ہوا ہی کہ ایک ترسا زادہ مسلمان ہوگیا دوسرے دن شراب پی کر مست ہوگیا - اس کی ماں نے ملامت کی اور کہا کہ اے فرزند تیرے فعل سے حضرت عیسیٰؑ ناخوش ہوئے اور حضرت محمدؐ خوش نہیں ہوئے -

یکے ترسا مسلماں گشت بیروز | بہ می خوردن شد آں جاہل دگر روز
چو مادر مست دید او را زدردی | بدو گفت اے پسر آخر چہ کردی
کہ شد آزردہ عیسیٰؑ زود از تو | محمدؐ ناشدہ خوشنود از تو
مخنث وار رہ رفتن نکو نیست | کہ ہر رعنا مزاجے مرد او نیست
بمردی رو دریں دنیا کہ ہستی | کہ نامردیست در دیں بت پرستی

ترغیب عمل :- رباعی

بے رہ رفتن رموز می اندیشی | برفیست کہ در تموز می اندیشی
مردانِ جہاں ہزار عالم رفتند | تو ہر دو قدم ہنوز می اندیشی

دیگر

تو بیکاری و ہمچنیں خواہی بود | اما ہمہ ذراتِ جہاں در کارند

حکیم خیام کی تقلید :- رباعی

لالہ ز رخ چو ماہ می بینم من | سبزہ ز خط سیاہ می بینم من
واں کاسۂ سر کہ بود پر باد غرور | پیمانۂ خاکِ راہ می بینم من

دیگر

ہر کوزہ کہ بیخود بہ وہاں باز نہم | گوید بشنو تا خبرے باز دہم
من ہمچو تو بودہ ام دریں رہ صد بار | نے نیست ہمی گردم و نے باز رہم

دیگر

ہر ذرہ کہ در وادی و در کہساریست
از ہیکر بر گزشتۂ آثاریست
واں ہر صورت کہ بر درے و بر دیواریست
از روے خرد ز صورتِ دلداریست

(کلیات صفحہ ۹۹۵)

دیگر

قومے کہ بخواب مرگ سر باز نہند
تا حشر ز قال و قیل خود باز رہند
تا کے گوئی کہ کس خبر باز نہ داد
چوں بے خبر ند از چہ خبر باز دہند

دیگر

بس عمر عزیز اے دل مسکیں کہ گزشت
بس کافر کفر و مومن دیں کہ گزشت
اے مرد خرد حساب کن تا چند ند
چندیں کہ در آمدند و چندیں کہ گزشت

دیگر

بر بستر خاک خفتگاں می بینم
در زیر زمیں نہفتگاں می بینم
چنداں کہ بصحرائے عدم می نگرم
نا آمدگاں و رفتگاں می بینم

جس چیز نے ان کی شہرت کو بالِ پرواز دیے، وہ اُن کی مثنویاں ہیں۔ ان میں اخلاق اور تصوف کو ملا کر لکھا ہی۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہی کہ حکایات کے بڑے شائق ہیں۔ تمام مثنویوں میں قدم قدم پر حکایات موجود ہیں۔ چونکہ غیر معمولی حافظے کے مالک ہیں اس لیے اخبار، قصص انبیا و اولیا وسلاطین و مشاہیر کثرت کے ساتھ مستحضر ہیں اور جو نکتہ یا مسئلہ بیان کرنا چاہتے ہیں اس کے مناسب حال اس ذخیرے سے حکایت لے آتے ہیں اور لطف یہ ہی کہ ایک حکایت پر بس نہیں کرتے بلکہ اس موقعے کے مناسب متعدد قصے اور چٹکلے بیان کر جاتے ہیں۔ قصہ گوئی کا لپکا اس قدر بڑھا ہوا ہی کہ حمد و مناجات جیسی مقدس زمینوں میں بھی قصہ نقل کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہ سب کچھ ہی تاہم ہر شعر صدق و اخلاص اور تاثیر کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہی۔ حمد و منقبت و مناجات ایسی دھوم دھام سے لکھتے ہیں کہ فارسی گویوں میں کوئی بھی ان کی ٹکر کا نہیں۔ اور رسولؐ کے تو عاشق زار ہیں۔ روضہ رسولؐ

کی یاد میں لکھتے ہیں :۔

منم در فرقت آں روضۂ پاک | کہ بر سر می کنم از آرزو خاک
اگر روزے در آں میداں درآیم | چگوئی زیں خم چوگاں برآیم
بآہے بگسلم بند جہاں را | خوطے سازم از خاک تو جاں را

(اسرار نامہ صفحہ ۲۷)

مختصر یہ کہ پاکی، پاک اعتقادی اور پاک گوئی ان کا اصلی جوہر ہی اور یہی وصف اُن کے کلام میں نمودار ہی۔

مثنویوں کی زبان بہت صاف اور سلجھی ہوئی ہی۔ عطار جس تیزی سے نظم لکھتے ہیں اکثر لوگ اس تیزی کے ساتھ نثر نہیں لکھ سکتے۔ اگر فکر و تلاش سے قلم کو روک کر لکھتے تو بڑوں بڑوں سے بازی لے جاتے۔ صرف خسرو نامہ میں زرا قلم کو روکا ہی اور نظامی سے ڈانڈا مینڈا ملادیا ہی۔

منطق الطیر میں منازلِ سلوک یعنے طلب، عشق، معرفت، استغنا، توحید، حیرت، فقر و فنا، بیان کی ہیں۔ اس کے لیے پرندوں کا ایک فرضی قصہ لکھا ہی کہ ایک روز پرندے جمع ہو کر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ دنیا میں ہر قوم کا کوئی نہ کوئی بادشاہ ہوتا ہی اس لیے ہمیں بھی کسی کو اپنا بادشاہ بنالینا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے قرعۂ انتخاب عنقا کے نام پر پڑتا ہی۔ اب سارے طیور ہدہد کی رہنمائی میں عنقا کی تلاش میں نکلتے ہیں اور اس سفر میں مذکورۂ بالا منازل سلوک ان کو پیش آتی ہیں۔ عطار کی مثنویوں میں منطق الطیر سب سے زیادہ مقبول ہی اور متعدد بار چھپ چکی ہی۔

الٰہی نامہ کے دوران میں یہ قصہ بیان ہوا ہی کہ کسی خلیفہ کے چھ فرزند تھے۔ ایک روز خلیفہ نے بلا کر اُن سے کہا کہ تم ہر ایک اپنی اپنی

دلی آرزو بیان کرو تاکہ میں اُسے بر لاؤں۔ چنانچہ پہلے نے عرض کی کہ پریوں کے بادشاہ کی لڑکی سے میری شادی ہو جائے۔ دوسرے نے کہا میں جادوگری سیکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ اس فن کا جاننے والا بڑا طاقتور ہوتا ہے میں چاہتا ہوں کہ جادو کے زور سے کبھی پرندہ بن جاؤں اور کبھی ہاتھی۔ تیسرے فرزند نے یہ استدعا کی کہ مجھ کو جام جہاں نما مل جائے جس کے ذریعے سے دُنیا کے تمام راز معلوم کرسکوں۔ چوتھے کی یہ خواہش تھی کہ مجھ کو آب حیات مل جائے۔ پانچواں حضرت سلیمانؑ کی انگشتری کا متمنی تھا اور چھٹا کیمیا کا طالب تھا۔ خلیفہ ان کی ہر خواہش کو ہوا و ہوس پر مبنی کہہ کر مسترد کر دیتا ہے اور مختلف حکایات سے اُن کے نقائص پر استدلال کرتا ہے۔ یہ مثنوی بائیس مقالوں میں ہے اور کلیات عطار کے ساتھ نول کشور کے مطبع میں چھپی ہے۔

اسرارنامہ میں مختلف مقالوں میں جن کی تعداد بیان نہیں ہوئی سالک کے لیے عام اخلاقی پند و نصائح ہیں جو مختلف حکایات پر شامل ہیں۔ حمد و نعت و منقبت اصحاب اربعہ کے اشعار جو اس مثنوی کے دیباچے میں پائے جاتے ہیں، درحقیقت خسرو نامہ کی پہلی اشاعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب اسرارنامہ تصنیف ہوا یہی اشعار اس کے ساتھ بھی لگا دیے گئے بعد میں ایک دوست کی فرمایش پر جب خسرو نامہ کا اختصار کیا تو حمد و نعت وغیرہ کے جدید اشعار کہہ کر اس میں اضافہ کر دیے۔ اسرارنامہ طہران میں ۱۲۹۸ھ میں چھپ چکا ہے۔ مطبع والوں نے یہ ستم ظریفی کی کہ منقبت اصحاب ثلاثہ کے تمام اشعار خارج کر دیے۔

مصیبت نامہ آج تک نہیں چھپا۔ میں جس نسخے سے کام لے رہا ہوں

وہ میرے عزیز دوست پروفیسر سراج الدین ایم اے، ایم-او-ایل کے مملوکہ کلیاتِ عطار میں شامل ہی-عطار کے جس قدر کلیات معلوم ہیں ان میں یہ نسخہ سب سے زیادہ قدیم ہی-اس کی تاریخ کتابت ۵۸۵ھ ہی-

مصیبت نامے میں چالیس مقامات ہیں جن میں سالک فطرت، تمثیلاً چاروں فرشتگان عظام، عرش، کرسی، لوح محفوظ، قلم، بہشت و دوزخ آسمان، آفتاب و ماہتاب، اربع عناصر، کوہ و دریا، جماد و نبات، حیوان، وحوش وطیور، شیطان، جن، انسان، ساتوں انبیاء کرام، حس وخیال، عقل، دل اور روح کے پاس جاکر ہر ایک سے فرداً فرداً تلاش حقیقت اور رہبری کا سوال کرتا ہی سب کے سب عجز کے قائل ہوتے ہیں اور روح آخر کار اس کا بیڑا پار کرتی ہی-ضمن میں بیسیوں حکایات نقل کر دی ہیں- خاتمے میں اشتر نامہ کی طرف شعر ذیل میں اشارہ ملتا ہی:-

بختیے افلاک نتواند کشید	نظم اشتر نامۂ تو اے فرید

یہ شعر بلکہ اس کے ساتھ جو قطعہ[1] ہی اگر الحاقی ہو تو کوئی تعجب نہیں

---

[1] وہ قطعہ حسب ذیل ہی:-

شاد باش اے شاہ دیوان سخن	دُرِّ دریاے سخن کان سخن
داد داری در سلوک و سیر راہ	لاجرم در ملک نطقی بادشاہ
نامۂ اسرار معنی چوں توئی	آسمان شعر را شعری توئی
شعر تو اں گفت سحر است ایں حلال	بادر از منطقت عین الکمال
نور جان ہا در سواد خامہ است	سوز دلہا در مصیبت نامہ است
بختی افلاک نتواند کشید	نظم اشتر نامہ تو اے فرید
خسرو ملک سخن عطار شد	زانکہ خوشبو چوں گل وگلزار شد
روح پاکش غرق رحمت باد و نور	ہم نشین و ہم دش رضوان و حور

ایسا معلوم ہوتا ہی کہ عطار کے کسی مداح نے یہ قطعہ لکھا ہی اور کاتب نے لکھتے وقت اس کو شامل متن کر لیا-

کیونکہ اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ اشتر نامہ مصیبت نامہ سے پیشتر نظم ہو چکا ہی۔ خسرو نامہ پر نظر ثانی کے وقت عطار نے دیباچے میں اپنی مثنویوں کا ذکر کیا ہی، چنانچہ :۔

مصیبت نامہ زاد رہروانست — الٰہی نامہ گنجِ خسروانست
جہان معرفت اسرار نامہ است — بہشت اہل دل مختار نامہ است
مقامات طیور اما چنانست — کہ مرغ عشق را معراج جانست
چو خسرو نامہ را طرزے عجیب است — ز طرز او کہ و مہ را نصیب است

(خسرو نامہ صفحہ ۵۲-۵۳۔ ثمر ہند۔ لکھنؤ ۱۲۹۵ء)

اس فہرست میں سب سے اوّل مصیبت نامے کا نام ملتا ہی، لیکن اشتر نامہ جو شعر بالا کی روسے مصیبت نامے سے اقدم ہی، شامل نہیں۔ جہاں مصنف نے اپنی اس قدر مثنویاں گنائی ہیں، اشتر نامے کو کیسے فراموش کر جاتے اگر وہ اس وقت تک لکھا جا چکا تھا۔

خسرو نامہ عطار کی شاعری کی بہترین مثال ہی وہ ایسے وقت کی یادگار ہی جب اُن کی شاعری جوان تھی۔ اس کتاب کی دو اشاعتیں ہیں، پہلی اشاعت چونکہ طویل تھی اس لیے ایک دوست کے کہنے پر اِس کو مختصر کر دیا۔ اختصار کے علاوہ اکثر موقعوں پر مناسب اصلاح و ترمیم بھی کی اور حمد و نعت اور منقبت کے جدید اشعار لکھ کر شامل کر دیے چنانچہ :۔

چو او در حقِ ایں قصہ نکو گفت — چناں کردم ہمی القصہ کو گفت
بروں کردم ازاں جا انتخابے — برآوردم زیک یک فصل بابے
جدا نعتے و توحیدے بگفتم — بسے از درّ حکمت نیز سفتم
دگر چیزے طرازش رازیاں داشت — بگردانیدم از طرزے کہ آں داشت

(خسرو نامہ صفحہ ۵۱ و ۵۲، طبع ثمر ہند۔ لکھنؤ)

اِس مثنوی میں قیصر روم کے فرزند شہزادہ خسرو اور خوزستان کی شہزادی گُل رُخ کے عشق کا قصہ ہے۔ خسرو عین ولادت کے وقت اُس کی سوتیلی والدہ کے خوف سے ماں کے آغوش سے جُدا کیا جاکر ایک وفادار کنیز کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا ہے۔ یہ دایہ خوزستان پہنچ کر فوت ہو جاتی ہے اور ایک باغبان اُس کی پرورش اپنے ذمے لیتا ہے۔ خسرو بہت جلد والیٔ خوزستان کے فرزند بہرام کا جلیس اور ہم مکتب ہو جاتا ہے۔ بہرام کی بہن گُل رُخ خسرو پر عاشق ہو جاتی ہے۔ جب گل رُخ کی کی شادی والیٔ اصفہان کے ساتھ ہو جاتی ہے خسرو اصفہان پہنچ کر گُل رُخ کو لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ والیٔ اصفہان حسنا کو گل رُخ کے واپس لانے کے لیے تعین کرتا ہے حسنا موقع پاکر گل رُخ کو چُرا کر ایک صندوق میں قید کر دیتی ہے۔ اور صندوق لے کر اصفہان کے ارادے سے روانہ ہوتی ہے۔ راستے میں دریا میں طوفان آتا ہے اور کشتی ڈوب جاتی ہے۔ صندوق ایک چین کا ماہی گیر دریا سے نکال لیتا ہے گل رُخ اس طرح بچ کر اور کئی مصیبتیں جھیلنے کے بعد شاہ چین کے محل میں پہنچ جاتی ہے اور کافور کی معرفت خسرو کو اپنی موجودگی کی اطلاع دیتی ہے خسرو اس کو لینے کے لیے آجاتا ہے اور ان کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ اس قصے کے ضمن میں مصنف نے بزم و رزم، دریا، پہاڑ اور جزیروں کے منظر خوب بیان کیے ہیں۔ شیخ عطار جو اور تصانیف کے دوران میں محض ایک صوفی باصفا اور زاہدِ خشک کے لباس میں نظر آتے ہیں، اس مثنوی میں اپنی طبیعت کی رنگینی اور تخیل کی بلندی کا ایک اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا معیار اس نظم میں اس قدر بلند کر دیا ہے کہ ہم اِس تصنیف کو بغیر کسی پس و پیش کے نظامی کی شیریں و خسرو کے پہلو میں جگہ دے سکتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ساتویں صدی ہجری تک جس قدر

عشقیہ مثنویاں فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں ان میں خسرو نامہ کو دوسرے نمبر پر جگہ ملنی چاہیے۔ خسرو نامہ مطبع ثمر ہند لکھنؤ میں (۱۲۹۵ھ) چھپا ہے۔ مطبع والوں نے ایسے اشعار نکال دیے ہیں جو منقبت اصحاب ثلاثہ، امام بوحنیفہ و امام شافعی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی تعداد اسّی کے قریب ہے۔

مثنویات عطار کے تاریخی مواد سے متعلق بھی یہاں چند الفاظ کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ عطّار بالعموم اپنی حکایات ایسے مآخذ سے لیتے ہیں جو تاریخی اشخاص اور ان کی سرگزشت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ان مثنویات میں تاریخی دل چسپی کا جدید ذخیرہ موجود ہے۔ مثلاً سلطان محمود غزنوی سے متعلق شیخ عطار نے متعدد قصے[1] ایسے دیے ہیں جن کی رو سے سلطان کی سیرت و اخلاق کے ایسے پہلو پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے جس کو اس کے مؤرخین نے بالکل فراموش کر دیا ہے۔ مورخین اس کی جنگ آزمائی، فتحیابی، دینی جوش و غزا کے خط و خال کو بڑے جوش و خروش سے بیان کرتے ہیں، لیکن اس کے ذاتی حالات، جذبات و خیالات، عادات اور خو بو پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ شیخ اس معاملے میں ایک حد تک ہماری امداد کرتے ہیں۔ ان کے بیانات میں محمود خدا ترس، درویش دوست، دل سوز، جفاکشی کا عادی، فیاض اور زندہ دلی کا شائق انسان ہے جو جلال و طنطنۂ سلطنت کو فراموش کر کے نجی زندگی میں عام انسانوں سے سطح مساوات پر ملتا ہے۔ اُن کی تکلیف اور مصیبت کا اس کے دل میں درد ہے اور امداد کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ فیاض اس قدر ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ لطیفوں اور چٹکلوں پر دیناروں کی تھیلیاں

[1] راقم نے اس سلسلے میں ایک علیحدہ مضمون لکھا ہے دیکھو اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ فروری ۱۹۲۵ء۔

برساتا ہے۔ اُس کے کان نصیحت سننے کے لیے ہر وقت آمادہ ہیں۔ ادنیٰ ادنی انسان اس بڑے آدمی کو کڑوی کڑوی باتیں سُنا سکتا ہے۔ بہرام گور کی طرح شکار کا بے حد شائق ہے۔ صحراؤں میں شکار کے پیچھے گھوڑا ڈال دیتا ہے اور لشکر سے جدا ہو کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ دیہاتیوں اور صحرائیوں کا ناخواندہ مہمان بنتا ہے۔ کبھی کسی بوڑھے خارکش کی امداد کے لیے جو سنسان بیابان میں گدھے پر کانٹے لادنے کے واسطے کسی ہمدرد انسان کی مدد کا منتظر ہے، بڑھتا ہے، کانٹوں میں ہاتھ ڈالتا ہے اور گدھے پر رکھوا دیتا ہے۔ کبھی کسی ضعیف عورت کی وزنی گانٹھ جو سر پر لیے جا رہی ہے اور تھک گئی ہے، لے کر اپنے گھوڑے پر رکھ لیتا ہے، پھر بڑھیا کے چھیڑنے کے لیے گھوڑا تیز کر دیتا ہے۔ بڑھیا پیچھے رہ جاتی ہے، غل مچاتی ہے اور سلطان کو روز قیامت اور پل صراط کی یاد دلاتی ہے۔ محمود یہ ڈرانے والے الفاظ سُن کر سہم جاتا ہے۔ کبھی کسی ماہی گیر لڑکے کے ساتھ نصف کا شریک بن کر مچھلی کا شکار کھیلتا ہے اور دوسرے دن لڑکے کو بُلوا کر اپنے برابر تخت پر بٹھا لیتا ہے۔ کبھی کسی بوڑھے ہیزم فروش سے جا کر خود ہیزم خریدتا ہے، بوڑھا لکڑیوں کی قیمت "دو جو سیم" بتاتا ہے۔ محمود سونے کے سکوں کی تھیلی سے ایک ایک سکہ نکال نکال کر بوڑھے کے ہاتھ پر رکھتا جاتا ہے اور پوچھتا جاتا ہے کہ ان میں سے کون سا سکہ "دو جو سیم" کے برابر ہے۔ بوڑھا سر ہلاتا جاتا ہے اور ہر سکہ کو بڑا بتاتا ہے۔ آخر سلطان تھیلی پھینک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اچھا یہ تھیلی لے جاؤ اور اپنے "دو جو سیم" لے کر باقی کل واپس کر دینا۔ شیخ ابوالحسن خرقانی سے ملنے جاتا ہے اور اُن کے ساتھ بھی شوخیوں سے باز نہیں آتا۔ ان حکایات پر نظر ڈالنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمود کی شمشیر نہیں تھی جس کے کارناموں نے اسے

محبوب بنا دیا تھا بلکہ اس کے یہی خسروانہ افعال تھے جنھوں نے وفات کے بعد بھی اس کی یاد کو تازہ اور اُس کے نام کو محترم بنا دیا تھا۔

محمود اور ایاز کے قصے جو سلجوقی عہد کے بعد فارسی ادبیات میں عالمگیر شہرت حاصل کر لیتے ہیں ان میں سے اکثر کے راوی شیخ عطار ہیں۔ خود مولانائے روم نے ایک سے زائد حکایت عطار سے لی ہے بلکہ ایک موقعے پر تو حوالہ بھی دے دیا ہے۔

شعرا کے متعلق بھی عطار بعض جدید اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔ فردوسی کے سلسلے میں اُن کے ہاں دو بیان ہیں۔ پہلا یہ کہ سلطان نے شاہنامے کے صلے میں پیل بار انعام بخشا لیکن شاعر نے بلند حوصلگی کی بنا پر قبول نہیں کیا:۔

اگر محمود اخبار عجم را — براد آں فیل ولشکر داں درم را
اگر تو شعر آری فیل دارے — نہ یابی یک درم در روزگارے
چہ آں گر فیل دارش کم نہ ارزید — بر شاعر فقاعے ہم نہ ارزید
زہے ہمت کہ شاعر داشت آنگاہ — کنوں بنگر کہ چوں برگشت از راہ

(الٰہی نامہ۔ کلیات صفحہ ۹۲۴، نول کشور)

دوسرا یہ ہے کہ شیخ الاکابر شیخ ابوالقاسم طوسی نے فردوسی کے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔ رات کو شیخ نے خواب میں دیکھا کہ فردوسی بہشت میں موجود ہے۔ شیخ کو بڑی حیرت ہوئی پوچھا کہ تمھاری بخشش کیوں کر ہوئی۔ فردوسی نے جواب دیا کہ ایک شعر توحید کی بنا پر بخش دیا گیا۔

اسی واقعے کی طرف ایما کرتے ہوئے خاتمۂ مصیبت نامہ میں لکھا ہے:۔

می نباید شد بحمد اللہ بزور — ہمچو فردوسی ز بیتے در تنور
ہمچو فردوسی فقع خواہم کشاد — چوں سنائی بے طمع خواہم کشاد

رابعہ بنت کعب القصداری کے دردناک حالات[1] سے متعلق جو روودکی کی معاصر شاعرہ ہی عطار ہم کو بالکل جدید اور تفصیلی اطلاع دیتے ہیں۔ (دیکھو الٰہی نامہ صفحہ ۱۸-۹۲۷)

علیٰ ہذا فخر الدین اسعد گرگانی اور سبب تالیف ویس و رامین کے سلسلے میں الٰہی نامہ صفحہ ۲۱-۲۰ ۸ میں ایک دلچسپ حکایت آتی ہی جو ہمارے لیے جدید معلومات کا حکم رکھتی ہی۔

شعرا میں ازرقی، انوری، شہابی، عنصری اور خاقانی کا نام مصیبت نامہ میں آتا ہی۔ ان کے علاوہ سلطان سنجر، اس کی بہن صفیہ، نظام الملک، خواجہ رکن الدین اکاف سے متعلق ان کے ہاں جدید اطلاع موجود ہی اور مشائخ کے حالات و مقولات کے لیے تو یہ مثنویاں بے حد ضروری ہیں۔

تصنیفات شیخ فریدالدّین عطّار

شیخ عطار کی تصنیفات کی بابت عجیب و غریب بیانات دیے گئے ہیں۔ بعض نے ایک سو کتابوں کا اُن کو مالک مانا ہی۔ سب سے قدیم بیان وہ ہی، جو "مفتاح الفتوح" تالیف سنہ ۶۸۸ھ میں ملتا ہی، و ہو ہذا:۔

خداوندش نوشتہ صد مجلد ہمہ علمے کہ او ماند مخلد

شین ضمیر شیخ کی طرف راجع ہی۔ "مظہر العجائب" میں بھی یہی تعداد بتائی گئی ہی، چنانچہ:۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو اورنٹیل کالج میگزین بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۵ء جہاں راقم نے رابعہ پر ایک علیحدہ مضمون لکھا ہی۔

زبحر علم دارم صد کتب من — درو بنهاده ام اسرار لب من

لیکن دولت شاہ اور صاحب ہفت اقلیم نے صرف چالیس کتابیں اور رسالے ان کی طرف منسوب کیے ہیں۔

دولت شاہ نے شیخ کی مصنفات کے یہ نام دیے ہیں:-

(۱) تذکرۃ الاولیا (۲) اسرار نامہ (۳) الٰہی نامہ
(۴) مصیبت نامہ (۵) اشترنامہ (۶) مختار نامہ
(۷) جوہر الذات (۸) وصیت نامہ (۹) منطق الطیر
(۱۰) بلبل نامہ (۱۱) گل و ہرمز (۱۲) سیاہ نامہ
(۱۳) ہیلاج نامہ (۱۴) اخوان الصفا (۱۵) حیدر نامہ

صاحب ہفت اقلیم نے ذیل کی فہرست دی ہی:-

(۱) الٰہی نامہ (۲) اسرار نامہ (۳) مصیبت نامہ
(۴) وصلت نامہ (۵) بلبل نامہ (۶) پندنامہ
(۷) جواہر نامہ (۸) بے سر نامہ (۹) خسرو نامہ
(۱۰) ولد نامہ (۱۱) حیدر نامہ (۱۲) اشتر نامہ
(۱۳) جوہر الذات (۱۴) مظہر العجائب (۱۵) منطق الطیر
(۱۶) گل و ہرمز (۱۷) شرح القلب (۱۸) تذکرۃ الاولیا
(۱۹) اخوان الصفا (۲۰) دیوان (۲۱) لسان الغیب (اگرچہ فہرست میں نام شامل نہیں، لیکن انتخاب کلام دیا ہی)۔

قاضی نور اللہ شوستری کے ہاں یہ نام آتے ہیں:-

(۱) منطق الطیر (۲) الٰہی نامہ (۳) بلبل نامہ
(۴) مظہر العجائب ——

حاجی خلیفہ کے ہاں ذیل کی کتابیں ہیں :-

(۱) اسرار نامہ (۲) الٰہی نامہ (۳) بلبل نامہ
(۴) پند نامہ (۵) تذکرۃ الاولیا (۶) جوہر الذات
(۷) حیدر نامہ (۸) خسرو نامہ (۹) شتر نامہ
(۱۰) منطق الطیر (۱۱) مصیبت نامہ (۱۲) مظہر العجائب
(۱۳) وصلت نامہ -

ڈاکٹر اسپرنگر کی فہرست کتب خانۂ اودھ میں یہ کتابیں مذکور ہیں :-

(۱) دیوان (۲) حقائق الجواہر، اس کا پہلا شعر ہے

اے خدائے سرِ ہر انساں توئی کاشفِ رازِ حقائقِ جاں توئی

(۳) بے سر نامہ (۴) مصیبت نامہ (۵) اسرار الشہود
(۶) جوہر الذات (۷) اشتر نامہ (۸) خسرو نامۂ کبیر
(۹) خسرو نامۂ صغیر (۱۰) مظہر العجائب (۱۱) منطق الطیر
(۱۲) بلبل نامہ (۱۳) وصلت نامہ (۱۴) پند نامہ
(۱۵) خیاط نامہ (۱۶) کنز الحقائق (۱۷) ہفت وادی
(۱۸) الٰہی نامہ (۱۹) اسرار نامہ

گیارہویں قرن ہجری کا ایک کلیات[1] کتب خانۂ بانکی پور پٹنہ میں ہے، جس میں حسب ذیل کتابیں ملتی ہیں :-

(۱) جوہر الذات (۲) مظہر العجائب (۳) منطق الطیر
(۴) حلاج نامہ (یا) منصور نامہ - (۵) مصیبت نامہ (۶) لسان الغیب
(۷) خیاط نامہ (۸) مفتاح الفتوح (۹) کنز الحقائق

---

[1] فہرست بانکی پور، نمبر ۴۶۰، صفحہ ۶۳ -

(۱۰) ہفت وادی (۱۱) اشتر نامہ (۱۲) پند نامہ (۱۳) دیوان۔

کلیات کے علاوہ اس کتب خانے میں یہ کتابیں اور ہیں:۔

(۱۴) اسرار نامہ (۱۵) بلبل نامہ (۱۶) بے سر نامہ (۱۷) وصلت نامہ۔

اسی کتب خانے کے فہرست نگار مولوی عبدالمقتدر صاحب نے ذیل کی فہرست علحدہ دی ہی:۔

(۱) اسرار نامہ	(۲) الہٰی نامہ	(۳) مصیبت نامہ
(۴) جوہرالذات	(۵) اشتر نامہ	(۶) مختار نامہ
(۷) حیدر نامہ	(۸) بے سر نامہ	(۹) سیاہ نامہ
(۱۰) منطق الطیر	(۱۱) گل و ہرمز (یا) خسرو نامہ	(۱۲) پند نامہ
(۱۳) وصلت نامہ	(۱۴) وصیت نامہ	(۱۵) بلبل نامہ
(۱۶) اسرارالشہود	(۱۷) گل و خسرو	(۱۸) مظہرالعجائب
(۱۹) خیاط نامہ	(۲۰) کنزالحقائق	(۲۱) ہفت وادی۔
(۲۲) لسان الغیب	(۲۳) مفتاح الفتوح	(۲۴) منصور نامہ
(۲۵) کنزالبحر		

انڈیا آفس لائبریری کے ایک کلیات نمبری ۱۰۳۱ میں مثنویات ذیل شامل ہیں:۔

(۱) اشتر نامہ	(۲) خسرو و گل	(۳) بلبل نامہ
(۴) پند نامہ	(۵) منطق الطیر	(۶) ہفت وادی
(۷) بے سر نامہ	(۸) کنزالاسرار	(۹) دیوان
(۱۰) وصلت نامہ	(۱۱) مفتاح الفتوح	(۱۲) اسرار نامہ
(۱۳) کنزالحقائق	(۱۴) الہٰی نامہ	(۱۵) مصیبت نامہ

(۱۶) لسان الغیب (۱۷) جوہر الذات (۱۸) مظہر العجائب۔

اسی کتب خانے میں ایک نسخۂ عطار[۵۱] ہی، اس کی تاریخ کتابت ۸۰۰ھ ہجری و ۸۱۲ھ ہجری کے درمیان ہی۔ اور مثنویات ذیل پر شامل ہی:۔

(۱) اشتر نامہ (۲) اسرار نامہ (۳) خطبۂ الٰہی نامہ

(۴) بلبل نامہ (۵) مصیبت نامہ (۶) وصلت نامہ

پروفیسر سراج الدین (آذر) کے کلیات میں یہ کتابیں ہیں:۔

(۱) جوہر الذات برمتن (۲) دیوان برحاشیہ (۳) مختار نامہ، حاشیہ

(۴) دیباچہ گل و ہرمز، اشاعت اول (حاشیہ) (۵) منطق الطیر، حاشیہ

(۶) ہیلاج نامہ، متن (۷) اسرار نامہ، حاشیہ (۸) اشتر نامہ، متن

(۹) الٰہی نامہ، حاشیہ (۱۰) مصیبت نامہ، متن (۱۱) وصلت نامہ، حاشیہ خاتمے کے اشعار نقل ہونے سے رہ گئے ہیں (۱۲) گل و ہرمز، متن

(۱۳) بلبل نامہ، حاشیہ (۱۴) نزہت الاحباب، حاشیہ (۱۵) مفتاح الفتوح حاشیہ، صرف دیباچہ منقول ہی۔

عطار کے معلومہ کلیات میں یہ نسخہ سب سے قدیم ہی اور صحت کے اعتبار سے متوسط درجے کا ہی۔ اس کی تاریخ کتابت ۸۵۷ھ ہجری ہی۔

نسخۂ عطار[۵۲]، (ضمیمہ فہرست کتب فارسیہ برٹش میوزیم لائبریری) سنہ ۸۸۹ ہجری کا نوشتہ ہی، اِس میں یہ کتابیں داخل ہیں:۔

(۱) مختار نامہ (۲) الٰہی نامہ (۳) منطق الطیر (۴) مصیبت نامہ

(۵) اسرار نامہ (۶) وصلت نامہ۔

---

[۵۱] فہرست انڈیا آفس نمبر ۱۰۳۴، صفحہ ۶۱۸۔

[۵۲] نمبر ۲۳۶، صفحہ ۱۵۹

سنہ ۱۲۸۹ ہجری میں نول کشور نے جو کلیات چھاپا ہی، اس میں کتب ذیل شامل ہیں :-

(۱) جوہرالذات' (جلد اوّل صفحہ ۲-۲۹۸، ایضاً جلد دوم، صفحہ ۳۰۰-۵۸۲)
(۲) ہیلاج نامہ، صفحہ ۵۸۴-۷۷۰۔ (۳) الہٰی نامہ، صفحہ ۷۷۳-۹۴۳۔
(۴) مختارنامہ صفحہ ۹۴۶-۱۰۴۷۔ (۵) منطق الطیر' ۱۰۵۰-۱۱۶۵۔
(۶) بلبل نامہ، صفحہ ۱۱۶۸-۱۱۸۴ (۷) نزہت الاحباب، صفحہ ۱۱۸۶-۱۱۹۵۔
(۸) مفتاح الفتوح، صفحہ ۱۱۹۸-۱۲۲۱ (۹) بے سرنامہ، صفحہ ۱۲۲۴-۱۲۲۹۔
(۱۰) پندنامہ، صفحہ ۱۲۳۲-۱۲۵۷۔

کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد کی فہرست میں عطار کی ایک اور تصنیف ملتی ہی، اس کا نام 'آغازِ عشق' ہی۔ مطبع مسیحائی نے ایک اور مثنوی موسوم بہ اسرارنامہ طبع کی ہی۔

اس طرح عطار کی تصنیفات کی فہرست حسبِ ذیل ہوئی۔
(۱) آغازِ عشق (۲) اسرارنامہ (۳) اسرارنامہ' (مطبع مسیحائی پریس)
(۴) اشترنامہ (۵) اسرارالشہود (۶) اخوان الصفا (۷) الہٰی نامہ
(۸) بے سرنامہ (۹) بلبل نامہ (۱۰) پندنامہ (۱۱) تذکرۃ الاولیا
(۱۲) جوہرالذات (یا) جواہرنامہ (۱۳) حلاج نامہ (یا) منصورنامہ۔
(۱۴) حقائق الجواہر (۱۵) حیدرنامہ (۱۶) خسرونامہ (یا) گل وہرمز۔
(۱۷) خیاط نامہ (۱۸) دیوان (۱۹) سیاہ نامہ (۲۰) شرح القلب۔
(۲۱) کنزالاسرار (۲۲) کنزالبحر (۲۳) کنزالحقائق (۲۴) لسان الغیب
(۲۵) منطق الطیر (۲۶) مصیبت نامہ (۲۷) مختارنامہ (۲۸) مظہرالعجائب
(۲۹) مفتاح الفتوح (۳۰) نزہت الاحباب (۳۱) وصیت نامہ۔

(۳۲) وصلت نامہ (۳۳) ولدنامہ (۳۴) ہیلاج نامہ (۳۵) ہفت وادی۔

مذکورۂ بالا مختلف فہرستوں سے یہ امر منکشف ہوتا ہی کہ شیخ عطار کا کلام خود اُن کے اپنے زمانے میں مدوّن نہیں ہوا تھا۔ ان کی وفات ایسے زمانے میں ہوئی جب کہ چنگیزی طوفان ایران کو زیر و زبر کر رہا تھا، اس لیے اس عہد میں بھی اِس کے جمع کیے جانے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ آٹھویں صدی کی کوئی چیز کسی کتب خانے میں موجود نہیں، نویں صدی کی متعدد چیزیں ملتی ہیں۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہی کہ اس عہد میں عطار کی تصنیفات اہل ذوق جمع کرنے لگے ہیں۔ اور چونکہ کوئی قدیم کلیات موجود نہیں، اس لیے اپنے اپنے مجموعوں میں مختلف مثنویاں جمع کر رہے ہیں اور نتیجہ یہ ہوا ہی کہ ان مجموعوں میں مختلف چیزیں شامل ہوگئی ہیں۔ کلیات ایک طرف، ستّے اور سبعے ایک دوسرے سے نہیں ملتے نہ اُن میں کسی ترتیب کا لحاظ ہی جیسا اور شعرا کے کلیات میں دیکھا جاتا ہی۔ اِس اِنتشار اور ابتری کا ایک نتیجہ تو یہ ہُوا کہ عطار کے کلیات میں دیگر شعرا کی تصنیفات سہواً شامل ہوگئیں۔ دوسرا یہ ہُوا کہ بعض لوگوں نے خاص خاص مقاصد کو مدنظر رکھ کر اپنی تصنیفات شیخ کے کلام میں شامل کر دیں۔ اس لیے ضروری ہُوا کہ ایک سرسری نظر ایسی کتابوں پر ڈالی جائے میرا تبصرہ انھیں کتابوں پر محدود ہوگا جو میری نظر سے گزر چکی ہیں۔

(۱) آغاز عشق

کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد دکن، کی فہرست میں یہ کتاب درج ہی جس کا نمبر ۱۵۵ ہی۔ فہرست نگار نے اس کا نام "آغاز عشق" رکھا ہی، درحقیقت یہ کوئی نئی مثنوی نہیں ہی بلکہ عطار کے خسرونامہ کا ابتدائی حصّہ ہی۔ یہ ایک

معما ہی کہ اس کا نام 'آغاز عشق' کیوں رکھا گیا۔

(۲) اسرار الشہود

ڈاکٹر اسپرنگر فہرست نگار کتب خانۂ اودھ[۵۱] اور مولوی عبد المقتدر خاں فہرست نگار[۵۲] کتب خانۂ بانکی پور اور مطبع خادم التعلیم لاہور (جنھوں نے سنہ ۱۸۹۴ء میں اس کو طبع بھی کر دیا ہی) عطار کی تصنیف بیان کرتے ہیں اور بعض قلمی نسخوں میں بھی عطار کی طرف منسوب ہی، لیکن صحیح یہ ہی کہ شیخ شمس الدین محمّد لاہجی اسیری نوربخشی شارح گلشن راز کی تصنیف ہی، جو سید محمّد نوربخش کے مُرید ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۸۴۲ھ کے گرد و پیش میں لکھی گئی ہی۔ مطبوعہ کتاب کے صفحہ ۹ پر علیحدہ عنوان کے تحت میں مصنف اپنے پیر کی مدح شروع کرتا ہی جس میں اشعار ذیل آتے ہیں:۔

آں محمّد نام عیسیٰ مرتبت ملک معنی را سلیماں منزلت
آمدہ از غیب نامش نوربخش بود چوں خورشید بامش نوربخش

صفحہ ۱۰ پر ایک شعر میں اس کا تخلص اسیری موجود ہی:۔

ہر یکے در دُور خود گشتہ جنید چوں (اسیری) دیدہ آزادی زقید[۵۳]

صفحہ ۹۲ پر ایک حکایت میں مصنف اپنے بعض حالات دیتا ہی، جن سے معلوم ہوتا ہی کہ جب جذبۂ عشق الٰہی اس پر غالب آجاتا ہی، ایک ابدال

---

[۵۱] فہرست صفحہ ۳۴۰ [۵۲] فہرست صفحہ ۶۴

[۵۳] فرقۂ نوربخشی پر پروفیسر محمّد شفیع ایم۔ اے نے ایک نہایت فاضلانہ مضمون اورینٹل کالج میگزین (بابت سنہ ۱۹۲۵ء) کے پہلے اور دوسرے نمبر میں لکھا ہی۔ میں نے یہ شعر اسی مضمون سے حاصل کیا ہی۔

سے اپنے آیندہ پیر سید محمد نوربخش کا نام سُن کر اصفہان سے روانہ ہوتا ہی:-

صبح دم پنہاں ز خویش و اقربا بہر طوفِ کعبۂ صدق و صفا
آمدم بیروں ز شہرِ اصفہاں یک تن تنہا پیادہ بہر آں
تا مبادا دوستان بے خرد مانعم آیند و کارم بد شود

مصنف یہ سفر غرۂ ماہ رجب سنہ ۸۴۲ھ کو اختیار کرتا ہی:-

سال تاریخش بود بے کیف و کم هشت صد و چہل و دو بے بیش و کم

(صفحہ ۹۴)

سید محمد نوربخش بانیٔ فرقۂ نوربخشیہ (سنہ ۷۹۵ ہجری و ۸۶۹ ہجری) قاین میں ولادت پاتے ہیں اور خواجہ اسحٰق ختلانی کے مُرید ہیں، جو سید علی ہمدانی کے مُرید تھے۔ خواجہ نے آپ کو "نوربخش" کا خطاب عطا کیا، ختلان میں ایک ہنگامے کے موقعے پر خلیفۃ المومنین بنا دیے جانے پر شاہرخ بادشاہ نے آپ کو ہرات میں قید کر دیا، ۸۲۶ھ میں آپ نے بھاگ کر اس قید سے رہائی پائی اور ایک عرصے تک بغداد بصرہ اور کردستان میں سیاحت کے بعد آپ نے گیلان میں سکونت اختیار کی اور شاہرخ کی وفات پر ری تشریف لے آئے، جہاں تا حینِ وفات قیام پذیر رہے۔

(۳) اسرار نامہ

یہ وہ اسرار نامہ نہیں ہی، جو عطار نے بحر ہزج مسدس میں لکھا ہی اور عام فہرستوں میں اُس کا افتتاحیہ ہی[1]

---

[1] پروفیسر آذر کے کلیات میں پہلے دو شعر یوں ہیں:-

بنام آں کہ از خاک آدمی کرد ز کفلے وز دودے آدمی کرد
جہاں داری کہ جاں را نور دیں داد خرد را در خدا دانی یقیں داد

بنام آں کہ جاں را نور دیں داد خرد را در خدا دانی یقیں داد

بلکہ یہ اور اسرار نامہ ہی جو بحر رمل مسدس میں ہی، اس کے پہلے دو شعر ہیں:۔

افتتاح نامہا از نام تو ہر دو عالم جرعہ نوش از جام تو
آں خداوندے کہ در عرض وجود ہر زماں خود را بہ نقشے وا نمود

اور خاتمے کا بیت ہی:۔

دیدۂ حق بیں اگر بودے مرا او رُخ از ہر ذرہ بنمودے مرا

یہ کُل آٹھ صفحوں کا رسالہ ہی اور ۱۲۶۷ھ میں مطبع مسیحائی میں چھپ چکا ہی۔ اُستادانہ کلام ہی۔ مسائل تصوف کو مختصراً چھیڑا گیا ہی کہ دنیا میں خدا کے سوا کچھ نہیں۔ ذرات عالم اُس کے مرآت ہیں اور اسی کے عشق میں مست ہیں۔ عجز و انکسار زاد راہ عشق ہی، طالب کو ہشت بہشت اور کونین سے کوئی سروکار نہیں۔ از روئے معنی انسان جانِ عالم ہی اور اُس کا دل لوحِ محفوظ ہی۔ نور و ظلمات کا برزخ انسان ہی اور انسان ہی مقصود عالم ہی۔ انسان اگر اپنی حقیقت شناخت کرلے تو کائنات کی حقیقت معلوم کرسکتا ہی۔ دل جام جم اور عرشِ رحمانی ہی، عشق کیا ہی؟ یہی قطرے کا دریا بن جانا!

عشق چبود قطرہ دریا ساختن از دو عالم با خدا پرداختن

شیخ عطار کے مقابلے میں اس کی زبان زیادہ صاف اور منجھی ہوئی ہی۔ محض اہلِ مطبع کی شہادت پر اس کو عطار کا کلام نہیں مانا جا سکتا، کیونکہ نہ وہ کسی کلیات میں شامل ہی اور نہ کوئی تذکرہ نگار اس کا ذکر کرتا ہی۔ علاوہ بریں حاجی خلیفہ غالباً اسی مثنوی کو مولانا جلال الدین رومیؒ کی طرف منسوب کرتا ہی۔

(کشف الظنون صفحہ ۹۵ جلد اوّل طبع مصر ۱۳۱۱ھ ہجری)

(۴) کنز الحقائق

اکثر تذکرہ نگار اس تصنیف کے متعلق خاموش ہیں - نویں صدی کے کلیات میں شامل نہیں، لیکن دسویں اور گیارہویں قرن ہجری کے کلیات میں موجود ہی- چنانچہ ایتھے انڈیا آفس کی فہرست[۵۱] میں اور ریو برٹش میوزیم کے ضمیمہ[۵۲] فہرست کتب فارسی میں اور مولوی عبدالمقتدر خاں بانکی پور کی فہرست[۵۳] میں اس کو عطار کی تصنیف مانتے ہیں اور شعر ذیل افتتاحی بیان کرتے ہیں :-

بنام آں کہ جاں را نور دیں داد   خرد را در خدا دانی یقیں داد

لیکن یہ شعر اسرارنامۂ عطار کا افتتاحیہ ہی- ڈاکٹر اسپرنگر نے کتب خانہ اودھ کی فہرست[۵۴] میں اور آئیوناف نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست[۵۵] میں بیت ذیل افتتاحی لکھا ہی:-

بنام آنکہ اول کرد و آخر   بنام آں کہ باطن کرد و ظاہر

کنز الحقائق کا میرے پاس بھی ایک نسخہ ہی، جس کا پہلا شعر اسپرنگر اور آئیوناف کے نقل کردہ شعر کے مطابق ہی- فہرست نگاروں نے اسی کتاب کا ایک اور شعر نقل کیا ہی یعنی :-

چو گفتم اندرد چندیں دقائق   نہادم نام او کنز الحقائق

یہ شعر خفیف سے اختلاف کے ساتھ میرے نسخے میں موجود ہی- پہلے مصرع میں 'اندرد' کی بجائے 'اندریں' اور دوسرے میں 'نام او' کی جگہ

---

۵۱ صفحہ ۶۱۵، نمبر ۱۰۳۱   ۵۲ نمبر ۲۳۵، صفحہ ۱۵۹

۵۳ صفحہ ۶۸   ۵۴ صفحہ ۳۵۶   ۵۵ صفحہ ۲۱۲، نمبر ۴۷۷

'نام وے' ہے۔

اس مثنوی میں حمد و نعت کے بعد حضرت علیؓ کی منقبت علیحدہ عنوان سے چلتی ہے۔ "سبب نظم کتاب" میں شاعر کہتا ہے کہ: میرے چند دوستوں نے اسرار طاعت کے متعلق مجھ سے سوالات کیے، میں نے ان کی فہم کے مطابق جوابات کو نظم کر دیا اور اس کا نام کنز الحقائق رکھ دیا۔ میرا مقصد نظم کہنے سے اظہار لیاقت نہیں۔ چھ ماہ کے عرصے میں جب کہ سنہ ۷۰۹ ہجری تھا، یہ کتاب ختم ہوئی:

مرا مقصود ازیں جز معرفت نیست خدا داند کہ اظہار صنعت نیست
ز ہجرت ہفصد و نہ شد، نہادم اساسش را بہ شش مہ نظم دادم

اِس مثنوی کے بعض زیر بحث عنوان یہ ہیں:-

تحقیقِ ایمان و اسلام۔ شہادت۔ طہارت۔ صلوٰۃ۔ زکوٰۃ۔ روزہ حج۔ جہاد۔ نفس۔ شیطان۔ عشق۔ دُنیا۔ بہشت و دوزخ۔ جان۔ عیسیٰ و دجّال۔ شناخت و تحقیق۔ عہد مہدی۔ آب حیواں۔ صراط وغیرہ۔

نسخۂ ہٰذا نہر والہ گجرات میں سنہ ۱۰۲۸ ہجری میں نقل ہُوا تھا، جیسا کہ ورق اوّل کے صفحۂ الف کے ایک فقرے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مصنف کا نام اسی صفحے میں عبارت ذیل میں یوں لکھا ہے:-

"کنز الحقائق پہلوان محمود بن پوریائے ولی"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا نام پہلوان محمود ہے۔ عبارت منقولۂ بالا کا راقم خواہ محب اللہ ہو جس کی مہر پاس ہی لگی ہوئی ہے یا کوئی اور شخص، مگر اس میں شک نہیں کہ وہ مصنف کی شخصیت سے بخوبی واقف تھا، کیوں کہ اس مثنوی کے ساتھ ہی مثنوی "گلشن راز" اسی کاتب کے

قلم کی لکھی ہوئی نحق ہی۔ اس پر محب اللہ نے صاف لکھا ہی "گلشن راز من محمود چبستری در سنہ ۷۱۷ ہجری ایں در نظم سفتہ" باوجودیکہ دونوں مثنویوں میں مصنفین کا نام 'محمود' عام ہی۔ اور دونوں اُسی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن وہ مغالطہ نہیں کرتا، پہلے کو پہلوان محمود کہتا ہی اور دوسرے کو محمود چبستری۔

کنز الحقائق کے متن کی شہادت بھی محب اللہ کے بیان کی موید ہی۔ مصنف نے ایک سے زیادہ موقعے پر اپنا نام محمود دیا ہی۔ مثلاً حمد کے خاتمے کا یہ شعر :-

خداوندا بحق نیک مرداں — کہ مارا عاقبت محمود گرداں

تحقیق صلوٰۃ کے ذیل میں یہ بیت آتی ہی :-

بروجان پدر بشنو ز محمود — کزینش جز حقیقت نیست مقصود

اور زکوٰۃ کے ذکر میں :-

بیاموز ار ندانی ایں طریقت — ز محمود (از) زکوٰۃ (دیں) حقیقت

اور بہشت و دوزخ کے بیان میں :-

بہشت و دوزخت ... کہ مقصود — کہ بشناسی بمعنی گفت محمود

یاد رہے کہ حاجی خلیفہ کے ہاں بھی یہ کتاب پہلوان محمود خوارزمی کی تصنیف بتائی گئی ہی (کشف الظنون جلد اوّل صفحہ ۲۳۳ طبع مصر)

فرہنگ آنندراج میں انجمن آرائے ناصری کے حوالے سے لفظ "لت" کی تشریح میں اسی شاعر کی ایک رباعی درج ہی، یہاں اس کو پہلوان محمود مشہور بہ پوریائے ولی خوارزمی لکھا ہی۔ رباعی :-

آنیم کہ پیل برنتابد لت ما — بر چرخ زنند نوبت شوکت ما

گر در صف ما مورچہ گیرد جائے آں مورچہ شیر گردد از دولت ما

(جلد سوم صفحہ ۹۱)

مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر اس کتاب کو عطار[1] کی تصنیف نہیں مانا جا سکتا۔

(۵) مفتاح الفتوح

اکثر کلیات میں موجود ہے اور تمام فہرست نگار عطار کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی دیباچہ تذکرۃ الاولیاے عطار، طبع یورپ میں، انڈیا آفس کے ایک نسخے سے جس کا نمبر سہواً ۵۵۹ دیئے ہیں، اشعار ذیل نقل کر کے بیان کرتے ہیں کہ وہ کسی زنجانی کی تصنیف ہے:۔

بسال شش صد و ہشتاد و دو چار شہور سال را بد آخر کار[2]

زذوالحجہ گزشتہ بُد دہ و پنج کہ مدفوں کردم اندر دفتر ایں گنج

(صفحہ یو)

"مفتاح الفتوح" دراصل غزلیات کے ایک مجموعے کا نام ہے جس کو زنجانی مذکور نے ایک منظوم دیباچے اور اس تعلّی کے ساتھ کہ وہ شیخ عطار کے روحانی فیضان اور اُنھیں کے طرز میں لکھ رہا ہے، شائع کیا ہے۔ اس کا

---

[1] والہ داغستانی "ریاض الشعرا" میں پہلوان محمود کے متعلق بیان کرتا ہے کہ: ان کا تخلص قتالی ہے، پدر محترم کی تقلید میں کُشتی گیری کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ ریاضت جسمانی کے ساتھ ساتھ ریاضت روحانی میں بھی سب کے سرکردہ اور ولیِ کامل تھے۔ اصل میں اورگنج سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثنوی کنز الحقائق سنہ ۷۰۳ھ میں تصنیف کی، سنہ ۷۲۲ ہجری میں انتقال کیا اور خیوق خوازم میں مدفون ہیں۔

[2] پروفیسر آذر اور نول کشور کے کلیات میں یہ اشعار نہیں ملتے۔

دعویٰ ہو کہ "شیخ نے خواب میں آکر مجھ کو اس تصنیف کا حکم دیا" لیکن راستم اس قدر بدعقیدہ واقع ہوا ہو کہ اس ادعائی فیضان میں سرقے کا پہلو دیکھتا ہو۔ بات یہ ہو کہ اس زنجانی نے ایک منظوم دیباچہ لکھ کر شیخ عطار کی چونسٹھ غزلیات پر قبضہ کر لیا ہو، کیونکہ مفتاح الفتوح کی جس قدر غزلیات ہیں، دیوان عطار سے اُڑائی گئی ہیں اور دلاوری یہ کی ہو کہ عطار کا تخلص تک بحال رہنے دیا ہو، ساتھ ہی پردہ دری کے خوف سے یہ ہدایت کر دی ہو کہ کتاب کو اغیار کی نگاہ سے دُور رکھنا:۔

وصیت کردم اے یار یگانہ　　کہ از ناساز پوشی ایں ترانہ

وہ اپنے دیباچے میں لکھتا ہو کہ "میں نے ایک شب ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا، اُنھوں نے فرمایا کہ تم اپنے دوستوں کے لیے ایک رسالہ نظم کر دو اور اس کا نام مفتاح الفتوح رکھ دو:۔

مرا گفتا چو برخیزی تو از خواب　　کتابے جمع کن از بہر احباب
سخن گو اندرو روشن بہ برہاں　　تو مفتاح الفتوحش نام گرداں

(کلیات ۱۲۰۰ (نول کشور)

جب میں بیدار ہوا تو کاغذ، قلم، دوات لے کر لکھنے بیٹھا، لیکن کچھ نہ لکھ سکا۔ اس کوشش میں دو ہفتے گزر گئے اور میں نے اپنے آپ کو اس کام کے بالکل ناقابل پایا۔ بھلا کہاں میں اور کہاں یہ قیل و قال، اور نہ میری یہ مجال کہ بغیر اجازت کے کوئی کام کروں، اس لیے مناسب ہو کہ اس کوشش سے دست بردار ہو جاؤں۔ آں حضرت[۵۱] نے سو مجلدات ہر علم

[۵۱] آں حضرت سے مراد شیخ عطار ہیں، گویا انھیں کے ارشاد اور فیضان سے کتاب مفتاح الفتوح تالیف ہوئی ہو۔

پر لکھے ہیں، نہ اُنھوں نے کسی سے پڑھا اور نہ کسی سے تعلیم پائی، جو کچھ لکھا الہامِ خداوندی سے لکھا:۔

نکردم بے اجازت کار ہرگز ۔ نگویم ایں سخن زنہار ہرگز
خداوندش نوشتہ صد مجلّد ۔ ہمہ علمے کہ او ماند مخلّد
نہ بر کس خواندہ، نے از کس شنیدہ ۔ بالہام از خدا بروے رسیدہ

(کلیات صفحہ ۱۲۰۰، نول کشور)

ئیں اس فکر میں رہا کہ دیکھیے غیب سے کیا اطلاع دی جاتی ہی۔ آخر ایک روز مجھ پر حالت طاری ہوگئی، اس بے خودی کے عالم میں دیکھتا ہوں کہ آنحضرت ارشاد فرماتے ہیں:۔"اے مسکین، تو آرائش لفظ و عبارت کے درپے نہ ہو اور معنی کو ضروری سمجھ کر اُنھیں کی تقریر پر اکتفا کر"۔

دریں اندیشہ بودم گاہ و بے گاہ ۔ کہ تا خود چوں کنند از غیبم آگاہ
بخود بودم فرو رفتہ یکے روز ۔ بدم در سینۂ تاب و جگر سوز
در آں دم حالتے دیدم نہانی ۔ کہ شد بر خاطرم کشف معانی
در آں حیرانی و حیرت کہ بودم ۔ بسمع دل ازاں حضرت شنودم
کہ اے مسکیں نگہ دار ازیں اشارت ۔ مدہ آرایش لفظ و عبارت
تو تقریر معانی کن دریں کار ۔ بہ جان و دل معانی دوست میدار

(ایضاً صفحہ ۱۲۰۱)

اب ئیں جان و دل سے ان کے ارشاد کا پابند ہوگیا اور جو کچھ لکھتا ہوں اُن ہی کے فیضان میں لکھتا ہوں اور ئیں تو محض بہانہ ہوں، شعر گوئی اُن کے طرز کے بغیر نہ صرف بے لطف بلکہ بے کار ہی۔ اب چونکہ آنحضرت نے اجازت دے دی ہی، ئیں بڑی تیزی کے ساتھ شعر لکھ سکتا ہوں اور میری

طبیعت سے اعلیٰ شعر ڈھلنے لگے ہیں :-

بجاں گفتم شدم منقاد رایش | سرم بادا فدائے خاک پایش
سخن زآنجاست اے مردیگانہ | بہا نہ داں مرا اندر میانہ
سخن بے طرز او بے ساز آید | اگر گوئی بکارے باز ناید
اجازت چونکہ شد ز انحضرت پاک | ہمی گویم سخن گستاخ وچالاک
چو زانحضرت اجازت شد چہ باکم | نکو آید سخن از طبع پاکم

(کلیات صفحہ ۱۲۰۱، طبع نول کشور)

اس دیباچے کے بعد غزلیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہی، جس کی تمام غزلیں دیوان عطار سے لی گئی ہیں۔ تعجب ہی کہ یہ مقدس سرقہ اب تک طشت از بام نہیں ہوا۔

(۶) وصلت نامہ

اس کے کئی نسخے نویں قرن کے لکھے ہوئے آج بھی موجود ہیں۔ معلومہ نسخوں میں سب سے قدیم وہ ہی، جو انڈیا آفس[۵۱] کے کتب خانے میں ہی۔ اس کی تاریخ کتابت ۸۱۲ھ ہجری ہی۔ فہرست نگار عطار کا تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے ایک مقام پر شیخ عطار[۵۲] کا بیان کیا ہی، دوسرے موقعے پر شیخ بہلول[۵۳] کا لکھا ہی۔ نول کشور نے مثنوی شیخ بہلول کے نام سے اس کو چھاپ بھی دیا ہی اور سنہ ۱۲۹۷ ہجری میں بار دوم طبع کیا ہی۔ ابتدائی شعر ہی :-

ابتدا اوّل بنام کردگار | خالق ہفت و شش و پنج وہزار

شیخ لقمان سرخسی اس کتاب کی مرکزی شخصیت ہیں، جن کو بایزید، جنید

---

۵۱ فہرست صفحہ ۶۱۸، نمبر ۱۰۳۴
۵۲ فہرست کتب خانۂ اودھ صفحہ ۳۵۵
۵۳ فہرست کتب خانۂ اودھ صفحہ ۳۷۰

اور منصور سے مقدم مانا گیا ہی۔ گویا ایک طرف وہ بایزید اور امام جعفر صادق متونی ۱۲۹ھ ہجری کے اور دوسری طرف شیخ ابوسعید ابوالخیر متوفی ۴۴۰ھ کے ہم عصر مانے گئے ہیں اور ان کی عمر ۳۷۰ سال بتائی گئی ہی:۔

شیخ لقماں آں زماں با بایزید | بود باقی تا بدور بوسعید
عمر او صد بود و ہفتاد و سہ سال | دائما در قرب بود و در وصال

(مثنوی بہلول صفحہ ۲۲، نولکشور)

اس کتاب کے خاص مضامین یہ ہیں:۔ حمد و نعت، تخلیق آدم، حکایت بلال، حکایت از روے رموز، حکایت سلطان محمود (سلطان ایک ویرانے میں جاتا ہی وہاں ایک دیوانہ رہتا ہی۔ معلوم ہُوا کہ شیخ لقمان سرخسی ہیں۔ جو حسین سے ملنے آئے تھے، اُس نے انا الحق آشکارا کہا تھا۔ جب لقمان پُہنچے وہ مرچکا تھا اور فرشتے اُس کو غسل دے رہے تھے اور نماز جنازہ کے بعد ایک سبز صندوق میں رکھ کر آسمان کی طرف لے گئے، وغیرہ وغیرہ)، حکایت بہلول در بغداد، حکایت آوردن بایزید پوستین امام جعفر صادق (امام جعفر شیخ بایزید کے ہاتھ اپنا پوستین لقمان سرخسی کے لیے بھیجتے ہیں) حکایت منصور (منصور نامہ والی حکایت ہی اور آیندہ اوراق میں مذکور ہی) حکایت فتح سومنات (جب محمود نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ سومنات پر حملہ کیا، مشرک قلعہ بند ہو کر لڑے اور سنگ باری سے سلطانی فوجوں کا بے حد نقصان کیا، محاصرہ چھ ماہ تک قائم رہا لیکن غنچۂ مقصود نہ کھلا۔ ایک دن سلطان نے جناب الٰہی میں دُعا کی۔ اُسی حالت میں اس پر بے خودی طاری ہوگئی، عالم رویا میں دیکھتا ہی کہ ایک نورانی صورت بزرگ تشریف لائے، ایک خشت ان کے ہاتھ میں ہی۔ وہ خشت انھوں نے قلعے کی دیوار پر کھینچ

ماری جس سے دیوار ٹوٹ گئی۔ اتنے میں شاہی لشکر میں ایک شور مچ گیا سلطان کی آنکھ اس شور سے کھل گئی، ایاز خاص نے آکر دیوار ٹوٹنے کی مبارک باد دی اور کہنے لگا کہ غیب سے ایک خشت آکر ایسی لگی کہ دیوار ٹوٹ گئی سلطان نے فرمایا وہ خشت میرے پاس لاؤ۔ جب لائی گئی تو دیکھا کہ اس پر حضرت لقمان سرخسی کا نام کندہ تھا۔ سلطان تشکر یے میں شیخ سے ملنے جاتا ہی۔ لقمان محمود سے پیشین گوئی کرتے ہیں کہ مجھ سے ڈھائی سو برس بعد شیخ محمد پیدا ہوں گے)' حکایت شیخ محمد مذکور و مرید او ابوبکر، حکایت برنائے ضعیف' حکایت بوذر و صحابی، منزل خوف ورجا حکایت یحییٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام منزل انس و ہیبت، حکایت بایزید و سائل، منزل انس و جلیس، حکایت درویش مسافر و ابوسعید، منزل جمال با جلال، حکایت لقمان و پیر بخارا، در مناجات و ختم کتاب۔

وصلت نامے کے ان بعض بیانات سے جن کو اوپر درج کر آیا ہوں، واضح ہوتا ہی کہ یہ کتاب شیخ عطار کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی، کیونکہ اس میں خوارق کی ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہی جو عطار کی طبیعت کے بالکل ناموافق ہی۔ اس کے اکثر بیانات افسانوی حیثیت رکھتے ہیں اور تذکرۃ الاولیاے عطار کے بیانات کے خلاف ہیں۔ مثلاً شیخ لقمان سرخسی کو جو وجاہت یہاں دی گئی ہی، وہ تمام روایات کے خلاف ہی۔ شیخ عطار نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کے حالات میں اُن کے متعلق اِس قدر لکھا ہی کہ "وہ عقلاے مجانین میں سے تھے ایک روز پوستین کے پیوند لگا رہے تھے کہ شیخ ابوسعید (جو ابھی طالب علم تھے) آنکلے، لقمان نے کچھ نجاست ان پر پھینک دی، انھوں نے خوشی سے اس کو برداشت کرلیا۔ اِس پر لقمان نے کہا: لڑکے! میں تجھے اس پوستین کے ساتھ ہی دوں؟۔ ابوسعید نے جواب دیا: آپ کی خوشی۔ پھر کچھ ٹانکے

بھر کر بولے : ابوسعید انھیں نے تجھے بھی دیا ہی۔ اب لقمان اُٹھے اور ابوسعید کا ہاتھ پکڑ کرلے چلے، راستے میں پیر ابو الفضل حسن ملے، کہنے لگے : اے ابوسعید تمہارا راستہ اِدھر نہیں ہی۔ اِس پر لقمان ابوسعید کا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے کر چلتے بنے۔" (تذکرۃ الاولیاے عطار صفحہ ۳۲۴، جلد دوم)

امام جعفر صادق کا بایزید کے ہاتھ شیخ لقمان کے لیے پوستین بھیجنا تاریخی لحاظ سے ناممکن ہی۔ جعفر صادق اور شیخ لقمان کے زمانوں میں جو فرق ہی ظاہر ہی۔ نہ لقمان کی درازی عمر کے متعلق کوئی روایت موجود ہی۔ رہا سومنات کا واقعہ، اس کے متعلق شیخ عطار اپنے تذکرے میں صاف صاف لکھتے ہیں کہ : فتح سومنات شیخ ابو الحسن خرقانی کے خرقے کی برکت سے حاصل ہوئی تھی جو شیخ نے بر وقت ملاقات سلطان کو دیا تھا۔ اُن کے الفاظ ہیں :۔

"پس سلطان برفت بغزا، درآں وقت بسومنات شد، بیم آں اُفتاد کہ شکستہ خواہد شد۔ ناگاہ از اسپ فرود آمد وبگوشۂ شد وروے برخاک نہاد و پیراہن شیخ را بر دست گرفت وگفت الٰہی بحق آبروے خداوند ایں خرقہ کہ مارا بریں کفار ظفر دہی کہ ہر چہ از غنیمت بگیرم بدرویشاں دہم۔ ناگاہ از جانب کفار غبارے وظلمتے پدید آمد، تا ہمہ تیغ در یک دیگر نہادند و می کشتند ومتفرق می شدند تا لشکر اسلام ظفر یافت۔ وآں شب محمود بخواب دید کہ شیخ می گفت آبروے خرقۂ ما بردی بر درگاہ حق، اگر دراں ساعت درخواستی جملۂ کفار را اسلام روزی کردے۔"

(تذکرۃ الاولیائے صفحہ ۲۰۹۔۲۱۰ جلد دوم مرتبۂ نکلسن)

اس بیان کی تائید تاریخ فرشتہ وتاریخ بناکتی وغیرہ سے ہوتی ہی۔ اب شیخ عطار وصلت نامہ میں (اگر وہ اس کے مصنف ہیں) اسی واقعے

کو غیر ذمہ دارانہ طریقے پر لقمان سرخسی کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔

پیر بخارا کی حکایت بھی اسی قسم کے خوارق سے لبریز ہے۔ پیر یہ معلوم کرکے کہ شیخ لقمان سرخسی نماز نہیں پڑھا کرتے، ان کی ہدایت کے لیے بخارا سے روانہ ہوتے ہیں۔ مگر اس شان کے ساتھ کہ مع اپنے مریدوں کے شیروں پر سوار ہیں اور کوڑوں کے بجائے ہاتھوں میں سانپ ہیں۔ لقمان نے جب از روے کشف معلوم کیا کہ پیر بخارا اس تجمل کے ساتھ اُن کی ہدایت کے لیے آتے ہیں تو یہ بھی ایک دیوار پر بیٹھ کر اُن کے استقبال کو روانہ ہوئے میں کہتا ہوں کیا یہ خرافات عطار کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں۔

یہ افسانے ایسے عہد کی یادگار ہیں جب دنیا میں انقلاب مغول کے بعد اوہام پرستی اور خوش عقیدگی کی لہر دوڑ گئی ہے، پاک باز اور فرشتہ صفات صوفیوں کی جگہ اوباش اور عیار لے لیتے ہیں اور بزرگوں کی کرامات و خوارق کی تشہیر سے اپنی دکان فروشی کرتے ہیں۔ لقمان سرخسی کی شعبدہ بازیوں کی نمایش سے جو ہم "وصلت نامے" میں پڑھتے ہیں، عطار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ قصّے صرف لقمان کی قبر کے مجاور کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

وصلت نامے کے مختلف اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مصنف شیخ بہلول ہیں، چنانچہ :-

نام او کردم بوصلت نامہ من	زانکہ وصلت دیدہ ام از خویشتن
ہر کہ می خواہد کہ او واصل شود	درد بہلولش ہمہ حاصل شود

(مثنوی حضرت شیخ بہلول صفحہ ۴ طبع نول کشور ۱۲۹۷ھ)

گفتۂ بہلول از جاناں بود	ہر چہ گوید آیت و برہاں بود
گفتۂ بہلول را توحید داں	دائمش در ترک و در تجرید داں

(ایضاً صفحہ ۲۹)

ہست بہلول از قدم تا سر گناہ رحمتت کردہ است پیشیں رہنما (کذا)
محو گرداں اے خدا بہلول را وارہاں از خویشتن ایں گول را

(ایضاً صفحہ ۳۰)

بلکہ شیخ بہلول نے ایک مقام پر شیخ عطار کی منطق الطیر سے ایک شعر بھی نقل کر دیا ہی اور حوالہ بھی دے دیا ہی۔ کہتے ہیں :۔

آن چنانکہ گفت عطار ایں در کتاب منطق الطیر از یقیں
سایہ در خورشید گم گردد مدام خود ہمہ خورشید گردد والسّلام

(ایضاً صفحہ ۲۹)

یہ حوالہ پروفیسر آذر کے کلیات (نوشتۂ ۸۵۷ھ) میں موجود ہی۔ صرف اِس قدر فرق ہی کہ شعر عطار میں 'گردد' کی بجائے 'بینی' ہی۔ کلیات عطار طبع نول کشور (صفحہ ۱۰۷۷ منطق الطیر) میں بھی ملتا ہی۔ لہذا میں اس شہادت نیز انداز کلام و بیان کی بنا پر (جو عطار سے بالکل مختلف ہی) وصلت نامہ کو شیخ بہلول کی تصنیف مانتا ہوں۔ یہ بھی واضح رہے کہ وصلت نامہ کے بعض جدید نسخوں میں ایک دو شعر ایسے بھی ملے ہیں جن میں عطار کا تخلص موجود ہی، مثلاً پروفیسر آذر کے وصلت نامہ مشمولۂ کلیات (۸۵۷ھ) اور مثنوی شیخ بہلول (نول کشور) میں ایک شعر ہی :۔

درد آمد رہبر راہ عیاں عاشق بے درد کے باشد رواں

(صفحہ ۲۶)

گیارہویں صدی کے ایک قلمی نسخے میں اِس کو یوں بدل دیا ہی :۔

درد آمد بر در راہ عیاں عاشقست عطار بیشک در جہاں

لیکن یہ ایک بے باکانہ تقلیب ہی اور ہمیں عطار کے تخلص کی موجودگی

سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ عطار کے نام پر وصلت نامہ کے انتساب کی غلطی نویں صدی ہجری سے پیشتر واقع ہوئی ہو۔ اُس وقت سے اب تک یہ مثنوی شیخ ہی کی مانی جاتی ہو اور یہ بات کاتبوں کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہی ہو، اس لیے تعجب نہیں اگر کسی دل چلے کاتب نے اس پر عطار کے نام کی مُہر لگانی چاہی ہو۔ خوش قسمتی سے پروفیسر آذر کا وصلت نامہ ایسی تقلیب سے پاک ہو اگرچہ "گفتۂ بہلول از جاناں بود" الخ، اور اس کے ہم ردیف شعر میں غلطی سے بہلول کی بجائے عطار لکھا گیا ہو، لیکن صاف معلوم ہوتا ہو کہ وہ سہو ہو۔

یہ ہے شیخ بہلول[۱] مجھ کو افسوس ہو کہ میں سردست اُن کا سراغ نہیں لگا سکتا وہ کوئی غیر معروف شخص معلوم ہوتے ہیں۔ (ریو) نے ایک دیوان اور

---

[۱] میں یہ مضمون (تصنیفات عطار) ختم کر چکا تھا کہ پروفیسر آذر نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست "مجموعۂ کرزن" مرتبۂ ڈبلیو آئیوانان جو اسی سال چھپی ہو، نہایت مہربانی کر کے میرے پاس بھیج دی۔ فہرست مذکور میں (صفحہ ۱۶۳) ایک وصلت نامہ نمبر ۲۰۶ نوشتۂ سنہ ۱۰۶۶ ہجری کا مذکور آتا ہو، اُس کے خاتمے پر مصنف کا نام شیخ الشیوخ شیخ بہلول مرقوم ہو۔

فہرست نگار کا بیان ہو کہ (۱) خاتمے کے علاوہ متن میں کئی موقعوں پر بہلول تخلص ملتا ہو (۲) ایسے اشعار کی جگہ جن میں عطار کا تخلص آتا ہو، خالی چھوڑ دی گئی ہو (۳) وصلت نامہ کے اڑتالیسویں شعر:۔

عاشقا ایں دم درآور سر جان تا بیابی سرِّ عشق لامکاں

کو افتتاحیہ بنا دیا گیا ہو۔ (۴) دیباچے کے آخری شعر:۔

(باقی برصفحۂ آیندہ)

وصلت نامہ ان کی طرف منسوب کرتے ہوئے فہرست برٹش میوزیم میں لکھا ہی کہ اُن کا انتقال ۹۷۰ھ ہجری سے پیشتر ہوا ہی۔ (ریو) کے ذہن میں غالباً شیخ بہلول دریائی ہیں، جو شاہ حسین مشہور بہ لال حسین کے پیر تھے۔ شیخ

(صفحہ ۴۱۶ کا بقیہ حاشیہ)

گفت وصلت نامہ را عطار پیر ختم گرداں یا الٰہی دستگیر

کو بالکل اُڑا دیا ہی اور (۵) اس کے مقابل شعر کے مصرع :۔

در د پہلویش ہمہ حاصل شود

کو تقلیب کر کے مصرع :۔

در د بہلولش مگر حاصل شود

میں تبدیل کر دیا گیا ہی (۶) مختصر یہ ہی کہ شیخ بہلول نہایت چالاک سارق ہی، لیکن اُس کی دلاوری اِن اشعار میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہی :۔

آں چنانم گفت عطار ایں در کتاب منطق از نور یقیں

سایہ در خورشید گم گردد مدام خود ہمہ خورشید گردد والسلام

قطرہ اندر بحر دریا اوفتد در ذر خورشید والا اوفتد

[یہ مصرع اصل میں یوں ہی :۔

"ذرہ بر خورشید والا اوفتد"]

(محمود شیرانی)

گفتۂ عطار خود از مغز بود لیک اندر صد لباس نغز بود

گفتۂ بہلول از جاناں بود ہرچہ گوید آیت برہاں بود

گفتۂ بہلول را توحید داں دائما در ترک و در تجرید داں

(۷) مثنوی ہذا بالخصوص حلاج کے افسانے سے تعلق رکھتی ہی۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۴۱۸)

محمود المعروف بہ محمد بیر نے اپنی مثنوی "حقیقت الفقرا" میں جو شاہ حسین کے حالات و کرامات میں ہی لکھا ہو کہ شیخ بہلول شاعر بھی تھے اور مثنوی "آداب فقر" اُن کی یادگار ہی :-

نظم آداب فقر زدست میاں ہمچو آیات مصحف از عثماں

لیکن ان کا انتقال سنہ ۹۸۳ ہجری میں ہوتا ہی :-

چوں شد او واصل خدائے احد بود ہشتاد و سہ دگر نہ صد

اسی صدی میں ایک اور بہلول ملتے ہیں جن کا پورا نام فریدالدین احمد جہاں گیر ہی اور بقول "گلزار ابرار" ۹۱۴ھ میں وفات پاتے ہیں۔ لیکن یہ تلاش بے سود ہی، کیونکہ ہمیں جس بہلول کی ضرورت ہی، وہ کم از کم آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔

(صفحہ ۷۱ کا بقیہ حاشیہ)

میں ان بیانات کے پڑھنے کے بعد بھی (جن کے ذکر کرنے میں تقدیم و تاخیر کا گنہگار رہوں) اپنے قدیمی نظریے پر قائم ہوں اور اب بھی مصر ہوں کہ مثنوی ہذا عطار کے شایان شان نہیں، نہ وہ اُن کے انداز میں مرقوم ہوئی ہی۔ اس کی اکثر حکایات فسانوی نوعیت کی ہیں، جن کا عطار کے قلم سے نکلنا دشوار ہی۔ نمبر (۴) میں جو شعر درج ہی الحاقی ہی، نہ کلیات آذر میں موجود ہی، نہ نول کشور کی مثنوی میں۔ اُس کی زبان کی خامی میرے بیان کے بغیر ظاہر ہی۔ نمبر (۵) میں مصرع کو "در د پہلویش ہمہ حاصل شود" پڑھنا شعر کو مہمل بنا دینا ہی (۶) شیخ بہلول کے خلاف سرقہ کا الزام بے حقیقت ہی، بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ایسی خام اور سقیم نظم کا عطار کی طرف منسوب ہونا سخت ظلم ہی۔ (۷) کتاب میں منصور کی صرف ایک حکایت ہی، زیادہ حکایات شیخ لقمان سے متعلق ہیں۔ پوری فہرست مضامین گزشتہ سطور میں آ چکی ہی۔

(۷) منصور نامہ (یا) حلاّج نامہ

انڈیا آفس، بوڈلین اور بانکی پور کے کتب خانوں میں موجود ہے اور فہرست نگار شیخ کی تسلیم کرتے ہیں، فاتحہ کا شعر ہے :۔

بود منصور اے عجب شوریدہ حال در رہِ تحقیق او را صد کمال

اکثر نے 'منصور اے' کو الف کے اسقاط کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ مثنوی علیحدہ چھپ بھی گئی ہے اور قلمی بھی ملتی ہے۔ اس میں منصور کے خلاف فتویٰ لگنے اور دار پر چڑھائے جانے کے حالات درج ہیں جو ہیلاج نامے سے ملتے جلتے ہیں۔

لکھا ہے کہ وہ پچاس سال تک اسرار پوش رہا، پھر اُس نے "انا الحق" کا نعرہ لگا کر اپنا راز فاش کر دیا۔ اہل تقلید نے فتویٰ مانگا، تین سو ستر عالموں نے کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ بغداد میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ جب خلیفہ کو اس امر کی اطلاع ہوئی، اگرچہ منصور کا دوست تھا کیونکہ اس کی کئی تصنیفات پڑھ چکا تھا لیکن عوام اور جہلا کے خوف سے اُس نے منصور کے قید کیے جانے کا حکم دے دیا۔ جب منصور قید خانے میں لایا گیا۔ جیل میں اس وقت چار سو قیدی تھے۔ منصور نے آتے ہی اُن سے کہا کہ: تم اپنے اپنے گھر چلے جاؤ۔ قیدی بولے :۔ ہم لوگ بھاری بھاری زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کیسے جا سکتے ہیں؟ منصور نے اُن کے قریب آ کر اپنا ہاتھ ہلایا، قیدیوں کی بیڑیاں کٹ کر گر گئیں۔ اُس وقت قیدیوں نے عرض کی: قید خانے کے دروازے بند ہیں ہم باہر نہیں نکل سکتے۔ منصور نے ایک اشارہ کیا اور دیوار میں چار سو رخنے نمودار ہو گئے۔ قیدی ان منفذوں سے باہر

نکل گئے۔ قید خانے کے مہتمم نے جب یہ کیفیت دیکھی، آکر اس کے قدموں میں گر گیا۔ منصور نے اس کو بھی چلے جانے کا حکم دیا۔ دارو غۂ جیل کے جانے کے بعد منصور مناجات الٰہی میں مشغول ہو گیا۔

شبلی جنید کے پاس گئے اور منصور کے قید ہونے کی اطلاع دی۔ جنید اپنے شاگردوں کو لے کر قید خانے پہنچے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ مخلوق کثرت سے جمع ہو رہی ہے۔ اجازت لے کر اندر گئے اور منصور کو ملامت کرنے لگے کہ: تم نے یہ کیا دیوانگی اختیار کی ہے، جو بات تم کہتے ہو وہ ہمارے پیشوا رسول اللہ نے بھی نہیں کہی، انا الحق کہنا کفر محض ہے۔ منصور نے جواب دیا: تم ان اسرار سے بے خبر ہو، رسول اللہ نے "من رآنی" فرمایا۔ "لی مع اللہ" کہا، خود خدائے پاک نے "نحن اقرب" فرمایا۔ تم مبتلائے تقلید ہو، واصلین کے مرتبے کیا جانو۔ اِس پر ملاقات ختم ہوئی اور جنید باہر آگئے۔ لوگوں نے اُن سے فتویٰ طلب کیا، انھوں نے کہا: مَیں ظاہر پر حکم دیتا ہوں، باطن سے واقف نہیں۔ بعد ازاں شبلی منصور کے پاس گئے، کہنے لگے: اے شیخ تو نے اپنا راز کیوں فاش کر دیا، اگر سَر کی خیر چاہتے ہو تو سِرّ کا ترک کہو۔ جواب میں منصور نے کہا: مَیں منصور نہیں ہوں، بلکہ:۔

من خدایم من خدایم من خدا　　فارغم از کبر و کین و از ہوا

اوّل و آخر، ظاہر و باطن مَیں ہوں۔ مَیں سِرّ توحید کو آشکار کرنے آیا ہوں تاکہ بقائے حق میں باقی رہوں، مصطفیٰ میرے پیشوا ہیں اور راہِ یقین کے رہنما ہیں لیکن تم ان غوغائیوں سے میرے لیے ایک روز کی مہلت مانگ لو، کیونکہ میرا ایک مخلص دوست جس کا نام شیخ کبیر (عبد اللہ خفیف) ہے، کل تک یہاں پہنچنے والا ہے اور مجھ کو اس سے ایک ضروری

راز کہنا ہی، اس کے بعد میں دار کے لیے تیار ہوں۔ دوسرے دن شیخ کبیر آ گئے اور سیدھے منصور کے پاس گئے۔ ملامت کے لہجے میں کہنے لگے "اے توحید پرست! تو نے سرّ حق کو کیوں فاش کیا، تو پچاس سال صاحب اسرار رہا، اب کیا ہو گیا کہ اس قدر بے خود ہو گیا"۔ منصور نے کہا: "تم کو معلوم ہی کہ بحر معنی بے نہایت ہی اور انا الحق تو اس کی ایک ادنیٰ سی موج ہی تم سے لوگ اگر فتویٰ مانگیں تو دے دینا"۔ شیخ کبیر نے جواب دیا: "میں فتویٰ نہیں دے سکتا"؛۔

شیخ گفتا آں چہ گفتی نے رواست من ہمی دانم کہ ذاتِ تو خداست
چوں دہم فتویٰ ز جہل واز گماں من عیاں دیدم خدا را ایں زماں

منصور نے کہا: خیر میرے کہنے سے دے دینا۔ شیخ کبیر اس کے بعد چلے آئے۔ عوام نے فتویٰ طلب کیا، شیخ نے کہا: منصور نے کہلا بھیجا ہی کہ میں واجب القتل ہوں، مگر میری رائے ہی کہ وہ اہل ظاہر کے نزدیک واجب القتل ہی مگر باطن کے حال سے میں واقف نہیں۔ اس کے بعد سب لوگ جمع ہو گئے۔ منصور آیا اور سولی پر چڑھ گیا۔ انا الحق کے نعرے لگانے لگا۔ حالت یہ ہوئی کہ سنگ و خشت، دار اور رسن تک سے انا الحق کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ظالم نے آ کر اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ منصور نے اپنا لہو بھرا ہاتھ چہرے پر مل لیا۔ شبلی نے دریافت کیا کہ تم نے ہاتھ منہ پر کیوں ملا؟ اس نے جواب دیا: میں نماز عشق ادا کرنا چاہتا ہوں اور یہ اس کا وضو ہی۔ شبلی نے پھر سوال کیا کہ: تصوف کا کوئی رمز بیان کرو۔ اس نے کہا: اپنے آپ کو سب سے کمتر دیکھنا۔ پھر پوچھا کہ طریق عشق کا پتا دو۔ منصور کا جواب تھا:۔

گفت عشق ایں جا بود گردن زدن بعد ازانش آتش اندر سوختن

ان الفاظ کے ختم ہونے پر اس کا سر کاٹ دیا گیا۔ جب سر کٹ کر گرا، اُس سے انا الحق کی آواز برابر آ رہی تھی۔ تب منصور کے جسم کو جلا دیا اور ہوا اُس کی خاک اُڑا کر پانی میں لے گئی۔

منصور نامہ میں یہ قصہ ہے، جو مختصراً یہاں بیان ہوا۔ اِس مثنوی کے ہیلاج نامہ سے جہاں یہی قصہ ایک دراز طریقے پر بیان ہوا ہے، قدیمی تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ منصور نامہ درحقیقت کوئی علیحدہ مثنوی نہیں، بلکہ وصلت نامے کی ایک حکایت ہے، جو مطبوعہ وصلت نامے میں صفحہ ۱۴ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۰ پر ختم ہو جاتی ہے۔ نول کشور نے ۱۲۹۷ھ میں وصلت نامے کو بار دوم چھاپا ہے، لیکن اس کا نام مثنوی حضرت شیخ بہلول رکھا ہے۔ پروفیسر آذر کے وصلت نامے مشمولہ کلیات میں بھی یہ حکایت موجود ہے۔

منصور نامہ کے متعلق ایک حیرت خیز امر یہ ہے کہ وہ اشتر نامۂ شامل کلیات پروفیسر آذر میں بھی موجود ہے، جہاں خاتمے پر "در رفع شدن ہستی منصور و پیدا شدن حق و ختم کتاب" کی سرخی کے تحت میں پوری حکایت درج ہے۔ آخر سے تقریباً ایک صفحہ جو اصل قصے سے علاقہ نہیں رکھتا یا تو کاتب اتفاقیہ ترک کر گیا ہے، یا مختصر کرنے کی غرض سے نکال دیا گیا ہے یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ آیا منصور نامہ اصل میں وصلت نامہ کا ایک حصہ ہے، یا اشتر نامہ کا۔ اس کے متعلق میرا عقیدہ ہے کہ وہ فی الواقع وصلت نامہ کا ایک جزو ہے اور اشتر نامہ میں اُس کا ایزاد غیر موزوں واقع ہوا ہے کیونکہ عین منصور نامہ کے قبل قریب قریب منصور کی یہی حکایت ایک وسیع پیمانے پر شروع

کی جاتی ہے، جس میں منصور قیدیوں کو رہا کر کے اور داروغۂ قید خانے کو روانہ کر کے قید خانے میں تنہا مناجات میں مصروف ہو جاتا ہے۔ مناجات کے اختتام کے بعد باقی حکایت کو ختم کیے بغیر منصور نامہ شروع ہو جاتا ہے اور منصور نامہ کے ختم پر اشتر نامہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ بہر حال منصور نامہ کو علیحدہ تصنیف ماننے میں ہم حق بجانب نہیں، اگرچہ وصلت نامے کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے شیخ بہلول کی تصنیف ہے۔

(۸) بے سر نامہ

امین احمد رازی کی فہرست میں شامل ہے۔ تمام فہرست نگار عطار کا مانتے ہیں اور چھپ بھی چکا ہے، اس کا پہلا شعر ہے:۔

من بغیر تو نہ بینم در جہاں تا درا پروردگارا جاوداں

یہ ایک ترجیع بند ہے اور ہر بند کے ترجیعی ابیات یہ ہیں:۔

من خدایم من خدایم من خدا فارغم از کبر و کینہ و ز ہوا

سرّ بے سر نامہ را پیدا کنم عاشقاں را در جہاں شیدا کنم

بے سر نامہ میرے خیال میں کسی علیحدہ وجود رکھنے کا مستحق نہیں، اُس کی تعمیر کا اکثر مواد منصور نامہ سے لیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ منصور نامہ کا موضوع منصور ہے، لیکن بے سر نامہ میں یہ منصب شیخ عطار کو دیا جاتا ہے جو کبھی صیغہ متکلم اور کبھی صیغۂ غائب میں دکھائے گئے ہیں۔ بے سر نامہ میں اصل قصے کی ترتیب، واقعات کی کوئی پروا نہیں کی گئی ہے اور نہ نفس قصے سے سروکار رکھا گیا۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ منصور کا درجہ عطار کو دیا جائے اور حدیثِ دار و رسن کی تجدید کی جائے۔ اس کتاب کو شیخ عطار کی طرف منسوب کرنا انسانی

فہم و شعور پر بیداد توڑتا ہے۔ اس کے اثبات کے لیے ہم کو کسی کد و کاوش اور تحقیق و تلاش کی ضرورت نہیں۔ اس قدر جاننا کافی ہے کہ بے سرنامہ منصور نامہ کی ایک مسخ شدہ شکل ہے۔ فارسی ادبیات میں ایسے دلیرانہ سرقے کی مثال مشکل سے ملے گی۔ میں بخوف طوالت بے سرنامے کے سارے گورکھ دھندے کو سلجھانا نہیں چاہتا، صرف بعض امثال پر قناعت کرتا ہوں :-

بے سرنامہ	منصور نامہ (از ابتدائے حکایات)
(۱) بود عطارے عجب شوریدہ حال در رہِ تحقیق او را صد کمال	(۱) بود منصورے عجب شوریدہ حال در رہِ تحقیق او را صد کمال
(۲) حال او حال عجب بود اے پسر نے چہ حال ایں کسان بے خبر	(۲) حال او حال عجب بود اے پسر نے چو حال ایں خسیساں بے خبر
(۳) در رموز سرّ حق پے بردہ بود نے کہ ہمچوں ما دو در پردہ بود	(۳) او رموز سرِ حق پے بردہ بود نے کہ چوں ما راہ را گم کردہ بود
(۴) او یقین خویشس حاصل کردہ بود در یقین خویش واصل گشتہ بود	(۵) او یقین خویش حاصل کردہ بود در یقین خویش واصل گشتہ بود
(۵) در علوم دیں وقوفے داشت او ہیچ علمے را فرو نگذاشت او	(۸) در علوم دیں وقوفے داشت او ہیچ علمے را فرو نگذاشت او
(۶) عالماں از علم او درماندہ اند عارفاں از عرف او واماندہ اند	(۹) عالماں از علم او درماندہ اند عارفاں از عرف او واماندہ اند
(۷) عاشقاں از عشق او حیراں شدند ہردم از نوعِ دگر بریاں شدند	(۱۰) عاشقاں از عشق او حیراں شدند ہردم از نوع دگر بریاں شدند

بے سر نامہ

(۸) بعد پنجہ سال او اسرار یافت
از فریدالدین لقب عطار یافت
(بند ششم بے سر نامۂ قلمی)

(۷) مردماں گفتند ایں چہ کردۂ
روے خود در خوں چرا آلودۂ
(۸) گفتم ایں دم می گزارم من نماز
پس بخوں سازم وضوئے پاکباز
(۹) ایں نماز عشق را آنجا وضو
راست ناید جز بخونِ خوبرو
(۱۰) بعد ازاں گفتند مرا اے مردکار
از تصوف ایں زماں رمزے بیار
(۱۱) گفت کمتر زیں کہ می بینی بہ بیں
تا ترا در راہِ حق باشد یقیں
(۱۲) بار دیگر گفتم اے صاحب نظر
از طریق عشق دہ مارا خبر
(۱۳) گفت ایں جا بس بود گردن زدن
بعد ازاں بر سوختہ آتش زدن

منصور نامہ

(۱۴) بود پنجہ سال او اسرار پوش
ناگہاں از وے بر آمد صد خروش
(مثنوی[۱] حضرت شیخ بہلول صفحہ ۱۴
طبع نول کشور سنہ ۱۲۹۷ھ)

(۱۴) شبلیش گفت ایں زماں چہ دیدۂ
دست در ساعد چرا مالیدۂ
(۱۵) گفت ایندم می گزارم من نماز
پس وضو سازم بخوں اے پاک باز
(۱۶) کیں نماز عشق را ایں جا وضو
راست ناید جز بخوں اے خوبرو
(۱۷) بعد ازآں شبلی بگفت اے مردکار
از تصوف ایں زماں رمزے بیار
(۱۸) گفت کمتر زیں کہ می بینی بہ بیں
تا ترا در راہِ حق باشد یقیں
(۱۹) بار دیگر گفت کاے صاحب نظر
از طریق عشق دہ مارا خبر
(۲۰) گفت عشق ایں جا بود گردن زدن
بعد ازانش آتش اندر سوختن

---

[۱] میرے پاس منصور نامہ علیحدہ بھی ہے، مگر قلمی ہے، اس لیے اس کے اشعار مثنوی شیخ بہلول مطبوعہ سے نقل کر رہا ہوں۔

بے سر نامہ	منصور نامہ
(۱۴) ایں کہ گفتم ایں چنیں شد حال من	(۲۲) ایں بگفت و ایں چنیں شد حال او
منتشر شد در جہاں احوال من	منتشر شد در جہاں احوال او
(بند دہم)	(صفحہ ۱۸ - بیت ۱۴ - ۲۲)
(۲) پیشوائے ماست ہمچوں مصطفیٰ است	(۵) پیشوائے ما ہمہ چوں مصطفیٰ است
لاجرم تو آنچہ گوئی کے رواست	لاجرم آنچہ تو گفتی نیست راست
(۳) بعد ازاں عطار گفت اے کور کر	(۸) بعد ازاں منصور گفتش شو بدر
وز رموز سرّ عشق اے بے خبر	از رموز سرّ معنیٰ بے خبر
(۴) تو بہ بندے صورتے در ماندۂ	(۹) تو برہنہ صورت وا ماندۂ
کے تو حرف حق احمدؐ خواندۂ	کے تو ہرگز حرف احمدؐ خواندۂ
(۵) "لی مع اللہ" گفت احمدؐ در بیاں	(۱۰) "من رآنی" گفت احمد در میاں
تو کجا دانی کہ ہستی بے نشاں	تو کجا دانی کہ ہستی بے نشاں
(۶) راز من گفتست احمدؐ از صفا (کذا)	(۱۱) "لی مع اللہ" گفت احمدؐ از صفا
تو کجا دانی کہ ہستی بے وفا	تو کجا دانی کہ ہستی بے وفا
(۷) تو بصورت ہمچو کافر ماندۂ	(۱۳) تو ز صورت ہمچو کافر ماندۂ
واصل حق را تو کافر خواندۂ	واصل حق را تو کافر خواندۂ
(۸) خرقۂ ناموس را پوشیدۂ	(۱۴) خرقۂ ناموس را پوشیدۂ
وانگہے سالوس را کوشیدۂ	وانگہے سالوس را کوشیدۂ
(۹) بُت پرستی می کنی در زیر دلق	(۱۵) بُت پرستی می کنی در زیر دلق
می نمائی خویش را صوفی بخلق	می نمائی خویش را صوفی بخلق
(۱۰) تو سلوک راہ را گم کردۂ	(۱۶) تو سلوک راہ خود وا کردۂ

منصور نامہ	بے سر نامہ
لاجرم در صد ہزاراں پردۂ	لاجرم در صد ہزاراں پردۂ
(۱۷) دانگاہے کردۂ ایں خرقہ را	(۱۱) دانگاہے کردۂ ایں خرقہ را
می فریبی ہر زماں ایں فرقہ را	می فریبی ہر زماں ایں فرقہ را
(۱۸) در خودی خود بد گرفتار آمدی	(۱۲) در خودیٔ خود گرفتار آمدی
لاجرم در عین پندار آمدی	لاجرم در عین پندار آمدی
(۱۹) راہ تجرید و فنا راہ تونیست	(۱۳) راہ تجرید و فنا راہ تونیست
تو سخن کم گوے کاں راہ تونیست	تو سخن کم گوے کاں راہ تونیست
(۲۰) روکہ در تقلید ماندی مبتلا	(۱۴) روکہ در تجرید ماندی مبتلا
سرّ توحید از کجا و تو کجا	سرّ توحید از کجا تو از کجا
(۲۱) روکہ راہ بے نشاں راہ تونیست	(۱۵) روکہ راہ بے نشاں راہِ تونیست
عقل تو از راہ معنی در شکیست	عقل تو از راہ معنی در شکیست
(مثنوی شیخ بہلول، صفحہ ۱۶- بیت ۵-۲۱)	(بند ہشتم۔ بے سر نامہ قلمی)

بے سر نامہ کے کل دس بند ہیں۔ نول کشور کے بے سر نامہ (مشمولۂ کلیات) کے بندوں میں بے ترتیبی ہی اور متن بھی بے حد غلط ہی اس لیے میں نے بے سر نامۂ قلمی مملوکۂ پروفیسر آذر سے کام لیا ہی۔

(۹) خیاط نامہ

اس کی ابتدا ہی :-

بنام آں کہ ہستی زو نشاں یافت   نفوس ناطقہ زو نور جاں یافت

اور کتاب کا نام اس بیت میں واقع ہوتا ہی :-

بچو بہ کاغذ بنہادم نوکِ خامہ نوشتم نام ایں خیاط نامہ

اکثر فہرست نگار مثلاً: اسپرنگر، ایتھے، عبد المقتدر خاں اور آئیوناف شیخ عطار کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن حاجی خلیفہ (کشف الظنون جلد اوّل صفحہ ۷۲۶ طبع مصر سنہ ۱۳۱۱ ہجری) اس کو خیاط کاشانی کی تصنیف بیان کرتا ہے۔ فہرست نگار خیاط کو بہ تخفیف تشدیدِ 'یا' پڑھتے ہیں، لیکن بیت مذکورۂ بالا میں یا پر تشدید موجود ہے۔ مجھ کو اس مثنوی کے مطالعے کا موقع نہیں ملا۔

(۱۰) کنز الاسرار

اِسٹورٹ نے اس کا نام "کنت کنزاً مخفی" لکھا ہے۔ ڈاکٹر ایتھے نے 'کنز البحر' ایک اور نام بتایا ہے۔ اس کے خاتمے میں یہ شعر آتا ہے:-

رساند نفع را بر خاص و عام ایں کہ در شش صد نود نہ شد تمام ایں

اگرچہ نسخوں میں "شش صد نود نہ" ملتا ہے، لیکن ڈاکٹر ایتھے نے اس کو سہو کاتب پر محمول کر کے اس کا نسخہ 'پنج صد نود نہ' یا 'شش صد نوازدہ' تجویز کیا ہے[۵۱] جو قابلِ قبول نہیں۔ میرزا محمد کہتے ہیں "وایتہ در فہرست کتب فارسیہ دیوان ہند...... بیت کنز الاسرار را حمل بر غلط بودن نسخہ کردہ است و ایں سہو است ...... و ایں ...... کتاب از عطار نیست ...... و کنز الاسرار معلوم نیست از کیست[۵۲]" آئیوناف اس معاملے میں میرزا محمد سے بالکل متفق ہے۔ کنز الاسرار کا میرے پاس بھی ایک نسخہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے مصنف کا تخلص تربتی ہے، اس نسخے میں تاریخ تصنیف سنہ ۶۹۹ ہجری

---

۵۱ فہرست کتب فارسیہ انڈیا آفس نمبر ۱۰۳۱ (۸)

۵۲ مقدمہ انتقادی تذکرۃ الاولیاے عطار صفحہ یو۔

کے بجائے ۶۹۹ ہجری دی گئی ہی، چنانچہ خاتمے کے چار بیت یہاں نقل کر دیے جاتے ہیں:۔

گناہِ من فزوں از کفِ دریاست فزوں تر ہم ز اوراق شجرہاست
گناہ تربتی از حد برون است کہ من از چہ سنی گویم فزونست
بیامرزد بنقد آں بندۂ حق دہد ایں نسخہ را با خلق رونق
رساند نفع ہم بر خاص و عام ایں کہ در ہفصد نو د نہ شد تمام ایں

بہلول کی حکایت کے آخر میں بھی شاعر اپنا تخلص لایا ہی:۔

نصیحت ہاے مسکیں تربتی را بگوشِ خود بگیرد مرد دانا
بناداں ہر چہ می گوئی دریغ ست ازاں کہ آفتابش زیر میغ ست

اس نسخے کی ابتدا میں نثر کا ایک دیباچہ بھی ہی، جو اس طرح شروع ہوتا ہی:۔

"اَلحمدُ لِلّٰہِ ربّ العالمین، وَالعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِین، ولاعدوان اِلّا علی الظّالمین ۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من حفظ علیٰ اُمّتی اربعین حدیثاً ممّا یحتاجون الیہ کتب اللّٰہُ فقیہاً عالماً۔ دبر امید ایں وعدہ ہر کہ یاد دہد امت من (کذا) چہل حدیث را کہ ازاں چیز کہ محتاجند آدمیاں بآں چیزہا، نویسد خداے تعالیٰ ویرا فقیہہ عالم"

پہلے صفحے میں اسی طرح سے کئی حدیثیں نقل ہیں اور ان کا فارسی ترجمہ بھی ساتھ ساتھ دے دیا ہی۔ لیکن بدقسمتی سے ساتھ والا ورق موجود نہیں ہی، جس میں دیباچے کا بقیہ حصہ ہونا چاہیے۔ تاہم اس قدر صاف سمجھ میں آتا ہی کہ مصنف نے اس مثنوی میں چہل حدیث بیان کی ہیں اور احادیث کے مناسب حال حکایات بھی درج کر دی ہیں۔ بہر حال "کنز الاسرار" شیخ عطار سے کوئی

علاقہ نہیں رکھتی ۔

۱۱ - وصیت نامہ

دولت شاہ نے شیخ کی تصنیفات کی فہرست میں اس کو شامل کیا ہے[۵۱]۔ اسٹیورٹ نے اپنی فہرست میں اس کا نام 'اوسط نامہ' بتایا ہے[۵۲]۔ پروفیسر[۵۳] میترا نے 'مثنوی مصباح' لکھا ہے اور فہرست نگار عطار کی تصنیف مانتے ہیں۔ اس مثنوی کا پہلا شعر ہے :-

اے بنامت کار ہا را افتتاح　　　نیست بے نام تو در امرے فلاح

لیکن اس مثنوی کے ایک شعر سے جو پروفیسر میترا نے فہرست کتب[۵۴] فارسیہ ریاست کپورتھلا شائع شدہ ۱۹۲۵ء میں نقل کیا ہے : معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۸۲۵ ہجری کی تصنیف ہے۔ وہ یہ ہے :-

چوں گزشت از ہجرت خیر الانام　　　ہشت صد و پنجاہ و دو ایں شد تمام

اس لیے ہمیں ماننا چاہیے کہ اس کتاب سے عطار کو کوئی تعلق نہیں ۔

(۱۲) مظہر العجائب

دولت شاہ اس تصنیف سے واقف نہیں۔ امین احمد رازی قاضی نور اللہ شوستری اور حاجی خلیفہ اس کا ذکر کرتے ہیں ۔ معلومہ نسخوں میں سب

---

[۵۱] تذکرۂ دولت شاہ صفحہ ۱۹۰ مرتبۂ پروفیسر براؤن ۔

[۵۲] منقول از فہرست کتب فارسیہ انڈیا آفس ۔

[۵۳] دیال سنگھ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر اور پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرر ہیں ۔

[۵۴] صفحہ ۱۰۴ نمبر ۱۰۴ ۔

سے پُرانے برٹش میوزیم[۵۱] اور بانکی پور[۵۲] کے کتب خانوں میں ہیں، ان پر کوئی تاریخ نہیں، لیکن فہرست نگاروں کی رائے میں گیارہویں صدی کے نوشتہ ہیں، اس سے گمان گزرتا ہے کہ "مظہر العجائب" گزشتہ تصنیفات کے مقابلے میں سب سے کم عمر ہے۔ تمام فہرست نگار حسب معمول عطار کی تصنیف مانتے ہیں۔

جب میں اس کتاب کے تبصرے کے لیے آمادہ ہوا تو لاہور میں اس کا ایک نسخہ تک موجود نہ تھا، مجبوراً میں نے پروفیسر سراج الدین آذر کی خدمت میں دستگیری کی التجا کی، انھوں نے کوشش کرکے کچھ ہی عرصے میں تین نسخے مہیا کر دیے، میں ان کی اس مہربانی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک نسخہ یار علی نے کلکتہ[۵۳] میں ۱۵ جمادی الاوّل سنہ ۴۲ عالمگیری موافق ۱۱۲۰ھ میں نقل کیا تھا۔ اس نسخے کے ۶۶۲ صفحات اور فی صفحہ تیرہ، چودہ، پندرہ یا سولہ سطریں ہیں، اس لیے اشعار کی تعداد تخمیناً نو یا دس

---

۵۱ ایڈ نمبر ۷۷۲۱، صفحہ ۵۷۹، جلد دوم، فہرست کتب فارسیہ۔

۵۲ نمبر ۶۳ صفحہ ۶۵ (۲) فہرست کتب فارسیہ۔

۵۳ سنہ ۱۷۰۰ء مطابق سنہ ۱۱۱۲ھ کے قریب الیسٹ انڈیا کمپنی نے دیہات سوتانتی کالی کٹا اور گوبند پور شہزادہ عظیم الشان صوبہ دار بنگال سے خرید کر کلکتہ کی بُنیاد ڈالی۔ تعجب ہے کہ ایسے ابتدائی زمانے میں مسلمان کاتب کلکتے پہنچ جاتے ہیں۔ مگر تاریخ جلوس عالمگیری اور تاریخ ہجری آپس میں مطابق نہیں ہیں۔ سنہ ۴۳ جلوس عالمگیری سنہ ۱۶۹۰ء مطابق ۱۱۰۲ھ کے مطابق ہے، جب کلکتے کا دنیا میں وجود ہی نہیں تھا۔ سنہ ۱۱۲۰ ہجری میں اورنگ زیب زندہ نہیں تھا۔ وہ سنہ ۱۱۱۸ ہجری میں وفات پا چکا ہے۔ اگر کاغذ، خط اور سیاہی کی شہادت کا لحاظ کیا جائے تو نسخۂ ہذا کی تاریخ تیرھویں قرن ہجری کی ابتدا میں ماننی پڑے گی۔

ہزار کے درمیان ہوگی۔ ابتدا کا شعر ہی:۔

آفریں، جاں آفرینِ جانِ جاں　　　زاں کہ ہست او آشکارا ہم نہاں

چونکہ کتاب چھپی نہیں ہی، اس لیے اِس کے بعض عنوان یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

در بیانِ کتابِ خویش۔ روایت نجم الدین کبریٰ، در آمدن سید کائنات بحجرۂ علی علیہ السّلام۔ گفتن نے نجم الدین کبریٰ را حالِ خود۔ سپردن پدر شیخ را بمعلم، دیدن شیخ پیر سالک و رسیدن بسید ناصر، آوردن جبریل سیبے بنزد سید کائنات، در آتش رفتن بوذر غفاری با امیر المؤمنین، در واقعۂ پیر سالک کہ پیش شیخ آمد، قصۂ جنگ خندق، شکستن ایاز گوہر را بفرمانِ سلطان محمود، قصۂ سید با شیر و غلام؛ در بیان اہل مناصب۔ قصۂ شقیق بلخی و امام موسیٰ کاظم و ہارون الرشید، قصۂ پادشاہ احمد۔ قصۂ خواجہ ابمار و امام ابوبکر۔ قصۂ حکیم و پیر عراقی۔ پند دادن شیخ حسین فرزند را، قصۂ پادشاہ عادل و امیران ظالم۔ قصۂ عیارانِ خراسان و بغداد۔ سوال کردن پیر سالک از عطار سوال از شیخ شبلی۔ در واقعۂ خواجۂ نیشاپوری و رفتن شیخ۔

اس کتاب[1] کی ایک خصوصیت یہ ہی کہ ذو بحرین ہی، یعنے صفحہ ۳۴۷ تک بحر رمل مسدس میں اشعار ملتے ہیں اور شعر:۔

گنہگارم زفعل بد گنہگار　　　خداوندا توئی دانائے اسرار

کے بعد سے بحر ہزج میں طبع آزمائی کی جاتی ہی، اور بیت:۔

---

[1] علامۂ محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے مقدمۂ تذکرۂ "عطار" میں اور پروفیسر براؤن نے جلد دوم "تاریخ ادبیات ایران" میں شیخ عطار کے اکثر حالات اسی کتاب کے حوالے سے نقل کرکے اس کو ایک ناواجب امتیاز دے دیا ہی۔

باز نقلے ہم ز شبلی گویمت سرے از اسرار غیبی گویمت

(ص ۵۸۵)

سے دوبارہ رمل کی طرف مراجعت کی جاتی ہے اور خاتمے[1] تک یہی وزن رہتا ہے۔

چند کلمے جوہر الذات اور مظہر العجائب کے تعلقات کی نسبت کہنے مناسب معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ دونوں کتابوں میں زبان اور مضمون کے لحاظ سے کوئی اتحاد نہیں، تاہم صاحب "مظہر العجائب" مصر ہے کہ جوہر الذات میری تصنیف ہے، قدم قدم پر اس کا اعلان کرتا ہے اور سینکڑوں موقعوں پر دونوں کتابوں کا نام ساتھ ساتھ لاتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اگرچہ میں نے سو کتابیں لکھی ہیں، لیکن "جوہر" اور "مظہر" ان میں نہایت قیمتی اور چوٹی کی کتابیں ہیں۔

جوہر ذاتم جہاں را جاں بود زانکہ او از معنئے قرآں بود

مظہر من مالسان الغیب داں اوست اسرار دو عالم رازداں (ص ۶۲۰)

زمظہر گردی تو انسان کامل زجوہر ذات من گردی تو واصل (ص ۵۳۲)

مظہرم می خوان وجوہر گوشدار تا بیابی در معنیٔ بے شمار (ص ۱۲۴)

ان بیانات سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کتابیں ایک ہی مصنف سے علاقہ رکھتی ہیں، لیکن ان کی زبان، انداز کلام اور تاریخی معلومات پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کتابوں کے مصنف دو مختلف شخص ہیں، مثلاً: الفاظ "حقیقت" اور "جاگاہ" وغیرہ جو صاحب جوہر کے لیے عصائے پیری کا حکم رکھتے ہیں، مظہر میں مطلق غیر حاضر ہیں۔ بعض باتیں ان میں مشترک ہیں، مثلاً: مظہر میں "ابا" کا استعمال خال خال موقعوں پر نظر آتا ہے، مگر

---

[1] ایک مقام پر چند صفحات کے لیے پھر بحر بدل دی گئی ہے۔ اس قسم کی اور مثالیں بھی ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔

جوہر کے مقابلے میں بہت کم ہی۔ اداے مضمون میں دونوں کتابوں میں بے ترتیبی اور طوالت کا ڈھنگ موجود ہی۔ دماغی قابلیت اور شاعری کے لحاظ سے دونوں مساوی ہیں، صرف انیس بیس کا فرق ہی۔ ایک ہی لفظ یا فقرے کی تکرار سے اشعار کی ابتدا ہونا جو "جوہرالذات" کا خوفناک پہلو ہی، "مظہر" میں اس سے بھی وسیع پیمانے پر نظر آتا ہی۔ ناصر خسرو کو دونوں کتابوں میں ایک قابل حرمت حیثیت حاصل ہی۔ "جوہر" میں حضرت علیؑ کا ذکر نہایت احترام اور توقیر کے ساتھ ملتا ہی، لیکن وہ عقیدت اور خلوص غیر حاضر ہی جو مظہر میں نمودار ہی یہاں حضرت علیؑ کو وہی رتبہ حاصل ہی جو "جوہر" میں منصور کو دیا گیا ہی۔ تاہم صاحب مظہر العجائب کہتا ہی :-

از برائے روح احمدؐ جوہرم | وز برائے روح حیدر مظہرم

اس سے مَیں خیال کرتا ہوں کہ مصنّف مظہر العجائب نے غالباً "جوہرالذات" کو دیکھا تک نہیں، کیونکہ یہ کتاب جس کا "ہیلاج نامہ" ایک سلسلہ ہی، درحقیقت منصور کے لیے لکھی گئی تھی۔ "جوہرالذات" میں رواداری کی روح موجود ہی اور تمام فرقوں حتیٰ کہ گبر و ترسا و یہود کو بھی مساوی مان لیا گیا ہی۔ "مظہر" میں مذہبی جوش غالب ہی اور مصنف سوائے اپنے عقیدے کے لوگوں کے سب پر تبرا بھیجتا ہی۔ "جوہر" میں منصور کی طرح دار پر چڑھائے جانے کی آرزو بے حد زبردست ہی، لیکن صاحب مظہر کو عام انسانوں کی طرح اپنی جان عزیز ہی۔

یہاں مظہر کی بعض خصوصیات لسانی بیان کی جاتی ہیں :-

ابا، بمعنی با :-

آں امامے کو بحق اسرار گفت | ہم ابا منصور ہم با دار گفت ص۱۹

رو تو ایں بیت ابا مظہر بہ بند | تا شوی در ملک معنی سربلند
زانکہ حیدر در درون یار گفت | ہم ابا منصور ہم با دار گفت

باشش، بمعنی سکونت :-

اے برادر علم معنی دانش است | زاں مرادر کوے معنی باشش است
ہر کرا باشد سعادت رہنموں | جاے باشش باشدش شاپور دتوں

زایدہ، بجائے زائیدہ :-

خود نظامی بود ازمن زایدہ | دادہ ام اورا بمعنی فائدہ

تبولند = مضارع :-

اگر من راستی گویم ملولند | طریق راستی را کے تبولند

رانفض بجائے رافضی :-

اے منافق تو مرا رافض مخواں | زانکہ ہستم من محب خانداں
ہر کہ رافض خواندم ملعوں شود | ہمچو سگ دائم سرش در خوں شود

روافض، بجائے رافضی :-

زنادانی روافض خوانیم تو | ز دین مصطفےٰ میرانیم تو

خارج بجائے خارجی :-

ازیں مردم بسے دیدیم خارج | ازاں کردیم شاں از دوست خارج

تذکیرہ، بجائے تذکرہ :-

کتابے را کہ آں تذکیرہ نامست | مرادر اشربت کوثر بجامست

دیگر

محبانِ علی خواہی بدانی | بذکرِ اولیا تذکیرہ خوانی

بعض اسالیب ایسے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہی کہ مثنوی مولانا

روم مصنف کے زیر مطالعہ رہی ہو۔

(مظہر العجائب) (مثنوی معنوی۔ طبع نول کشور سنہ ۱۹۰۰ء)

استون بجائے ستون :-

چار یار ند لیک در مذہب یکند گرچہ تقلید ست استون جہاں
چار استون شریعت بیشکند ہست رسوا ہر مقلد ز امتحاں (ص۲۶۷)
خانۂ در شرع احمد ساختند پر پئے غیر است سر از بہر من
چار استون اندرو پرداختند خانۂ سمع و بصر استون تن (ص۳۰۷)

اشکست بجائے شکست :-

گفت ایں در را چرا اشکست تو اے در از اشکست خود بر سر مزن
بعد ازیں خواہد شدن اشکست تو کز شکستن روشنی خواہد شدن (ص۳۱۰)

اشگاف بجائے شگاف :-

مرا خود طاقت اشگاف نبود پس کنیزک آمد از اشگاف در
چنیں زجرے بہ او الطاف نبود دید خاتون را بمرد زیر خر (ص۴۴۲)

اس کے علاوہ سلطان محمود کے حکم سے ایاز کے گوہر توڑنے کی حکایت دونوں مثنویوں میں عام ہے۔ مولانا رومؒ کی غزل کا ایک مشہور شعر ہے :-

من ز قرآں برگزیدم مغز را پوست را پیش سگاں انداختم

مظہر العجائب میں یوں آتا ہے :-

روز قرآں مغز گیرد پوست ماں پوست را انداز پیش کرگساں

شیخ عطار کی عادت کے برخلاف مصنف مظہر العجائب اپنے متعلق بہت کچھ کہنے سننے کا عادی ہے، چنانچہ سب سے زیادہ حکایتیں اس نے اپنے ہی متعلق لکھی ہیں۔ یہاں وہ جستہ جستہ حالات دیے جاتے ہیں، جو

کتاب ہذا کے دوران میں مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں۔
اپنے نام کے لیے کہا ہی:۔

ہست نام من محمدؐ بانسرید   گشتہ عطارے معانی برمزید
من زباب علم عطار آمدم   لاجرم گویاے اسرار آمدم

اور حسینی ہونے کا دعوٰی ہی:۔

حسینی ام ازاں با من بکینی   یزیدی، کشتنی، درخوں نشینی

جاے ولادت نیشاپور اور تونی الاصل ہیں۔

خود مرا مولد بہ نیشا پور بود   لیک اصل من ز کوہ طوٗر بود

دیگر

اصل من از تون و نیشاپور جاے   باشدم در مشہد سلطاں سراے

دیگر

اصل من از تون و شاپور وہری   خاک طوس است جوہر من از علی

ایام طفلی میں جب تون میں قیام تھا، برابر آٹھ ماہ تک شدید بیماری میں مبتلا رہے، مرض روز بروز ترقی کرتا گیا، حتیٰ کہ والدین اُن کی زندگی سے مایوس ہوگئے، کفن آگیا اور قبر تیار ہوگئی۔ یہ بوجہ اشتدادِ مرض بیہوش تھے۔ اس عالم میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آئے اور محبت کے لہجے میں ان سے کہا:۔ میاں لڑکے ڈرو مت! ہم تمھیں اچھا کرنے آئے ہیں تم زندہ رہوگے اور تمھارا کلام بہت مقبول ہوگا۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر ان کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور فرمانے لگے:۔ صاحبزادے! تم ہمارا نام بھی جانتے ہو؟ سُنو! میں علی ہوں، تم مجھ کو تون، طوس، کاشان، حلہ، نیشاپور سبزوار، روم، نجف، آمل اور ساری میں تلاش کرنا۔ مریض نے اپنا سر

حضور کے قدموں پر رکھ دیا۔ آنحضرت کے جانے کے بعد پسینہ آیا۔ اور خدائے پاک نے صحت عطا کر دی۔ اس حکایت کا پہلا شعر ہی :۔

من بدم در توں بوقت کودکی گشتہ بیمار و گزشتہ از خودی (ص ۱۲۱)

ایک حکایت میں بیان کرتے ہیں کہ :۔ جب والد نے مجھ کو تعلیم کے لیے بٹھایا تو میرا اُستاد بھی میرا ادب کرتا تھا، وہ ایک فاضل شخص تھا، حکمت لقمان و تصوف میں کامل۔ جفر روحانی طریقے سے امام جعفر سے سیکھی تھی۔ نجم الدین کبریٰ کئی مرتبہ اُس سے ملنے آئے، لیکن وہ فخر الدین (رازی) سے ناخوش تھا۔ تین سو باسٹھ عارف اس کی خدمت گزاری میں مصروف رہتے تھے۔ ایک روز یہ اُستاد جس کا نام زبان پر لانا گستاخی سمجھتا ہوں کہنے لگا کہ : مَیں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ دروازے سے کوئی شخص اندر داخل ہوا۔ جب قریب آیا تو مَیں نے پہچان لیا کہ رسول اللہؐ ہیں مَیں دوڑ کر آپ کے قدموں میں گر گیا، اب مَیں نے جو دیکھا تو آپ کے ہمراہ حضرت علیؑ بھی تھے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا : جانتے ہو میرے ساتھ کون ہیں ؟ مَیں نے عرض کی : اے ختم الانبیا! پہچانتا ہوں، یہ وہی ہیں جو میرے ایمان ہیں اور آپ کے بعد امام کل، تمام آفاق انہی کی ذات کے پَرتو سے روشن ہی۔ تمام نبیوں کے امام اور پیشوا یہی ہیں، آدم یہی ہیں اور عیسیٰ ابن مریم اور منصور بھی یہی ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا : تم تو اولیاؤں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اُس کے بعد ارشاد فرمایا کہ صبح کے وقت تمھارے پاس ایک امیر مع ایک بندے کے آئے گا، اس کو تم میرا جام اسرار پلا دینا، کیونکہ وہ عطار ہوگا اور عالم پر ہمارے اسرار کھولے گا۔

او بود عطّار و عطر افشاں شود بوئے معنیش ہمہ در جاں بود

تم کو چاہیے کہ عرفانیات میں اُس کو درس دو، نہ زہدیات میں۔ ہم نے اُس کو علم سُلطانی، انفاس حکیمی، جفر حیدری، تخت اولیا، تاج انبیا، مُہر نوکشف اور نور من عرف، عطا کیا ہی۔ مصنّف کہتا ہی کہ: جب مَیں نے اُستاد سے یہ خواب سُنا، میرے جسم میں ایک بجلی سی دَوڑ گئی، مَیں ولایت کے لیے بے تاب ہوگیا اور مختصر یہ کہ جب مرشد نے بدرجۂ غایت مجھ کو وارفتہ دیکھا، ارشاد کیا کہ علوم صوری کو دل سے بھُلا دو، مَیں حکم بجا لایا اور پورے ایک چلّے شیخ کی خدمت میں رہا اور اپنے مقصد پر فائز ہوگیا۔ بعد میں اجازت لے کر رخصت ہوُا اور عزلت نشین ہوگیا۔ اس حکایت کی ابتدا ہی:۔

چوں پدر ایں بندہ را تعلیم کرد   اوستادم ہم مرا تعظیم کرد

ایک موقعے پر کہتے ہیں کہ مَیں نے سات سو دس کتابیں پڑھی ہیں تب کہیں جاکر علم الٰہی حاصل ہوُا:۔

ہفصد وده من کتب را خواندہ ام   تا معانی خدا دانستہ ام (۳۶۳ص)

دوسرے موقعے پر یہ تعداد ایک ہزار بتائی ہی:۔

دو پانصد خود کتاب اولیا را   دوبارہ خواندہ ام خود اولیا را

ایّام طفلی میں سترہ سال تک مشہد میں رہے اور مزار امام رضا پر راتوں کو اوراد و وظائف پڑھتے رہے۔ آخر روح امام نے اُن کا مقام نیشاپور تجویز کیا:۔

بوقتِ کودکی من ہفدہ سال   بمشہد بودہ ام خوش وقت و خوشحال
بحال کودکی بر آستانش   بہ شب ہا خواندہ ام ورد زبانش
مرا از روح او آمد مدد ہا   دگر گفتا کہ شاپور است ترا جا

جس زمانے میں "مظہر" لکھی جارہی تھی، اُس وقت ایک سُلطان

ابو القاسم حکمراں تھا۔ امرا نے اُس کو ظلم کے راستے پر چلایا۔ ان کے پیر نے اُمرا کو سمجھایا۔ لیکن انھوں نے بادشاہ کو ظلم سے نہیں روکا۔ شیخ ناراض ہو کر چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد سلطان نے کسی ملک پر چڑھائی کی، اس ملک کے ایک حقیر سردار نے اس کو اور اس کے لشکر کو تباہ کر دیا۔ اسی سلسلے میں ترکوں کے متعلق ایک پیشین گوئی کی ہی کہ میرے بعد ترک دنیا کو ویران کردیں گے اور بہت جلد بعد اُن کی سلطنت بھی تباہ ہو جائے گی :-

بعد من ترکاں کنند عالم خراب	بس دل مسکیں کہ سازندش کباب
برندارد سلطنت شاں درجہاں	عاقبت ویراں شود شاں خانماں

(صفحہ ۳۳۹)

متعدد موقعوں پر ناصر خسرو کا ذکر کیا ہی، بلکہ اُس کی حمایت بھی کی ہی :-

ناصر خسرو کہ اندوہے گرفت	رفت او خود گوشۂ کوہے گرفت
ناصر خسرو ز سِر آگاہ بود	نے چو تو خود مرتد و گمراہ بود
ناصر خسرو بحق پی بردہ بود	از میان خلق بیروں رفتہ بود
یار او یک غار بود و تار بود	او بنور و نار حق درکار بود

اِس حکیم کی ایک حکایت لکھی ہی کہ ایک روز ایک پیر سالک مجھ سے ملنے آیا۔ اثنائے گفتگو میں مَیں نے اس سے کہا کہ کوئی عجیب قصّہ آتا ہو تو سناؤ۔ پیر سالک نے کہا کہ آج مَیں وہ قصّہ سناتا ہوں جو مَیں نے ایسے سالک سے سُنا ہی جو حکیم ہونے کے علاوہ منصور حسینی کی طرح شاہ تھا (یعنے شاہ ناصر خسرو) ؎

از کمال حکمت او آگاہ بود	او چو منصور حسینی شاہ بود

(ص ۷۶)

اُس نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ بغداد میں میرا گزر ہُوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص سر بسجدہ ہی اور چاروں طرف خلائق کا ہجوم ہی، وہ شخص مناجات میں مشغول تھا۔ جب مناجات ختم ہوی، افسر نے جلاد سے کہا: بڑھو اور اپنا کام کرو۔ جلاد اس کو ایک بلند طاق پر لے گیا اور وہاں سے گرادیا، وہ شخص گر کر مرگیا اور اس کی لاش آگ میں جلادی گئی۔ میں نے مقتول پر وجہ سیاست دریافت کی، مجھ سے کہا گیا کہ دجلے کے کنارے کچھ لوگ جمع تھے، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق گفتگو کر رہا تھا۔ کسی نے کہا: سب کی اصل حضرت آدم ہیں۔ دوسرے نے کہا رسول اللہؐ ہیں۔ ایک نے کہا: نبوت کو فضیلت ہی۔ دوسرے نے کہا: نبوت پر ولایت کو شرف حاصل ہی۔ اِس پر سوال اُٹھا کہ ولایت کس کا حق ہی۔ متوفیٰ نے کہا، حضرت شاہِ ولایت کا، جو افضل ہیں، اور جو اس پر یقین نہیں رکھتا، کافر ہی۔ مصنف کی دینی حرارت ذیل کے اشعار سے واضح ہوتی ہی:۔

خود خدا قفلے ترا بر جان زدہ راہ دینت بیشکے شیطاں زدہ
زاں نمی دانی امام خویش را بیشکے افتادی از مادر خطا
بستر مادر ترا خود پاک نیست گر ترا مردود گویم باک نیست

(صفحہ ۸۰)

جب لوگوں نے اُس سے ایسی باتیں سُنیں، زدو کوب کی، ہاتھ باندھ دیے اور شیخ (قاضی) کے پاس لے گئے۔ شیخ تمام گفتگو سُن کر سخت طیش میں آیا، بولا کہ یہ شخص رافضی ہی، کیونکہ باجماع اہل سنت، ولایت پیغمبر کا حق ہی۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ تھے ولی نہیں تھے:۔

ایں ولایت حق پیغمبر بود پیش اہل سنت ایں باور بود

او خلیفہ بود، کے بود او ولی　　　　دیں ولایت رانبی دارد بنی

لیکن دیکھو مَیں بھی اُس کو کیسی سزا دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر اور خچّر پر بیٹھ کر بارگاہ خلافت کی طرف روانہ ہوا۔ حاجب نے شیخ کی آمد کی اطلاع خلیفہ کو دی۔ خلیفہ نام سنتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھا اور استقبال کرکے لایا۔ شیخ نے تمام ماجرا بیان کیا۔ خلیفہ نے کہا یہ تو ایک خفیف معاملہ ہو۔ مَیں نے ایسے ہزاروں انسان قتل کیے ہیں، فرزندانِ علی تک کو نہیں چھوڑا۔ اُسی وقت ایک ترک امیر کو، جس کا نام "اصیل مردگیر سمرقندی تھا" حکم دیا کہ جاؤ پہلے اس مجرم کو قتل کرو اور پھر اس کی لاش کو جلا دو۔ شیخ نے اس موقعے پر یہ اضافہ کیا کہ تمھیں اِس کارِ نیک میں بڑا ثواب ملے گا۔

جب ناصر خسرو نے یہ ماجرا سُنا، اس کو بے حد رنج ہوا، تب اُس نے بددعا کی:۔

چوں بدید آں ناصر خسرو چناں　　　　گفت بینائی و دانا بے گماں
گفت یارب تو بحقِ جدِّ من　　　　دور گرداں شاں زصدقِ جدِّ من

ناصر خسرو کا بیان ہو کہ مَیں ایک شب اپنے گوشے میں ملول و غمگین بیٹھا تھا کہ اتنے میں غیب سے میرے کانوں میں آواز آئی کہ خدا کا عذاب اس شہر پر نازل ہونے والا ہو، تو یہاں سے نکل جا:۔

یک شبے بودم بکنجے دردمند　　　　بادلِ مجروح و جانِ مستمند
یک ندا آمد بگوشم کاے حکیم　　　　خیز رو زیں شہر من بیروں سلیم
کز خدا آمد بلاے بے حساب　　　　اوّلش رنج آید و آخر عذاب

مَیں علی الصبح اس شہر سے نکل کھڑا ہوا۔ آخر شہر میں ایسی وبا پھوٹی کہ نہ شاہ بچا، نہ اُس کا لشکر اور نہ وہ شیخ۔

شاعر کئی موقعوں پر اپنی تصنیفات کا ذکر کرتا ہی اور دعویٰ کرتا ہی کہ میں نے سو کتابیں لکھی ہیں :-

زبحر علم دارم صد کتب من — درو بنہادہ ام اسرار لب من

(صفحہ ۳۶۰)

کہتا ہی، پہلے تین کتابیں لکھیں، پھر ایک، پھر تین :-

باوّل سہ کتب تقریر کردم — بآخر یک کتب تحریر کردم
جواہر نامہ با مختار نامہ — ز شرح القلب من رہ بردخامہ
ترا معراج نامہ پیش حق خواند — جواہر نامہ ات خود ایں سبق خواند
ترا مختار نامہ چوں بہشت است — بشرح القلب دنیا چوں کنشت است
زبعد ایں کتب خواں سہ کتب را — کہ تا گردد وجودت خود مصفا
بوصلت نامہ داں وصل معانی — زبلبل نامۂ ما وا نمانی
زہیلاجم جہاں در لرزش آمد — فلک از قدرتش در گردش آمد

(صفحہ ۳۵۷)

ایک مقام پر سولہ کتابوں کے نام گنائے ہیں، یعنے :- (۱) مظہر (۲) وصلت نامہ (۳) ہیلاج نامہ (۴) اسرار نامہ (۵) منطق الطیر۔ (۶) خسرو وگل (۷) الہٰی نامہ (۸) پند نامہ (۹) مصیبت نامہ (۱۰) بلبل نامہ (۱۲) تذکرۃ الاولیا (۱۳) معراج نامہ (۱۴) مختار نامہ (۱۵) جواہر نامہ (۱۶) شرح القلب۔

بداں خود را کہ در مظہر تو بینی — ز وصلت نامہ نام اظہر تو بینی
بداں خود را کہ ہیلاجم چنیں گفت — کہ از اسرار نامہ در تواں سفت
بداں خود را کہ مرغِ لامکانی — کتاب طیر ما را آشیانی

بداں خود راو خسرو داں تو گل را | الٰہی نامہ گفتست ایں معما
بداں خود را کہ پند من شفیقست | مصیبت نامہ ات ایں دم رفیقست
بداں خود را کہ بلبل نامہ داری | باشتر نامہ کے میحنا نہ داری
بداں خود را اگر تذکیرہ داری | جمیع اولیا را دیدہ داری
بداں خود را کہ ایں معراج نامہ | بہفتم آسماں دارو نشانہ
بداں خود را کہ ایں مختار نامہ است | دو عالم را از وہم دام و دامست
بداں خود را جواہر نامہ کن گوش | بشرح القلب من فی الحال مونوش

(صفحہ ۴۵۶)

کتابوں کی تعداد سولہ ہوتی ہو، لیکن سترہ بتائی ہو۔

بداں خود را کہ ایں ہفدہ کتب را | نہادم بر طریق علم اسما

(صفحہ ۴۵۶)

اور تمام اشعار کی تعداد دو لاکھ دو ہزار اور ساٹھ بیان کی ہو:۔

شمار بیت اینہا را بگویم | من از کشت معانی تخم رویم
دو بیست و دو ہزار شصت بیت است | زیادہ یا کمی میداں کہ قیداست

(صفحہ ۴۵۶)

یہ تعداد مبالغے سے خالی نہیں، کیونکہ شرح القلب اور تذکرۃ الاولیا نثر کی کتابیں ہیں۔ اور معراج نامہ ایک ایسی کتاب ہو، جس سے نہ تذکرہ نگار واقف ہیں اور نہ فہرست نگار۔ کوئی تعجب نہیں اگر بے سر نامہ مراد ہو۔ رہیں باقی تیرہ کتابیں، ان کے ابیات کی تعداد کسی حالت میں اٹھاسی ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

مظہر کے دیباچے میں ان کتابوں کے نام لیے ہیں:۔

جوہر ذاتم عجائب بودہ است ہمچو اشتر نامہ مستی کردہ است
گر تو از مرغ حقائق پے بری منطق الطیرم بخواں تا بشنوی
رو تو اسرار ولایت گوش کن واں گہے جام نبوت نوش کن
رو مصیبت نامہ را از سر بخواں تا شود حاصل ترا مقصود جاں
گر تو از خسرو یکے گل داشتی بلبل مسکین خود بگزاشتی
گر الٰہی نامہ را گیری بگوش جام وحدت را بگیری نوش نوش
گر تو پندم را بیابی در جہاں رو عزیزش دار ہمچوں جان جاں
رو بذکر اولیا مشغول شو واں گہے چوں تذکرہ مقبول شو

(صفحہ ۱۳-۱۴)

کہا ہے کہ میں نے بہت کتابیں لکھی ہیں لیکن مظہر العجائب کو سب پر فوقیت ہے:

کتب (من) بسیار دارم در جہاں لیک مظہر را عجائب نیک داں (ص ۱۴۲)
کتب بسیار دارم گر بخوانی از و دنیا و عقبیٰ را بدانی
بداں کیں مظہرم جان کتبہا است درو اسرار دین حق ہویدا است (ص ۳۵۷)

ان کو عباسیوں نے بہت بلایا اور زمرۂ علما میں رکھنا چاہا، لیکن یہ گئے نہیں۔ وجہ ظاہر ہے، یہ حق گو تھے اور وہ حق بات نہیں سنتے تھے:۔

مرا عباسیاں بسیار خواندند مرا بر عالمانِ خود جہانند

(کذا۔ نشانند؟)

اگر من راستی گویم ملولند طریق راستی را کے قبولند

(صفحہ ۵۸۳)

ایک حکایت میں جو صفحہ ۶۷۴ سے شروع ہو کر صفحہ ۹۷۵ پر ختم ہوتی

ہی، کہا ہی کہ ایک پیر سالک نے آکر مجھ سے تیس سوال کیے اور اُن کے جواب طلب کیے۔ میں یہ سوالات سُن کر حیران رہ گیا دل میں کہنے لگا کہ الٰہی! ان سوالوں کا جواب کیونکر دے سکوں گا۔ مجھ میں یہ توفیق نہیں اور یہ ظالم تمام اسرارِ غیب مجھ سے دریافت کر رہا ہی۔ ان سوالوں کا جواب ہاتفِ غیبی ہی دے سکتا ہی۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ ہاتف تشریف لایا اور اس نے مجھ کو ان کے جوابات تعلیم کر دیے۔ جب پیر سالک نے مجھ سے جوابات سُنے، بولا کہ اگر یہ حال ہی تو مجھ کو دُنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے، میرا اصل مقام عقبیٰ ہی۔ یہ کہ کر اُٹھا اور جان دے دی ؎

مرا عقبیٰ بایں معنی مقام است	مرا از خود ہمیں معنی تمام است
بمعشوق حقیقی او رواں داد	قدم در راہ بنہاد او وجاں داد

یہ قصہ عطار کے توبہ کرنے اور اُن کے کوچۂ تصوف میں آنے کے قصّے سے بہت کچھ ملتا جلتا ہی اور ممکن ہی کہ تذکرہ نگاروں نے اُلٹا سیدھا تراش کر اسی کو اور غرض سے استعمال کر لیا ہو، یا یہ قصّہ اُس قصے کی بنیاد پر تراشا گیا ہو۔

متعدد موقعوں پر دشمنوں کے جور و تشدد، اُن کے مذہبی عناد وغیرہ کا ذکر آتا ہی۔ حب مرتضیٰ کی بنا پر ظالموں نے ایک مرتبہ کامل سال بھر قید رکھا اور مکان لوٹ لیا۔ آخر حضرت مرتضیٰؓ نے رحم کیا، قید سے رہائی مل گئی اور جایداد بحال ہو گئی:۔

کہ داری در دل خود حب کرار	تو بر عطار کر دی ظلم بسیار
بکردند آں لعیناں در کمر بند (کذا)	ز بہر ایں مرا یکسال در بند
بغارت برد او یا خورد سالم	ز بہر ایں تمام ملک و مالم

یقینم داں تمام بند گانم — کشید ند و نماند یکتائے نانم
بآخر مرتضیٰ دریافت مارا — بکرد او دفع از ما ایں بلا را
بحق بود و بحق درخواست کرد او — ہمہ طفل و معاشم راست کرد او
مرا بکشاد او از بند ایں قوم — زتار یکے مرا او داد ایں بوم
مرا او داد جان نو دریں دہر — بزد بر جان دشمن نوش خوں زہر

(صفحہ ۴۰۶)

یہی شکایت دوسرے موقعے پر یوں دُہرائی ہے:-

اے منافق! آں چہ با من کردۂ — کلبۂ ماشل گلخن کردۂ
خان و مانم را بتاراج سگاں — دادۂ تا خاطرت گیرد اماں
قصد کشتن نیز کردی لیک شاہ — داد اندر کوے خود مارا پناہ
روسیہ گشتی بدستت، ہیچ ماند — زاں ترا شیطاں ملعون خویش خواند
کردۂ عطار را تو قصد خوں — کردۂ خود را تو از جنّت بروں
بہر حُبِ مرتضیٰ مارا کشی — در دو عالم خویش را رسوا کشی

(صفحہ ۴۴۶)

دشمنوں نے ایک بار ان کے قتل کے لیے وسیع پیمانے پر تیاریاں کیں اور ان کو مع فرزند کے گرفتار کیا۔ ایک لاکھ کی تعداد میں جمع ہوگئے جن میں فاضل شیوخ و قاضی و اکابر سے لے کر بازار کے دکان دار تک شامل تھے۔ ہر ایک اُن کے خون کا پیا سا تھا۔ بالآخر دریا میں پھینک دیا اِس بے بسی کے عالم میں انھوں نے خدا کی طرف رجوع کی۔ الہام ہُوا کہ: اے عطار مطلق خوف نہ کر تو دشمنوں کے پنجے سے رہا ہو جائے گا۔ قدرت الٰہی ملاحظہ ہو کہ اُس ہجوم میں سے

شہباز کی طرح اُڑتے ہوئے نکل گئے۔[1]

تو اے ناپاک کردی جور بسیار — نہ می اندیشی تو از جورِ عطار
چہ حاصل کردی از جورِ چنیں تو — چہ کردی بہر خون مائیں تو
جزائے تو خدا در حشر بدہاد — کہ خواہم کرد از تو پیش حق داد
ازیں ظلمے کہ بر عطار کردی — علیؓ را تو زخود بیزار کردی
زبہر مرتضیٰؓ کردی بما جور — جہود اں فخر دارند بر تو اے کور
کہ حیدر را چرا تو دوست داری — زبہر ایں بریزم خوں بزاری
خلاصم کرد حیدر از بلایت — کشم از دوش صورت ایں وایت
قریب صد ہزار آدم دریں باب — فگندندت ترا عطار در آب

---

[1] میرزا محمد بن عبد الوہاب قزوینی نے لسان الغیب سے جو اسی شاعر کی تصنیف ہی، بعض ایسے ابیات نقل کیے ہیں جو اس واقعے پر مزید روشنی ڈالتے ہیں:-

بر سر مسند براق ترکماں — در چنیں ظلمے کشادہ او زباں
بر سر من کردہ ترکاں اتفاق — تا بریزد خوں کہ دارد او نفاق
اے فقیہہ ایں جا بمن پیچیدۂ — فتوے در خون من بنوشتۂ
قصد جان و مال و عرضم کردۂ — پارۂ جانم زمن ببریدۂ
در بدر از دستِ تو افتادہ ام — در توکل دل بجاناں دادہ ام
گرد عالم گشتہ ام از دست تو — گفتہ ام بیدادیت را کو بکو
جمع گشتند خلق بہرِ قتل ما — جرم عطار است حب مرتضیٰؓ
عاقبت مارا زدست ایں سگاں — حق خلاصی داد انہ۔ وہم دگماں
بغض حیدر سود نبود اے فقیہہ! — آں زبان جانت باشد اے سفیہ

(مقدمہ تذکرہ عطار ص یا)

چو یونس حق ترا از بطن ماہی　　رہا دہ کرد آزاد از تباہی
تمام ملک از شیخانِ فاضل　　ز قاضی و اکابر ہم ز کامل
تمام خلق، عام و خاص بازار　　ہمہ گشتند بر قتلم روا دار
ہمہ در قتل و خونم میل کردند　　مرا با یور اندر خیل کردند
دریں حالت نیایش در فتادم　　در توبہ بروئیم برکشادم
ز حق جستم خلاصی نیز خلقاں　　یہ بیں از حق تعالیٰ نص و برہاں
بالہام ندا در داد یزداں　　کہ اے عطار تو خود را مترساں!
خلاصی ایں زماں از دستِ ایشاں　　ازیں معنی مکن خاطر پریشاں
بالہام آلٰہی ہمچو شہباز　　پریدم از میاں شاں چشم کن باز

(صفحہ ۴۰۱-۴۰۲)

مظہر العجائب[۵] کے جلائے جانے کا اشارہ کئی موقعوں پر موجود ہے تعجب

---

۵ مظہر کے جلائے جانے کا ذکر لسان الغیب میں بھی ملتا ہے۔ میں میرزا محمدؒ کے مقدمے سے اشعار ذیل نقل کرتا ہوں :-

زاں بسوزی مظہرم کاں اسم اوست　　غافل از سرِ خدا و دید دوست
اے سمرقندی حذر از سوزشش　　چوں کنی ز آتش دریں جا پوششش
لعنت حق باد بر سوزندہ اش　　چونکہ یزداں از در خود راندہ اش
تو یزید عصر مائی اے پلید　　می کنی نفس حسین ایں جا شہید
اے سمرقندی مکن ایں کار تو　　می فرستی خویش را در نار تو
مظہرم گوئی بباید سوختن　　چشم مظہر خواں بباید دوختن
در جہاں خوانند مظہر را کساں　　بر تو خواہند کرد لعنت بیکراں

(مقدمۂ تذکرۂ عطار، ص یب)

ہی کہ ابھی مظہر ختم بھی نہیں ہوئی ہی کہ دشمن اُس کے جلانے کے منصوبے کر رہے ہیں، حالانکہ شاعر اُس کے چھپانے میں بہت کچھ اہتمام کرتا ہوگا:۔

بسوزی مظہر عطار را تو　　دگر نوری بگیری نار را تو

کلام و ہم حدیث و اسم حق را　　بسوزی و نداری ہیچ پروا

تو سوزی اسم ایشاں جسم سوزند　　قبائے ظلم و جور و مکر دوزند (ص ۳۱)

بنادانی بسوزی مظہرم را　　درو بینی چہ نام حیدرم را (ص ۴)

علیٰ ہذا مختلف مقامات پر اپنے ناظرین کو ہدایت کرتا ہی کہ مظہر کو نا اہلوں اور خارجیوں سے محفوظ رکھنا:۔

من نمایم جملہ اسرارت تمام　　لیک ایں مظہر نہاں باشد ز عام

کن ز نا اہلاں کتابم را نہاں　　زانکہ دیدم من درو حق راعیاں

جوہر و مظہر بکنجے باز نہ　　خود ورا سرپوش از اسرار نہ

تا نیفتد او بدست خارجی　　منکر مظہر بباشد خارجی

بعد من گر خوانی ایں مظہر تمام　　زینہارش تو نگہ دار از عوام

اور مظہر کے خوش نصیب کاتب سے وعدہ کیا ہی کہ میں تجھے ساتھ لیے بغیر کبھی جنت میں قدم نہ رکھوں گا:۔

با خدا بستم بمعنے عہدِ نو　　بے تو باشد خود بہشتم نانکو

بے تو اے کاتب نہ باشم در بہشت　　زانکہ ایں مظہر شدستم سر نوشت (ص ۶۱۹)

اور ساتھ ہی اس کتاب میں اعتقاد نہ رکھنے والوں پر دوزخی ہونے کا فتویٰ لگا دیا ہی:۔

ہر کہ شک آرد بمظہر دوزخیست　　زانکہ ایں مظہر نشان جنتیست (ص ۶۲)

مصنف مذہباً اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کا ایک رکن بیان

کرتا ہے اور ساتھ ہی گویا ہے کہ میں حضرت علی کو وصی مانتا ہوں اور شیعہ نہیں ہوں:-

من بدین اہل سنت رفتہ ام — بر طریق اہل سنت بودہ ام
کہ عطار است سنّی نیست شیعہ — نبودہ او بدین با مطیعہ (کذا)
منم سنی و اسرارم عیانست — جہاں اندر جہاں اندر جہانست
ولیکن پیر و میر ما علیؑ است — ازآں کو وارث علم نبیؐ است
دگر او را وصی دانم بحکمش — نبودہ در جہاں خود عدل و ظلمش

(صفحہ ۴۳)

دیباچے میں اگرچہ شیخین کے لیے اُس نے ایک شعر لکھا ہے:-

از ظہور مصطفٰےؐ آگاہ شو — با ابوبکرؓ و عمرؓ ہمراہ شو

لیکن جو مذہبی ماحول اس کتاب میں پیدا کیا گیا ہے، سنی معتقدات کے عین منافی ہے، بلکہ یہ سنّی ہیں جو اس کی سب دشنام کے آماج ہیں۔ شاعر نے اپنی لعنت اور دشنام کے تمام تیر پوری طاقت کے ساتھ اُن پر برسائے ہیں، وہ سنیوں کو اپنی تمام بدقسمتی کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ اُنھوں نے اُسے قید کیا، گھر لوٹ لیا اور قتل کرنا چاہا۔ وہ تقلید اور چاروں مصلّوں سے سخت بیزار ہے، چاروں اماموں کی تضحیک کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک چاروں مصلّوں کو ماننے والے مردود ہیں، ع:-

چار دیدن کار مردوداں بود

اہل سنت کو اُن کے دشمن ناصبی کہتے ہیں (جو در اصل خوارج کا نام تھا) مصنف بھی ان کو اسی نام سے پکارتا ہے، لیکن جائے حیرت یہ امر ہے کہ وہ ان کو خارجی بھی کہتا ہے اور رافضی بھی، مزید براں منافق مقلد، پیروان معاویہ، عباسی، تقلیدی اور راویوں کے پیرو بھی کہتا ہے۔

جو لوگ دین علیؓ کے پیرو نہیں ہیں اور چار مذہب کے ماننے والے ہیں، شاعر کے نزدیک وہی رافضی ہیں ؎

هر که در دین علیؑ نبود درست　　رافضی خوانم من او را از نخست

دیگر

ندانستی که رافض کیست اے سگ　　بگویم تا شود خود خشک ایں رگ
روافض آں که دین شہ ندارد　　بکوے مرتضیٰ ایں رہ ندارد
روافض آں که دین غیر دارد　　بکوے غیر حیدر سیر دارد
روافض آں که از توحید دور است　　به علم چار مذہب خود صبور است
ناصبی با دینکے بے دیں شدہ　　او ز سر تا پائے خود ننگیں شدہ
ایں جماعت دشمنان حیدر ند　　پیش ما لائق به تیغ و خنجر ند
(صفحہ ۳۲۰)

چار مذہب

خانہ دینؐ نبیؐ کردند خراب　　خون مومن ریختن دیدند صواب
چار مذہب بہر ایشاں ساختند　　دین ایشاں را بروں انداختند

ؐ اس نقلی عطار کے مقابلے میں اصلی عطار کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں :-

جہاں را ہم امام و ہم خلیفہ　　گرامی دانی الا بو حنیفہؒ
جہان علم و دریاے معانی　　امام اول و لقمان ثانی
چراغ است آمد آں سرافراز　　چراغے کو عدو را می نہد کاز
قضا کردند بروے عرضہ ناگاہ　　بہ نپذیرفت آنجان و دل آگاہ
نبیؐ بنہاد گنجے جملہ رحمت　　بحصہ بو حنیفہؒ کرد قسمت
گرت از ہر کوئی حاصلے نیست　　چہ کوفت جز خرابہ منزلے نیست

(بقیہ صفحہ ۴۵۳ پر)

بوحنیفہ گفت کیں دین مہمل است | پیش من دین نبیؐ خود مجمل است
من دہم احیاے دین مصطفےٰ | زانکہ علم من ندارد خود فنا
شافعی گفتا کہ قول من حق است | پیش من گفت نبیؐ خود مطلق است
ہرچہ گویم از روایت راست است | ایں معانی از دل من خاست است
احمد حنبل بگفتا قول من | بہتر است از قول دیگر در سخن
گفت من چوں گفت پاکاں روشن است | آں زماں نبود کہ بیروں از تن است
گفت مالکؒ آں امام راست گوے | بودہ ام در علم شرعش راست روے
من بہ شرع مصطفےٰ در تاختم | ہم چو عیسیٰ در رہش خر یافتم

(صفحہ ۳۲۸)

مظہر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اعزاز میں لکھی گئی ہی- بلکہ حقیقت یہ ہی کہ تمام کتاب اُن کے عشق و وجدان

صفحہ ۴۵۲ کا بقیہ حاشیہ :-

چرا چوں چرخ مقلوبی تو داری | دگر مطلب چو مطلوبے تو داری
چو داری شافعیؒ و بوحنیفہؒ | توئی ہم مالکؒ دیں ہم خلیفہ
دگر ایں داری اما آں نداری | دلے داری ولیکن جاں نداری
چو ایشانند ہر دو چشم دیں را | بنہ سر ایں دو چشم راہ بیں را

(خسرو نامہ قلمی)

مطبوعہ خسرو نامہ سے یہ اور منقبت اصحاب ثلثہ کے اشعار اہل مطبع نے خارج کر دیے ہیں، مَیں نے پروفیسر آذر کے کلیات سے ان کو نقل کیا ہی- یہ بھی یاد رہے کہ شیخ عطار اپنی مثنویات میں ائمہ اربعہ کا نہایت احترام سے ذکر کرتے ہیں اور ان کی حکایات بھی نقل کرتے ہیں-

سے معمور ہی۔ شاعر نے ان کی تجید اور تحمید میں ایسی مبالغہ آمیز زبان استعمال کی ہی جس سے خود رسول اللہؐ کے امتیاز یکتائی کو صدمہ پہنچنے کا خطرۂ عظیم ہی۔ حضرت علیؑ کا مرتبہ تمام مقدس ہستیوں، فرشتوں اور انبیاؤں سے بالا مانا ہی۔ الوہیت کے اگرچہ تمام خطابات ان کو نہیں دیے گئے، تاہم "بعد از خدا بزرگ توئی" میں تو کوئی گنجائشِ احتمال نہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ہمی اسرار عرفاں مرتضا ایست	ہمی درجان منصور او خدا ایست
خدا او را ولی اللہ خواندہ	برفعت مصطفےٰ اش شاہ خواندہ
بہر قرنے بروں آید بلوئے[1]	از و آباد میداں ایں دوکونے

(صفحہ ۳۵۲)

گفت پیغمبر کہ شاہی زان تست	مظہر سرّ الٰہی جان تست
در ہمہ روے زمیں او مقتدا است	ایں ہمہ درشان شاہ اولیاست
شاہ عشق و شاہ موسیٰ، شاہ طور	شاہ سرور، شاہ اکبر، شاہ نور
شاہ یوسف، شاہ یعقوب است و خضر	شاہ الیاس است در دریاے خزر
شاہ اسمٰعیل و ابراہیم داں	یا چو اسحٰق و چہار دنش بخواں
شاہ بودہ با جمیع انبیا	ہم ہمو بودہ ہمینی رہنما
شاہ بودہ با محمدؐ درعیاں	ہم ہمو دیدہ ہمہ سرّ نہاں
شاہ با عیسیٰ است و با روح اللہ است	رفتہ او بر عرش علیین و راست

---

[1] اس شعر سے واضح ہوتا ہی کہ مصنف حلول کا معتقد ہی اور خود اس کو اعتراف ہی کہ اس پر اس قسم کے الزام لگائے گئے ہیں :۔

"تا نگویندت وجودی یا حلول	تا نگویندت چو رافض بو الفضول
بعض گویند اتحادی بودہ است	یا بکیش ملحداں ہم رفتہ است"

شاہ جبرائیل و میکائیل ہم　　　شاہ اسرافیل و عزرائیل ہم

زانکہ حیدر در درون یار گفت　　　ہم ابا منصور و ہم با دار گفت

ہم ازو یعقوب و ہم موسیٰ شنید　　　ہم ازو عطار و ہم کبریٰ شنید

ہم ازو جبریل و ہم آدم شنید　　　ہم ازو عیسیٰ بن مریم شنید

ہم ازو سید بمعراجش شنید　　　ہم ازو ایں جملۂ عالم شنید

شاعر کے نزدیک ولاے علیؑ کے بغیر نجات ناممکن ہی:۔

گر ترا عمرے دو صد باشد بسال　　　وندریں عمرت بخوانی علم قال

روزہ گر داری تو خود عمر دراز　　　ور بشب دائم گزاری تو نماز

بے ولاے او نیابی ہیچ نور　　　روسیہ باشد ترا خود در حضور

اگرچہ بارہ اماموں کا قائل ہی اور ان کی مدح بھی دیباچے میں موجود ہی۔ تاہم امام جعفر صادق کا زیادہ گرویدہ معلوم ہوتا ہی اور متعدد مقامات پر اپنے آپ کو جعفری[1] کہتا ہی:۔

---

[1] شیعوں میں ایک فرقہ جعفری بھی ہی، جو امام حسن عسکری کے بعد اُن کے بھائی جعفر کی امامت کا قائل ہی۔ لیکن اثنا عشری اس امام کو کذاب کہتے ہیں (از مرآت المذاہب) بعض نے لکھا ہی کہ حسن عسکری لاولد فوت ہوئے اور نہ ان کا کوئی فرزند محمدؐ نامی پیدا ہوا، اس لیے جعفری امام مہدی کی ولادت کے منکر ہیں (مذاہب الاسلام صفحہ ۴۴۴) ہمارا مصنف بہرحال امام حسن عسکری کے بعد (جن کو غلطی سے ابوالحسن عسکری، شعر:۔

بو الحسن داں عسکری را در جہاں　　　بوالحسن داں ہمراہ در جان جاں

لکھتا ہی) غیبتِ امام مہدی کا قائل ہی، چنانچہ:۔

یا الٰہی مہدیے از غیب آر　　　تا جہانے عدل گردد آشکار

اس لیے اس کا شمار اثنا عشریوں میں ہونا چاہیے، جو اپنے مذہب کو حضرت امام جعفر کی طرف منسوب کرکے اپنے آپ کو جعفری بھی کہتے ہیں۔

من طریق جعفری دارم چو باب	خوردہ ام از ساقی کوثر شراب
مرد آنست کو بدین جعفر است	یا چو سلماں او بدین حیدر است
اے ترا نشناختہ جز جعفری	ایں معانی را ز فہم ما بری
راہ حق چوں راہ جعفر راست است	خارجی از من چرا حجت خواستست
ایں کتب دارد لباس جعفری	معرفت گفتہ باہل معنوی
ترا مظہر زجعفر داد پیغام	ترا مظہر ز لطف اوست انعام

مظہر کو عطار کی طرف منسوب کرنے میں کئی امور دامنگیرِ تامل ہیں جن کو مختصراً ذیل میں لکھا جاتا ہی:۔

(۱) اُس کی زبان جس کا میرزا محمد قزوینی بھی[۵۱] دبی زبان سے اقرار کرتے ہیں، عطار کے حقیقی کلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ ان کا خیال ہی کہ طبیعت میں یہ اضمحلال بڑھاپے کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہی، لیکن میری سمجھ سے باہر ہی کہ ایک مشاق شاعر جو مدتُ العمر پُرگوئی کے لیے معروف ہو انحطاط و پیری کے دَور میں اس قدر سٹھیا جائے کہ معمولی جملوں میں صرف و نحو کی غلطیوں کا ارتکاب کرے۔ اِس کی سیراب طبیعت کی تمام روانی اور

---

[۵۱] میرزاے موصوف کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"یکے از تالیف آخری عطار مظہر العجائب است و در مقدمۂ ایں کتاب غالب کتب مصنفہ اش را کہ از جملہ تذکرۃ الاولیا ست نام می برد و اشعار ایں کتاب بالنسبۃ بسائر اشعار عطار تفاوت واضح دارد در پستی و سستی و قدرے رکاکت۔ و ہر کس منطق الطیر و الٰہی نامہ و خسرو و گل و دیوان عطار را مطالعہ کردہ باشد، براے او قدرے مشکل ست اعتقاد کند کہ صاحب مظہر العجائب با آنہا یکے بودہ است و ظاہراً علت ایں انحطاط و خمود طبع است در سن کہولت" (مقدمۂ تذکرۂ عطار، ص ط۔ی مرتبہ پروفیسر نکلسن)۔

طوفان خیزی بالکل مفقود ہو جائے اور معمولی ترکیب اور بندش کی لغزشں جملوں کی بے ربطی اور الفاظ کے بے محل استعمال کا مرتکب ہو، وزن و قوافی کے معمولی قواعد کو بالائے طاق رکھ دے نظم میں اس قدر اختلال اور لغزش البتہ اختلال دماغ کی طرف منسوب کی جا سکتی ہے، نہ اضمحلال طبیعت کی طرف عطار کی یہ تصنیف بہت کچھ مولانا مولانا آزاد کے دورِ جنوں کی یادگار "جانورستان" اور "سپاک و نمانک" سے مماثل ہے لیکن میں اس نظریے کا بھی معتقد نہیں کیونکہ شاعر اپنی تصنیف کی خامیوں سے باخبر ہے اور رفع اعتراض کی بے سود کوشش کرتا ہے۔ اس کی صرف و نحو کے متعلق ایک بے باکانہ انداز میں کہتا ہے:۔

جوہر و مظہر باہل دل دہم صرف و نحوش را باہل گل دہم

دوسرے موقعے پر کہا ہے:۔

جوہر من نیست شرح نحو و صرف زانکہ او در نقطۂ گشتست حرف

گویا وہ اپنی ذات کو اِن فنون کے ضوابط کی پابندی سے بالا سمجھتا ہے۔ یہی نہیں ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ:۔ میں نے یہ کتاب عام زبان میں اس لیے لکھی ہے کہ عوام النّاس اس سے مستفید ہوں۔ میں اس کو نفیس عبارت میں لکھ سکتا تھا لیکن عامۃ الناس اس کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہے

من ایں مظہر بلفظ عام گفتم گہے پختہ و گاہے خام گفتم
کہ فہم خلق در وے خوش برآید زجہل و کبر خود بیروں بہ آید
وگرنہ خود بالفاظ شریفش ہمی گفتم کہ می آمد شریفش
ولے درویش ازو محروم می ماند بہ پیش خادم مخدوم می ماند

اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ شخص کوئی بہروپیا ہے جس نے خاص مقاصد کو مدِّ نظر رکھ کر شیخ عطار کا سوانگ بھر لیا ہے۔ چونکہ اس کے پاس

نہ عطار کا دماغ ہی نہ ان کی طبیعت اور نہ علمیت، اس لیے یہ تمام اضمحلال ہی اور اسی لیے خیالات میں اس قدر ابتذال اور عبارت میں خامیاں ہیں، جس کے پڑھنے سے طبیعت متنفر ہو جاتی ہی۔ ایک شخص عطار کا تخلص اختیار کرنے اور اس تخلص کی رٹ لگانے سے (جیسا کہ مصنف اس تصنیف کے دوران میں دیکھا جاتا ہی۔) عطار نہیں بن سکتا۔

(۲) تاریخی لحاظ سے نظر ڈالتے ہوئے متعدد خامیاں اور پائی جاتی ہیں۔ مشاہیر کے زمانوں اور اُن کے سنین وسال سے بے خبر معلوم ہوتا ہی۔ شیخ نوری کو عطار کا ہم عصر خیال کر کے ایک حکایت تراشتا ہی، جس میں شیخ نوری اُس کے گھر آتے ہیں اور حرب صفین و نہروان کی تاریخ سناتے ہیں:۔

خواجۂ نوری بما ہم خانہ شد — از وجود ناقصاں بیگانہ شد
علم معنی از وجودش ہمچو نور — شعلہ می زد بر طریق کوہ طور
یک شبے در پیش من آں بحر راز — از حکایات شہاں می گفت باز
از معانی و مشائخ وز علوم — از احادیث نبی و از نجوم
گفت وگوئے بود مارا خود بہم — از مقالات صحابہ بیش و کم
گفتمش از حرب صفیں گو سخن — وز مصاف نہرواں ہم یاد کن

حالانکہ شیخ نوری جنید کے ہم عصر ہیں اور سنہ ۲۹۴ ہجری یا سنہ ۲۹۵ ہجری میں وفات پاتے ہیں اور پھر لطف یہ ہی کہ شاعر ان کو ایک حکایت میں شیخ شبلی کے وعظ میں بھی حاضر مانتا ہی۔

حسین منصور کا اُس نے نیا نام رکھا ہی یعنے منصور حسینی :۔

جام اسرار معانی نوش کُن — ہمچو منصور حسینی جوش کُن
از کمال حکمت او آگاہ بود — ہمچو منصور حسینی شاہ بود

عطار حسین بن منصور کے حالات ایک معقول پیرایے میں اپنے تذکرے میں لکھ چکے ہیں، جس میں انھوں نے حسین کے متعلق صوفیوں کی تمام روایات کو جمع کر دیا ہی، لیکن عطار کا یہ مثنیٰ جو تذکرۃ الاولیا کی تصنیف کا مدعی بھی ہی، تذکرے کے بیانات کے بالکل برعکس ایک طویل حکایت منصور سے متعلق لکھتا ہی جس میں شقیق بلخی جاکر خلیفہ ہارون الرشید کو سمجھاتے ہیں کہ تم نے چونکہ منصور کو قتل کرا دیا ہی اور وہ حضرت موسیٰ کاظم کا آدمی تھا اس لیے تمھیں چاہیے کہ اب جا کر حضرت امام سے اس قتل کی معافی مانگو۔ ہارون الرشید پر شیخ کی نصیحت کا اس قدر اثر ہوتا ہی کہ سیدھا حضرت موسیٰ کاظم کی خدمت میں پہنچتا ہی، معذرت خواہ ہوتا ہی اور کہتا ہی کہ اب تک آپ کی طرف سے غافل رہنے کی معافی مانگتا ہوں، آیندہ آپ جو حکم دیں گے بسر و چشم بجا لاؤں گا۔ آپ حقیقت میں ہمارے پیشوا ہیں کیونکہ آپ ہی نقد خیر المرسلین ہیں اور میرا ملک درحقیقت آپ کی ملک ہی۔ جس طرح منصور کے الفاظ آپ کے الفاظ تھے:۔

من ترا دانم کہ ملکم حق تست — گفتۂ منصور ہم از حق تست

دشمن آپ کی تاک میں تھے اور منصور کو بھی اسی لیے لپیٹا گیا کہ وہ آپ کے محبت کیشوں میں تھا اور آپ کی درگاہ پر سجدے کیا کرتا تھا وہ برابر پانچ سال تک میرے کان بھرتے رہے کہ جب منصور امام کے آستانے پر پہنچتا ہی، سینکڑوں سجدے[1] کرتا ہی:۔

دیگر آں کہ چوں بروں آید ز پیش — سر نہد بر آستاں صد بار پیش

---

[1] صفویوں نے جب وہ صاحب الزماں کے نائب مان لیے گئے ہیں، سجدے کی رسم کو رواج دیا، کوئی تعجب نہیں اگر اس قسم کے قصوں سے اس رسم کی حرمت منوائی گئی ہو۔

روے وموے خود بمالد بر زمیں خود خدا را سجدہ باید ایں چنیں

ئیں طرح دیتا رہا اور لوگوں سے کہتا رہا کہ اس میں کیا ہرج ہی' خود
شیخ بایزید بسطامی جب عیدین میں امام جعفر صادق کے ہاں جاتے تو آستانے
پر سجدہ کرتے۔ معاملات کی ابھی یہی صورت تھی کہ منصور نے نعرۂ انا الحق
بلند کیا' علما نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا' چنانچہ وہ قتل کر دیا گیا۔ میرا اگرچہ
اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہی' لیکن التجا کرتا ہوں کہ آپ میرے اس
جرم سے در گزریں۔ امام نے فرمایا: اگرچہ باطن میں تم کو میرے ساتھ عداوت
تھی، مگر اس مرتبہ تم کو معاف کرتا ہوں کیونکہ تمھارا اعتراف گناہ اخلاص مندانہ
ہی' مگر آیندہ محتاط رہنا اور اہل دین کے ساتھ مخلصانہ پیش آنا۔ زرا ادھر
کونے میں تو دیکھو' کون کھڑا ہی؟ خلیفہ نے کونے میں نگاہ ڈالی دیکھا تو
منصور حلاج کھڑا تھا۔ ہارون نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔

اِس قصّے کی لغویت ناظرین میری مدد کے بغیر معلوم کر سکتے ہیں[۵۱] کیونکہ
منصور حلاج اور ہارون الرشید کے زمانوں میں ایک صدی سے زیادہ
کا فرق ہی۔ خلیفہ ہارون الرشید سنہ ۱۹۳ ہجری میں وفات پاتا ہی اور منصور
سنہ ۳۰۹ ہجری میں دار پر چڑھایا جاتا ہی۔ شیخ شقیق بلخی متوفی سنہ ۱۹۵ھ

---

۵۱ تذکرہ جلد اوّل صفحہ ۱۹۸' طبع یورپ۔ علامہ محمد بن عبد الوہاب قزوینی کے
لیے جو اس کتاب کے پہلے سیاح ہیں اور تذکرۂ عطار پر دیباچہ لکھ رہے ہیں' یہ
امر ناممکن تھا کہ ایسے قصّے پڑھنے کے بعد بھی اس کتاب کی لغویت اور عطار کے نام
پر افترا ہونے کے راز سے ناواقف رہتے۔ تاہم انھوں نے اسے اور اسی مصنف
کی دوسری خرافات لسان الغیب کو عطار کی تصنیف قبول کر لیا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ یہ
اُن کی تاریخ دانی پر اُن کا مذہب غالب آگیا۔

اور ہارون الرشید کی ملاقات کا ذکر خود شیخ عطار نے کیا ہے اور تمام گفتگو بھی درج کردی ہے۔ جو زیادہ تر پند و موعظت پر شامل ہے۔

(۳) سب سے اہم مصنف کے مذہبی عقائد ہیں، جو عطار کے معتقدات سے مشرق و مغرب کا فرق رکھتے ہیں۔ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں سنّی معتقدات کے متبع ہیں۔ اصحاب اربعہؓ و ائمہ اربعہؒ کے مداح و ثنا خواں ہیں۔ یہ شخص اس اقرار سے کہ سُنّی ہے، شروع کرتا ہے لیکن ایسے جذبات اور معتقدات کا اظہار کرتا ہے جو شیعہ جماعت سے بالخصوص تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ہر ایسے عقیدے کی جو سنیوں کے نزدیک قابل احترام ہے تحقیر و تذلیل کرتا ہے۔ سنیوں کو نئے نئے ناموں سے پکارتا ہے، ائمہ اربعہ کی مذمت کرتا ہے، اصحاب ثلثہ کے لیے اس تصنیف کے دوران میں اس کا قلم خاموش ہے، مگر یہ ایک ایسی فرد گزاشت ہے جو اس نے کسی خاص مصلحت کے زیر اثر روا رکھی ہے، جس کی تلافی اپنی دوسری تصنیف لسان الغیب میں کر دیتا ہے۔ جہاں علی الاعلان اور بقول[۵] مرزا محمدؒ بن عبدالوہاب قزوینی "بدون تقیہ" کہتا ہے:-

شیعۂ پاکست عطار اے پسر	جنس ایں شیعہ بجان خود بخر
ما ز فاروقؓ التجا برکندہ ایم	پے ز نورین شما ببریدہ ایم
بو حنیفہؒ را ز دست بگزار تو	خود برو اندر پے کرار تو

(تذکرۂ عطار، مقدمہ میرزا محمدؒ قزوینی، ص یب)

میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ عطار تمام عمر سنّی رہ کر بڑھاپے میں اپنا مذہب تبدیل کر سکتے تھے، لیکن ان کے لیے نئے شیعہ ہونے کی حیثیت

---

[۵] میرزا کے الفاظ ہیں:- "و دریں کتاب در اظہار تشیع خود بصراحت و بدون تقیہ گوید"۔ (مقدمہ تذکرۂ عطار، صفحہ یب)۔

سے اپنی تصنیف میں اس مذہب کی تمام روایات و معتقدات کا ماحول پیدا کرنا سخت دشوار تھا۔ یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے، جو ابتدا ہی سے اس مذہب کا پیرو ہو۔ اس کی تردید میں شاید یہ کہا جائے، جیسا میرزا محمدؒ بن عبدالوہاب قزوینی نے کہا ہے کہ عطار نے تقیہ کر لیا تھا اول تو یہ خیال کرنا کہ عطار عمر بھر تقیے کے پردے میں زندگی بسر کرتے رہے، ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے میرزا محمد[۵۱] معترف ہیں کہ یہ کتاب نجم الدین کبریٰ کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے، جو ۶۱۸ھ ہجری میں تاتاریوں کے ہاتھ سے شہید ہوتے ہیں۔ تاتاریوں کو اگرچہ ہم اپنے نقطۂ نظر سے وحشی کہنے کے عادی ہیں، لیکن انتظامی قابلیت کا وصف ان میں بڑی حد تک موجود تھا۔ انھوں نے آتے ہی اپنی سیاسیات کو مدنظر رکھ کر سنیوں کی کثیر تعداد کے برخلاف شیعہ جماعت کی، جو قلیل تعداد میں تھی، مراعات اور تقویت شروع کر دی تھی، اس لیے میں نہیں سمجھ سکتا کہ چنگیزیوں کے عہد میں عطار کے لیے اصول تقیہ کی پابندی کی کیا ضرورت تھی۔ عطار جیسا کہ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے، نیشاپور میں مقیم تھے اور نیشاپور تاتاریوں کے قبضے میں تھا۔ میں نہیں جان سکتا کہ تقیہ کا انتساب ایک ایسے صوفی کی طرف جو ہمیں بے تعصبی اور رواداری کی تلقین کرتا ہے اور اپنی وسیع مشربی سے ہفتاد و دو فرقے کی نجات میں یقین رکھتا ہے کس قدر صحیح مانا جا سکتا ہے۔ ہمیں اسرار نامہ کے یہ اشعار[۵۲] یاد رکھنے چاہییں، جو تلقین ان میں ہے اُس کی آج بھی ضرورت ہے:۔

---

۵۱ تذکرہ صفحۂ یز۔

۵۲ گزشتہ صفحات میں بعض ایسے اشعار نقل کر آیا ہوں جن میں عطار نے متعصبین سے خطاب کیا ہے اُن پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

الا اے در تعصب جانت رفتہ — گناہ خلق با دیوانت رفتہ
زنادانی دلے پُر زرق و پُر مکر — گرفتار علیؓ گشتی و بو بکرؓ
گہے این یک بود نزد تو مقبول — گہے آن یک بود از کار معزول
گر این یک بہ گر آں دیگر تراچہ — کہ تو چوں حلقۂ بر در تراچہ
ہمہ عمرت دریں محنت نشستی — ندانم تا خدارا کے پرستی
تراچند از ہوا راہ خدا گیر — خدایت گر ازیں پرسد مرا گیر
یقیں دانم کہ فردا پیش حلقہ — یکے گردند ہفتاد و دو فرقہ
چگویم جملہ ارزشت ار نکو یند — چو نیکو بنگری جویلے او یند
خدایا نفس سرکش را زبوں کن — فضولی از دماغ ما بروں کن
دل ما را بخود مشغول گرداں — تعصب دار را معزول گرداں

(۴) ایک نہایت عجیب بات یہ ہے کہ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں کبھی کوئی لغو دعوے نہیں کرتے، نہ انھیں الہام ہوتا ہے، نہ کرامت کے مدعی ہیں حتیٰ کہ اپنے مرشد کی طرف بھی کوئی کرامت منسوب نہیں کرتے۔ اگرچہ دیگر مصنفین کے نوشتہ ایسے قصے اپنے تذکرے اور دیگر تصنیفات میں ذکر کرجاتے ہیں۔ اِس سے ہم اُن کی طبیعت کی متانت اور واقعیت پسندی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر کوئی وصف اُنھوں نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، تو یہ ہے کہ "دنیا میں ذلیل ترین ہستی میں ہوں" شیعہ بن کر ان کی طبیعت مطلق بدل جاتی ہے اور اخلاق میں اس قدر ابتذال پیدا ہوجاتا ہے کہ ہر قسم کی غیر ذمہ دارانہ تعلّیاں ابلہ فریبی کے لیے شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کا اُستاد اُن کی تعظیم اس لیے کرتا ہے کہ رسول اللہؐ اس کو خواب میں آکر ہدایت کر گئے ہیں، ایک لاکھ انسان اُن کے قتل کے لیے جمع ہوجاتے ہیں لیکن یہ اپنی

کرامت سے باز بلند پرواز کی طرح اُڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور جائے حیرت یہ امر ہی کہ اتنے بڑے معجزے کے باوجود اُن کے دشمن اُن کے دشمن رہتے ہیں اور بدستور درپئے آزار ہیں۔ ایک پیر سالک آکر تیس سوال دریافت کرتا ہی، یہ اپنے آپ کو اُن کے جوابات کا نااہل پاکر بہت خفیف ہوتے ہیں۔ لیکن ہاتف غیبی عین وقت پر آکر جوابات تعلیم کر دیتا ہی۔ مَیں پوچھتا ہوں کیا یہ لغویت عطار کی طرف منسوب کی جاسکتی ہی؟

(۵) مصنف کی طبیعت پر بجائے صوفیانہ ترک و تجرید و فنا، مذہبی بلکہ فریقی جذبات زیادہ غالب ہیں۔ جس طرح عشق علی کرم اللہ وجہہ اس کے قلب میں موجزن ہی، بغض نواصب بھی اسی طرح جوش و خروش کے ساتھ لہریں مار رہا ہی۔ اس کی زبان اِس قدر عامیانہ اور بازاری ہی کہ عطار جیسے فرشتہ صفت انسان کی طرف منسوب کرنا من قبیل محالات ہی۔ کیونکہ یہ نقطۂ نظر صوفیانہ معتقدات و احساسات کے بالکل منافی ہی۔

(۶) وہ مدعی ہی کہ مَیں نے سو کتابیں لکھی ہیں، لیکن اپنی تصنیفات کی زائد سے زائد جو تعداد دی ہی، سولہ ہی، اور یہ وہی کتابیں ہیں جو اور ذرائع سے بھی ہم کو معلوم ہیں۔ پھر پھر کر کئی موقعوں پر انہی ناموں کو دہراتا ہی۔ اب اگر یہ اصلی عطار ہوتا تو زیادہ نہیں، کم از کم باقی کتابوں کے نام ہی بتا دیتا۔ عطار کی تصنیفات سے اس کی بے خبری کا یہ عالم ہی کہ دیوان عطار سے ناواقف محض ہی۔ وصلت نامہ شیخ بہلول کو عطار کی تصنیف مانتا ہی۔ تذکرۃ الاولیا اور شرح القلب کے متعلق اس کو یہ علم نہیں کہ وہ نثر میں ہیں یا نظم میں، اِس لیے ان کے اشعار کی تعداد اپنے مفروضہ شمار دو لاکھ دو ہزار اور ساٹھ میں شامل کر لیتا ہی، لیکن دیوان کے اشعار کو داخل نہیں کرتا کیونکہ

اس کے وجود سے ناواقف ہی۔ وہ ایک فرضی تصنیف "معراج نامے" کا ذکر کرتا ہی، جس کے وجود سے کوئی شخص واقف نہیں۔ جوہر الذات اور ہیلاج نامہ کے تعلق سے مطلق بے خبر ہی۔

(۷) اِس کا دعویٰ ہی کہ جوہر الذات میری تصنیف ہی اور اس دعوے کی تصدیق کی غرض سے دونوں کتابوں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتا ہی لیکن جوہر الذات ہرگز ہرگز اس کی تصنیف نہیں ہو سکتی، کیونکہ زبان و انداز کلام اور موضوع کے اختلاف کے علاوہ مصنف جوہر، ہیلاج نامہ میں کہتا ہی کہ یہ میری آخری کتاب ہی:۔

کتاب آخر است ایں تا بدانی اگر تو زہرہ داری ایں بخوانی

جوہر کا مصنف فنائی المنصور ہی۔ اِس کا عقیدہ ہی کہ ہیلاج کے ختم ہونے کے بعد اس کی شہادت کے سوا کوئی مرحلہ باقی نہیں رہتا۔

بگو ہیلاج وآں گہ جاں برافشاں دل و جاں بر رخ جاناں برافشاں (ص۱۴۶)

اور خود منصور کا پیکرِ مثالی اِس کو اسی قسم کی ہدایت دیتا ہی، جو ہم جوہر الذات کے تبصرے میں آیندہ دیکھیں گے لیکن بعد میں یہ مثیل عطار منصور کا عاشق زار اور شہادت کا طلبگار ایک نیا سوانگ بھرتا ہی، مظہر العجائب پر قلم اُٹھاتا ہی، لسان الغیب نظم کرتا ہی، حُبِ علی اور بغض ناصبی کا وعظ کہتا ہی۔ عطار نہ ہوئے بھان متی کا تماشا ہو گیا! مصنف جوہر، جوشِ شہادت میں، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں دیکھا جا چکا ہے، بے تاب ہی، لیکن مصنف مظہر جب ایک لاکھ آدمی اِس کے قتل کرنے پر مستعد ہوتے ہیں، ایک معجزے کے ذریعے سے اپنی جان بچاتا ہی، اس لیے ضروری ہوا کہ دونوں کتابوں کے مصنفین کو دو مختلف اشخاص تسلیم کیا جائے۔

(۸) مظہر العجائب میں ایک دل چسپ لفظ "تومن" یا "تومان" ملتا ہے۔ اس لفظ کی موجودگی دلالت کرتی ہے کہ یہ کتاب عطار کے عہد سے بہت بعد لکھی گئی ہے کیونکہ لفظ تومان چنگیزیوں کے ساتھ ساتھ ایران میں آتا ہے اور سب سے پہلے بحیثیت فوجی اصطلاح رواج پاتا ہے۔ "جہانکشائے جوینی" پہلی کتاب ہے، جس میں یہ لفظ ملتا ہے۔

"تمامت خلائق را دہ دہ کردہ و از ہر دہ یک نفس را امیرِ نہ دیگر کردہ و از میان دہ امیر یک کس را امیر صد نام نہادہ و تمامت صد را در زیر فرمان او کردہ و بدیں نسبت تا ہزار شود و بدہ ہزار کشد، امیرے نصب کردہ و اورا امیر تومان خوانند"۔ (جہانکشا، صفحہ ۲۳، جلد اول)

"چنگیز خاں توریاے تقشی را با دو تومان لشکر مغول نام زد کرد تا از عقب او از آب سندھ بگزشت"۔ (جہانکشائے جوینی صفحہ ۱۱۲)

بعد میں مالیات کی اصطلاح بھی بن گیا، مثلاً :-

"و حقوق دیوانی آں ولایت با آنچہ داخل آں تومان است، پانزدہ تومانی و یک ہزار پانصد دینار است"۔ (نزہت القلوب حمد اللہ مستوفی، صفحہ ۱۴۴، طبع ملک الکتاب)

عطار کا اس لفظ سے آشنا ہونا، اول تو بعید ہے اور پھر اس کا اس طرح استعمال کرنا کہ گویا فارسی کا روزمرہ ہے اور بھی مشکل ہے۔ امثال ذیل ملاحظہ ہوں :-

صد توماں بالست ایں خود قیمتش — خود بکشتی و ببردی حسرتش (ص۲۳)

مال عالم داشت گویند صد تومن — لیک پوشش شاں نبودہ در بدن (ص۹۳)

درآں عصر او دو مہ میر تمن بود — بسالے او دو ساعت پیش زن بود

مرتضی دیدی کہ سرہا چوں گرفت صد تن جاں بداں افزوں گرفت

(۹) شیخ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں، اگرچہ انوری و خاقانی کا ذکر کرتے ہیں لیکن شیخ نظامی کے نام سے واقف نہیں - تاہم مصنف مظہر العجائب (جو اسم بامسمیٰ مظہر العجائب ہی) ان کا ذکر کرتا ہی، چنانچہ :-

گہ نظامی را بیاری در سخن گہ بنظامی بگوئی من لدن

گہ ہمی گوئی نظام دیں منم گہ فراز عرش علیین منم

بلکہ ایک موقعے پر ایک بے معنی دعویٰ کیا ہی کہ نظامی نے مجھ سے روحانی استفادہ کیا ہی :-

خود نظامی بود ازمن زایدہ دادہ ام اورا بمعنے فائدہ

کیا یہ بے حقیقت لاف نظامی کے شعر :-

مرا خضر تعلیم گر بود دوش برازے کہ آمد پذیرائے گوش

کی تشریح ہی ؟

(۱۰) ہمارا مصنف پیشین گوئیاں کرنے کا نہایت مشتاق ہی - ترکوں کے متعلق اُس کی ایک پیشین گوئی گزشتہ صفحات میں مرقوم ہوچکی ہی یعنے :-

بعد من ترکاں کنند عالم خراب بس دل مسکیں کہ سازندش کباب

ظاہر ہی کہ شاعر اس بیت میں چنگیزی طوفان کی طرف اشارہ کر رہا ہی - چونکہ اس عہد سے پہلے مغول دنیاے اسلام پر چھا چکے ہیں، اس لیے اِسس بہروپیے نے یہ پیشین گوئی جڑ دی -

اسی طرح ناصر خسرو کی بد دعا سے شہر بغداد میں وبا کے پھیلنے، خلیفہ اور اس کے لشکر کے تباہ ہونے کا ذکر کرتا ہی :-

بعد ازاں آں شاہ بالشکر تمام جملہ مردند و نماند از خاص و عام

آں بلا بر جان اہل بغی بود	زاں کہ از خونش بدا نزاسعی بود ص ۹۳

یہ وبا نہیں ہی، بلکہ ہلاکو کے حملۂ بغداد کی طرف تلمیح ہی۔

(۱۱) ایک اور پیشین گوئی کی ہی کہ میرے بعد ایک درویش روم میں ہوگا جو میرے عقائد کی شراب سے سرشار ہوگا اور میرا خرقہ پہنے گا، تم کو چاہیے کہ اِس کے ہاتھ سے جام وحدت نوش کرو:۔

شمۂ از آں ز بعد من بردم	عارفے گوید ز اصل ہر علوم
گر تو اہل وحدتی رو گوش کن	جام وحدت را ز دستش نوش کن
از ہماں جامے کہ من نوشیدہ ام	وز ہماں خرقہ کہ من پوشیدہ ام
او بنوشد او بپوشد شمس دیں	ایں معانی را بود سرپوش دیں

(صفحہ ۶۰۳-۶۰۲)

مولانا جلال الدین رومیؒ کی طرف اس سے زیادہ صاف اور صریح تلمیح ہو بھی نہیں سکتی شمس دیں سے مُراد شمس تبریز ہیں۔

(۱۲) اگر اب بھی اس جعلی عطار کے متعلق شبہ ہی تو ذیل کے ابیات پر غور کر لیا جاے:۔

گر تو اے شاعر بہ بینی مظہرم	در بخوانی یکزمانے جوہرم
آں زماں معلوم گردد شعر تو	خط و خالے خود نیابی اندرو
شعر حافظ خواںؔ[1] و باقاسم نشیں	زانکہ ایشانند با ملا قریں
بعد من اسرار ایشاں گوش کن	روز خنب عشق شاں می نوش کن

[1] تعجب ہی کہ ایسی صریح شہادت کو صرف نظر کر کے جو اس تصنیف کی مجعولیت کے حق میں موجود ہی، علامہ محمدؒ بن عبدالوہاب قزوینی دُنیا کو عطار کے تشیع اور تقیہ اور جمود طبع کا افسانہ سُنا رہے ہیں۔

یہ بھی ایک قسم کی پیشین گوئی ہی۔ حافظ سے مُراد خواجہ حافظ شیرازی متوفی سنہ ۷۹۲ ہجری ہیں۔ اور قاسم سے مراد شاہ قاسم انوار ہیں، جو ۸۳۵ھ یا ۸۳۷ھ ہجری میں انتقال کرتے ہیں۔

جو شخص ماضی کے مشاہیر کے زمانوں اور اُن کے سنین وسال میں فاحش اور یاس انگیز اغلاط کا مرتکب ہو، وہ مستقبل کی تاریک لوح کے اسرار کیا پڑھ سکے گا۔ اس لیے ہمیں مصنف مظہر العجائب کے دعوئے غیب گوئی کو یک قلم ترک کر کے اصل حقیقت کو بے نقاب کر دینا چاہیے کہ یہ کتاب ایک افترائے عظیم ہی جو فرشتہ صفت عطار کے نام پر باندھی گئی ہی۔

مولانا روم، خواجہ حافظ اور شاہ قاسم انوار کے ذکر سے ظاہر ہی کہ یہ کتاب نویں صدی ہجری کے منتصف اول کے خاتمے کے بعد کسی وقت لکھی گئی ہی، بلکہ میں دسویں قرن کے ربع اول میں اس کا زمانہ ماننے کے لیے آمادہ ہوں اور میرے وجوہ یہ ہیں :-

(۱) اس کے قلمی نسخے گیارہویں صدی سے پُرانے نہیں ملتے۔

(۲) مصنف اپنے آپ کو نیز حسین منصور کو حسینی کہتا ہی۔ اس لفظ کا رواج نویں صدی میں کم، لیکن دسویں صدی میں بہت زیادہ ہو جاتا ہی۔ خود صفوی اِس کے استعمال کو فروغ دیتے ہیں۔

(۳) سجدے کی رسم جس کا منصور کے قصے میں ذکر آتا ہی، صفوی عہد میں غالباً رواج پاتی ہی۔

(۴) سنیوں کے خلاف اس کتاب میں جو تشدد کا لہجہ اختیار کیا گیا ہی، ایسے زمانے میں ممکن ہی جب کہ ملک میں شیعہ حکومت برسر اقتدار ہو۔

الغرض شاہ اسمٰعیل صفوی سنہ ۹۰۷ ہجری۔ سنہ ۹۳۰ ہجری کا عہد اس

تصنیف کے لیے بہت موزوں معلوم ہوتا ہو، جب کہ مذہبی لحاظ سے ایران نئی کروٹ لے رہا تھا، جدید سیاسی انقلاب نے مذہب اثنا عشری کو صدر میں جگہ دے دی تھی، سنی بزور شمشیر شیعہ بنائے جا رہے تھے، اُن کے علما قتل کیے جا رہے تھے، جس نے انکار کیا تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ زندہ ایک طرف، مُردوں کی قبریں اُکھڑوا کر پھنکوا دی گئیں اور ان کی ہڈیوں کو جلا دیا گیا۔ اصحاب ثلثہ کے خلاف بغاوت کی آگ چارسو مشتعل تھی، حضرت فاروق اعظم رض جن کی بدولت ایران نے نعمت دین اسلام حاصل کی تھی، آج اُنھیں کے نام پر لعنت و نفرت کی آوازیں مسجد و منبر سے بلند ہو رہی تھیں۔ شاید اسی موقعے کے لیے شیخ عطار نے اپنی الہامی زبان میں اشعار ذیل لکھے تھے:۔

عجم ز اوّل جہود و گبر بودند ۔۔۔ ازاں گوئے مسلمانی ربودند
کسے کاجداوش ایماں از عمرؓ یافت ۔۔۔ ز مہر او چرا امروز سر تافت

(خسرو نامۂ عطار)

جب زندہ سنّیوں کو بزور شمشیر شیعی بنایا جا رہا تھا تو کوئی تعجب نہیں اگر مردہ سنّی مشاہیر کو بزورِ قلم ذاتی یا مذہبی اغراض کی بنا پر اسی مذہب کے دائرے میں لانے کی کوشش کی گئی ہو، چنانچہ مظہر العجائب اور لسان الغیب اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔

عطار اگرچہ کسی نئے مذہب کے بانی نہیں اور نہ کسی جدید فرقے کے پیشوا ہیں، لیکن دیکھا جاتا ہو کہ اُن کی شہرت سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے مختلف فرقوں نے ان کو اپنی اپنی اخوت کا رکن بنانے کی کوشش کی ہو۔ جوہر الذات میں فنا فی المنصور کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں مظہر العجائب میں ایک اثنا عشری شیعہ کے لباس میں پیش کیے گئے ہیں۔ حیدر نامہ میں

انھیں حیدری بنانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن اُن کی تصنیفات جو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہیں، یہ ہیں :-

(۱) اسرار نامہ (۲) الٰہی نامہ (۳) پند نامہ (۴) تذکرۃ الاولیا (۵) خسرو نامہ (۶) دیوان (۷) شرح القلب (۸) منطق الطیر (۹) مصیبت نامہ (۱۰) مختار نامہ۔

رہیں باقی پچیس کتابیں، ان میں تیرہ غیر عطار ثابت ہو چکی ہیں۔ باقی کتابیں یہ ہیں :-

(۱) اخوان الصفا (۲) اشتر نامہ (۳) بلبل نامہ (۴) حقائق الجواہر (۵) حیدر نامہ (۶) سیاہ نامہ (۷) لسان الغیب۔ (۸) کنز البحر (۹) نزہت الاحباب (۱۰) وصیت نامہ (۱۱) ولد نامہ (۱۲) ہفت وادی۔

اِن میں اُشتر نامہ، بلبل نامہ، نزہت الاحباب اور ہفت وادی، میری نظر سے گزر چکی ہیں، لیکن اُن کا تبصرہ بعض وجوہ کی بنا پر سردست ملتوی کرتا ہوں، لسان الغیب اور حیدر نامہ اگرچہ میری نظر سے نہیں گزریں، لیکن یہ دونوں کتابیں علی الاعلان مجعول مانی جا سکتی ہیں۔ یہی کیفیت حقائق الجواہر کی ہے۔ کنز البحر اور کنز الاسرار اصل میں ایک ہی کتاب ہے۔

(۱۲-۱۳) جوہر الذات و ہیلاج نامہ

اگرچہ مصنف اِن کو علیحدہ علیحدہ کتابیں مانتا ہے لیکن میں اتحادِ مضمون و زبان کی بنا پر دونوں کا تبصرہ ایک ہی ساتھ مناسب سمجھتا ہوں۔ اشتر نامہ، جوہر الذات اور ہیلاج نامہ ایک ہی شخص کی تصنیف معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں مثنویوں سے اکثر تذکرہ نگار واقف ہیں اور فہرست نگار بالاتفاق

عطار کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اُن کے قدیم نسخے وہ ہیں، جو نویں قرن[1] ہجری کے نوشتہ ہیں اور کئی کتب خانوں میں ملتے ہیں۔

جوہر الذات ایک ضخیم مثنوی ہے جو نول کشور کے مطبوعہ کلیات کی پوری پہلی جلد پر محیط ہے، اس کی دو جلدیں اور ۵۸۲ صفحات ہیں۔ ہیلاج نامہ ص ۵۸۴ سے شروع ہو کر ص ۷۷۰ پر ختم ہوتا ہے۔ فی صفحہ بیالیس ابیات ہیں، اس حساب سے دونوں مثنویوں کے اشعار کی تعداد بتیس ہزار کے قریب ہے۔

جوہر الذات کے بعض ممتاز عنوان یہ ہیں:-

جلد اوّل:- تکریم بنی آدم۔ امامت امیر المومنین علیؑ، حکایت پیر، توحید صرف و بقائے کل، خطاب پدر بہ پسر و مقالات ایشان، حکایت پیر، رو گردانیدن شیطان، در مشقت کشیدن آدم از شیطان و شرف انسان، اسرار قربت شیطان، تخلیق آدم فی صورت الرحمٰن، و ہو معکم اینما کنتم، پیدا آوردن حوا از پہلوے آدم، اسرار اعیان کل، رفتن ابلیس در بہشت بہ تلبیس در دہان مار، مناجات شیطان، اسرار یافتن حضرت علی کرم اللہ وجہہ و در چاہ گفتن، اسرار ذ، اسرار نفس مردم، سوال امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ و جواب دادن ز در اسرار ہا، مکر شیطان با آدم، وحدت صرف و یکتائی ذات و صفات، سوال از منصور و جواب او، تقریر شیخ ابو سعید مہنہ، نگاہ کردن درویش در کواکب و جواب ہاتف، در بے نشانی حسین منصور، مناجات شیخ اکافی، در التماس کردن فنائے کل از شیخ حسین منصور، در سر نگاہ داشتن، سوال از حسین منصور و جواب دادن او۔ حکایت مرد پاکباز، در اثبات ذات کل،

---

[1] سب سے پُرانا نسخہ وہ ہے جو پروفیسر آذر کے کلیات نوشتہ ۸۵۷ھ ہجری میں شامل ہے۔ دوسرا نسخہ برٹش میوزیم میں آر (۳۵۳۰) ہے جو ۸۷۷ھ ہجری کا نوشتہ ہے۔

آگاہی دل در اسرار و از تقلید دور شدن، صفت وصل و راز کل وغیرہ وغیرہ۔

جلد دوم:۔ سوال از منصور در سرّ آدم، صفات جان و دل، صفات عناصر، قصۂ منصور و اعیان او، صفات فیض و حکمت حکما، عین ذات و صفات و قدرت و قوت اسرار الہٰی، در آگاہی دادن دل در عین منزل، جوہر حقیقت، صفت دنیا، کشف اسرار حقیقت در نمود صور، در صفت حضرت محمدؐ علیہ افضل الصلوٰۃ، گنج جان و دل، صفات حضرت پیر دانا، صفت معراج عین العیان، صفت کنت کنزاً مخفیاً، در عیان جام منصور، سوال از منصور در عیان عشق و جواب او، عیان در دُنیا و راز منصور، اسرار حسین منصور، در تفسیر اللہ نور السمٰوات والارض، درعیان دیدار صورت و معنی سرّ منصور، سوال صاحب راز از منصور، در واصل شدن سالک و اعیان منصور، سوال از ابلیس و جواب دادن او، سوال از حسین منصور در اسرار ابلیس، حکایات ابلیس و اسرار وے وغیرہ وغیرہ۔

ہیلاج نامہ:۔ در اسرار عشق بہر نوع، نموداری ہیلاج، جواب منصور شیخ جنید را، فنا و بقاے کل، جواب منصور در خطاب حق عز وجل، عیان جان، حقائق اسرار، سلوک سالک، نموداریِ عشق، شریعت و طریقت و حقیقت جملہ یکیست، کشف حجاب، نموداریٔ یقین، موتوا قبل ان تموتوا ہدایت در رہ شریعت، اسرار دل و جان و تفسیر قرآن، حکایت حقیقت منصور، جواب منصور شبلی را، سوال بایزید از منصور و جواب وے، نموداریٔ سرّ توحید، گریستن بایزید بر حالت وبے خودی منصور، اسرار گفتن منصور بر دار، سخن گفتن شیخ جنید و شیخ کبیر در کار منصور، نکوہش کردن جاہلے مغرور منصور را و جواب آں، جواب شیخ جنید شیخ کبیر را، عین الاعیان توحید، سوال جنید از منصور در حقیقت شرع و جواب آں، سخن گفتن منصور با شیخ کبیر اسرار گفتن

منصور با شیخ کبیر، راز گفتن جنید با شیخ کبیر از ہوا داری منصور، اسرار گفتن عبدالسلام درحضور منصور، اسرار گفتن عبدالسلام با شیخ جنید، در ہوا داری شیخ کبیر با منصور، سخن گفتن شیخ کبیر با منصور از ہواداری قصاص، فریدالدین عطار درہو داری خود و اسرار منصور۔

اِن سرخیوں کو پڑھ کر ناظرین یہ خیال کریں گے کہ بڑے جلیل القدر اور اہم مباحث ان کے تحت میں مذکور رہوں گے، لیکن ایک عنوان کے ذیل میں آدمی دس صفحے پڑھ جائے اور پھر بھی یہ نہ کہہ سکے کہ اس نے کیا سیکھا اور بعض اوقات تو سرخیاں بالکل برائے بیت ہیں۔

مصنف اپنا نام فریدالدین محمدؐ بیان کرتا ہی:۔

حقیقت من محمدؐ نام دارم — ازو پیدا حقیقت کام دارم
فریدالدین محمدؐ ہست نامم — محمدؐ دادہ ایں جا جملہ کامم (ص ۳۷۰)

وہ اپنے تخلص "عطار" کے ذکر کرنے کا بے حد شائق ہی، کتاب کا کوئی صفحہ ایسا نہیں، جس میں تخلص مذکور نہ ہو۔

جواہرالذات میں بیان کیا ہی کہ میں اشترنامہ میں بعض اسرار بیان کر آیا ہوں:۔

ز اشترنامہ سرّ کار دیدی — حقیقت دیدہ و دیدار دیدی (ص ۳۰)

لیکن یہ کتاب اس سے افضل ہی:۔

از اشترنامہ ایں بہتر نمودم — ز ہر دو عالم ایں برتر نمودم (ص ۲۶)

اکثر مقامات پر وہ اپنے قتل اور منصور کی طرح دار پر چڑھائے جانے کی پیشین گوئی کرتا ہی:۔

جواہر ذات بر گو آشکارا — چو خواہد کرد یارت پارہ پارہ (ص ۳۰)

دلگہ کہ می بینم کہ چوں منصور عطار   بخواہد سر بریدن زود ناچار (ص ۴۳)

دیگرے شد ستم کشتہ چوں منصور اسرار   مرا آویختن اندر سر دار (ص ۲۰۶)

اس کا خیال ہی کہ جب جوہر الذات کو پورا کر کے ہیلاج نامہ ختم کر چکوں گا، تب مجھ کو پارہ پارہ کیا جائے گا:۔

جواہر نامہ باقی چند ماند است   ز بہر ایں دلم در بند ماند است

رسانی ایں تمام آخر بپایاں   دگر ہیلاج سرِ ذات جاناں

بگوئی بعد جوہر آشکارا   کنندت آں زماں مر پارہ پارہ

(ص ۳۲۵)

اس شہادت کی بشارت حضرت علیؓ نے خواب میں آکر مصنف کو دی ہی:۔

شبے دیدم جمال جاں فدایش   شدم افتادہ اندر خاک پایش

ازو پرسیدم احوالم سراسر   مرا بر گفت اندر خواب حیدرؓ

بگفتم رازہا در خواب آں شاہ   مرا از کشتن او کرد است آگاہ

مرا گفتا کہ اے عطار ماندہ   ز سرِ عشق برخوردار ماندہ

بسے گفتی ز ما ایں جا حقیقت   بیردی نزد ما راہِ شریعت

حقیقت بر تو ایں در بر کشادیم   ترا گنج یقیں در دل نہادیم

بکش رنج ایں زماں چوں گنج داری   ز ما در عشق ہاں کن پائے داری

ترا خواہند کشتن آخر کار   کہ کردی فاش ایں جا گاہ اسرار

کسے کو راز ما گوید حقیقت   بنگزاریم او را در طبیعت

حقیقت گفت منصور آں خود دید   دریں جا گہ جفائے نیک و بد دید

(صفحہ ۶۹۱)

مختصر یہ ہی کہ مصنف بے شمار موقعوں پر اپنے قتل و شہادت کی غیب گوئی کرتا ہی۔ اس کا یہ عقیدہ بھی ہو کہ وہ مظہر منصور یا نمودار منصور ہی۔ ہیلاج نامہ کے دیباچے میں کہتا ہی کہ جب مَیں جواہر نامہ کو ختم کر چکا' اس فکر میں مبتلا ہُوا کہ دیکھیے آیندہ کیا اسرار ظاہر ہوں۔ اسی فکر میں ایک روز گوشۂ تنہائی میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں میری نگاہ ایک دیوانے پر پڑی جو چپ چاپ آکر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور پوچھنے لگا کہ اس قدر خاموش اور ملول کیوں ہی؟ جس کا تو طالب تھا وہی مطلوب سامنے کھڑا ہی، تو نے سب سے قطع تعلق کر لیا ہی اور تیری شہادت کے سوا اب کوئی مرحلہ باقی بھی نہیں رہا' لہذا تجھے لازم ہی کہ کشف اسرار کرے اور حقیقت کے پردے اُٹھا دے' اس کتاب کو تو میرے نام پر لکھنا! مَیں نے اس سے دریافت کیا کہ آپ کا نام کیا ہی؟ اس نے جواب دیا: میں منصور حلاج ہوں' اور عالم میں ہیلاج کے نام سے معروف ہوں۔ تیری جان میں مَیں ہی گویا ہوں اور میری ہی وجہ سے تجھ کو گویائی حاصل ہی' یہ کہ کر میرے قریب آیا' میرے ہاتھ اور سر پر بوسے دیے اور میرے سر پہ اسرار کا تاج رکھ دیا۔ اس وقت مَیں نے آنکھ اُٹھا کر ہیلاج کو دیکھنا چاہا لیکن وہ غائب ہو چکا تھا اور مجھ کو ایک نشانی دے گیا تھا' یعنی میرے سر پر ایک کلاہ چھوڑ گیا تھا۔ جب مجھے ایسی ٹوپی مل گئی ہی تو جس قدر فخر کروں بجا ہی۔ اسرار حلاج کی یہ آخری کتاب ہی جو مَیں لکھ رہا ہوں' اس میں معنے کے بے شمار خزانے ہیں[۱]۔

---

[۱] اس قصّے پر غالباً وہ روایت جو نفحات الأنس (ذکر عطار) میں ملتی ہی کہ نور منصور ڈیڑھ سو سال بعد عطار پر تجلّی کرتا ہی' تاسیس پاتی ہی یا یہ قصّہ اس روایت کی بنیاد پر نشو و نما پاتا ہی۔

چو جوہر نامہ کردم فاش آخر
نمودم صورت نقاشش آخر

بکنجے در نشستم زار ماندہ
ضعیف و ناتوان و خوار ماندہ

دریں اندیشہ کہ از بادہ جوہر
چہ اسرار آید ایں جاگاہ ظاہر

نظر کردم یکے دیوانہ دیدم
زعلم صورتے بیگانہ دیدم

کہ آمد پیش من ایں عاشق زار
لب از ہم برکشاد و گفت اسرار

زمانے بود ایں جا ساکن و خوش
دگر آورد سر بیروں ز آتش

مرا گفتا چرا در غم نشستی
در معنے بر وے خود بہ بستی

نہ وقت آمد کہ دیگر راز جوئی
دگر اسرار جاناں باز جوئی

تو ایں دم عاشقی دراز دیدہ
جمال دوست در خود باز دیدہ

طلب کردی و دیدی روئے مطلوب
رسیدی ایں زماں در ذات محبوب

چرا فارغ نشینی زود برخیز
دگر در عشق و ذوق فقر آویز

چو کردستی دریں جا جملگی ترک
بجز کشتن نماندستت دگر برگ

کنوں باید کہ گوئی سرّ اسرار
حقیقت فاش گردانی دگر بار

بنام من کتابے نغز آری
دگر ہوشے دگر با مغز آری

بنام من دہی بنیاد ایں جا
دہی امروز ایں جا داد ما را

خدایم ایں زماں من واقف خود
درون جان تو من واصف خود

بدو گفتم کہ اے جاں چیست نامت
کہ حق داد است ایں جاگاہ کامت

جوابم داد من منصور حلاج
مرا نامست در آفاق ہیلاج

کنوں بنویس مر اسرار ما را
نگہ می دار مر گفتار ما را

درون جان تو مائیم گویا
توئی از من شدہ در عشق گویا

بگفت ایں، آں گہے نزدیکم آمد
چراغے در دل تاریکم آمد

بدادم بوسہ بر دست و بر سر ، نہادم بر سر از اسرار افسر
نظر کردم پس آں گہ سوے بالا ، کہ تا بینم مبارک روے ہیلا
ندیدم ہیچ صورت درمیانہ ، مرا بخشیدش آں گہ یک نشانہ
کلاہے بد نشانے بر سر ما ، کہ آں باشد بعالم افسر ما
بخود گفتم کہ ہاں برخیز و خوش باش ، کہ بنمود است اینک روے نقاش
سرا فرازی کن اے بے سر در آخر ، کہ ایں جانیستت ہم سر در آخر
کتاب آخر است ایں تا بدانی ، اگر تو زہرہ داری ایں بخوانی

(ہیلاج نامۂ قلمی ۔ کلیات پروفیسر آذر)

یہ مثنویاں عطار کی دیگر تصنیفات مثلاً الٰہی نامہ، اسرار نامہ، منطق الطیر اور مصیبت نامہ کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتیں۔ عطار اگرچہ پُرگو ہیں، تاہم ان کے ہاں زبان کا لطف اور متانت کافی مقدار میں موجود ہی، اُن کا قاعدہ ہی کہ جس مسئلے کو چھیڑتے ہیں، اسی کو پیش نظر رکھ کر اور غیر ضروری امور سے بچ کر ایک خوش مذاقی کے ساتھ اپنے ضروری دلائل اور آرا بیان کر دیتے ہیں۔ بحساب جوہر الذات اس بارے میں عطار کے بالکل برعکس ہی، وہ سب کچھ کہ جاتا ہی لیکن نفس مضمون کو تشنہ چھوڑ جاتا ہی، پھر اُس کے بیان کرنے کا ڈھنگ عجیب وغریب ہی۔ ہر مضمون کے متعلق ایک پُراسرار فضا پیدا کر دیتا ہی۔ ہر چیز اس کے نزدیک ایک راز ہی خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ۔ وہ اس کے گرد اسی طرح گھومتا ہی، جس طرح ایک بلی کسی چوہے کے گرد دبوچنے کے بجائے چکر لگاتی رہے۔ جن اسرار کے انکشاف کا وہ دعویٰ کرتا ہی بجائے اس کے کہ اُن کا حل سوچے، یا اُن کے حل کی کوشش کرے، ان کا وظیفہ یا ورد شروع کر دیتا ہی۔ جو بات آسانی سے پانچ شعروں میں کہی جاسکتی ہی، ہمارا

مصنف ان کو پچاس بیت میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس کا ہر دوسرا مصرع برائے بیت ہوتا ہی۔

قدم قدم پر کشف حقیقت و اسرار کا مدعی ہی، لیکن اگر اسرار بیان کرنے کا یہی ڈھنگ ہی، جو اس نے اختیار کیا ہی تو ایسے بیان کرنے سے ان کا بیان نہ کرنا بہتر ہی ؎

کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں سے
اک مرغ ہی خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہی

لیکن پیشتر اس کے کہ میں اور امور کی طرف توجہ کروں مجھ کو چند الفاظ اس کی زبان اور طرز کے متعلق کہنے ضروری ہیں۔

خاص خاص روزمرے، محاورے، خیالات، الفاظ اور بندشیں مل کر بحیثیت مجموعی، کسی مصنف کی شخصیت یا اُس کے انداز تحریر کو قائم کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ہمارا شاعر ایک طرز خاص کا مالک ہی، جو اس کو نہ صرف عطار سے بلکہ دیگر شعرا سے بھی ممیز کرتی ہی۔ اس کے ہاں حقائق و اسرار کے بیان کرنے کی خاص خاص اصطلاحیں ہیں جو دیگر مصنفین نے کم استعمال کی ہیں۔ مثلاً :-

دید، دید دید، بود، بود بود، بود نبود، واصل دیدار، سر، راز، جاں، جان جاں، کل، لقا، عیاں، عکس عیاں، عیان عیاں، عیاں در عیاں، عیان عشق، عین الیقین، نمودار، حقیقت (ذات مصطفوی) شریعت (قول و فعل او) یک رنگی، بے نشانی، نقش، نقاش، نقش طبیعت، جاناں، شاہ، دار طبیعت، عین طبیعت، قربت لا، دار، اعیان ذرات، عین تمام، وصال کل، عیان یار، در وجود مردن، عین پرگار، مغز، پوست،

عین طبیعت، رمز مطلق، دیدار دید، دیدار اعیان، کل دید، نقطۂ و پرگار، کل لقا، ہیلاج جہاں، عیان عقل وغیرہ۔

'با'، 'بر' اور 'بے' جیسے حروف اپنی قدیمی شکل یعنے 'ابا'، 'ابر' اور 'ابے' کی صورت میں ملتے ہیں اور ہم کو حیرت ہی کہ یہ شاہنامہ اور گرشاسپ نامہ کے دَور کے یادگار جواہرالذات اور ہیلاج نامہ میں کیسے نمودار ہو گئے، حالانکہ عطار کی اصلی مثنویات میں نظر نہیں آتے۔ امثال:۔

منم اللہ و رحمٰن و رحیم — ابے صورت یقیں حد قدیم (ص ۲۹۹)

ابے غم شد ہر آنکو برد فرماں — ترا ورنہ فنا و او سوے زنداں (ص ۳۴۷)

رہ دور و عجب در پیش داری — ابا خود بر پیش اندیش داری (ص ۳۴۰)

دمے گوید منت دیدار دارم — ابا تو اندریں سرکار دارم (ص ۳۴۱)

محمدؐ با علیؓ دارند بے شک — وجود لحمک لحمی ابر یک (ص ۳۳)

بسے گشتی ابر گرد کمر تو — کہ باز ایں جا بری بوے اگر تو (ص ۲۵)

لفظ "حقیقت" بمعنی درحقیقت مصنف کا تکیہ کلام بن گیا ہی۔ امثال:۔

حقیقت بیر از خود رفت بیروں — کہ بیروں بود او از ہفت گردوں

نہ پردہ بود نے شاہ جہاں تاب — حقیقت گم شدہ او اندر دیاب

ہمہ در پردہ گم دید و یقیں دوست — حقیقت مغز گشت و درعیاں پوست (ص ۳۷)

یہ اشعار میں نے صرف ایک صفحے ہی سے نقل کر دیے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت علیؓ کی بشارت کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

دوسرا تکیہ کلام 'جاگہ'، 'جایگہ' اور 'جاگاہ' ہی، جو جوہر اور ہیلاج کے طول وعرض میں ہر مقام پر موجود ہی۔ میں کہتا ہوں وہ صفحہ نہایت بدنصیب ہی جہاں یہ الفاظ نہ ہوں، امثال :۔

جمال من ندیده غافلا تو دریں جاگاه اے بے حاصلا تو (ص۱۹۴)

نداین جاگاه اندر آخر کار اگرچه برکشید او رنج و تیمار

در آخر گشت ایں جاگاه واصل شدش مقصود ایں جاگاه حاصل (ص۱۹۸)

مرا ایں جایگه او منفعل کرد دمادم پیش خلقانم خجل کرد (ص۱۹۵)

ترا ایں گلشن ایں جاگه خوش آمد ازاں اصلت ز باد و آتش آمد (ص۱۸۹)

ز تیر عشق ایں جاگه بدوزد پس آنگه بودت ایں جاگه بسوزد (ص۱۰۳)

"ے" جو ماضی ناتمام اور حال کی علامت ہی، اصل فعل سے دُور لایا جاتا ہی:۔

چراخوں میخوری در خاک فانی ازاں می ره نبردی و ندانی (ص۲۰۳)

درونت روشنائی دارد ایں جا درونت می جدائی دارد ایں جا (ص۲۰۴)

نخواہی یافت آخر می رہائی چرا بے چارہ در قید ہوائی (ص۳۴۳)

بجز خورشید می تاباں نباشد ندیدی ایں ترا تا داں نباشد (ص۳۴۸)

نمی دانی کہ می آخر چہ بودت زہر چیست ایں گفت و شنودت (ص۱۲۸)

'من'، 'تو'، 'او' اور 'ما' وغیرہ مفعولی معنوں میں لائے گئے ہیں:۔

تو دارم در جہان و کس نہ دارم کہ عمرے سوے دیدت می گزارم (ص۲۱۶)

چو من دیدی منت بنمایم ایں راز حجاب اندازم ایں دم آخرت باز (ص۳۳۹)

تمامت مست و حیران اند جانا بروز و شب تو می خوانند جانا (ص۱۸۴)

تو مارا ذات ما را این و ما جوے ہر آں رازیکہ می داری بما گوے (ص۱۹۱)

زہے حسن تو دادہ ماہ را نور کہ در آفاق او دیدیم مشہور (ص۲۱۷)

'را' زائدہ کی مثالیں:۔

خبر دادم شمارا از شمارا کہ خواہد بودتاں آخر فنا را (ص۴۳۹)

گماں بردار اے بمودہ خود را | فگندہ تہمتے در نیک و بد را (ص۳۳۹)
نمی دانی جوابے دادن اورا | کہ باشد درخور جاناں نکورا (ص۳۴۰)
زبعد خالق کون و مکاں را | ثنا بر خاتم پیغمبراں را (ص۵۸۸)

حاصل بالمصدر "گفت و گو" وغیرہ کے ٹکڑے کرکے حروف جارہ وغیرہ درمیان میں لائے جاتے ہیں:-

درم بکشادۂ درگفت و درگوے | بگو اکنوں دگر درجست و درجوے (ص۶۶۸)
بگوید آں زماں خاکستر او | اناالحق ہمچناں درگفت و درگوے (ص۵۸۶)
در اول لعنتم چوں کردہ بد او | بہرزہ دانم ایں جاگفت یاگو (ص۴۸۵)
زعقل سفل چہ گفت و چہ گویست | نمود صورتست و جست و جویست (ص۱۱۷)
من از فتویٰ چناں کردم اباد | کہ تاکوتہ شود ایں گفت و یں گو (ص۵۶۷)

الف زائدہ:-

ترا ایں جاست ابراہیم درتن | شود درعاقبت ایں جابت آتشکن (ص۵۰۲)

عربی الفاظ میں تصرفات:-

عام کی جمع عوام ہے، لیکن مصنف "اعوام" لایا ہے:-

کنوں اے شیخ ایں اعوام سگیں | بصورت اندریں شورند و درکیں (ص۷۶۵)

دیگر:-

طلبگار تو اند ایں جا نجومات | کجا دانند از سر علومات (ص۳۶۸)

معائنہ بروزن مفاعلہ ہے، مصنف نے بروزن مفاعیلہ استعمال کیا ہے:-

معائینہ جمال خود نمود است | کہ با عطار درگفت و شنود است
معائینہ مرا کرد است واصل | حقیقت بود او شد جان و ہم دل
معائینہ دل و جانم یکے کرد | زدیدار خود ایں جایگہ کرد (ص۵۱۲)

ان مثنویوں کی مرکزی شخصیت حسین بن منصور حلاج ہی، جس کو مصنف ہمیشہ منصور کے نام سے یاد کرتا ہی۔ یہ مثنویاں گویا اس کے اقوال و افعال و کرامات کی داستانیں ہیں۔ مخلوق خالق کے لیے، اور عبد معبود کے لیے جس قدر احترام دکھا سکتا ہی، وہ سب احترام منصور کے لیے دکھایا گیا ہی۔ خود منصور اپنے لیے ایسی زبان استعمال کرتا ہی، جو بشریت کی حدود سے گزر کر الوہیت کی فضا میں دم لیتی ہی، اور بندے اور خدا میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ حلاج کے جو قصّے یہاں ملتے ہیں، عام طور پر معلوم بھی نہیں۔ منصور کی طفلی کی ایک حکایت کلیات میں صفحہ ۵۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۶۹ پر ختم ہوتی ہی۔ میں اس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں:۔

مصنف کا بیان ہی کہ میں نے اپنے پیر سے سُنا ہی کہ چین میں ایک تاجر تھا، جو سفر کا بے حد شائق تھا۔ اس بوڑھے تاجر کے ایک لڑکا تھا، چندے آفتاب و چندے ماہتاب، جس قدر حسین و جمیل تھا اسی قدر متقی اور راست باز تھا۔ خدا کے ذکر کے سوا کوئی چیز اس کو پسند نہ تھی۔ ایک مرتبہ یہ لڑکا اپنے باپ کے ہمراہ سفر کو گیا، راستے میں ایک دریا آیا جس کو عبور کرنے کے لیے انھیں کشتی میں بیٹھنا پڑا۔ اتنے میں ملّاح نے کہا کہ: طوفان آ گیا ہی۔ لڑکے نے اپنے باپ سے کہا: بابا جان! یہ خوفناک مقام ہی آؤ کشتی چھوڑ دیں، اور کہیں چل کر پناہ لیں، کیونکہ مجھے الہام ہوا ہی۔ باپ نے کشتی میں ٹھیرنے کے لیے اصرار کیا اور کہا: اے فرزند! نادانی نہ کر اور طفلی کی ضد سے باز آ، اور بتا کہ یہ بات تجھ کو کس طرح معلوم ہوئی۔ اُس نے جواب دیا کہ جب تمھارے پاس دولت کثیر ہی تو پھر کیوں دریا کے سفر سے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہو۔ تاجر نے جواب دیا: اے فرزند! دنیا ایک عزیز مقام ہی اور انسان ایک رُپے

کے دس رُپے کرنے کی غرض سے تمام خطروں کا مقابلہ کرتا ہی۔ دیکھو اپنی اسی کشتی میں بڑے بڑے تاجر موجود ہیں اور سب اسی امید میں آئے ہیں کہ نفع کمائیں۔ لڑکے نے جواب دیا: اے پدرِ محترم! اس سے کیا فائدہ، دریا میں آنے اور فنا ہونے سے حاصل؟ تمھیں ابدی نیک نامی کے استحصال کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ سب لوگ رُپیہ اور دولت بٹورنے والے ہیں اسی لیے امید و بیم کی دو عملی میں گرفتار ہیں، محض دنیا کمانا جانتے ہیں اور عقبیٰ کا کوئی کام نہیں کرتے، اِن کے درمیان مجھ کو بٹھا کر تم نے خود مجھے اپنی نگاہوں میں ذلیل بنا دیا۔ افسوس! اس مقام سے مَیں اور کہیں جا بھی نہیں سکتا۔ تاجر نے کہا: لڑکے! خاموش رہ، یہ بات تھی تو تُو آیا نہ ہوتا اور اب آگیا ہی تو جھگڑا نہ کر۔ میرے لیے دُنیا میں سب سے عزیز شے تو ہی اور تیرے ہی لیے یہ تمام صعوبتیں برداشت کرتا ہوں۔ تجھے ساتھ لانے سے میرا مقصد یہ ہی کہ تو بھی کچھ تجربہ کار ہو جائے۔ لڑکے نے کہا: بادا جان! مَیں دُنیا داری کی باتیں سننا نہیں چاہتا، مجھ سے اگر کوئی ذکر کرو تو شریعت کا کرو۔ مَیں سیمرغ بحرِ لامکاں ہوں اور نورِ شرعِ مصطفےٰ ہوں جس طرح دریا کے عجائبات لاتعداد ہیں، میرے اسرار بھی غیر متناہی ہیں۔ تاجر نے کہا: فرزند! یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات! اپنی حد سے قدم نہ بڑھاؤ بے عقلی کی باتیں نہ بنا، اس میں تیری سُبکی ہی، تو نے ایک بات پوچھی تھی مَیں نے اس کا جواب دے دیا۔ بھلا حقیقت کہاں اور تُو کہاں، تُو تو ابھی نادان لڑکا ہی۔ لڑکے نے کہا: بادا جان! مجھ کو لڑکا نہ سمجھو، مجھ میں نمود عشقِ ربّانی ہی۔ اگر تم اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہو تو خیر، مگر مجھ کو گمراہ کرنے کی کوشش مت کرو، میں سب سے فارغ اور سب سے آزاد ہوں

میری رہنما عین ذات ہی، تم بے شک میرے پدر محترم ہو، لیکن میری حقیقت سے واقف نہیں۔ تم کشتی دیکھتے ہو اور میں دریا کو دیکھتا ہوں، میں اِس بحر میں گوہر اِلّا دیکھتا ہوں۔ اب تاجر کو خیال ہُوا کہ لڑکا دیوانہ ہو گیا ہی۔ کہنے لگا: لڑکے! یہ سودا تجھ کو کب سے ہوا ہی کہ تو اپنے آپ کو واصلین میں شمار کرنے لگا، اگر اب خاموش نہ رہا تو میں تجھے دریا میں پھینک دوں گا، میری عقل حیران ہی کہ تو حدود سے باہر نکلا جا رہا ہی، تجھ کو لازم ہی کہ "عیانِ عقل" سے کام لے۔ لڑکے نے جواب دیا: باوا جان! تمھیں یہ خیال ہی کہ میں کوئی جنیت ہوں، حالانکہ عالمِ جاں میں سب عینِ جاناں ہیں۔ اس کشتی میں میں ایک بحرِ اعظم ہوں، اگرچہ تمھارے ساتھ بحرِ ہستی میں ہوں؛ لیکن میں اپنی صدف کا دُرِّ یگانہ ہوں۔ میں یہ باتیں کیوں نہ کہوں، جب جانتا ہوں کہ راست ہیں۔ تم نے مجھ کو دریا میں پھینک دینے کی دھمکی دی، میں کہتا ہوں تم ضرور اُسے پوری کرو۔ میں اسرارِ حقیقت کا مالک ہوں اور انوارِ طریقت میرے دیکھے بھالے ہیں۔ اگر تم نجاتِ دارین حاصل کرنی چاہتے ہو تو مجھ کو اس بحرِ ہستی میں تنہا چھوڑ دو۔ تقلید میری دامنگیر نہیں ہی، میں اس دریا سے نکل جاؤں گا تمھارا خیال ہی کہ میں غرق ہو جاؤں گا لیکن میں کہتا ہوں کہ مجھ کو کون و مکاں سے باہر اُڑ جانا چاہیے۔ میں ذات ہوں، پھر کس لیے کشتیِ صفات میں رہوں، مجھ کو خدا کا حکم ہی کہ دفعتاً گم ہو جاؤں۔ اس دریا میں میں منصور ہوں اور تمام عالم میں مشہور ہوں۔ کونین میرے اسرار ہیں، لیکن میں نامحرموں کی آنکھوں سے مخفی ہوں۔ میں اسرار کا دریاے لاہوتی ہوں، جو دریا میں ناپایدار ہو جائے گا۔ علم و حکمتِ حق کا دریا ہوں، رازِ مطلق کو افشا کروں گا۔ دریاے علم اور بحرِ تنزیل ہوں اور صورت کو

تبدیل کر دوں گا ۔

دریں دریا منم بابا الٰہی	گواہی می دہندم ماہ وماہی
دریں دریا منم اللہ بنگر	نمود دید "الا اللہ" بنگر
منم بابا نمود ار الا اللہ	دریں دریا منم عین ہو اللہ
منم منصور و بنمایم ترا دید	کہ می گوئی ایا من عین تقلید

(صفحہ ۵۶-۵۷)

جب یہ جوش بھرے الفاظ کشتی والوں نے سُنے سب دنگ رہ گئے آخر وہ قطب سرفراز جو ہر احترام کا مستحق تھا، اُٹھا اور کہنے لگا: اب تمھارے ساتھ رہنے میں مجھ کو تکلیف ہوتی ہے، اس لیے رخصت ہوتا ہوں۔ اے پدرِ محترم!

وداعت کردم دخواہم شدن زود | زبہر شرع از من باش خوشنود (ص ۵۷)

میں جاتا ہوں اور میرا راز اکسٹھ سال کے بعد بغداد میں ظاہر ہوگا۔ کیا تم نے سورۂ طٰہٰ نہیں پڑھی:۔

درختے دید موسیٰ آں شب از دور	ز صد سالہ رہ آں جاگہ پُر از نور
بیک جذبہ بشد آں نیک بخت او	ز قربت تا سوے نور درخت او
ہمی زد آں درخت "انّی انا اللہ"	کہ گردد از نمود شاہ آگاہ
درختی یافتت ایں قربت دوست	کہ می داند کہ بود لبودش از اوست
روا است "انّی انا اللہ" از درختے	ز وصل ایں جا بگوید نیک بختے

سلہ یہ استدلال اگرچہ یہاں بے محل واقع ہوا ہے لیکن صوفیانہ نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں کیونکہ شیخ عطار اپنے تذکرے میں (صفحہ ۱۳۶، جلد دوم) اس کو بیان کرتے ہیں: "مرا عجب آمد از کسے کہ روا دارد کہ از درختے "انا اللہ" برآید۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۷ پر ملاحظہ ہو

روا است انی انا الحق گر بگوئی | بوقتے کز خودی خود نگوئی
چو حق دیدم پدر در عین تحقیق | حقیقت حق شدم از سِرّ توفیق

(صفحہ ۵۷-۵۸)

منصور اس کے بعد حقیقت اعیان وصفات کُل اور دُنیا سے قطع تعلق پر اپنے خیالات سُناتا ہی، اس کے بعد ایک بوڑھا جو واصلین میں سے تھا منصوؔر سے سوالات کرتا ہی اور منصور ان کے جواب دیتا ہی، آخر بوڑھا اُس کا معتقد ہو جاتا ہی۔ منصور زور دیتا ہی کہ جہان جان، طلب کرو اور باقی سب قیل و قال چھوڑ دو۔ اپنی خودی سے مرجاؤ اور بر قیعِ صورت کو اُتار کر پھینک دو۔ دریا سے جواہرات معنی رولنا چاہییں۔ کشتی کا کیا کروگے وہ محض نمود خودی ہی۔ اسی کشتی نے ہفتاد و دو دست کو غرق کردیا۔ البتہ ایک اور کشتی ہی اور وہ کشتی حقیقت ہی، اس میں محمد (صلعم) اور علی (کرم) مقیم ہیں، تم اُن کا دم بھرو اور گوہر مُراد حاصل کرو۔[1]

ز دریا جوے دریاے معانی | ز کشتی جز نمود خود ندانی

(صفحہ ۴۸۶ کا بقیہ حاشیہ)

درخت درمیان نہ چرا روا نباشد کہ از حسین انا الحق برآید وحسین درمیان نہ" پھر یہی شعر انھوں نے خسرو نامہ - (طبع ثمر ہند) میں یوں لکھا ہی:-

روا است انی انا اللہ از درختے | چرا نبود روا از نیک بختے

پروفیسر آذر کے کلیات میں بھی موجود ہی۔ لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہی کہ یہی شعر بجنسہ مثنوی گلشن راز محمود چبستری میں بھی موجود ہی۔ صاحب جوہر الذات عطار کے اشعار کو اکثر مسخ کردیا کرتا ہی، چنانچہ اس شعر کے متن میں بھی اصلاح کردی ہی۔

[1] پُرانی روایات منصور کو شیعہ بیان کرتی ہیں۔ مجالس المومنین میں بھی شیعہ تسلیم کیا گیا ہی۔

دریں کشتی بسے گشتند غرقہ | دریں بودند ہفتاد و دو فرقہ
یکے کشتی دیگر ہست دریاب | دراں کشتی حقیقت رو و بشتاب
محمد با علی آں جا مقیم است | ازاں ذرات کل بازرس دبیم آت
دم ایشاں زن و ہر دو جہاں شو | نمودار زمین و آسماں شو

جب منصور یہ باتیں کر چکا، اُٹھا اور لوگوں کی نظروں سے غائب ہوگیا تماشائی حیران رہ گئے، بوڑھے باپ نے ایک نعرہ مارا اور بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش میں آیا سمندر میں کود پڑا اور جان دے دی[۵]۔

منصور سے ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ تم جو 'راز مطلق' بننے کا دعویٰ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ حق کو میں نے عین مطلق دیکھا ہے، مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم کو غیب کے حالات کس طرح معلوم ہو گئے اور اپنے قتل کے متعلق تم نے کیسے اطلاع حاصل کر لی؟ منصور نے جواب دیا کہ میں نے اپنے قتل کی 'نمود' کو دیکھ لیا ہے، بغداد میں میرا سر برباد ہوگا، یہ باتیں مجھ پر منکشف ہوگئی ہیں۔ حج کے راستے میں منصور سے یہ سوال کیا گیا تھا۔ سائل نے دوبارہ کہا: غیب کی بات خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اس لیے مجھ کو تمھاری بات پر یقین نہیں آتا، البتہ اگر کوئی زبردست شہادت (نمود) دو اور کوئی راز دکھاؤ تو مانوں گا۔ منصور نے جب یہ بات سُنی، اپنی نگاہ اس پر جما دی اور کہا: تو میری 'دید دید' میں اچھی طرح سے دیکھ! کیونکہ میں وہی ہوں جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے:-

نظر نیکو کن اندر دید دیدم | کہ من ہستم کہ جملہ آفریدم (۲۴۹۳)

اب جو سائل نے غور سے دیکھا تو اُس کو آسمان ہفتم سے بھی بلند پایا۔

۵؎ منصور کی طفلی کی یہ حکایت کسی تذکرے میں نہیں ملتی۔

حیرت و استعجاب سے اُس پر محویت طاری ہوگئی اور مست لقا رہ گیا۔ اہلِ قافلہ یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پوچھنے لگے کہ اے منصور تو نے اس پر کیا کر دیا ہے؟ منصور نے کہا کہ مَیں نے اس کو نور دکھا دیا ہے، وہ تمام باتوں سے بے خبر ہے اور دیدار مولیٰ میں مستغرق ہے۔ اِس وقت وہ جسم و جاں سے صاف ہو کر دیدار عین العیان میں محو ہے، جب ہوش میں آئے گا، تب بولنے لگے گا۔ یہ کہہ کر اس نے اشارہ کیا اور کہا کہ اب ہوش میں آجا۔ وہ مرد ہوش میں آتے ہی اُس کے قدموں میں گر گیا اور رونے لگا بولا کہ مجھ پر تیرا عین العیان ظاہر ہوگیا، مَیں تیرا غلام ہوں اور تو سلطان آفاق ہے اور دُنیا میں تیرا ہی شور ہے۔ یہ کہتے کہتے اُس نے ایک نعرہ مارا اور جان دے دی۔ قافلے والوں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو ان میں جو صورت پرست تھے، اُنھوں نے ایک شور مچا دیا، کہنے لگے کہ اِس شخص نے جادو سے کام لیا ہے، اِس لیے قتل کا مستوجب ہے۔ منصور نے اُن سے کہا: اے گمراہو! مَیں دیدار الٰہی ہوں، مجھ میں یہ طاقت موجود ہے کہ تمھارے شور و غوغا کو فرو کر دوں، لیکن اظہار راز کا یہ وقت نہیں، کیونکہ تمھارے درمیان ایک پیر واصل موجود ہے، جو صاحب درد ہے، مجھ کو اُس کی خاطر منظور ہے، لہذا تم کو معاف کرتا ہوں۔ یہ الفاظ کہے اور قافلے والوں کی آنکھوں سے غائب ہوگیا۔[۱] (صفحہ ۲۴۹-۲۵۱)۔

جوہر الذات میں حکیم ناصر خسرو کا ذکر بھی احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ سلسلہ کلام یہ ہے کہ: خون کی اصل کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ خون کی اصل حیوان اور نبات سے نہیں ہے، بلکہ نبات کی اصل فیض ہے اور فیض کی اصل نور ذات ہے۔

---

[۱] اس حکایت کے متعلق بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں۔

اور جان و دل کی اصل قطرۂ خون نہیں ہی[۱]۔ لیکن یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہی۔ تم یوں سمجھ لو کہ فیض نور سے نبات ظاہر ہوتی ہی اور حیوان کو زندگی دیتی ہی، اس فیضِ نبات اور وجود حیوانی سے جسم انسان پیدا ہوتا ہی۔ حکما نے اس بارے میں بہت کچھ بحثیں کی ہیں اور اس کی تشریح میں کتابیں بھر دی ہیں، لیکن ناصر (خسرو) نے اِس سِر کو معلوم کیا، یہ حکیم ایک سِرِ پاک تھا۔

ولیکن کرد ناصر سِرّ اظہار ببایدمی بسفتن آں بناچار (ص ۳۱۹)

حکمت میں اُس کا کمال عین الیقین کی حد تک تھا، اس لیے وہ مخلوق سے پوشیدہ ہوگیا۔ اور اس طرح چھپ گیا، گویا صورت اور معنے کے پردے ہی سے غائب ہوگیا۔ جس طرح حکمت میں سب پر غالب تھا اسی طرح اسرار میں پیش پیش تھا۔ آخر میں اُس نے عزلت اختیار کرلی اور عین ذاتِ قربت تک پہنچ گیا۔ خدائے پاک نے اُس کی حکمت میں اس قدر ترقی دی کہ اُس کو خدائے بیچوں کا دیدار بھی میسر ہوگیا۔ جب اُسے جمال ربّانی حاصل ہوگیا، مخلوق سے متنفر ہوگیا۔ اُس نے دیدار خداوندی کیا اور عین اس کی ذات بن گیا، خدا میں پنہاں ہوگیا اور اس پر تمام راز منکشف ہوگئے۔ اس کا اکثر بیان عقل اور جان کے متعلق تھا۔ کیونکہ اس کی عقل اور جان عین العیان تھی۔ وہ کوہِ قناعت کی طرف چلاگیا اور اس قربت میں پابند سلوک رہا اور چھُپ گیا۔ قاف قربت میں پہنچ کر اپنے اوپر دنیا کا دروازہ بند کردیا۔ اور فنا کا دروازہ کھول لیا۔ اِس قاف قناعت میں اس قدر رہا کہ حد و برہان کو اس کے وجود سے راحت ملی۔ دُنیا کے اور حکیم اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ جو شخص قاف

---

[۱] کیا عطار جیسے فاضل طبیب سے خون کی اصلیت پر اسی قسم کی تحقیقات کی توقع کی جاسکتی ہی۔

قناعت میں مسکن بنالیتا ہی، تین باتیں اختیار کرلیتا ہی، کم آزاری، کم خوری اور عبادت۔ اصل مردانہ ہونی چاہیے، پھر تو آدمی ناصر خسرو کی طرح اپنے مطلوب تک پہنچ سکتا ہی:-

ہر آنکو اندریں قاف قناعت گریزد، پیش گیرد، ہر سہ عادت
کم آزاری و کم خوردن حقیقت پس آنگہ طاعت از عین شریعت
بباید اصل اوّل ہمچو مرداں رسد چوں ناصر خسرو بجاناں (ص۲۱۹)

جوہر الذات میں منصور اگرچہ ہر وقت مصنف کے پیش نظر ہی، تاہم اِس مثنوی میں خارجی مضامین بھی کافی موجود ہیں، لیکن یہ ہیلاج نامہ ہی جو تمام و کمال منصور کے ذکر اور اس کے کمالات ومقالات سے لبریز ہی۔ اِس کتاب میں بڑے بڑے صوفی مثلاً جنید، بایزید، شبلی اور شیخ کبیر عبد اللہ خفیف اور عبد السلام، منصور کے معتقد اور مداح کی حیثیت سے دکھلائے گئے ہیں۔ وہ باری باری منصور سے اسرار وحقائق پر سوالات کرتے ہیں اور منصور اُن کے جواب دیتا ہی۔ بعض اس کے متعلق متشکک بھی ہیں، تاہم اس کے سامنے مجال دم زدن نہیں رکھتے۔

شیخ کبیر عبد اللہ خفیف شیراز میں رہتے ہیں اور اُن کے اور منصور کے درمیان ایک راز ہی۔ منصور کے تعلقات اُن سے قدیم ہیں اور یہ بھی اس کے سرگرم معتقد ہیں۔

عبد السلام یہ ایک غیر معروف بزرگ ہیں، اگر منصور کے بیحد معتقد، اپنے پیر کے کہنے سے منصور کے عقیدت مند ہیں اور پیر کو منصور کا راز حضرت خضر کی زبانی معلوم ہوتا ہی۔

جنید کو منصور کے متعلق کچھ شکوک ہیں۔ خود براہ راست منصور کے

سامنے بیان کرنے کی جرأت نہیں کرتے اور شیخ کبیر سے کہتے ہیں کہ دیکھیے ہمارے زمانے میں بے شمار اولیا ہیں اور اُن سے پیشتر بھی گزرے ہیں وہ سب واصلین میں سے تھے اور خدا کے نزدیک ان کے بڑے درجے تھے لیکن کسی نے انا الحق نہیں کہا سب کے سب ہو الحق کہتے رہے، خود رسول پاکؐ نے ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ رسولؐ نے لوگوں کو شریعت کی دعوت دی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حدود میں قائم رہی۔ شریعت صرف اسی لیے ہو کہ نیک و بد اور حق و باطل میں تمیز کر دے۔ اب زرا اس منصور کی کیفیت ملاحظہ کیجیے کہ ہر دم انا الحق کے نعرے لگا رہا ہی، روشنی اس سے دور ہو گئی ہی، کیونکہ شرع محمدی سے بھٹک گیا ہی، عوام الناس جاہل ہیں، ان کو ہمارے قرب کی کیا خبر، اِس لیے ہر کس و ناکس کے سامنے اس راز کا افشا کرنا قرین مصلحت نہیں۔

منصور شیخ کبیر کو خطاب کر کے جواب دیتا ہی:۔ شیخ کبیر تم نے سُنا جو جنید نے شرع کے متعلق کہا؟ مجھ کو بایزید نے مان لیا، لیکن یہ نہیں مانتے۔ مَیں ان کو معذور سمجھتا ہوں، بایزید کے پیر ہوئے تو کیا ہوا۔

اگرچہ شیخ و پیر بایزید است ولیکن پختہ و بس نارسید است (ص ۲۳۶)

حالانکہ تم نے میرے وہ تمام خوارق جو مَیں نے تری و خشکی پر کیے ہیں، جب کہ ڈھائی سال تک مَیں اور تم ساتھ رہے، بیان کر دیے ہیں اور یہ سب باتیں واقعیت سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن جنید ہیں کہ شرع پیش کرتے ہیں اور مجھے دیوانہ قرار دیتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ مَیں اپنی 'عین منزل' پر پہنچ گیا ہوں اور تمام حجاب دور ہو چکے ہیں۔ جب مَیں 'نمودارِ خدا' ہوں تو انبیا اور اولیا سب کچھ مَیں ہوں۔ خدا مجھ سے ہم کلام ہی۔ کیا رسول اللہؐ سے صرف

جنید ہی واقف ہیں، بچہ بچہ جانتا ہی کہ محمد (صلعم) ہمارے ہادی ہیں لیکن حقیقتِ محمدیہ سے کون واقف ہی؟ محمد (صلعم) مجھ میں ہیں، درحقیقت وہی میرے رہنما ہیں اور یہ محمد (صلعم) ہیں، جو انا الحق کہ رہے ہیں:

محمد می زند در ما انا الحق ہمی گوید سراسر سِرّ مطلق
وصال مصطفٰی درجان منصور چو خورشید است کل نور علیٰ نور (ص ۳۴۴)

محمد (صلعم) نے جو یہ راز آشکارا نہیں کیا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کو دعوت شریعت منظور تھی، اس لیے حقیقت کو آشکارا نہیں کیا اور شریعت ہی بیان کرتے رہے، حقیقت انھوں نے صرف علیؓ کو بتائی۔ اگر جنید میرا عین الیقین حاصل کرلیں تو میں اُنھیں دکھادوں کہ مصطفٰی مع تمام انبیا یہاں موجود ہیں۔

اگر ایں جا جنید پاک دینم بیابد یک زماں عین الیقینم
نمایم مصطفٰی اورا دریں دم تمامت انبیا با دید آدم (ص ۳۴۴)

بایزید منصور کے اس قدر عقیدت مند ہیں کہ اپنے آپ کو اس کا غلام غلامان بیان کرتے ہیں ؎

تو دیدی آنچہ ایں جا کس ندیدست غلامے از غلاماں بایزید است (ص ۲۰۹)

خود منصور اپنے لیے ایسے دعوے کرتا ہی، جو ولایت اور نبوت سے گزر کر الوہیت کی حدود میں داخل ہیں:-

تعالی اللہ منم منصور حلاج ہمہ بر رحمت من گشتہ محتاج
تعالی اللہ منم خورشید و اختر مرا گویند کل اللہ اکبر
تعالی اللہ منم ایں جا خداوند وجود خویش ازمن جملہ پیوند
الست اندر ازل گفتم ابد را نمایم چوں نمودم نیک و بد را

خداوندی مرا زیبد کہ دانم
تمامت در یقیں راز نہانم
ز صنع آفرینش جملہ پیداست
ز نور ذاتم ایں جاگہ ہویداست
یکے ذاتم منزہ در ہمہ من
فگندہ در تمامت دمدمہ من (ص ۱۴۵)
بجز منصور ایں جانیست اللہ
کہ از اسرار رحمٰن وے آگاہ
خدا منصور و منصور است خالق
وصال اینست ایں جائے خلائق
خلائق من خدایم تا بہ بینند
نمودم می نمایم تا بہ بینند
خلائق من خدایم در نمودار
ز عشق خویش امروزم بر دار
خلائق من خدایم چند گویم
ہمہ خواہند تا پیوند جویم (ص ۷۵۴)

خود مصنف منصور کے عشق میں اس قدر سرشار ہی کہ اس کا جذبہ محویت اور فنائیت کی حد تک پہنچا ہوا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ جب تک میں زندہ ہوں اُسی کے اسرار بیان کرتا رہوں گا بلکہ یہ منصور ہی ہی جو میری جان میں بول رہا ہی :-

بجز حلاج چیزے می ندانم
کہ با وے گویم و از وے بخوانم
زنم ہر لحظہ دم از عشق منصور
اگرچہ می نماید در دلم شور
مرا تا جاں بود زو راز گویم
ازو در قصہ مردم باز گویم
مرا تا جاں بود در دیر فانی
ہمہ گویم ازو سرّ معانی
ہمہ منصور می بیند درونم
ہمو خواہد بد آخر رہنمونم
حقیقت اوست ایں دم ہر گفتار
کہ می گوید درون جان عطار (ص ۶۸۸)

ایک نہایت عجیب امر یہ ہی کہ مصنف نے جہاں منصور کو پچاسوں مقام پر خدا کہا ہی، وہاں متعدد موقعوں پر رسول اللہؐ اور حضرت علیؓ کو بھی خدا کے نام سے یاد کیا ہی :-

محمّد را شناس این جا خدا تو دگرنہ اوفتی اندر بلا تو (ص ۴۱۰)
علیؓ با مصطفٰےؐ ہر دو خدایند کہ دم دم راز درجاں می نمایند (ص ۶۹۳)
علیؓ با مصطفٰےؐ ہر دو خدایند نمودند و دگر کل می نمایند (ص ۳۵۰)

تمام مورخین کے برخلاف مصنف حضرت اسمٰعیل کی قربانی کا قائل ہونے کے باوجود حضرت اسحٰق کی شہادت میں بھی اعتقاد رکھتا ہے:۔

اگر کشتہ شوی مانند اسحاق تو باشی بے تنکے دیدار آفاق (ص ۳۶۱)
اگر ہم بود اسحاق گزیدہ زعشق روے تو شد سر بریدہ (ص ۳۶۹)
گہے در کسوت اسحٰق گردی بریدہ سر بخود مشتاق گردی (ص ۳۸۱)
چناں کن خویش را تسلیم مشتاق کہ سر ببریدہ اندر عشق اسحاق (ص ۲۲۴)

جوہر الذات اور ہیلاج نامہ جس قدر مشہور ہیں، معلوم ہوتا ہے اس قدر پڑھی نہیں گئیں، ورنہ اُن کی شہرت اب تک ماند ہوجاتی۔ کتابیں کیا ہیں، دریاے اعظم ہیں، جن کی گود میں تیس بتیس ہزار اشعار موجیں مار رہے ہیں۔ فارسی ادبیات میں شاید اِس قدر تھکا دینے والی، غیر دلچسپ، کُند اور دل اُچاٹ کردینے والی کوئی کتاب نہ ہوگی جیسی یہ کتابیں، جو عطار کی طرف خدا جانے کس گناہ میں دنیا نے منسوب کی ہیں۔ علمی و ذہنی لحاظ سے اُن کا شمار ادنیٰ درجے کی تصنیفات میں ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ باوجود کوششِ بلیغ، میں ان مثنویوں کو پورا ختم نہ کرسکا، نہ مجھ میں، حالانکہ مجھ کو اقرار ہے کتابوں کے معاملے میں خاصہ تحمل ہے، اس قدر تاب تھی کہ اُن کو پورا پڑھ سکوں۔ ممکن ہے کہ کوئی اور صاحبِ ذوق جن میں مجھ سے زیادہ استقلال ہے، اِن کے نشیب و فراز اور معلومات سے ہم کو اطلاع دیں۔

اِن مثنویوں میں خوارق، اسرار اور کرامات کی فضا پیدا کردی گئی ہے۔

جو بہت کچھ عطار کی واقعیت پسند طبیعت کے منافی ہی۔ مصنف خواب دیکھنے اور بشارتیں سننے کا عادی ہی۔ وہی مسائل جن کو شیخ اپنی عقل اور استدلال کے زور سے حل کر دیا کرتے ہیں، اِن مثنویات میں اسرار بن گئے ہیں معمولی سے معمولی مسئلہ ہمارے مصنف کے نزدیک ایک بستر ہی اور یہ بستر بغیر کسی انکشاف کی کوشش کے ایک طویل سمع خراشی کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہی۔ پھر کسی اور بستر کی باری آتی ہی اور اُس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہی۔ ہر مضمون اِس کی علمی اور دماغی استعداد کی بے بضاعتی کا راز الم نشرح کر رہا ہی۔ عربی اس کو آتی نہیں، مجھ کو اس کی فارسی دانی میں بھی تنگ ہی۔ ہمارا ناظم صرف الفاظ کو وزن کا جامہ پہنانا جانتا ہی۔ قافیے کا بھی چنداں پابند نہیں، مل گیا تو خیر، نہ ملا تو وزن ہی پر گزارا کر لیا۔ سلسلۂ بیان غیر منتقل، طویل اور بے ترتیب ہی۔ جیسے کسی مجذوب کی بڑ یا کسی نیم مست کی ہذیاں سرائی۔ جو مطلب اس کو ادا کرنا ہوتا ہی اُس کے لیے الفاظ نہیں ملتے اور جو الفاظ ملتے ہیں وہ مطلب ادا نہیں کرتے۔ اِس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ شعر اکثر مبہم اور مہمل بن کر رہ جاتا ہی۔ شاعر کا ذخیرۂ الفاظ بے حد محدود ہی، حالانکہ بتیس ہزار اشعار لکھے ہیں، لیکن اِس کثیر ذخیرے سے ہم چند نئے لغت بھی نہیں سیکھتے۔ یہی حالت اس کی معلومات کی ہی۔ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں قدم قدم پر جدید اطلاع دیتے ہیں اور ان کی مثنویاں تاریخی دل چسپی کا قابل قدر سامان بہم پہنچاتی ہیں، لیکن اس بے مایہ شاعر کی جھولی میں جو لحظہ بلحظہ ہمیں یاد دلاتا ہی کہ مَیں عطار ہوں، سوائے منصور کی چند حکایتوں کے جن کو نہ تاریخ جانتی ہی اور نہ روایت پہچانتی ہی، جدید معلومات کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں۔ جو مطلب ایک شعر میں کہا جا سکتا ہی، شاعر اسی مطلب کو دس شعر میں ٹھنک

ٹھٹک کر اور رُک رُک کر بیان کرتا ہی۔ اس طرح حشو و زوائد نے ایک ممتاز حیثیت اختیار کر لی ہی اور طوالت اِن مثنویوں کا عام جوہر بن گئی ہی۔ ان کتابوں کا بدترین پہلو ایک ہی خیال کی بار بار تکرار ہی، جس سے قاری نہ صرف اُکتا جائے گا، بلکہ دِق ہو جائے گا۔ وہی ایک بات ایک دفعہ نہیں کہی گئی بلکہ دس مرتبہ۔ اس پر بھی قناعت نہیں، دس مرتبہ اور تکرار کی۔ چند ورق لوٹیے تو بیس مرتبہ پھر وہی خیال دُہرایا گیا ہی۔ اشعار کیا ہیں، پلٹنیں ہیں، جو الگ الگ وردی پہنے کھڑی ہیں۔ مثلاً:۔

زشاگردان خود آگاہ می باش — ولیکن از دروں با شاہ می باش
زشاگرداں نظر کن راز بیچوں — کہ ایشانند نور ہفت گردوں
زشاگرداں نظر کن خویش بنگر — ترا بنہادہ سر در پیش بنگر
زشاگرداں نظر کن تا بدانی — کہ از ایشاں حقیقت باز دانی
زشاگرداں نظر کن راز بنگر — ہمی انجام و ہم آغاز بنگر
زشاگرداں نظر کن ہفت گردوں — حقیقت بعد ازاں مرُ راز بیچوں

(ص ۴۵۹)

مَیں اسی قدر نمونے پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ "زشاگرداں نظر کن" کی پلٹن کے ابھی سترہ جوان اور باقی ہیں۔ مَیں ناظرین سے استدعا کرتا ہوں کہ اِن اشعار کے معنوں پر غور نہ کی جائے اگر بالفرض ایسا کیا جائے تو غالب مرحوم کا یہ مصرع بھی یاد رہے۔ ع

یہ ہی وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہُوا

کچھ اِن اشعار پر حصر نہیں، تمام کتاب اسی صنعت میں لکھی گئی ہی ——
زرا "ترا ایں جاست" کا رسالہ ملاحظہ ہو:۔

ترا ایں جاست ز ان نیشان نبیدی | تو از آنساں بجاناں کل رسیدی
ترا ایں جاست وصل و روشنائی | حقیقت نور دیدار خدائی
ترا ایں جاست بود کل مسلم | کہ دید ہستی زخود دیدار آدم
ترا ایں جاست آدم آشکارہ | تو در او، او بتو ایں جا نظارہ
ترا ایں جاست آدم تا کہ دیدی | کہ در دم دید آدم را بدیدی

(صفحہ ۵۰۲)

اس رسالے میں اڑتیس سوار ہیں۔ اس کے بعد "دل آگاہ" کا توپخانہ ہے، جس میں تین اوپر چالیس توپیں ہیں :-

دل آگاہ می باید دریں راز | کہ دریابد وصال ایں جایگہ باز
دل آگاہ می باید دریں جا | کہ ایں در باز بکشاید دریں جا
دل آگاہ می باید دریں سر | کہ اسرارش ہمہ آمد بظاہر

(صفحہ ۵۰۴)

اس کے عین بعد "ہمہ وصلست" کے بائیس اونچی کھڑے ہیں :-

ہمہ وصلست ہجراں رفت از پیش | ہمہ جانست مرجاں رفت از پیش
ہمہ وصلست و دیدار است ایں جا | دلت جاناں نہ پندار است ایں جا
ہمہ وصلست و دیدار است بیچوں | ولیکن تو شدہ ایں جا دگرگوں

(صفحہ ۵۰۵)

الغرض کہاں تک لکھا جائے، یہی ایک ایسا مہیب منظر ہے، جس کو ان مثنویوں کا سیاح ہفتخوان رستم سے زیادہ دشوار گزار اور ناقابل عبور مانتا ہے۔ جوہر الذات کی پہلی جلد میں (جو نسبتاً میرے مطالعے میں زیادہ آئی ہے) موقعے موقعے پر اعلیٰ درجے کی شاعری کے نمونے ملتے ہیں اور میرے لیے

یہ امر موجب حیرت تھا کہ وہی شخص جس کی دماغ سوزی بالعموم ایک مبتذل قسم کی تک بندی پیدا کرنے کی عادی ہو ایسے نفیس اور عمدہ اشعار لکھ سکے، مثلاً:-

الا اے جان و دل را درد دارو ۔۔۔ تو آں نوری کہ لم تمسسہ نارٗ
تو در مشکات تن مصباح نوری ۔۔۔ ز نزدیکی کہ ہستی دُور دوری
ز روزنہاے مشکات مشبک ۔۔۔ نشیمن کردہٗ خاک مبارک
زجاجہ بشکن و زیت بروں ریز ۔۔۔ بنور کوکب دُرّی در آویز
ترا با مشرق و مغرب چہ کارست ۔۔۔ کہ نور آسماں گردت حصارست
[زبینایٔ مداں ایں فرد فرہنگ[۱] ۔۔۔ کہ کنجشکے بہ بیند بست فرسنگ]

(صفحہ ۲۹)

یا یہ اشعار:-

نگرمی کرد درویشے نگاہے ۔۔۔ دریں دریاے پُر دُرِّ الٰہی
کواکب دید چوں دُرِّ شب افروز ۔۔۔ کہ شب از نور ایشاں بود چوں روز

---

[۱] خطوط ہلالی میں نے ڈالے ہیں، کیونکہ یہ شعر اشعار گزشتہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، لیکن جوہر الذات کے قلمی نسخوں میں اسی مقام پر ملتا ہے۔ اسرار نامہ میں شیخ عطار نے اس شعر کو مع اسی قسم کے دیگر اشعار کے حیوانات پر انسانی تفوق کے استدلال میں لکھا ہے، چنانچہ:-

بآوازِ خوشش خود سر میفراز ۔۔۔ کہ در ابریشم و نے ہست آواز
خوش آوازیے بلبل از تو بیش است ۔۔۔ کہ سرمست خود و آواز خویش است
زشنوائیٔ خود چنداں بخروش ۔۔۔ کہ بانگے بشنود دہ میل خرگوش
ز بویائی خود رو قصّہ کم گوے ۔۔۔ کہ از یک میل موشے بشنود بوے
و گر بیشی ازیں جملہ ازانی ۔۔۔ کہ بس گویا و بس پاکیزہ جانی

تو گفتی اختراں استادہ اندے — زبان خاکیاں بکشادہ اندے
کہ ہاں اے غافلاں ہشیار باشید — برین درگہ شبے بیدار باشید
چرا چندیں سر اندر خواب آرید — کہ تا روز قیامت خواب دارید
رُخ درویش بیدل زاں نظارہ — زچشمش درفشاں شد چوں ستارہ
خوشش آمد سپہر کوز رفتار — زباں بکشاد چوں بلبل بہ گفتار
کہ یارب بام زندانت چنین است — کہ گوئی چوں نگارستان چین است
ندانم بام ایوانت چسانست — کہ زندانِ تو بارے بوستانست

(صفحہ ۱۹۰)

اب ان اشعار اور اُن مہمل اشعار میں، جو ٹھیک اِن سے پہلے درج ہوئے ہیں، رات دن اور زمین آسمان کا فرق ہی۔ تیں شروع ہی سے ان کو کالاے دزدیدہ مانے ہوئے تھا۔ آخر اسرارنامۂ عطار میں اُن کا سُراغ مل گیا۔ یہ ابیات اسرارنامۂ عطار طبع ایران کے صفحہ ۳۰ اور صفحہ ۱۱۱-۱۱۲ پر ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد مقامات[۱] اور ہیں جہاں تین تین، چار چار، یا پانچ پانچ اشعار

---

[۱] ذیل میں بعض ایسی اور مثالیں ہدیۂ ناظرین ہیں، جن میں صرف شمار صفحات و اشعار پر قناعت کی جاتی ہی:-

جوہرالذات	اسرارنامہ
جوہرالذات، ص ۴۴، اشعار ۱-۲-۳-۴	اسرارنامہ طبع ایران، ص ۴۵، ابیات ۸-۹-۱۰-۱۱
" ص ۵۰، اشعار ۱۳-۱۴-۱۵	" ص ۴۸، ابیات ۱۳-۱۴-۱۷
" ص ۵۰، اشعار ۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲	" ص ۸، ابیات ۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۴
" ص ۱۷، اشعار ۲۲-۲۳-۲۵	" ص ۸۰، ابیات ۶-۷-۸
" ص ۶۹، اشعار ۲۹-۳۰-۳۱	" ص ۱۲۳، ابیات ۱۵-۱۶-۱۷
" ص ۱۰۸، اشعار ۱۷-۱۸	" ص ۹۵، ابیات ۲-۵

اس دزدی کا دائرہ ابھی اور وسیع ہی۔ تلاش سے متعدد مقامات اور نکل آئیں گے۔

اسی اسرار نامہ سے لیے گیے ہیں، بخوف طوالت ان کی فہرست پیش کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہی کہ ان مثنویوں میں جو بہتر اشعار ہیں، بیرونی ہیں اور اسرار نامہ کا تو اس قدر ناس کیا گیا ہی کہ ناگفتہ بہ ہی۔

جب ہم اِن کتابوں کا، عطار کی دیگر تصنیفات سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں اس قدر نمایاں اور زبردست فرق دیکھتے ہیں کہ ہمیں اِن لوگوں پر تعجب ہوتا ہی، جو انھیں عطار کی تصنیف مانتے ہیں۔ 'ابا'۔'ابر' اور 'ابے'، عطار نے اپنی تصنیفات میں استعمال نہیں کیے۔ 'جاگہ'، 'حقیقت' وغیرہ عطار کے تکیہ کلام نہیں، اسرار نامہ عطار نے ساٹھ سال کی عمر میں لکھا ہی جوہر الذات اور ہیلاج نامہ اگر درحقیقت انہی کی یادگار ہیں تو اسرار نامہ کے بعد لکھے گئے ہوں گے۔ اب ایک شصت سالہ پختہ کار شاعر جو ضرورت سے زیادہ پُرگو ہی اور جس کو مضامین اس افراط کے ساتھ سوجھتے ہیں کہ وہ اُن کی کثرتِ آمد سے نالاں ہی، اس دَور کی تصنیف میں اِس قدر بدل جائے گا کہ بالکل نئی زبان اور نئی روش اختیار کرلے گا، اس کی شاعری اِس قدر پھُسپھُسی، گھٹیل اور کوفت پیدا کرنے والی ہوجائے گی، جس سے انسانوں کی طبیعت مکدر ہونے لگے۔ وہی شاعر جس کا خسرو نامہ، نظامی کی "شیریں و خسرو" کے ہم پلّہ مانا جاسکتا ہی، بعد میں ایسی مبتذل شاعری اختیار کرسکتا ہی، مَیں ماننے کے لیے تیار نہیں۔

شیخ عطار، حسین بن منصور حلاج کے مبسوط حالات اپنے تذکرے میں لکھ چکے ہیں۔ وہ اگرچہ حسین کو عبداللہ خفیف، شبلی اور ابوالقاسم کی شہادت پر کاملین میں شمار کرتے ہیں، تاہم کوئی غیر معمولی عقیدت اس کی نسبت نہیں جتلاتے۔ تذکرے کے علاوہ مثنویات میں بھی کئی موقعوں پر

اس کی حکایات ملتی ہیں، اُن میں بھی حسین کو کوئی خاص احترام نہیں دیتے، لیکن جوہرالذات اور ہیلاج نامے میں، حسین ایک ایسے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے، جس کے سامنے جنید اور شبلی جیسے درخشاں آفتاب، شمع بے نور معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس طاقت ورستی سے ادنیٰ ادنیٰ سوالات پوچھتے ہیں اور آخر میں اُس کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ منصور کو اپنے خوارق پر ناز ہے اور اُس کے دعادی اس قدر بلند ہیں کہ استغراق، صحو، اور محویت کے خطِ حد بندی کو توڑ کر حلول اور اتحاد کی ارضِ ممنوعہ میں داخل مانے جاسکتے ہیں۔ حالانکہ خود عطار ہمیں اطلاع دے چکے ہیں کہ زنادقہ کا ایک ایسا گروہ بھی ہوا ہے، جو اتحادی اور حلولی ہیں اور جنھوں نے اپنے آپ کو "حلاجی" مشہور کیا ہے۔ وہ اگرچہ اس کے اقوال کو سمجھے نہیں، لیکن اس کے قتل اور جلائے جانے پر فخر کرتے ہیں۔ چنانچہ بلخ میں دو شخصوں کا وہی حشر ہوا جو منصور کا ہوا۔ میرا خیال ہے کہ عطار بحیثیت تذکرہ نگار اہل اللہ کے حالات اور زمانوں سے بخوبی واقف تھے، یہ مان کر اگر وہ جوہرالذات اور ہیلاج نامہ لکھتے تو ظاہر تھا کہ ایسے صریح اغلاط مثلاً منصور اور بایزید کی گفتگو کے بے سروپا واقعات نہیں لکھتے، حالانکہ بایزید کی وفات کا واقعہ سنہ ۲۶۱ ہجری یا ۲۶۴ ہجری میں پیش آتا ہے اور منصور سنہ ۳۰۹ھ میں دار پر چڑھایا جاتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ بایزید کو جنید کا مرید بتایا جاتا ہے ان دونوں بزرگوں میں بایزید اقدم ہیں اور شیخ عطار ہم کو اطلاع دیتے ہیں کہ جنید بایزید کے اس قدر معتقد تھے کہ کہا کرتے تھے: "بایزید کا ہماری جماعت میں وہی مرتبہ ہے، جو حضرت جبرائیل کا ملائکہ میں ہے۔" یہ اور دوسری صریح غلط بیانیاں جو ان کتابوں کے اوراق میں نظر آتی ہیں، عطار کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتیں۔

حکیم ناصر خسرو اسماعیلیوں کا داعی ہونے کی بنا پر، نیز سیاسی وجوہ سے ان ایام کے خراسانیوں میں جو اکثر حنفی اور شافعی تھے، نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا؛ اِس لیے بہت کم مصنفوں نے اِس کا ذکر کیا ہی۔ محمد عوفی نے شاعر کی حیثیت سے بھی "لباب الالباب" میں اس کا ذکر نہیں، نہ شیخ عطار نے اپنی مثنویات میں اس کا ذکر آنے دیا۔ لیکن جوہر الذات میں اسس عظمت کے ساتھ اس کا ذکر آتا ہی کہ ایک طرف حکما کا سرتاج اور دوسری طرف ولی کامل دکھایا گیا ہی۔ دشمنوں کے خوف سے، حکیم موصوف یمگان میں آکر پناہ لیتا ہی، اس واقعے کو مصنف نے حکیم کے ذوقِ سلوک اور گریز از خلق کے نام سے تعبیر کیا ہی:-

در آخر حکمتش افسزود بیچوں	خدارا باز دید او بے چہ و چوں
خدارا باز دید او آخر کار	گریزاں شد ز خلق او کل بہ یک بار
خدارا باز دید و ذات او شد	کہ ایں معنی یقیں ذات او بد
دراں قربت کہ بودش حدِ امکاں	سلوکے کرد خود را کرد پنہاں
بسوے قاف قربت رفت بنشست	دراز عالم بروے خود فروبست

(صفحہ ۳۱۹)

حکیم موصوف نے اِن ایام میں جس قسم کا سلوک اختیار کیا تھا، اسس کی حقیقت اُن قصائد سے ظاہر ہوتی ہی، جو اِس نے عزلت نشینی کے زمانے میں لکھے ہیں اور بعضِ نواصب و مدح مستنصر اسمٰعیلی کی آوازوں سے گونج رہے ہیں، یہ قصیدے آج بھی موجود ہیں اور چھپ چکے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والا یہ امر ہی کہ جہاں عطار نے جنید کو بایزید کا پیر بنا دیا اور ناصر خسرو کو ولی کامل مان لیا۔ وہاں وہ حسین بن منصور کا نام

بھی بھول گئے اور اسی عام غلطی کے شکار بن گئے، جس میں شعرائے ایران مولانا رومی کے زمانے سے مبتلا ہیں۔ جوہرالذات اور ہیلاج نامہ میں حلاج کا نام منصور بتایا گیا ہی، جو بالکل غلط ہی۔ اس کا نام حسین ہی اور منصور اس کے باپ کا نام ہی۔ شیخ عطار اپنے تذکرے میں ہمیشہ اس کو حسین کے نام سے یاد کرتے ہیں، یا بعض وقت حلاج کے خطاب سے پکارتے ہیں۔ لیکن کبھی منصور کے لفظ سے یاد نہیں کرتے۔ ان کی مثنویوں میں بھی منصور کی کئی حکایتیں ملتی ہیں، مثلاً منطق الطیر:۔

چوں شد آں حلاج بر دار آں زماں ∗ جز انا الحق می نرفتش بر زباں

(کلیات ص ۱۱۰۵) اور الٰہی نامہ:

چو ببریدند ناگہ بر سر دار ∗ سر و دو دست حلاج آں چناں زار

(کلیات ص ۸۲۱) اور الٰہی نامہ:

پسر را گفت حلاج نکو کار ∗ بہ چیزے نفس را مشغول میدار

(کلیات ص ۹۱۱) اور اسرار نامہ:

بشب حلاج را دیدند در خواب ∗ بریدہ سر، بکف در جام جلاب

(ص ۴۵ ۰ طبع ایران)

یہاں ہر موقعے پر حلاج کے نام سے یاد کیا ہی۔ قصہ مختصر، یہ بعض وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں کتابوں کو عطار کی تصنیف ماننے کے لیے تیار نہیں۔

مولانائے روم کے "سخنان" کے حوالے سے 'جامی' نے ایک روایت لکھی ہی کہ نور منصور ڈیڑھ سو سال بعد شیخ عطار کی روح پر تجلی کرکے اُن کا مُربّی بن گیا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس روایت کے زیر اثر مثنوی جوہرالذات

وغیرہ تصنیف ہوتی ہیں اور یہ کوئی تنہا اقدام نہیں ہی، بلکہ اشتر نامہ بھی اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتا ہی۔ روایت بالا کی تصدیق دیباچۂ ہیلاج نامہ سے ہوتی ہی، جہاں منصور کے پیکر مثالی کی آمد کا مفصل مذکور ملتا ہی۔ چونکہ ان مثنویوں میں عطار کی شہادت کا علی التواتر ذکر آتا ہی، بلکہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ خواب میں آکر شہادت کی بشارت دیتے ہیں کہ "منصور نے ہمارے اسرار کھولے سزا پائی، جو منصور نے کیا وہی تم نے کیا، اس لیے ہم تم کو جام شہادت پلائیں گے۔" اس بنا پر ضروری ہوا کہ شیخ کی شہادت کے اثبات میں کوئی چیز لکھی جائے، چنانچہ بے سر نامہ[۵] مرقوم ہوا۔ یہ یاد رہے کہ جوہر الذات میں منصور کی طرح اہل ظاہر کے ہاتھوں شہید ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہی۔

بخواہم کشتنت مانند حلاج ہم بر فرقت ایں جا ہم چو او تاج (ص ۶۹)

زعشقت آگہم اے برتر از نور کہ خواہم رفت بر دارت چو منصور (ص ۳۲۶)

اس لیے بے سر نامہ اسی عقیدے کی صدائے بازگشت ہی، لیکن موجب حیرت یہ امر ہی کہ اہل ظاہر نے یہ تہمت اپنے سر سے ہٹا کر تاتاری وحشیوں کے سر منڈھ دی، جس سے اہل ظاہر و اہل باطن کی روایات کے اختلاف نے ہمارے نزدیک بالفاظ صاحب جوہر الذات "ایک سر" کی شکل اختیار کر لی ہی، اور میں اکثر سوچتا رہا ہوں کہ اس فرضی عطار کی یہ آرزو :۔

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد من جلوہ دہم بار دگر دار و رسن را

کبھی قوہ سے فعل میں بھی آئی یا نہیں ـــــــ

---

[۵] بے سر سے مراد عطار ہیں، چنانچہ ہیلاج نامہ میں بھی ایک موقعے پر اسی نام سے پکارا گیا ہی :۔

سرافرازی کن اے بے سر در آخر کہ ایں جا نیستت ہم سر در آخر

کمال اسمٰعیل

قولہ :- ان کے والد جمال الدین عبدالرزاق مشہور شاعر تھے ...... ان کے دو بیٹے تھے عبدالکریم اور اسمٰعیل "۔

(شعر العجم ص۱۷ جلد دوم، معارف پریس اعظم گڈھ)

لیکن خود کمال کے ایک قصیدے سے جو اس نے اپنے والد جمال الدین کی وفات کے وقت رکن الدین صاعد بن مسعود کی مدح میں لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جمال نے چار بچے اپنے بعد چھوڑے۔ چنانچہ :-

سپہر قدر را اصغا کن از طریق کرم — حکایت من خستہ روان زیر و زبر
چہ شرح شاید داد از حقوق آں مرحوم — کہ ہست نزد تو چوں آفتاب بل اظہر
دریغ الحق ازان گونہ داعی مخلص — کہ بے ہوائے تو جاں را نخواستی دربر
برآستان تو کردہ سفید موے سیاہ — بد استان تو کردہ سیہ رخ دفتر
ہزار دُرِّ یتیمند باز ماندہ ازو — کہ جز ز عقد مدیح تو نیست شاں زیور
چو گرگ مرگ بناگہ شباں ایں رمہ برد — ز بہر ایں رمۂ بے شباں توئی غمخور
بزرگ حقی اگر گوش باز خواہی داشت — بچشم لطف دریں چار طفل خورد نگر

(ص۷ کلیات[1] اسمٰعیل، طبع بمبئی)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ چار بچے کمال کے علاوہ ہیں جو بظاہر خلف اکبر ہیں۔

قولہ :- اسمٰعیل نے بھی مذہبی علوم حاصل کیے تھے لیکن شاعری کا مذاق خاندانی

---

[1] اوراق آیندہ میں جہاں کہیں صفحات کا حوالہ دیا ہے اسی کلیات طبع بمبئی سے دیا ہے۔

تھا اس لیے اسی طرف توجہ کی اور اسی میں کمال پیدا کیا۔"

(شعر العجم جلد دوم ص۱۶۷ طبع معارف پریس)

ان کے بعض ابیات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ان کا شمار بھی علما میں تھا بلکہ اسی جرگے میں ملازم بھی تھے۔ ایک قصیدے میں کہتے ہیں :۔

نیست پوشیدہ کہ در عہد صدور رضی　　رخت در مدرسہ آورد ز دکاں پدرم
از کرم عذر چہ خواہی کہ در ایام تو من　　از میان علما رخت ببازار برم

(ص۱۰۵، ایضاً کلیات)

(دیگر) عالم و شاعر و فقیہ و ادیب　　از تو دارند راتب و ادرار
من کہ این ہر چہارم از تو چرا　　خوف و تہدید دارم و آزار (ص۱۸۸)

قولہ :۔ "بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ جب سلطان سنجر سلجوقی گرجستان کو فتح کرکے اصفہان میں آیا تو کمال نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

حجاب ظلم تو برداشتی ز چہرۂ عدل　　نقاب کفر تو بکشادی از رخ ایماں

(شعر العجم ص۱۶۷ جلد دوم، معارف پریس)

سلطان سنجر سلجوقی کا زمانہ ۵۱۱ھ تا ۵۵۲ھ ہے جو کمال کے زمانے سے صریحاً اقدم ہے، نہ اس نے گرجستان کبھی فتح کیا۔ شعر بالا کمال کے اس مشہور قصیدے سے ماخوذ ہے، جس کا مطلع ہے :۔

بسیط روے زمیں گشت باز آباداں　　بہ یمن سایۂ چتر خدایگان جہاں

اور جلال الدین منکبرنی کی مدح میں ہے۔ چنانچہ :۔

خدایگان سلاطین مشرق و مغرب　　کہ آب باغچۂ سلطنت دہد بہ سناں
جلال دنیا و دین منکبرنی آں شاہی　　کہ ایزدش بسزا کردہ درجہاں سلطاں

قصیدۂ ہذا ۶۲۳ھ کے قریب لکھا گیا ہوگا جب جلال الدین گرجستان کی فتح کے بعد اصفہان آتا ہی۔ شاعر نے اسی قصیدے میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہی جو جلال الدین کی تاریخ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً اُس کا ہندُستان آنا، ہندستان سے ایران جانا، تفلیس پہنچنا اور عیسائیوں سے محاربات وغیرہ:-

براق عزم تو گامی کہ بر گرفت از ہند — نہاد گام دگر بر اقاصی ایران
کہ بود جز تو ز شاہان روزگار کہ داد — تضیم اسپ ز تفلیس و آبش از عماں
تو عمر نوح بیابی از انکہ در عالم — عمارت از تو پدید آمد از پس طوفاں
تو داد منبر اسلام بستدی ز صلیب — تو بر گرفتی ناقوس را ز جاے اذاں
اگر نبودی سعی تو حلقۂ کعبہ — چو نعل زیر سم خر بماندہ بود نہاں

(ص ۱۶ کلیات)

قولہ:- "بالآخر افسردہ ہو کر ترک تعلقات کیا اور حضرت شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت کی، دیوان میں ایک قصیدہ بھی ان کی مدح میں موجود ہی۔" (شعر العجم ص ۱۸، جلد دوم، معارف اعظم گڈھ)

اس قصیدے کا مطلع ہی:-

دلا بکوش کہ باقی عمر دریابی — کہ عمر باقی ازیں عمر بر گزریابی

میرے پیش نظر اس وقت کلیات کمال قلمی مملوکۂ پروفیسر سراج الدین آذر ہی۔ جن اشعار میں شیخ شہاب الدین کا نام آتا ہی یہ ہیں:-

ازیں بزرگان امروز در زمانہ یکی ست — کہ مثل او نہ ہمانا بہ بحر و بر یابی
شہاب بن عمر سہروردی آں رہ رو — کہ از مسالک او دیو بر حذر یابی
امام و قدوۂ آفاق ثالث العمرین — کہ خاک پایش بر جبہت قمر یابی

اگرچہ شاعر اپنی ارادت کا اظہار کر رہا ہے اور ان کی پیروی میں نجات کا طالب ہے تاہم چنداں جوش عقیدت محسوس نہیں کرتا جو ایک خالص الارادت مرید کو اپنے مرشد وہادی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کہتا ہے:۔

باآبروی چنیں خواجۂ توسّل کن — مگر رہائی از آتش سقر یابی
مدد زہمت او خواہ در ریاضت نفس — چو جنگ دیو کنی یاری از عمر یابی
در بہشت بروے دل تو باز کنند — گر آستانۂ عالیش مستقر یابی
اگر تو بیخ ارادت فرو بری بدرش — زشاخ تربیتش گونہ گوں ثمر یابی
زدامن طلبش بر مدار دست طلب — کہ ہر چہ آرزوے تست سربسر یابی
زخاک پایش تاجی بساز و برسر نہ — کہ تا زخیل ملک گرد خود حشر یابی

کمال نہ کبھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے نہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ بغداد گئے۔ قصیدۂ ہذا ارادۃً بھیج دیا ہے:۔

کلاہ او نہ باندازۂ سر چو تو نیست — تو جہد کن کہ بجائے کلہ کمر یابی
چو ایں مساعدت از دولتت میسر نیست — کہ بر ملازمت خدمتش ظفر یابی
زنظم خویش دعائے بداں جناب بست — زگفتۂ کرمش بہرۂ مگر یابی
سعادت ابدی برسرت نثار کند — اگر قبولی ازاں صدر نامور یابی

(کلیات کمال، قلمی)

قولہ:۔ ۶۳۵ھ میں جب اوکتائی قاآن اصفہان میں پہنچا تو قتل عام کا حکم دیا اس زمانے میں یہ زاویہ نشین ہو چکے تھے اور شہر کے باہر ایک زاویے میں رہتے تھے .... گھر میں ایک کنواں تھا وہ ان امانتوں کا خزانہ بن گیا۔ شہر کی غارت گری میں ایک ترک اس طرف نکل آیا ...... کنویں میں اُترا۔ زر و جواہر کا انبار دیکھ کر آنکھیں کھُل گئیں۔ سمجھا کہ

اور بھی خزانے گڑے ہوں گے، کمال اسمٰعیل کو پکڑا، کہ پتا بتاؤ۔ انھوں نے لاعلمی ظاہر کی، اس نے غصے میں آکر ان کا خاتمہ کر دیا۔"

(شعر العجم ص ۱۸ جلد دوم۔ معارف پریس)

اوکتائی قاآن ۶۲۴ھ و ۶۳۹ھ اصفہان میں کسی وقت نہیں آیا اگرچہ اصفہان کا قتل عام اُس کے زمانے میں ہوا ہو۔ مولانا شبلی کمال کے حالات کے زیر عنوان اس کا سال وفات ۶۲۶ھ بتاتے ہیں۔ اس موقعے پر ۶۳۵ھ تحریر کرتے ہیں اور اس اختلاف کی کوئی وجہ بیان نہیں کرتے۔

قولہ: "متوسطین اور متاخرین دونوں اُن کے معترف ہیں .... عرفی کہتا ہو:۔

مراز نسبت ہمدردی کمال غم است | وگرنہ شعر چہ غم دارد از غلط خوانی

(شعر العجم ص ۱۹ جلد دوم)

مشکل سے یقین آسکتا ہو کہ عرفی جیسا خود ستا اور خود فروش کمال کے کمال کا اعتراف کرے گا۔ وہ جب کبھی متقدمین کا ذکر کرتا ہو اپنے اظہار کمال اور فضلیت کے تعلق میں کرتا ہو یا اپنے مقابلے میں ان کو گراتا ہو۔ انوری اور ابو الفرج رونی کے حق میں کہتا ہو:۔ ؎

انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز | بہر چہ غنیمت نہ شمارند عدم را

اور سعدی شیرازی کے واسطے لکھتا ہو:۔

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز از چہ بود | گر نبود آگہ کہ گردد مولد و ماوائے من

اور خاقانی کے تعلق میں گویا ہو:۔

دم عیسیٰ تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد | بامداد صبا اینک فرستادم بہ شروانش

ان اساتذہ کے مقابلے میں بھلا کمال کو کیا خاطر میں لاتا۔ بلکہ اسی قصیدے

یں جس سے علامہ شبلی شعر بالا نقل فرماتے ہیں عرفی کمال کی نسبت کہتا ہے کہ میرے کمال کی نمود پر کمال کی نظموں کی قبولیت کو بڑا نقصان پہنچا۔ جب شیراز میں مجھ جیسا سُرمہ ساز موجود ہے تو یقین ہے کہ عقل انسانی سُرمۂ صفاہانی کو آنکھوں میں جگہ نہ دے گی :-

بعہد جلوۂ حسن کلام من اندوخت　　قبول شاہد نظم کمال نقصانی
کنوں کہ یافت چو من سرمہ سائے در شیراز　　خرد ز دیدہ کشد سُرمۂ صفاہانی

اب ظاہر ہے کہ دونوں شعروں سے کمال کی بے قدری مقصود ہے نہ اس کی قدر دانی۔ لیکن مولانا کے نقل کردہ شعر سے عرفی کا مقصد اس مطلب سے جو مولانا اخذ کر رہے ہیں بالکل مختلف ہے۔ اس کے لیے ہمیں ناظرین کی توجہ کمال کی زندگی کے ایک واقعے کی طرف جس کا عرفی نے اشارۃً ذکر کیا ہے، مبذول کرنی چاہیے۔ ایک قصیدے میں جو عرفی نے عبدالرحیم خانخانان کی تعریف میں بہ فرمایش حکیم ابوالفتح لکھا ہے شعر زیر بحث سے قبل یہ شعر آتا ہے :-

مدہ بہ راوی ناجنس نامہ ام کہ مرا　　دریں قصیدہ بروز کمال بنشانی

شاعر اپنے مخاطب سے کہتا ہے کہ میرا قصیدہ کسی غلط خواں راوی کے حوالے نہ کر دینا ورنہ کہیں میرا بھی وہی حشر ہو جو کمال کا ہوا تھا۔ اس شعر کی شرح میں عرفی کے شارحین کہتے ہیں کہ کمال اسمٰعیل نے اپنا قصیدہ دربار میں پڑھنے کے واسطے کسی نالائق راوی کے حوالے کر دیا تھا۔ پڑھتے وقت اس سے ایسی ادائیں سرزد ہوئیں کہ ممدوح نے خفا ہو کر شاعر کے قید کیے جانے کا حکم دے دیا۔

کمال کے حالات میں اس واقعے کا ذکر نہیں آتا مگر اسی بحر و قافیے میں اس کے ہاں ایک قصیدہ موجود ہے، جس میں شعر ذیل آتا ہے ؎

اگرچہ شعر ہماں است لیک از ادی بد ‌‌ ‌ تبہ کند سخن نیک را ز نادانی

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرفی کی تلمیح کسی اصلی بنیاد پر قائم ہے۔

اس پس منظر کے جاننے کے بعد ہمارے نزدیک شعر زیر بحث کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو کمال فن کے ساتھ محبت ہونے کی بنا پر غلط شعر پڑھے جانے کی صورت میں رنج ہوتا ہے ورنہ غلط خوانی سے شعر کا فی نفسہ کوئی نقصان نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ کمال سے مُراد کمال اسمٰعیل ہے جیسا علامہ شبلی سمجھے ہیں تو یہ ترجمانی ہر حال میں مورد اعتراض ہے۔ کمال اسمٰعیل کے ساتھ ہمدردی کی بنا پر صحیح شعر خوانی کی ضرورت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

قولہ: "کسی نے کمال کو بُرا کہا تھا اس کے جواب میں کہتے ہیں:۔

شخصی بد ما بخلق می گفت ‌‌ ‌ ما از بد او نمی خراشیم

ما نیکی او بخلق گفتیم ‌‌ ‌ تا ہر دو دروغ گفتہ باشیم

محقق طوسی کا یہ مشہور قطعہ:

نظام بی نظام ار کافرم خواند ‌‌ ‌ چراغ کذب را نبود فروغی

مُسلمان خوانمش زیرا کہ نبود ‌‌ ‌ سزاوار دروغی جز دروغی

اسی قطعہ سے ماخوذ ہے۔" ‌‌ ‌ (شعر العجم ص۱۹، انوار المطابع)

مخدوم جہانیاں کی ملفوظات جامع الکلام مرتبہ سنہ ۷۸۲ھ میں جس کو اُن کے مُرید محمدؐ بن محمدؐ حسینی ترتیب دیتے ہیں۔ آخری قطعہ مخدوم جہانیاں کی زبانی حضرت امیر خسرو کی طرف منسوب ہے۔ اس کتاب میں یہ قطعہ حسب ذیل ہے:۔

مرا سید اجل گر خواند کافر ‌‌ ‌ چراغ کذب را نبود فروغی

مسلمان خواندمش بہر مکافات ‌‌ ‌ دروغی را چہ آید جز دروغی

چونکہ یہ شہادت اب سے چھ سو سال قبل کی ہے اس لیے زیادہ مستحق اعتبار ہے۔

جلال الدین محمد مخدوم جہانیاں [illegible]ھ میں انتقال کرتے ہیں۔

محقق طوسی شعر کے کوچے سے نابلد معلوم ہوتے ہیں اگرچہ ان کے مداحوں نے یہ وصف ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ خود محقق معیار الاشعار میں شعر سے اپنی بے ذوقی کے اعتراف میں لکھتے ہیں :۔

" اعتقاد من آنست کہ اگر کسی را در مبدا، فطرت ذوق نباشد، ممکن باشد کہ بملکۂ عروض اورا اکتساب ذوقی پیدا شود و ایں معنی در خویشتن مشاہدہ کردہ ام "۔

(میزان الاشعار ص۲۷)

قولہ :۔ " کمال اور محقق طوسی ہمعصر ہیں، کمال کی بلند پائگی کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو گی کہ محقق طوسی نے عظمت کے لہجے میں کمال کا ذکر اپنی کتاب معیار الاشعار میں کیا ہے "۔ (ص ۲۰ جلد دوم، شعر العجم، معارف)

ان بزرگوں کی معاصرت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ کمال ۵۶۰ھ کے گرد و پیش میں پیدا ہو کر محقق طوسی کی ولادت کے وقت جو ۵۹۷ھ میں ہوتی ہے اپنی عمر کے سینتیس سال قریباً ختم کر چکا تھا اور بقول مولانا شبلی ۶۲۶ھ یا ۶۳۵ھ میں انتقال کرتا ہے۔ محقق کمال کی وفات سے چھیالیس یا سینتیس سال بعد ۶۷۲ھ میں وفات پاتے ہیں۔

علیٰ ہذا محقق کی عظمت کے لہجے میں کمال کے ذکر کی اصلیت بس اتنی ہے کہ معیار الاشعار میں ایک موقعے پر قصیدے میں تغیر ردیف کی بدعت کی مثال میں کمال کا ذکر بدیں الفاظ آیا ہے :۔

"مثال تغیر ردیف بطریق بدعت آنست کہ کمال اصفہانی دریں روزگار در قصیدۂ کہ بعضی را ردیف 'می آمد' کردہ است و بعضے را 'می آید' آوردہ است

(مطلع قصیدہ اینست ؎

سپیدہ دم کہ نسیم بہار می آمد نگاہ کردم و دیدم کہ یار می آمد

و در موضع تغیر بہ ایں نوع گفتہ است ؎

زبہر فال زماضی شدم بہ مستقبل کہ ایں ایام[1] چنیں خوش گوار می آید

زہے رسیدہ بجائے کہ پیش خاطر تو ہمہ نہان سپہر آشکار می آید

(ص۲۸۵، زر کامل عیار، ترجمۂ معیار الاشعار، نولکشور ۱۲۸۹ھ)

اس عبارت سے تو کمال کے واسطے محقق کے احترام کا کوئی پتا نہیں چلتا۔

یہاں بطور جملۂ معترضہ میں اس قدر اور کہنا چاہتا ہوں کہ صفحہ ۲۱-۲۲ پر شعر العجم میں اس قصیدے کے جو سات شعر نقل ہوئے ہیں۔ان کی ردیف میں بجائے 'می آید' کے 'می آمد' چاہیے۔ ورنہ کمال کے تغیر ردیف کا مقصود مہمل رہ جائے گا۔ یہ ساتوں شعر تشبیب سے تعلق رکھتے ہیں جو بصیغۂ ماضی 'می آمد' ردیف پر ختم ہوتے ہیں۔ گریز کے وقت اس نے ردیف بدل دی بصیغۂ حال 'می آید' لے آیا اور اشعار ذیل میں اس کی طرف اشارہ بھی کردیا:۔

ردیف شعر دگر کردم از پئے مدحش کہ آنم از پئے چیزے بہ کار می آمد

زبہر فال زماضی شدم بہ مستقبل کہ ایں ایام چنیں خوش گوار می آید

چنانچہ اس کے بعد تمام اشعار میں 'می آید' ردیف ہی۔

قولہ:۔ "شاعری پر سب سے بڑا احسان کمال کا یہ ہی کہ شاعری کی ایک صنف یعنی ہجو اور ظرافت جو انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے، لچّوں کی زبان بن گئی تھی، کمال نے اس کو نہایت لطیف اور پُر مزہ کر دیا۔ اگرچہ بہتر تو یہی تھا کہ یہ بے ہودہ صنف سرے سے اُڑا دی جاتی، لیکن

---

[1] ایام میں میم مفعولی ہی۔

ہجو شعرا کا ایک بڑا آلہ تھا، اس لیے وہ اس سے بالکل دست بردار
نہیں ہو سکتے تھے۔" (شعر العجم ص۲۲، جلد دوم، معارف پریس)

اس سے بیشتر دو مختلف موقعوں پر حضرت علامہ انوری کی ہجاجات کی دل کھول کر ثناخوانی کر چکے ہیں۔ ایک موقعے پر ارشاد فرمایا کہ ہجو میں وہ نہایت دل چسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا۔[1] دوسرے موقعے پر فرمایا کہ "اگر ہجو گوئی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اُس کا پیغمبر ہوتا۔ ہجو میں اس نے نہایت اچھوتے، نادر، باریک اور لطیف مضامین پیدا کیے ہیں"[2]۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ یہاں وہ اس عزت سے بھی محروم کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ ہجو اور ظرافت انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے لچّوں کی زبان بن گئی تھی اور یہ کمال کا احسان ہے جس نے اس کو لطیف اور پُر مزہ کر دیا۔ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

قرونِ ماضیہ کے اوضاع و اطوار کو چودھویں صدی کے اخلاقی معیار سے جانچنے اور ایک کو دوسرے پر ایک قیاسی فضیلت دینے میں ہم سخت غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مولانا کا یہ بلند معیار غالباً ان کے مغربی دوستوں کی صحبت کا اثر ہے۔ یاد رہے کہ مغربی مصنفین اس قسم کے اعتراض ہمارے ادبیات پر کرتے ہیں۔ ان کو خود اپنی قوم کے ادب ماضی کا تجربہ نہیں۔ عہدِ قدیم میں ہجو کی دست بُرد سے کوئی قوم محفوظ نہیں تھی۔ یونانی اور لاطینی ادبیات میں ہجو نگاری کو پورا فروغ حاصل تھا۔ خود انگریزی ادب اس بارے میں استثنا پیش نہیں کرتا۔ پُرانے شعرا کینیڈی اور ڈنبار، متاخرین میں پوپ

---

[1] شعر العجم، جلد اول ص۲۶۸ معارف پریس اعظم گڈھ۔

[2] ایضاً، جلد اول ص۲۸۱-۲۸۲۔

وغیرہم کے ہاں یہ صنف نظم موجود ہے۔ جب اس حمام میں سب ہی ننگے نہاتے ہیں اور قرونِ ماضیہ کا مشرق و مغرب ایک ہی سطح اخلاقیات پر قائم ہے تو پھر انوری اور سوزنی کی تشہیر انصاف سے بعید ہے۔

علامہ شبلی اگر کمال کا کلیات زرا غور سے ملاحظہ فرماتے تو کمال کے متعلق ان کا حسن ظن زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ دربار صاعدیہ سے چالیس سال برابر تعلقات رہنے کی بنا پر جہاں بوجوہ منصب قضا مذہبی رنگ زیادہ غالب تھا اور اس لحاظ سے بھی کہ زمرۂ علما میں اس کا شمار ہوتا تھا، کمال نے اپنی ہجو گوئی کی استعداد کو واضح طور پر بے نقاب نہیں کیا تاہم کلیات میں کافی سے زیادہ شہادت موجود ہے کہ ہجو کے میدان میں وہ اپنے کسی ہم ردیف سے پیچھے رہنا نہیں چاہتا۔ کمال کے ہاں قاضی گیرنگ بھی آتا ہے۔ اس کا سوگند نامہ اگرچہ اس کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ مانا جا سکتا ہے۔ فحش بیانی سے داغ دار ہے۔ ضیاء الدین موش کی ہجو میں تو خوب ہی چھینٹے اُڑائے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ یہ حیا سوز نظمیں حضرت علامہ کی نگاہ سے کیونکر اوجھل رہیں۔ ذیل میں بعض ایسی ہجویں جو موجودہ مذاق پر گراں نہ گزریں گی بقولے خذ ما صفا ودع ما کدر درج کی جاتی ہیں :-

خواجہ از کبر چوں پلنگ آمد — کہ ہمی با وجود بستیزد
راتق و فاتقش یکے موش است — کز پلیدیش سگ بپرہیزد
ہر کرا ایں بقصد زخمی زد — حالی آں دیگرش برو میزد
ہر کجا موش گشت جفت پلنگ — ابلہ آنکس بود کہ نگریزد

(کلیات کمال، قلمی مملوکۂ پروفیسر آذر)

(دیگر) نکنی رائے مردمی ہرگز — درکنی طبع تو بہ نگزارد

تو خری وز تو خر تر آں باشد — کہ ز تو مردمی طمع دارد

(ایضاً کلیات قلمی)

مذمت ریش ؎

تو چناں گشتہ نہاں پس ریش — کز تو جز چشم ہیچ چشم ندید

بجز از ریش مرد ریک تو کس — سپر گاؤ را ز پشم ندید

(ایضاً کلیات قلمی)

ایک نا اہل سے خطاب ؎

ایں چنیں دون و بد گہر کہ توئی — بمنت التفات چوں باشد

مردماں سوے مردمی یازند — میل دوناں بسوے دوں باشد

عقل را جائے در دماغ بود — تیز را رہگزار ... باشد

(ایضاً کلیات قلمی)

بخیل کی ہجو ؎

خواجہ در ماہتاب ناں می خورد — در سرائے کہ ہیچ خلق نبود

سایۂ خویش را کسی پنداشت — کاسہ از پیش خویشتن بربود

بے فیض ممدوح کے نام ؎

ہرچہ گفتم من از مدیح و غزل — بعضی از وے دروغ بُد ناچار

ہجو تو اختیار ازاں کردم — کہ ہمہ راست باشدم گفتار

کسی افسر کی روانگی کے وقت ؎

بسفری روی برو کہ شدند — از وجودت ہمہ صفاہاں سیر

اجل و گرگ و چاہ در راہند — رو ببیں روے خویش و یاراں سیر

کس ز پہلوے تو نخورد مگر — بجز د شیر در بیاباں سیر

(کلیات قلمی)

ایک بخیل کی مذمّت سے

اے ترا جمع گشتہ در رہ آز — ہمت کوتہ و امید دراز
ہمہ دندان ز حرص ہمچوں سیر — ہمہ مغز تو پوست ہمچو پیاز
دست تو چوں دہان گرسنگاں — ہرچہ در وی نہی نیابی باز
چون گلومی فرو بری ہمہ چیز — در تو ناید بروں مگر آواز

ہجو لکھنے کی دھمکی سے

اے صدر روزگار تو دانی کہ مدتیست — تا انتظار خلعت خاص تو می کنم
درباب بیش ازانکہ من انکار فکر را — تعلیم قاف و دال حروف ہجی کنم

کسی ممدوح کو تہدید سے

بس کن اے مرد ناخوش احمق — چند و تا چند حیلہ و فن تو
بیش ازینم طمع چو می بودے — بجاے ز خسنزاد کن تو
می فتادم چو خاک و می دادم — بوسہ بر پاے تو چو دامن تو
ببریدم طمع بہ یکبارہ — رستم از پارہ نامہ کردن تو
بر نشینم ازیں سپس ہمہ جاے — چوں زہ پیرہن بگردن تو
ہرچہ می خواستم بخواہم گفت — فارغم ... در ... زن تو

قصیدہ در ہجو ضیاء الدین سے

تیزے کہ مغز چرخ ز بانگش فغاں کند — تیزے کہ روزگار بدو امتحاں کند
تیزے کہ بر بروت ہر آنکس کہ بگزرد — خروار ہاش حشو شکم در دہاں کند
تیزے کہ گر خرزش آواز بشنود — شرم آیدش کہ بار دگر عان وعاں کند
تیزے چنیں کہ گفتم و امثال آں ہزار — در ریش آنکہ دشمنی شاعراں کند
ایں اختیار کس نکند پس اگر کند — آں خرس روے خر صفت گاؤ باں کند

گرگ کہن ضیاے مضل آنکہ چو کبش — اغزار گو سفند بخون شباں کند
خطش ز ریش گندہ تر و لفظش از بیاں — پس قدح در ائمہ بسیار داں کند
الفاظ بستہ اش نہ زبان شکستہ اش — باشد چو سندہ کو گزر از ناوداں کند
الحق خوش آیدم کہ ریم در دہان او — خاصہ چو دعوئے نسب و خانداں کند
اے بے حفاظ شرم نداری کہ چوں توئی — بر اہل فضل بیتی در اصفہاں کند
خروار کے دو جو بر بودی ولے بہ بیں — تا ایں ہجا کہ اے دو صد زعفراں کند
آں جو خر دگر خورد و شعر من ترا — بر روئے روزگار یکے داستاں کند

میں نے اس قصیدے کے چند شعر نمونۃً نقل کیے ہیں۔ اصل قصیدے میں چھیتر شعر ہیں جو اسی رنگ میں چل رہے ہیں جیسا کہ آخر میں شاعر نے اشارا کیا ہے۔ سارا جھگڑا دو خروار جو کا ہے۔

ایک قصیدے میں ایک مزدقانی کی ڈاڑھی پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ چند شعر درج ہیں :-

آں ریش فلاں مزدقانی — ریشیست عظیم باستانی
بسیار جو حادثات گیتی — ناخوش چو بلاے ناگہانی
درہم چو دلش ز تنگ عیشی — محکم چو کفش ز سوزیانی
انبوہ و گران و زشت و ناخوش — مانندۂ ابر مہرگانی
بر سینۂ او ز دور کوہے — بر جنسر نمدیست ترکمانی
از جملۂ ریشہاے گیتی — آں را شاید کہ ریش خوانی
بس لائق تست اینکہ گویند — ریش تو بریم ز باستانی
کان ریش چنیں نمی پسندند — صاحب طبعان ایں زمانی
زیرا کہ بہیچ کار ناید — الا ز برائے دمنہ دانی

ایک مثنوی رئیس لنبان کی مذمت میں لکھی ہی۔اس کے ابتدائی اشعار ہیں:۔

تا زبانم بہ کام جنبان است	در ہجاے رئیس لنبان است
چہ رئیس آں خسیس پر تلبیس	مایۂ ظلم و سایۂ ابلیس
آنکہ نامش زشرم پیدا نیست	در بدی و دولیش ہمتا نیست
آں کہ او پیشواے دزدانست	سرو سرخیل زن بمزدانست
مرد کے زشت روے گندہ بغل	پاے تا سر ہمہ دروغ و دغل
ناحفاظ و گداے و قحبہ زنست	کیسہ پرداز و دزد و نقب زنست
طبع او لوم و شکل نامعلوم	صحبتش شوم و سیرتش مذموم

میں ان مثالوں سے دست کش ہوکر عرض کرتا ہوں کہ کمال کے نزدیک شاعر کے لیے ہجو گوئی ایک لازمی امر ہی جس سے اس کو کوئی چارہ نہیں۔اس کی اباحت میں وہ کہتا ہی ؎

ہجا گفتن ارچہ پسندیدہ نبود	مبادا کسے کالت آن ندارد
ہر آں شاعرے کو نباشد ہجا گو	چو شیرے کہ چنگال و دنداں ندارد
خدا دند امساک راہست دردے	کہ الا ہجا، ہیچ درماں ندارد
چو نفریں بود بولہب را ز ایزد	مرا ہجو گفتن پشیماں ندارد
مرایں عزنان راکہ از بخل مفرط	کس امید چیزے ازیشاں ندارد
اگر ہجو گوئی تو در گردن من	کہ ہرگز زیانے بایماں ندارد

قولہ "ایک رئیس سے صلے کا تقاضا کیا ہی، اور کس قدر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہی ؎

سہ شعر رسم بود شاعران طامع را	یکے مدیح، دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ور نداد ہجا	ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی شعرا پہلے مدح کہتے ہیں، پھر صلے کی یاد دہانی کے لیے ایک نظم لکھتے

ہیں، اب اگر ممدوح نے صلہ عنایت کیا تو شکریہ لکھتے ہیں، ورنہ ہجو،
ہم ان تینوں نظموں سے دو لکھ چکا ہوں، تیسری کی نسبت کیا ارشاد
ہوتا ہی"
(شعر العجم ص۲۵ ج ۲)

قریباً انہی الفاظ میں یہ قطعہ انوری کی طرف بھی منسوب ہوا ہی۔ چنانچہ
فرماتے ہیں :۔

قولہ :۔ "پہلے ایک شخص کی مدح لکھی، پھر صلے کا تقاضا کیا، اس کے بعد ہجو
کی دھمکی دی، دیکھو کس لطیف طریقے سے ادا کیا ہی :۔

سہ بیت رسم بود شاعران طامع را — یکے مدیح دو دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ورنہ داد ہجا — ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی شاعروں کا قاعدہ ہی کہ تین نظمیں لکھتے ہیں، اوّل مدح پھر قطعۂ
تقاضائی جس میں صلہ کا تقاضا ہوتا ہی، اب ممدوح نے صلہ دیا
تو شکریہ ورنہ ہجو، ان تین نظموں سے میں دو تو لکھ چکا، فرمایئے اب
کیا ارشاد ہوتا ہی" (ص۱۸، شعر العجم، جلد اول، معارف پریس)

مگر انوری پر حضرت مولانا نے جو ستم توڑا ہی یہ ہی کہ انوری کے ذکر میں اسی
قطعے کو انوری کی "فحش سے خالی ہجو" کی مثال میں نقل کیا ہی اور کمال کے
ہاں کمال کی ظرافت کی مثال میں۔ بالفاظ دیگر وہی چیز انوری کے ہاں ہجو ہی اور
کمال کے ہاں ظرافت۔

ع تا یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

قولہ :۔ "غزل کی نسبت یہ مسلم ہی کہ سب سے پہلا خاکہ کمال ہی نے قائم کیا ہی،
جس کو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ موجد بن گئے"

(ص۲۶، شعر العجم جلد دوم، طبع معارف پریس)

یہ جملہ غالباً کمال کی عزت افزائی کے خیال سے لکھ دیا گیا ہی ورنہ اس سے قبل اسی مسئلے کے متعلق حضرت مولانا یوں ارشاد فرما چکے ہیں:۔

"غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہی، لیکن سچ یہ ہی کہ اس صنم کدہ کے آزر نظامی ہی ہیں۔"

(ص۲۱ جلد اول، شعر العجم، معارف پریس، اعظم گڑھ)

اس بیان سے عام غلط فہمی پھیل گئی ہی۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ کمال غزل کا موجد ہی۔ خود مولانا سید سلیمان بھی اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اس کے متعلق آیندہ ضمیمے میں کسی قدر تفصیل سے بحث آتی ہی۔ ناظرین اسے ملاحظہ فرمائیں۔

قولہ:۔ "رباعی کو جس قدر کمال نے ترقی دی، قدما اور متوسطین میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔"

(ص۲۷ شعر العجم، جلد دوم)

شعر العجم کی پہلی جلد میں خیام کی رباعیوں پر اُنتیس صفحے لکھنے کے بعد حضرت مولانا کے قلم سے یہ جملہ نکلتا ہی۔ اگر کمال واقعی رباعی میں اتنا باکمال ہو تو موجب حیرت ہی کہ اُس کی رباعیوں کی اوصاف نگاری میں مولانا نے چند صفحے نہ سہی چند سطریں تک لکھنی گوارا نہ کیں۔ قدما و متاخرین کے بیانات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہی کہنا پڑے گا کہ اس کی شہرت صرف قصیدہ نگاری کی بنا پر ہی نہ رباعی گوئی کی وجہ سے۔ تذکرہ نگاروں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو اس کی رباعیات کا معترف ہو۔ یہ مولانا کی کمال نوازی ہی جو خیام۔ عطار اور سحابی وغیرہ کے ہوتے ہوئے قدما و متوسطین میں اس کو بے نظیر مانتے ہیں۔

کمال کے حالات

کمال کے متعلق مزید اطلاع جو اس کے کلیات اور دیگر ذرائع سے حاصل ہوئی، سطور آیندہ میں درج ہوتی ہے۔ اس کا ظہور ایک ایسے دَورِ انقلاب میں ہُوا ہے جب عراق کی سیاسیات کا مطلع غبار آلود تھا، اصفہان اندرونی اور بیرونی شورش و ہیجان کا شکار تھا، آئے دن نئے نئے فتنے وقوع پزیر ہوتے تھے، خانگی فتنوں میں حنفی و شافعی مذاہب کی باہمی چپقلش تھی۔ جس نے بعض اوقات خطرناک نتائج پیدا کیے ہیں۔ اصفہان کی جامع مسجد ابتدا میں حنفیوں کی مِلک تھی۔ خواجہ نظام الملک نے جو شافعی المذہب تھے اپنے وقت میں اس پر شافعیوں کا قبضہ کرا دیا۔ سلطان محمّد نے اپنے عہد میں حنفیوں کو واپس قبضہ دلا دیا لیکن بڑی خوں ریزی کے بعد۔ قاضی رکن الدین نے اس میں پہلا خطبہ[۵۱] پڑھا۔ شہر میں شافعی اور حنفی مساوی تعداد میں آباد تھے۔ اس لیے ان کی عداوت نہایت آسانی سے ایک خوں ریز جنگ کی صورت اختیار کر سکتی تھی جس میں ہزاروں اشخاص موت کے گھاٹ اُترتے۔

اصفہان اوّل اوّل سلجوقیوں کے زیرِ نگیں تھا۔ اُن کے زوال پر اُن کے غلام اور افسر ہر طرف طاقت ور ہو گئے۔ علاء الدین تکش نے آخر کار سلطان طغرل کو قتل کر کے عراق پر قبضہ کر لیا۔ خوارزم شاہیوں کا یہ قبضہ نہ عراقیوں کو منظور تھا نہ بارگاہ خلافت کو۔ اصفہان تکش نے قتلغ اینانج کو دے[۵۲] دیا۔ ۵۹۳ھ میں خلیفہ نے اپنے وزیر کو بغرض جنگ بھیجا۔ جب مزدقان میں خوارزم شاہ سے مقابلہ ہوا۔

---

۵۱ راحت الصدور مرتبہ ڈاکٹر محمد اقبال ص ۱۸ -

۵۲ جہانکشائے جوینی جلد دوم ص ۳۳ -

وزیر باجل طبعی مرگیا۔ فتح کے بعد تکش اصفہان میں آیا اور کچھ دنوں ٹھیرا۔ اسی موقعے پر خاقانی نے وہ مشہور قصیدہ لکھا۔ جس کا مطلع ہے۔

مژدہ کہ خوارزم شاہ ملک سپاہاں گرفت ملک عراقین راہمچو خراساں گرفت

تکش اپنے فرزند زادہ اریوزخاں بن تغان تغدی[۵۱] کو ایالت دیگر اور بیغوسیہ سالار سامانی کو اس کا اتابک بنا کر رخصت ہوتا ہے۔ ۵۹۶ھ میں تکش اپنے فرزند تاج الدین علی شاہ کو عراق کا والی مقرر کرتا ہے اور اصفہان[۵۲] اس کا مستقر بنتا ہے۔

۶۱۳ھ میں سعد بن اتابک زنگی عراق کی تسخیر کے خیال سے آیا۔ علاء الدین خوارزم شاہ سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اتابک اگرچہ بہادری سے لڑا۔ مگر آخر میں گرفتار ہوا۔ کچھ مدت قید رکھنے کے بعد علاء الدین نے معاہدہ کرکے اسے رہا کر دیا۔ کمال کے اتابک سے تعلقات اس عہد سے قدیم ہیں۔ اس اسیری کے زمانے میں اس کی تسلی کے خیال سے شاعر ایک قصیدے میں اتابک سے اس طرح خطاب کرتا ہے:۔

جہاں پناہا معلوم رائے انور تست کہ خلق جز رہ تقدیر رفت نتواند

نگر ز نکبت ایام تنگ دل نشوی کہ چرخ گہ بدہد چیز و گاہ بستاند

حطام دنیٔ فانی ندارد ایں مقدار کہ یاد کردن آں خاطری بشوراند

بسا وظیفہ کہ در ضمن نامرادیہاست خدائے مصلحت کار بندہ بہ داند

ترا عنایت سلطان چو پائے مزد بود فلک ز چنبر حکم تو سر نہ پیچاند

اسیر خسرو عالم شدن ز بونی نیست کہ سیل چونکہ بدریا رسد فرو ماند

---

۵۱ جہانکشائے جوینی، ج ۲، ص ۳۸۔

۵۲ ایضاً جہانکشا، ج ۲، ص ۴۵۔

اگر مہابت سلطان عالمت بگرفت
همت عواطف او زیں مضیق برہاند

سخاوت تو خلاص ترا ضمان کردہ است
کشادہ دست سخی پائے بستہ کے ماند

اساس جاہ تو الحمد للہ آں سدّ است
کہ نفخ صور ہم از جاش بر بخنباند

تن درست تو عذر شکست لشکر خواست
سلامت تو ہمہ نقصہا بپوشاند

تو شادزی و بلطف خدائے واثق باش
کہ کارہا بمراد تو زود گرداند

(کلیات ص۲۶۶، طبع بمبئی)

۶۱۷ھ کے ابین سلطان رکن الدین اصفہان آتا ہے۔ عراق اس کی ولایت تھی۔ تمام فراری امرا اس کے گرد جمع ہو گئے۔ قاضی اصفہان کو اُس کا آنا ناگوار ہوا۔ "قاضی اصفہان ناایمن گشت۔ خویشتن کشیدہ کرد واحتیاط واحتراز می نمود۔" اس بے اعتمادی کی حالت میں رکن الدین نے شہر میں قیام مصلحت نہ سمجھ کر بیرون شہر خیمے لگا دیے۔ اُس کے سپاہی بضرورت شہر میں آمد و رفت کرتے رہے قاضی کے اشارے سے شہریوں نے ان پر سنگ و تیر برسائے اور ایک ہزار کے قریب فوجی مقتول و مجروح ہوئے فوجیوں نے شہریوں سے بدلا لیا۔ بالآخر رکن الدین اُٹھ کر رے[۵۱] چلا گیا۔

۶۲۰ھ میں جلال الدین منکبرنی پہلی مرتبہ اصفہان[۵۲] پہنچا ہے۔ اس موقعے پر کمال اسمٰعیل مع چند احباب کے اس کے منشی نور الدین سے ملاقات کرنے گیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک سو رہا ہے۔ نور الدین منشی شراب کا عادی تھا۔ کمال نے یہ رباعی[۵۳] لکھ کر بھیجی۔

فضل تو و ایں بادہ پرستی باہم
مانند بلندیست و پستی باہم

حال تو بہ چشم خوبرویان ماند
کانجاست ہمیشہ نور و مستی باہم

---

۵۱ جہانکشا جلد دوم ص۱۲۱۔ ۵۲ جہانکشا جلد دوم ص۱۵۲۔ ۵۳ جہانکشا جلد دوم ص۱۵۲

سنہ ۶۲۲ھ میں جلال الدین منکبرنی دوبارہ اصفہان آتا ہی۔کمال اپنا مشہور قصیدہ اس کی خدمت میں پیش کرتا ہی:۔

بسیط روے زمیں گشت باز آباداں — بہ یمن سایۂ چتر خدایگان جہاں

سلطان پھر گرجستان چلا جاتا ہی۔جب تایماس اور تاینال افسران مغولی کے عراق پہنچنے کی خبر آتی ہی۔جلال الدین منکبرنی ایک مرتبہ اور اصفہان آتا ہی۔اسی مقام پر سلطان اور مغولوں میں جنگ ہوتی ہی۔عین معرکۂ جنگ میں غیاث الدین اس کا بھائی اس سے کنارہ کش ہوجاتا ہی۔اس وجہ سے جلال الدین کے لشکر میں بددلی پھیل جاتی ہی۔تاہم بہادر سلطان نے اپنے جوہر شجاعت دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔آخر اس کو شکست ہوئی۔جلال الدین میدان جنگ سے نکل گیا اور کسی کو اطلاع نہ تھی کہ کدھر گیا۔مغول اصفہان تک آکر رَی کو لوٹ گئے۔سلطان بعد میں اصفہان پہنچ گیا اور سنہ ۶۲۵ھ میں واپس گرجستان[1] چلا گیا۔

یہ چند دھندلے خط وخال ہیں ان پُر آشوب واقعات کے جو اس منحوس زمانے میں اصفہان پر گزر رہے تھے۔یہ خیال کہ کمال کی شاعری کا زمانہ ۵۸۰ھ ہجری کے قرب میں شروع ہوتا ہی ایک مستحکم اساس پر قائم ہی۔۵۸۲ھ کے طوفان باد کی نسبت اُس کے ہاں بھی صریح تلمیح موجود ہی اور انوری وظہیر کی طرح کمال بھی اُس کے وجود کا قائل نہیں۔یہ تلمیح ان اشعار میں آتی ہی:۔

سر فراز ا منجمان بدروغ — تہمتے بر ستارگاں بستند
اثر اندر حسود پیدا کرد — ایں سخنہا کہ بر قراں بستند
برد آں را کہ بردنی بد باد — گرد طوفاں بروگماں بستند

---

[1] جہانکشاے جوینی ص۱۶۹ جلد دوم، طبع یورپ۔

کمال کے والد جمال الدین عبدالرزاق خاقانی اور مجیر بیلقانی کے ہمعصر ہیں۔ انھوں نے خاقانی سے قصائد بھی تبدیل کیے ہیں، وہ اصفہان کے قاضیوں کے خاندان صاعدیہ[۱] کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مدت العمر انھیں کی مداحی کرتے رہے۔ صاعدیہ کا مداح ہونے سے پیشتر ان کا پیشہ دکان داری تھا۔ کمال کہتے ہیں :۔

نیست پوشیدہ کہ در عہد صدور ماضی رخت زی مدرسہ آورد ز دکاں پدرم

جمال الدین ایک خاموش اور فارغ زندگی بسر کرنے کے بعد ۵۸۸ھ[۲] میں بوڑھے ہوکر وفات پا گئے۔ باپ کی وفات کے وقت کمال کی عمر انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن قصیدہ گوئی اس عہد سے قبل شروع کر دی ہے۔ ابتدائی قصیدوں میں دو جگہ اپنی انّیس سال کی عمر کی طرف اشارہ کرتے ہیں :۔

مراست از ندب فضل ہفدہ فصل و ہنوز میان نوزدہ و بیست می کنم تکرار

(ص۷۶ کلیات اسمٰعیل، طبع بمبئی)

سالم ز بیست گرچہ فزوں نیست می‌شود گردون پیر از بن سی و دو چاکرم

والد کے بعد انھوں نے اپنا آبائی پیشہ یعنی مداحی سنبھالا اور برابر چالیس سال صاعدیہ کی ثنا گستری کرتے رہے۔ سال وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ دولت شاہ کے ہاں ۶۳۵ھ، مرآت العالم میں ۶۳۹ھ اور خلاصۃ الافکار

---

[۱] کمال کے ایام میں صاعدیہ خاندان برائے نام سلطان طغرل سلجوقی کا محکوم تھا۔ شاعر قاضی ابوالعلا صاعد بن مسعود متوفی ۵۰۰ھ کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

پیوستہ باد ازیں سال جاہ تو در ترقی آسودہ دولت تو در ظل شاہ طغرل

[۲] یہ سال وفات صرف تقی کاشی کے ہاں ملتا ہے۔ کوئی تعجب نہیں اگر انھوں نے اس سن سے چند سال قبل انتقال کیا ہو۔

میں ۶۲۸ھ بیان ہوا ہی۔ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر آخری سال صحیح ثابت ہو۔
کمال کے ہاں ۵۸۵ھ (ہ) ہجری کی ایک تلمیح قاضی رکن الدین کی مدح میں
ملتی ہی :-

بر تو میموں باد و فرخ کا وفتاد　　　　در سن خمس و ثمانیں غرّہ ماہ صیام

۵۹۰ھ میں سلطان علاء الدین تکش اور سلطان طغرل سلجوقی کے درمیان جنگ
ہوتی ہی جس میں عراق خوارزم شاہی سلطنت سے الحاق پاتا ہی۔تکش کی مدح
میں کمال قصیدہ لکھتے ہیں ؎

اے زرایت ملک و دیں در نازش و در پرورش
وے شہنشاہ فریدوں فر اسکندر منش

مورخین لکھتے ہیں کہ طغرل شراب سے بدمست بھاری گرز لیے شاہنامہ
کے اشعار پڑھتا ہوا میدان جنگ میں آیا۔مخموری اور نشۂ جنگ میں جھومتے ہوئے
اس نے گرز اپنے ہی گھوڑے کے سر پر مار دیا۔گھوڑا گرا اور اس کے ساتھ ہی
طغرل زمین پر آرہا۔دشمنوں نے فوراً پہنچ کر اُس کی گردن کاٹ لی۔کمال غالباً
اسی واقعے کو ذہن میں رکھ کر قصیدۂ بالا میں کہتا ہی۔؎

کرد بر دل خویش تطاولہاے مجت خصم لیک　　　　گہ گہش سخت آید از گرز گرانش سرزنش

۶۰۰ھ میں قاضی ابو العلا رکن الدین صاعد بن مسعود کا واقعۂ وفات پیش
آتا ہی۔شاعر اُس کے فرزند رکن الدین مسعود بن صاعد کی مدح میں قصیدہ لکھتا ہی:

چو سال شش صد در طی انقضا افتاد　　　　رسید دور بدیں سرفراز عالی راے
جہان مکرمت و جود رکن دیں مسعود　　　　خدایگان شریعت امام راہ نماے

اسی قصیدے میں کمال اپنے متعلق کہتے ہیں :-

بپیش سروریت نیک روشنست کہ نیست　　　　چو تو مدیح نیوش و چو من مدیح سراے

ولی دو عیب بزرگست ایں دعا گو را چہ باشد آن؟ کہ صفاہانیست و نیست گدا

(ص۱۷۱ کلیات کمال طبع بمبئی)

کمال کے نزدیک صفاہانی ہونا گویا عیب میں داخل ہی۔ اس بیان سے ہم کو ایک جدید اطلاع حاصل ہوتی ہی، جو یہ ہی کہ اس عہد تک خراسان اور صرف خراسان فارسی زبان اور شاعری کا گہوارہ مانا جاتا تھا، اسی صوبے کی زبان ٹکسالی اور شستہ سمجھی جاتی تھی، باقی علاقوں کی زبان قصباتی شمار ہوتی تھی۔

قطران تبریزی کے متعلق ناصر خسرو کی رائے اس کے سفرنامے میں محفوظ ہی۔ جہاں اُس نے کہا ہی کہ قطران فارسی میں عمدہ شعر کہتا تھا لیکن اس کو فارسی نہ آتی تھی۔ کمال کے والد جمال الدین ایک قصیدے میں خاقانی کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

ماد تو باری کیئم زشاعرانِ جہاں کہ خود کسی نام ما ز جمع ایشاں برد

وہ کہ چہ خندہ زنند بر من و تو کودکاں گر کسی شعر ما سوے خراساں برد

گویا خاقانی کو اس کی تعلی پر جس میں خراسانیوں کی ہم چشمی کا دعویٰ کیا تھا ملامت کی ہی۔ خاقانی نے ایک موقعے پر اپنی طبّاعی کی بنا پر عراق کو خراسان کے نام سے یاد کیا ہی:-

عراقم جلوہ کرد امسال در لشکر گہ سلطاں کہ بودش ز آفتاب خاطرم لاف خراسانی

خراسان کی آرزو میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہی جس کا پہلا مصرع ہی:-

ع بخراساں روم انشاء اللہ

اسی طرح دوسرے موقعوں پر بھی خراسان کے متعلق اس کے ہاں اشارے موجود ہیں۔

چونکہ کمال اسمٰعیل خراسانی نہیں ہی بلکہ اصفہانی اپنے صفاہانی ہونے کو

وہ عیب شمار کرتا ہی اور اپنی ناقدری کو مدنظر رکھ کر دوسری جگہ کہتا ہی ؎

بدیں جزالت الفاظ و دقت معنی — دریغ و درد اگر بودمی خراسانی

کمال کے قصائد اور قطعے زیادہ تر اسی قاضی رکن الدین مسعود بن صاعد کی شان میں ہیں۔ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر جن سے ہم تاریکی میں ہیں قاضی اصفہان چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہی۔ کمال رفاقت کرتے ہیں۔ تین سال تک وطن آنا نصیب نہیں ہوتا۔ غالباً اکثر یا کچھ زمانہ خوارزم میں بسر ہوتا ہی۔ کمال نے یہاں کئی قصیدے خوارزمی امرا کی تعریف میں لکھے۔ منجملہ ایک وہ ہی جس کی ردیف برف ہی۔ لیکن واپسی پر جیسا کہ توقع ہو سکتی تھی قاضی صاحب نے ہمارے شاعر کے حق میں کوئی مراعات نہ کی بلکہ اُلٹی حق تلفی کی۔ ملازمت سے برطرف کر دیا اور دیگر امداد بھی موقوف کر دی ؎

زان پس کہ ہزار غصہ خوردم — در بندگیت سہ سال آزاد
گفتم شودم جزایت افزوں — چوں ہرکس را زیادتی داد
افزوں نشد این و آں کہ خود بود — یکبارگی از قلم بیفتاد
از صورت حال خود بدیں شکل — دانی کہ چہ آیدم ہمی یاد
خرزفت کہ آورد سروے — ناورد سرو دو گوش بنہاد

دوسرے موقعے پر شکایت کرتے ہیں :-

عجب کہ روی دلت نیست سوے حال ہی — چنیں کہ روے جہاں ہست سوے ویرانی
تو فارغی زمن و من خود از تو موجودم — کہ ذرہ ام من و تو آفتاب رخشانی
روا مدار پراگندگی خاطر من — برائے نظم معیشت ز فرط حیرانی

(کلیات ص ۱۳۳)

اپنے عزل، افلاس اور ناقدری کے متعلق لکھتے ہیں :-

حقوق من ہمہ بگذار چوں منے شاید | کہ یار دوست بد امسال آشنا نبود
بریز خون من و آبروے من بریز | بجان تو کہ مرا طاقت جفا نبود
زبیخ برکن آں راکہ غرس دولت تست | کہ ایں زروے کرم لائق شما نبود
مرا چو خرج فزوں گشت دخل کم کردی | مکن کز اہل مروت چنیں سزا نبود
عمل تو خرج کنی سیم دیگراں ببرند | رسوم قطع کند جاے غصّہا نبود
برو تقدمہ باری اشارتے فرماے | کہ عزل و تقدمہ با یکدگر روا نبود

(کلیات صفحہ ۱۱۳)

یہ شکایت متعدد قصائد میں دیکھی جاتی ہے۔

قاضی صاحب ایک مرتبہ اور کسی ناگہانی حادثے کی بنا پر اصفہان کو خیرباد کہتے ہیں۔ کمال اس مرتبہ ساتھ نہیں جاتے ؎

سرورا موکب عالیت کہ بادا منصور | دائم آسودہ بداز زحمت داعی ایں بار
اگر از جمع ہا جر نبد ایں بار رہی | پاے بیروں ننہاد ست ز حد انصار

قاضی صاحب کی غیر حاضری میں اصفہان پر ایک دور قیامت گزرا۔ کمال:۔

ازاں ہا کہ در غیبت خواجہ رفت | درین شہر خاصا بر اصحابنا

قتل و غارت گری شروع ہوئی۔ امیروں کو لوٹا، عورتوں کی عصمت دری ہوئی، مساجد کی بے حرمتی کی، مال داروں کو پکڑ کر چار میخ کیا، شہر کی خندق میں زندوں کو پاٹ دیا، نہ بوڑھوں کو چھوڑا نہ بچوں پر رحم کیا، یہ سب مذہبی تعصب کی بنا پر ہوا۔ ایسی حرکات سے ابخازیوں کو بھی شرم آئے گی۔ ان اعمال کے باوجود دعویٰ ہے کہ ہم امت رسول اللہ ہیں:۔

تعصب چہ باشد کہ ایں رسم و راہ | ندارند ابخازیاں ہم روا
چنیں رسم و آئین و پس لاف زن | کہ ہستیم ما امت مصطفےٰ

(کلیات صفحہ ۱۴۱ طبع بمبئی)

اس زمانے میں قاضی صاحب نے دشمنوں سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ پر پناہ لی ہی۔ ان کا فرزند قید ہوگیا تھا، باپ بیٹوں میں پھر ملاقات ہوتی ہی۔ کمال :-

یوسف زحبس آمد و یعقوب از سفر — گشتند شادمانہ بدیدار یک دگر
آفاق شرع رونق دین دگر گرفت — تا برزد آفتاب لقایش زکوہ سر
بر تیغ کوہ جائے اگر کرد طرفہ نیست — آرے عجب نباشد گوہر بہ تیغ بر
تابندہ وار جائے وے از شعب خود کند — بر بستہ بود کوہ خود از ابتدا کمر

(کلیات صـ۹۵، طبع بمبئی)

دیگر : گردن کش است و ثابت و سر سبز کوہ از انک
روزی دو بود خواجہ مادر کنار او (کلیات صـ۹۶)

متعدد قصائد سے معلوم ہوتا ہی کہ قاضی اپنے دشمنوں کے منصوبوں کو شکست دے کر دوبارہ اپنے منصب پر فائز ہو جاتا ہی۔ واپسی پر اپنا محل و دیگر املاک کامل بربادی کی حالت میں دیکھتا ہی۔ شاعر اُسے تسلی دیتا ہی۔

بزرگوارا دل تنگ می نباید بود — ز نکبتے کہ بریں دولت جواں آمد
اگر بکند عدو خاک در گہت چہ شود — کہ کان فضل و کرم در جہاں ہماں آمد
چہ نقص ذات ترا از خرابی مسکن — خرابہ ہم وطن گنج شائگاں آمد
دماغ بود حسود ترا جہاں گیری — گرفتن تو مگر زانشس در گماں آمد

(کلیات صـ۹۳)

کمال کے تعلقات قاضی صاحب کے دربار میں بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ قاضی نے اس کے علم و فضیلت، دنیا سے شعر میں اس کی شہرت۔ کبر سنی، سفید ریشی، افلاس و تنگ دستی، کثیر العیالی کی طرف سے آنکھ پر پٹی باندھ لی۔

بار بار وہ رحم کی درخواست کرتا ہے، معافیاں مانگتا ہے، دشمنوں کی بدگوئی کی تردید کرتا ہے، پشتینی تعلقات کے واسطے دیتا ہے۔ قصیدے سُناتا ہے، قطعے پیش کرتا ہے، لیکن ظالم قاضی آخر دم تک صاف نہ ہوا پر نہ ہوا میں بعض اقتباس یہاں درج کرتا ہوں:-

زمانہ خود پئے کار منست فارغ باش ... ہمیں بس است کہ از تو نیافت خط جواز
گرفتم آنکہ مرا نیست ہیچ استحقاق ... گرفتم آنکہ بہ دانش زکس نیم ممتاز
زمن بصورت تمثیل نکتۂ بشنو ... بلفظ مختصر اندر نہایت ایجاز
اگر ستوری بر آخور جواں مردی ... رسد بنوبت پیری بروزگار دراز
برون نراندش از پایگاہ خود بجفا ... گرش ندارد چوں دیگراں بآلت و ساز
دگر نیاید از و خدمت رکاب بشرط ... از و علوفۂ معہود ہم نگیرد باز
گرہ ز ابرو بکشا و چشم خشم بہ بند ... پس ار تو خواہی کارم بساز و خواہ مساز
حقوق بندہ بسی ہست پیش چشم آور ... عتاب و خشم ز حد رفت سوی پشت انداز

(کلیات، ص ۱۴۵)

دیگر:-

شہنشاہ شد کہ بانگ تظلم ہمی زنم ... دادم نمی دہند بمقدارے از عشیر
گیرم کہ آب و رونق فضل و ہنر نماند ... دیوار قصر شرع چرا شد چنیں قصیر
بسیار خوردہ ام غم ایں دولت جواں ... اکنوں بخور تو ہم غم ایں ناتوان پیر
در عہد نامرادی با زمرۂ خواص ... شبہا سمیر بودہ ام و روزہا سفیر
واکنوں کہ استقامت ایام دولت است ... بر طبع تو ثقیلم و در چشم تو حقیر
پشتم دو تا شدہ چو کمانم بخویش کش ... کو باؤ پر کہ دور بیند ازیم چو تیر
بر مدح تو ہزینہ شدم عمر نازنیں ... بر درگہت چو شیر شدم موی ہمچو قیر
با من بہ نیک و بد دو سہ روزی دگر بساز ... کیں جائے عاریت نہ بماند بہ مستعیر

(کلیات کمال ص ۱۵۹، طبع بمبئی)

آخر تعلق کا سلسلہ بالکل ختم ہو جاتا ہی۔ کمال کے زار نالے بیکار جاتے ہیں۔ قاضی بوڑھے شاعر کی دل آزاری کے لیے قرض کے بہانے روپیہ مانگتا ہی۔ یہ کہتے ہیں:۔

برمن خستہ باز بے موجب ترشی کردۂ وصفرا نیز
ویں کہ امسال ہم بریں منوال می کنی زیں حدیث میدا نیز
لاجرم نیست از سخات مرا بہرہ چہ زہرۂ تمنا نیز
زحمت حضرت ارچہ کم کردہ است ہم دراں خدمت است اینجا نیز
گرتو از بندہ قرض می خواہی بخطایانہ خود بعمدا نیز
ہم عفا اللہ بلطف تو کاخر درشمارے گرفت مارا نیز
از تو تشریف بود عیب از ماست کہ نداریم زر و کالا نیز
ورنہ از بندگان مفلس خویش قرضی خواست حق تعالیٰ نیز

وہ اپنی چہل سالہ خدمات اور اپنے کلیات کی جو قاضی اور اس کے والد کی ثناگستری میں تیار ہوا ہی، یاد دلاتے ہیں۔ مگر ہر التجا بے اثر ثابت ہوئی:۔

مگر کہ مدت دہ سال ہست یا افزوں کہ از شماتت اعدا نخوردم آبے خوش
ہزار بار مرا عفو کردۂ و ہنوز نگشت طبع تو با من ز ہیچ بابے خوش
گرفتم آنکہ نہ من بودم آنکہ ساختہ ام زمدحت تو و اسلاف تو کتابے خوش
گرفتم آنکہ چہل سال آں نہ من بودم کہ شب نکردم از اندیشۂ تو خوابے خوش

ہجوم یاس میں کمال اپنا لہجہ بدلتے ہیں اور قاضی کو بد دعا دیتے ہیں:۔

نگشتہ ہیچ مرادے مرا ز تو حاصل دریغ درسر کار تو رفت ہر دو جہاں
چنانکہ سعی من از خدمت تو ضائع شد خدائے سعی تو ضائع کناد در دو جہاں

اگر قاضی کی ہجو نہیں لکھی تو یہ ان کا قصور نہیں۔ اس کے حاشیہ نشینوں

کو تو نہیں چھوڑا:۔

گشت یکبار حضرت خواجہ	مجمع ناکسان و بے ہنراں
روز بازار فضل بود و شداست	جائے بازاریان و برزگراں
خیمۂ او ز بار دم خراست	کہ درو حاضرند .... خراں
نے غلط می کنم کہ حضرت او	با خطر شد ز جمع بے خطراں
مصر جامع شداست زانکہ درو	جمع گشتند جملہ پیشہ وراں

قاضی کے اہلکاروں کے حق میں کہتے ہیں:۔

درنگر در صدر دیوان و ببیں	خواجگان نو کہ صف دربستہ اند
سر بسر بازاریان مختلف	جمع گشتہ جملہ دریک ستہ اند
در خور بالشش نیند اما ہنوز	از پئے ہم .... شایستہ اند
موی را نا زدہ اند الحق جز آنک	از زنخدان خودش بگسستہ اند
نے خطا گفتم جوانانی ہمہ	شاہد و شایستہ و بایستہ اند
راست پنداری عروسان نوند	بس کہ چیست و شاہد و برجستہ اند
چہرہاشان در قبائی سرخ و سبز	ہمچو گل با غنچہ دریک دستہ اند

تالی دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہی، ہم اگرچہ تمام واقعات سے واقف نہیں تاہم کہا جاسکتا ہی کہ کمال بھی اس معاملے میں سراسر بے قصور نہیں تھے۔

کمال کا پیری کا زمانہ بڑی تلخی کے ساتھ گزرا ہی جس کے لیے اس عہد کے حاکموں کی سختی اور جبر زیادہ ذمہ دار ہی۔ صاحب عادل شہاب الدین نے جس کی مدح میں کمال نے قصائد و قطعات بھی لکھے ہیں، ان پر کچھ جرمانہ کر دیا ہی اور ضیاء الدین جو اس وزیر کا افسر ماتحت ہی اس جرمانے کی وصولی میں بیحد سرگرمی دکھاتا ہی۔ اس سلسلے میں کمال نے کئی قصیدے لکھے۔ صدائے احتجاج بلند کی

اور وصولی کے واسطے جو سپاہی (سرہنگ) اُن کے گھر پر تعینات ہوئے تھے ان کے ہٹانے کی استدعا بھی کی اور ضیاء الدین کی تو (جسے موش کے نام سے یاد کیا ہی) ایسی خبر لی کہ عبید زاکانی کی سطح پر آگئے۔ کہا ہی :-

بخدائیکہ بر خزینۂ ملک ۔۔۔ پاسباں کرد دولت بیدار
کانچہ گفتند حاسداں بغرض ۔۔۔ درحق من ز اندک و بسیار
ہمہ کذب صریح و بہتان است ۔۔۔ ورنہ از فضل و دانشم بیزار
مفسداں خود کنند تسویلات ۔۔۔ تو بخود راہ شاں مدہ زنہار
خود چہ کار خزینہ راست شود ۔۔۔ از دو سہ کہنہ جبّہ و دستار
نام من در جریدۂ صلت است ۔۔۔ در دادین خواجگان کبار
چوں نویسند اندریں دیواں ۔۔۔ در وجوہ مصادرات و قرار
تو بزرمی خری ثنا زا ہنا ۔۔۔ کہ عیال منند در اشعار
بجز از من براٗیگاں بارے ۔۔۔ ویں زیاں را ز سود کم مشمار
عوض زر ز من گہر بستان ۔۔۔ قیمتی تر ز گوہر شہوار

شاعر نے اس کے بعد موش کی ہجو میں ابیات ذیل لکھے :-

آمدم با حدیث موش کہ او ۔۔۔ کرد خبث درون خود اظہار
خود بیندازم از بغل گربہ ۔۔۔ کنم از ماجرائے موش اظہار
گربۂ روزہ دار بود آنموش ۔۔۔ ہم فریبندہ ہم سبک طرّار
موش چوں منقلب شود شومست ۔۔۔ شومی او اثر کند ناچار
ظنّم آں بد کہ شیر مرداں را ۔۔۔ بشکنم پنجہ خرد در پیکار
درخیالم نبد کہ خیرہ مرا ۔۔۔ قصد موشی چنیں کند افگار
ہر کجا موش اژدہا گردد ۔۔۔ عندلیبان شوند بو تیمار

خود گرفتم کہ فارۃ المسک است — کہ ز غمّاز لیش نیاید عار

ہم بباید شگافتن شکمش — تا بروں اوفتند ازو اسرار

بخدائیکہ او ز عطسۂ خوک — موش را کرد در جہاں دیدار

واجب القتل کرد موشاں را — در بود شاں درون کعبہ قرار

برسولے کہ فتوی شرعش — موش را کرد ہم طویلۂ مار

کانچہ گفتند مفسداں بغرض — در ضمیر رہی نکرد گزار

بشنو از بندہ نکتۂ شیریں — کہ خلندہ است در دلم چوں خار

گرچہ دندان موش بس تیز است — تیز تر زاں زبان من صد بار

تو بحق نائب سلیمانی — حق ہر یک بجائے خود بگزار

کار موشاں بر آسماں بردی — جانب بلبلان فرو مگزار

(کلیات ص۱۸۹)

اسی شہاب الدین کے نام ایک اور قصیدے میں کمال کے طاقتور قلم نے سرہنگوں کا خاکہ یوں کھینچا ہی :-

جفتی عوان بخانۂ من سر فرو کنند — ہر صبح دم کہ باز کنم چشم خیر خیر

مریخ ہیکلے دو کہ گر بر فلک شوند — حالی ز سہم شاں بگریزد ز خانہ تیر

جفتے زمیں شگاف بدنداں چو گاؤ یوغ — سرہنگ نام شاں و لقب منکر و نکیر

نقان و ازرقان و غلیظاں کہ وصف شاں — آرد بروے اہل ہنر گونۂ زریر

سرہنگ ہفت رنگ کہ اجزائے ذات شاں — زرنیخ و نیل باشد و شنگرف و نفت و قیر

ز وپیں آبدادہ درخشاں ز دست شاں — زاں ساں کہ در سیاہی شب صبح مستنیر

گر در خیال دایہ کند شکل شاں گزر — کودک ز بیم شاں نبرد لب بسوئے شیر

چشمی چو آبگینۂ و پیشانی چو سنگ — قدی چو تیر کشتی و ریشی چو بادگہ

روئے بسان آتش و موئے بسانِ دود زنگی چو رنگ طبر خون بوئی چو بوی سیر
نقش نگین ہر دو گراں جان و زن بمزد وصف جمال ہر دو عبوس است و قمطریر
رفتارشاں چو آتش و گفتارشاں چو جنگ دیدارشان عقوبت و آوازشاں نفیر
بااین چنیں حریف ہمانا کہ بعد ازیں شاعر دریں دیار نشاید زدن بہ تیر
(کلیات صہ ۱۹۳)

کسی دوسرے قصیدے میں یہی آوازِ فغاں ایک نئے انداز میں بلند کی جاتی ہی۔ مخاطب وہی شہاب الدین ہی:۔

چہ دیدۂ زمن بے نوا کہ ہر ساعت زکوے لطف بسوے جفا کنی آہنگ
گہی بہ تیغ جفاے تو عرض من مجروح گہی بسنگ عتاب تو پاے عذرم لنگ
گہی خورم زخرے پاۓ پیل بر سینہ گہے رسد بدل من زموش زخم پلنگ
چنانہ ام کہ نسازی مراجز از پۓ زخم بہانہ ام کہ بجوئی مراجز از پۓ جنگ
چو حاضرم ندہی ہر گزم بجز دشنام چو غائبم نفرستی بمن بجز سرہنگ
چو حلقہ بر درمن زدیکے ز درگاہت شود زبیم رخ کودکان من بے رنگ
چناں کہ دیو ز زخم شہاب بگریزد ہمی گریزم از نام تو بصد فرسنگ

ان کے سلسلۂ معاش کا اب تک ذکر نہیں ہوُا۔ ایک ذریعہ تو ایک چھوٹا سا گانو ہی۔ جس کا ذکر ان شعروں میں کیا ہی:۔

دارم ز راہِ شغل و عمل مختصر دہی از جور دَور کاسۂ گردوں شدہ خراب
درعہد دولت تو کہ برسنگ می زند لالہ زبیم معدلتت ساغرِ شراب
چندیں شگفت نیست اگر ایں خراب را آرد ظہور عدل تو در بابِ احتساب

اس گانو کا نام غالباً کرم آباد ہی۔ فرماتے ہیں ؎

حصۂ از کرم آباد کہ آں حق منست خود دو سالست کہ از جورِ فلک ویرانست

لطف فرمائی بتجدیدش و امضا بنویس — کہ مرا خود بجہاں رسم معیشت آنست

دیگر

بصد حیلت بخون دل بعمری کردہ ام حاصل — محقر ملککے ویراں وجوہ نیم نانے را

زجو ریکدو نا معلوم اینک شد دو سال افزوں — کہ تا من ز ارتفاع آں نکردم تردہانے را

دوسرے قاضی کے ہاں جماعت علما میں جیسا کہ اس سے قبل مذکور ہوا، ملازم بھی تھے۔ اس کے علاوہ سالانہ غلہ بھی ملا کرتا تھا۔ جوڑے دستار وغیرہ بھی ملتے رہتے تھے اور اسی واجبی آمدنی اور انعام و اکرام پر ان کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ ایک سال گلا ہوا غلہ ان کے ہاں پہنچایا گیا۔ بہت بگڑے اور شکایت میں ایک قطعہ لکھا:۔

غلہ کامسال خواجہ داد مرا — گر نبد جملہ بود اکثر خاک

خاک مردم خورد ندانستم — کہ خورد مردم اے برادر خاک

کردم اندیشہ تا چرا فرمود — خواجہ با گندمم برابر خاک

آدمی را چو خاک سیر کند — کرد وجہ غذائے من بر خاک

کمال کے ڈاڑھی نہیں تھی۔ صرف ٹھوڑی پر کچھ بال تھے:۔

زنخم می بلرزد ارچہ مرا — ہر چہ مویست بر زنخدان است

(کلیات صفحہ ۲۴)

جمال الدین کی طرح ان کے بھی چار اولادیں تھیں:۔

شاعری قانعم بخود مشغول — من و مشتی عیال و طفل چہار

(صفحہ ۱۸۷ کلیات)

ان میں سے ایک کا نام علی تھا۔ جو قاضی کے ہاں کسی خدمت پر ملازم تھا اس کے سالانہ مرسوم کی طلب میں قاضی کی خدمت میں لکھتے ہیں:۔

از جناب تو کہ نیست خالی از دو — ہر چہ رسم کمال می وارد
بندہ زادہ علی اسمٰعیل — طمع رسم سال می دارد

(صفحہ ۲۵ کلیات)

غالباً اسی فرزند کی سفارش میں اسے ملازم کراتے وقت لکھا تھا:۔

توقع است کہ ایں بندہ زادۂ خود را — کہ داغ بندگی از جد واز پدر دارد
بشرط تربیت از من قبول فرماید — بزبدہ خانۂ خاصش زلطف بسپارد

ایک فرزند جو کسی قافلے کے ساتھ سفر کو گیا تھا واپسی کے وقت اتفاقیہ کسی ندی میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کا مرثیہ کلیات میں موجود ہے:۔

شرط ہمراہی نبدکاں سایہ پرورد مرا — بازپس ماندند وخود باشور وشر باز آمدند
ناگہاں در نیمہ رہ طفل جہاں نادیدہ را — در خطر بگذاشتند و با بطر باز آمدند
گوہری کش جاں بہا بود اندر آب انداختند — وز برائے حفظ رخت مختصر باز آمدند
قرۃ العین مرا تنہا بجا بگذاشتند — در بیابانی وخود بایکدگر باز آمدند
دوستاں و یارکاں از بہر استقبال او — ہمچو من برپائی رفتند و بسر باز آمدند
آہ ازاں ساعت کہ ہمزادان او باچشم تر — بے برادر خوں چکاں پیش پدر باز آمدند
نازنین خویش را با بار و خر کردم براہ — باز نامد نازنینم بار و خر باز آمدند
برلب جوئے فرو بردند سروے را بخاک — مرغ وماہی از برش زیر و زبر باز آمدند
چوں بدیدندآں جواں را زیر آب و زیر خاک — پس برما غنچہ آسا جامہ در باز آمدند

لڑکوں کے علاوہ دو لڑکیاں تھیں۔ دوسری لڑکی کی پیدائش کے وقت بڑے رنج و ملال کی حالت میں لکھتے ہیں:۔

رسید دختر دیگر مرا و یکبارہ — ببرد رونق عیش و ببرد آب حیات

ایک قطعہ جوان بھائی کے مرثیے میں لکھا ہے:۔

بنوجوانی ببرید شاخ عمر بتیغ مرگ — اگرچہ رسم بنود دست شاخ تر ببرید
اگرچہ منزل ما با سفر برابر بود — ولیک آنکہ جواں بود زود تر ببرید

کمال مدعی ہیں کہ ان کی ذات میں سترہ فضیلتیں جمع ہیں۔ ہم تفصیل سے ناواقف ہیں۔ ان کا بیان ہے :- **مصرع** مراست از ندب فضل ہفدہ خصل ہنوز ——

لیکن جن فضائل پر ان کو ناز ہے وہ عربی۔ شعر و ادب فقہ و علوم ہیں۔

گمان غالب ہے کہ وہ بعض دستکاریوں سے بھی واقف تھے۔ ایک قطعے کے ذریعے کسی کو دندان ماہی کے دستے والی چھُری بھیجی ہے ؎

فرستادم بخدمت کاردے خوب — کہ ارزد گوہر او ہرچہ خواہی
ببیں بر دستہ تیغش گر بخواہی — زبانِ مار در دندان ماہی

ایک قطعہ مظہر ہے کہ انھوں نے ایک صندوق جس پر ان کا بہت وقت لگا ہے تیار کیا ہے۔ کہتے ہیں اور علاء الدین سے خطاب کرتے ہیں :-

صندوقکے لطیف مراہست و راستی — مثلش نساخت آنکہ ز اہل صناعتست
بسیار روزگار دراں صرف کردہ ام — پنداشت صنعتش کہ چو صندوق ساعتست
زاں صاحبست کہ بفرست و حکم او — ناچار در مقابل سمعاً و طاعتست
لیک از ہی فرستم چشم قفائی اوست — درمی کنم توقف جائے شناعتست
در حضرتش زیاں نکنم زانکہ حضرتش — جائے بضاعتست نہ جائے اضاعتست
دریاست دست خواجہ و گر ایں بدو رسد — گویم مرا بدریا چیزے بضاعتست
دارم ز جود تو طمع دہ چہل از انکہ — از بحر سود یک دو طریق قناعتست

ایک دفعہ بیمار ہو گئے تھے، حکیم نجم الدین کے علاج سے اچھے ہوئے، شکریے میں لکھتے ہیں :-

چگونہ عذر کر ہائے او توانم ساخت — کہ من توانِ تن ناتواں ازو دارم

زمن چہ خدمت شایستہ آید آنکس را — کہ بعد از ایزد خلاق جان از و دارم

ضیاء الدین احمد ابن ابوبکر بیابانکی کی مدح میں کمال نے ایک قصیدہ لکھا تھا۔ جس کا مطلع ہے:۔

درست گشت ہمانا شکستگی منش — کہ نیک از ان بشکستست زلف پر شکنش

(کلیات ص۱۷۹)

قصیدہ پڑھتے وقت کسی نے اعتراض کیا کہ یہ مطلع ظہیر فاریابی کے مطلع سے اڑایا گیا ہے۔ ظہیر کا مطلع ہے

ہزار توبہ شکستست زلف پر شکنش، — کجا بچشم در آید شکست حال منش

کمال نے اسی وقت ممدوح کو خطاب کر کے جواب میں فی البدیہہ کہا:۔

بفر مدح تو شد گفتہ این قصیدہ کہ خواست — بامتحان زمن خستہ جان ممتحنش

توارد ی گر افتادہ بود در مطلع — بدان سبب رقمی از قصور بر مزنش

ظہیر اگرچہ کہ صراف نقد اشعار است — گمان مبر کہ زند بندہ قلب بر سخنش

یہی معذرت ایک قطعے میں بھی ادا کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

خدای داند اگر من ز شعر ہیچ کسے — بقصد مظلمۂ کردہ ام بادنی شیٔ

مرا کہ چوں بہ سخن خوان نظم آرایم — بود نوا کہ او جدی و سفرہ ریزہ جدی

چگونہ دل دہدم لقمۂ فرو بردن — کہ خاطرے دگرے کردہ باشد آن راقی

مگر توارد خاطر کہ در مجاری فکر — نہ ممکنست کہ کس محترز بود از وی

دو راہ رو کہ براہے روند بریک سمت — عجب نباشد اگر اوفتند پی بر پی

(کلیات قلمی مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر)

کمال کے کلیات میں مفصلۂ ذیل اسما کی مدح میں قصائد ملتے ہیں:۔

(۱) علاء الدین تکش ۵۸۹-۹۶ھ ہجری (ص۱۶ کلیات)۔ (۲) جلال الدین منکبرنی ۶۱۷-۲۸ھ (ص۲۱۶ و

(۳) غیاث الدین محمود برادر جلال الدین مذکور (ص۱۹)۔ (۴) اتابک اعظم سعد بن زنگی، ۵۹۹-۶۲۸ھ (ص۲۵)۔ (۵) اتابک اعظم مظفر الدین ابوبکر بن سعد زنگی جب شہزادگی کے زمانے میں اصفہان آتا ہے۔ کمال کہتے ہیں:۔

خسروا حال سپاہاں وانچہ دروے میرود | از ستمہا سمع اعلیٰ را خبر باشد مگر
ہست مارا بر تو حق خدمت و ہمسایگی | از برائے ایں دو حق اندر حق ما کن نظر
لطف تو گر در نیابد کار ایں بیچارگاں | در دو سہ ماہے دگر ایں جا نیابی جانور

(۶) شہزادہ شرف الملک بن حسام الدولہ اردشیر۔ اس خاندان سے ان کے قدیمی تعلقات ہیں۔ جمال الدین بھی مداح رہے ہیں:۔

میراث یافتم ز پدر مدحت شما | والحق ازیں شرف سرِ من باسماں رسید
نتواں بصد ہزار زباں گفت شکر آں | تشریفہا کہ مارا ازیں خانداں رسید

(کلیات ص۳۶)

(۷) سلطان اتابک سلغر۔ (۸) صاحب اعظم شرف الدین معین الاسلام علی بن فضل وزیر جلال الدین منکبرنی۔ اس وزیر کی تعریف میں متعدد قصائد وقطعات موجود ہیں۔ ان میں ایک قصیدہ ایک مدرسے کی تاسیس کے وقت جس کی بنیاد تباہی اصفہان کے بعد ڈالی جاتی ہے، لکھا ہے۔ یہ مدرسہ غالباً جلال الدین منکبرنی کے حکم سے کھولا جاتا ہے۔ کہتے ہیں:۔

چو حق شہی را الہام داد و شاہی داد | کہ روے خیمۂ دولت بدیں مکاں آرد
سرائے علم فرازد اساس خیر نہد | درخت ظلم کند خوف را اماں آرد
صلیب خاج بسوزد کلیسیا بکند | بنائے مدرسہ بر گنبد کیاں آرد
زخشت خام یکے جام جم بیاراید | زآب وخاک یکے خلد ناگہاں آرد
روا بود اگر از بہر اقتباس علوم | فرشتہ رخت بدیں عالم آشیاں آرد

اگرچہ حکم سلیمان روزگار کنند ولیک تخت سبا آصف زماں آرد
بہمت شرف الدین علی تمام شود ہرآنچہ خسرو آفاق درگماں آرد

(۹) ملک نصرت الدین۔ (۱۰) صدر نظام الدین نظام الملک محمد (۱۱) فخر الدین ابن نظام الدین (ص۱۴)۔ (۱۲) حاجب شمس (ص۴۳)۔ (۱۳) شرف الملک تاج الدین علی وزیر (ص۴۴)۔ (۱۴) قاضی القضاۃ رکن الدین ابوالعلا صاعد (ص۵۴) (۱۵) رکن الدین مسعود بن صاعد۔ (۱۶) در صلح صدر الدین و قوام الدین (ص۱۶۵) (۱۷) صدر الدین عمر خجندی (ص۱۶۹)۔ (۱۸) عضد الدین حسن (ص۱۷۳) (۱۹) عمید الدین آصف ثانی (ص۱۷۶)۔ (۲۰) احمد بن ابوبکر بیابانکی (ص۱۸۱) (۲۱) بہاء الدین عبدوس؟ (ص۱۸۳) (۲۲) صاحب اعظم شہاب الدین (ص۱۸۷)۔ (۲۳) شمس الدین خوارزمی (ص۱۹۸) (۲۴) نور الدین (ص۱۹۹) (۲۵) رشید الدین وزیر (ص۲۰۰) (۲۶) قطب الدین (ص۲۰۲) (۲۷) زین الدین علی السہروردی (ص۲۰۳) (۲۸) عمید الدین پارسی (ص۲۴۵)
(۲۹) صدر کبیر ضیاء الدین (ص۲۵۶)۔ (۳۰) نجم الدین (ص۲۵۶)۔ (۳۱) عز الدین (ص۲۵۷)۔ (۳۲) کریم الدین (ص۲۶۱)۔ (۳۳) اسپہسالار ملک عز الدین اصفہانی (۳۴) قوام الدین ابراہیم بنداری (ص۲۶۲)۔ (۳۵) ناصر الدین منگلی (ص۲۶۳)۔

کمال نے بعض شعرائے عصر کے ساتھ قصائد و قطعات کا تبادلہ کیا ہے۔ ان میں پہلا نام فخر الدین ہے۔ اس کے قصیدے کے جواب میں وہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے ؎

خیر مقدم زکجا پرسمت اے باد شمال کش خر امیدی چونی وچہ داری احوال

دیر میں جواب دینے کی معذرت کے بعد اپنے پیشے کی کساد بازاری کا قصہ لے بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں ان دولت مندوں کی کیا شکایت کروں۔ جنھوں نے فقیروں تک سے ان کا پیشہ (گدائی) چھین لیا۔ پس ان کے مدحیہ قصیدے لکھنا

ہوں اور اپنی روٹی کھاتا ہوں پھر بھی وہ مجھ سے وصولی کی توقع کرتے ہیں۔ اے بھائی جب ایسا زمانہ آگیا ہی کہ مدح خریدنے والے ممدوح نہیں رہے تو آؤ ہم تم ایک دوسرے کی تعریف میں شعر لکھیں۔ کسی زمانے میں لوگ ہجو سے خوف کھاتے تھے۔ اب تو وہ بھی بے اثر رہ گئی۔ ۔ ۔

بلکہ نالم زکسانے کہ ز افراط طمع ۔۔۔ بگدایان نگزارند گدائی و سوال
نان خود می خورم و مدحت شان می گویم ۔۔۔ پس ہم ایشان را از من طمع افتد بمنال
اے برادر چو فتادیم بدورے کہ درو ۔۔۔ نیست ممدوحی کز ما بخرد مدح بمال
خود بیا تا پس ازیں مدحت خود می گوئیم ۔۔۔ چون ز ممدوح توقع بنود جود و نوال
ہجو را نیز اگر وقتی تاثیرے بود ۔۔۔ ایں زمانش اثری نیست بجز وزر و وبال

دوسرے اثیرالدین (اومانی) ہیں، جو اظہار عقیدت میں ایک قطعہ اس کی خدمت میں بھیجتے ہیں اور اسے پیغمبر سخن کہتے ہیں۔ اثیر کے قطعے کے پہلے دو شعر یہ ہیں:۔

جہان فضل و معانی خدیو کشور فضل ۔۔۔ کہ فخر جان و جہاں شد ترا ثنا کردن
کمال ملت و دیں آنکہ بر خرد فرض است ۔۔۔ بہ نسبت سخن خوبت اقتدا کردن

جواب میں کمال لکھتے ہیں:۔

اثیر دین را رسمیست بر زبان قلم ۔۔۔ پیام روح قدس دمبدم ادا کردن

تیسرا نام نورالدین ہی جس نے کمال کی تعریف میں اشعار لکھے ہیں اور کلام کی درخواست کی ہی۔ کمال اس وقت شعر و شاعری کا مشغلہ قریباً بند کر چکے ہیں، جواب میں لکھتے ہیں:۔

نور دین اے ذات تو کان گہر ۔۔۔ کان چہ باشد خود سراسر جوہر است
تا بدید آں طبع گوہر زاے تو ۔۔۔ از خجالت دامن دریا تر است

شعر می خواہی ، خادم مدتیست   تا ز شعر و شاعری فارغ تراست
شعر را گر بود وقتے رونقے   ایں زماں بارے عجب مستنکراست
بلبل طبعم نوا کم می زند   زانکہ شاخ جود بے برگ و براست
زان چو سوسن خامشم کیں قوم را   ہمچو نرگس چشم یکسر بر زر است
چوں بدیں صورت بود کار ہنر   وائے آن مسکیں کہ معنی پرور است
ہم فرستادم بخدمت چند بیت   تا بدانی کین رہی فرماں بر است

کمال نے اپنے عہد میں شعر و شاعری کی بے قدری کا جو بیان مذکورۂ بالا فخر الدین و نور الدین کے خطابیہ ابیات میں دیا ہی یہ کوئی تنہا بیان نہیں ہی بلکہ ایسے جذبات اُس کے ہاں نہایت عام ہیں۔ اس کو اپنی ناکام زندگی پر سخت افسوس ہی بلکہ بعض اوقات اس تاسف اور تلخی پر غصہ غالب آجاتا ہی اور وہ نہایت سخت زبان استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ یہاں بعض صاف اشعار درج ہیں:-

عقد گوہر کجا کنم عرضہ   چوں نہ بینم ہمی خریدارے
نیست در روزگار ممدوحی   کہ ازو نیست بر من انکارے
(دیگر) ہمہ دریاے جور لیست شدند   ہر کجا در زمانہ پُر ہنر لیست
باچنیں نکبت ہُنر منداں   وائے او کز ہُنر برو اثر لیست
(دیگر) بقحط سالی افتادم از ہُنر منداں   کہ گر بیاں کنم او را بشرح نتوانم
اگر بیابم آں را کہ شعر در یابد   بدو دہم صلتی تا سخن بر و خوانم
(دیگر) دریغ روز جوانی کہ در محالاتش   بباد دادم و او نیز داد بر بادم
ز عمر آنچہ گزیں بود رفت و من ہمہ عمر   بکام خویش یکے روز نیست بریادم
بعمر ماندہ اگر شاد لیست مردم را   من از زمانہ بعمر گزشتہ بس شادم

زفن شعر بیکبارگی شدم بیزار — کہ آبرو مے برد ہر زماں بہ بیدادم

دیگر :-

مرا چہ حاصل ازیں خواجگان بے معنی — کہ ہیچ کار مرا انتظام می ندہند
ندانم از کرم آخر چہ در وجود آمد — کہ ہیچ گونہ بدستش زمام می ندہند
چہ چشم دارم ازیں منعماں کہ شاعر را — بصد شفیع جواب سلام می ندہند
کجا روم چہ خورم من زباد شاید زیست — کہ قوت روز بروزم تمام می ندہند
زکات می ندہند و کرم نمی ورزند — کتاب می نخرند و بوام می ندہند
پناہ سوے قناعت ہمی برم زیں قوم — کہ اہل خانۂ خود را طعام می ندہند
دلا بحکم ضرورت بساز با اینہا — کہ ہیچ جاے نشان کرام می ندہند

دیگر :-

شکایتے کہ ز ابناے عہد ہست مرا — بگویم ونکنم شرم مے نیارم گفت
سزاے یک یک شاں آنچنانکہ میدانم — کسی نداند گفتن ولے نیارم گفت
بہ ترک شعر بگفتم چرا ازاں کہ دروغ — ز حد ببردم و یک راست می نیارم گفت
سخن چگونہ تواں گفت کاہل ایں ایام — سزاے مدح نیند و ہجی نیارم گفت

لیکن قطعۂ ذیل ان کی انتہاے یاس کا آئینہ دار ہے :-

چو عادتست کہ ابناے دہر در ہر فن — کرم بلاف ز عہد گزشتہ وا گویند
بداں گروہ بباید گریست کز پس ما — حکایت کرم از روزگار ما گویند
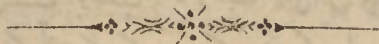
ضمیمہ متعلق رُباعی

بجواب مولانا سیّد سلیمان ندوی

تنقید شعر العجم کی پہلی قسط میں جو اکتوبر ۱۹۲۲ء کے رسالۂ اُردُو اورنگ آباد میں شائع ہوئی تھی، میں نے رباعی کے سلسلے میں جو بیان دیا تھا اس پر ہمارے ملک کے فاضل بزرگ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی قابل قدر تصنیف خیام میں جو ۱۹۳۳ء میں طبع ہوتی ہی کئی اعتراض کیے ہیں۔ مثلاً میں نے معیار الاشعار کو خواجہ نصیر الدین طوسی کی تصنیف بیان کیا تھا۔ سید صاحب نے اس سے انکار کر دیا۔ میں نے لکھا تھا کہ رباعی ایرانی الاصل ہی یعنی اس کے اوزان ایران زا اور مقامی ہیں۔ سید صاحب کا دعویٰ ہی کہ رباعی کہنے والے "قدما عربی کے شاعر تھے"۔ میں نے کہا تھا کہ رباعی ابتدائی مدارج میں چار بیتی کی شکل میں لکھی جاتی تھی جس کے چاروں شعر ہم قافیہ ہوتے تھے۔ سید صاحب اس کو ایک بے سند دعویٰ بیان کرتے ہیں۔ میں نے لکھا تھا سب سے قدیم رباعی اس وقت ابو شکور بلخی کی ملتی ہی۔ سید صاحب کا ارشاد ہی کہ ایسی قدیم رباعیاں دس بارہ سے زیادہ موجود ہیں۔ میں نے فرخی کا ایک شعر اُس کے دیوان سے ابوطلب ترانہ گو سے متعلق نقل کیا تھا۔ سید صاحب نے بدانستِ خود اس کی تصحیح کر کے اس کے وزن کو بدل دیا۔

اس کے علاوہ سید صاحب بعض جدید امور یا نئی تحقیقات برروے کار لائے ہیں۔ایک یہ کہ قدما قول غزل اور رباعی میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ بالفاظ دیگر قول و غزل کی اصطلاح کا اطلاق رباعی پر کیا کرتے تھے۔دوسرے یہ کہ ابو دُلَف عجلی اور ابوطلب ترانہ گو ایک ہی شخص ہیں۔اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ فارسی میں بھی اشعار معقّد لکھے جاتے تھے۔ قدیم رباعی گویوں میں شیخ بایزید بسطامی۔ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کا نام لیا گیا ہی۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب وقت آگیا ہی کہ سیّد صاحب کے اعتراضات کا جواب دوں اور ان کے بیانات کو جو کئی امور میں ہماری فنی روایات سے منحرف ہیں نقد و نظر کی کسوٹی پر جانچ لوں۔سب سے پہلے میں ان کے اعتراضات کو لیتا ہوں۔

معیار الاشعار خواجہ نصیر الدین طوسی کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"تنقید شعر العجم کے فاضل مولف پروفیسر شیرانی نے اپنے مضمون کے پہلے نمبر میں اس کو کسی تذبذب کے بغیر محقق طوسی کی تالیف بتایا ہی۔معلوم نہیں ان کے سامنے اس کی کیا سند ہی درانحالیکہ مشرق و مغرب کے فضلا اس نسبت کے قبول کرنے میں تردد کرتے ہیں چنانچہ علامہ عبدالوہاب قزوینی (کذا) نے معجم کے دیباچے میں (ھ) تصریح کی ہی کہ "کتاب مرغوب معیار الاشعار است در علم عروض و قوافی کہ در سنہ ۶۴۹ھ تالیف شد و مصنف آں معلوم نیست .... وی (مفتی سعد اللہ مراد آبادی شارح المتوفی سنہ ۱۲۹۴ھ) تالیف ایں کتاب را بخواجہ نصیر الدین طوسی معروف متوفی سنہ ۶۷۲ھ نسبت دادہ است، ولی معلوم نیست از روے چہ ماخذی۔"

ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم لائبریری کی فارسی کتابوں کی

فہرست ص۵۲۵ میں بعینہٖ یہی لکھا ہی اور بتایا ہی کہ محقق طوسی کی تصانیف کی
فہرست میں یہ نام نہیں"۔ (خیام۔ حاشیہ ص۲۲۱)

میں عرض کرتا ہوں کہ ریو فہرست نگار مخطوطات فارسی برٹش میوزیم اور اس کے مقلّد مرزا محمد بن عبدالوہاب کے دو نام گنا کر سید صاحب نے حکم لگا دیا کہ فضلاء مشرق و مغرب اس نسبت کے قبول کرنے میں تردد کرتے ہیں۔ گویا ان دو ناموں پر مشرق و مغرب کے فضلا کی فہرست ختم ہو گئی۔ سیّد صاحب سمجھ رہے ہیں کہ صرف مفتی سعد اللہ کی یہ رائے ہی۔ مگر اس بارے میں ان کو سخت سہو ہوا ہی۔ اکثر و بیشتر عروضی یہ رائے رکھتے ہیں کہ معیار الاشعار خواجہ نصیر الدین طوسی کی تصنیف ہی۔ مثلاً کچھ نام عرض ہیں:۔

(۱) منشی مظفر علیخاں آسیر جو زر کامل عیار ترجمۂ معیار الاشعار (طبع اول ۱۲۸۹ھ نول کشور) کے مالک ہیں۔ اپنے ترجمے کے پہلے صفحے پر لکھتے ہیں:۔
"صحیفۂ رشیقہ اعنی کتاب معیار الاشعار تصنیف عالم کامل فخر اماجد و اماثل رئیس الحکما استاد الکملا محقق طوسی علیہ الرحمۃ" الخ،

(۲) مرزا محمد جعفر اَوج، اُردو میں مقیاس الاشعار کے مصنف ہیں۔ اس تالیف میں ص۵۴ پر یہ عبارت درج ہی:۔
"محقق علیہ الرحمۃ نے معیار الاشعار میں چونتیس زحاف لکھے ہیں۔" اور ص۱۹۰ پر یہ عبارت ملتی ہی:۔
"من خواجہ نصیر الدین طوسی علیہ الرحمۃ مفاعلتن مفاعلتن دو بار

بت بدی چکنی بجاے کسی   کہ او نکند بجاے تو بد

ہم سید صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ شعر معیار الاشعار میں بذیل بحر وافر ص۴۲ پر موجود ہی اور زر کامل عیار میں ص۱۲۹ پر (نول کشور ۱۹۱۳ء)۔

(۳) غلام حسنین قدر بلگرامی کی قواعد العروض میں تو کثرت کے ساتھ معیار اور محقق کا ذکر بار بار آرہا ہی۔ معیار کی اکثر و بیشتر امثال اس تصنیف میں موجود ہیں۔ میں صرف چند صفحوں کے حوالے دیتا ہوں۔ صـ ۱۴۳ صـ ۱۵۰ صـ ۱۵۱ صـ ۱۵۲ صـ ۱۵۸ صـ ۱۶۹۔

(۴) واجد علی شاہ بادشاہ اودھ ارشاد خاقانی (حکم اختر) تالیف سنہ ۱۲۶۹ھ میں صفحہ ۱۰۰ پر رقم طراز ہیں :-

"اور خواجہ نصیر الدین طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے معیار الاشعار میں کہا ہی"۔

(۵) روضات الجنات میں (طبع ایران سنہ ۱۳۰۶ ہجری) جو محمد باقر خوانساری نے سنہ ۱۲۸۷ھ میں تالیف کی ہی صـ ۶۰۶ پر محقق طوسی کی تصنیفات کے ذکر میں معیار کی طرف بھی اشارہ موجود ہی۔

ممکن ہی کہ سید صاحب کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ مصنفین تو مفتی سعد اللہ کے مقلد اور متبع ہیں ان کی سند چنداں مضبوط نہیں مانی جا سکتی۔ اس لیے ہم بطور دفع دخل مقدر اپنی تحقیقات کو مفتی صاحب سے سابق تر زمانوں میں لے جاتے ہیں۔

(۶) شمس الدین فقیر بارھویں صدی ہجری کے ایک اعلیٰ شاعر اور مشہور مصنف ہیں۔ ان کی تالیف حدائق البلاغت ہمیشہ درس میں شامل رہی اور آج بھی شامل ہی۔ موصوف اس تالیف میں حدیقۃ الرابعہ کے شعبۂ اول میں دربیان حروف قافیہ ردف زائد کی تشریح کے موقعے پر لکھتے ہیں :-

"بعضے حرف بعد از ردف را داخل ردف شمردہ اند و آں را ردف زائد نام کردہ و خواجہ نصیر الدین طوسی رحمۃ اللہ علیہ در رسالۂ معیار الاشعار حرف مذکور را داخل روی شمردہ و آں را روے مضاعف خواندہ"۔

(۷) گیارھویں صدی ہجری میں ہمیں میر ابو الحسن فراہانی شارح انوری کا نام ملتا ہی جو قافیۂ شایگان کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

"استاد المحققین خواجہ نصیر الدین محمد طوسی در رسالۂ عروض و قافیہ مسمیٰ بمعیار الاشعار آوردہ"

(۸) عبداللہ خاں اوزبک والی توران جلال الدین اکبر کا معاصر ہی۔ اس کے دربار میں ایک زبردست عروضی پایندہ محمد بن محمد بن شیخ محمد موجود تھے، قضائی تخلص کرتے تھے۔ ۹۹۹ھ میں فنِ عروض پر ایک تالیف ان کے قلم سے نکلتی ہی جس کا نام جو تاریخی بھی ہی تنقید الدرر ہی۔ اس تالیف کا ایک قریب العہد مخطوطہ نوشتہ ۱۰۶۰ھ راقم کے عروضی مجموعے کی زینت ہی۔ اس اہم تالیف میں کئی موقعوں پر معیار الاشعار کے حوالے آتے ہیں۔ چنانچہ :-

"و خواجہ نصیر طوسی در معیار الاشعار فاصلہ را ازیں ارکان رکنے علیحدہ نشمردہ بلکہ فاصلۂ صغریٰ را مرکب از سببین ثقیل و خفیف و فاصلۂ کبریٰ را مرکب از سبب ثقیل و وتد مجموع داشتہ" ورق ۳۷ب

(دیگر) "و شیخ نصیر طوسی کہ صاحب معیار الاشعار است پس از روی بینش ازیک حرف را از حروف قافیہ اعتبار نکردہ است" ورق ۷۶ب

(۹) صنائع الحسن ایک اور عروضی تالیف ہی جو دسویں صدی ہجری میں مشہور فخری مصنف تذکرۂ جواہر العجائب کے قلم کی یادگار ہی۔ یہ تالیف فخری اپنے سرپرست شاہ حسن (حسین ؟) ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء و ۹۶۲ھ/۱۵۵۲ء والی سندھ کے لیے لکھتا ہی۔ یہ مخطوطہ بانکی پور لائبریری میں محفوظ ہی۔ اس کتب خانے کے فہرست نگار خان بہادر عبدالمقتدر خاں کہتے ہیں کہ ورق ۵ پر مصنف نے معیار الاشعار کو خواجہ نصیر الدین طوسی کی تصنیف بیان کیا ہی۔ ملاحظہ ہو جلد نہم

فارسی مخطوطات ۸۴۲ھ

(۱۰) سلطان حسین بایقرا کے عہد میں دیگر علوم کے علاوہ عروض و قافیہ اور معما کا بہت رواج رہا ہے۔ مولانا جامی نے اپنی مصروفیتوں کے باوجود عروض و قافیے پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں۔ جامی کے شاگرد میر عطاء اللہ الحسینی مشہدی ہیں جو کتاب تکمیل الصناعۃ میں قافیے پر ایک رسالہ شامل کرتے ہیں۔ رسالۂ ہذا میں میر عطاء اللہ متعدد موقعوں پر معیار الاشعار کا نام لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک مثال یہاں عرض کرتا ہوں :۔

"چنانکہ دریں بیت کہ در معیار الاشعار خواجہ نصیر الدین طوسی آوردہ۔ بیت

صنم من زبر من بنروی دلک من بزی بنشنوی

(۱۱) جامی کے رسالۂ قافیہ کا نام مختصر وانی فی علم القوانی ہے۔ اس پر ان کے ایک شاگرد نے جس کے نام سے میں ناواقف ہوں ایک شرح لکھی ہے۔ میرے عروضی مجموعے میں اس کا ایک مخطوطہ ۱۰۹۰ھ کا نوشتہ ہے جس پر رسالہ کا نام بدیں الفاظ درج ہے۔ "رسالۂ عروضیہ مسمیٰ بشرح مختصر وانی فی علم قوانی بر متن حضرت مولوی جامی"۔ رسالۂ ہذا میں کئی جگہ معیار الاشعار کے حوالے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہاں نقل کیا جاتا ہے :۔

"و خواجہ نصیر الدین طوسی در کتاب معیار الاشعار حرف مقدم بر روی را منحصر در ردف داشتہ"۔

(۱۲) فخر الدین محمد ابن شاکر الکتبی متوفی ۷۶۴ھ نے اپنی تصنیف فوات الوفیات کے جزو ثانی میں صفحہ ۱۵۰ پر محقق طوسی کی تالیفات کے ذکر میں معیار الاشعار کو بالفاظ "العروض بالفارسیہ" یاد کیا ہے۔

(۱۳) صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی متوفی ۷۶۴ھ کی الوافی بالوفیات

کے جزو اوّل میں صلاً پر محقق کی تصنیفات کے ضمن میں "العروض بالفارسیہ" یعنے معیار الاشعار کا پھر ذکر آیا ہی۔

جب گزشتہ صدی سے لگا کر آٹھویں صدی تک کے تمام علما معیار کو محقق کی تصنیف مانتے آئے ہیں۔ تو میرا کیا قصور ہی اگر مَیں نے اسے خواجہ نصیر کی تالیف مان لیا۔

ایک موقعے پر سیّد صاحب نے فرمایا ہی :-

"سلسلۂ شعر العجم کے وسیع النظر ناقد پروفیسر شیرانی نے تنقید کے پہلے نمبر (رسالۂ اُردو، اورنگ آباد دکن) میں رباعی کی بحث پر دو صفحے لکھے ہیں اور معیار الاشعار کی مذکورہ بالا عبارت کے لفظ "قدما" سے اتنی وسعت پیدا کرلی کہ یہ دعویٰ کردیا ہو کہ قدیم الایام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم جس کو چہاربیتی کہا جاتا تھا رائج تھی اس کے اوزان عربی اوزان سے غالباً متخرج نہیں ہیں بلکہ ایران زا اور مقامی معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ ان میں سے ہر دعویٰ ثبوت کا محتاج ہی۔ اہل عروض و اہل موسیقی کی روایات (قابوس نامہ کا حوالہ آتا ہی) کا جہاں تک تعلق ہی یہ بات ظاہر ہوتی ہی کہ ارباب فن کے یہاں یہ چیز نو پیدا تھی اور اسلام کے بعد اہل فن کے استعمال میں آئی ہی" (خیام صـ۲۲۲)

مَیں یہاں سرِ داستان ہی عرض کردینا چاہتا ہوں کہ محترم سید اپنے اعتراض میں ایسے فقرات کے استعمال سے کہ 'لفظ قدما سے اتنی وسعت پیدا کرلی ہی'۔ 'ارباب فن کے یہاں یہ چیز نو پیدا تھی' اور اسلام کے بعد استعمال میں آئی' وغیرہ میرے خلافِ مدعا یہ امر ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ مَیں رباعی کو اسلام سے قبل کی پیداوار مانتا ہوں۔ حالانکہ میرے زیرِ نظر شعر العجم تھی جو خالصتہً فارسی

شاعری بعد از اسلام کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے اور جو عربی شاعری کی تقلید میں شروع ہوتی ہے۔ فارسی شاعری اور رُباعی تو ایسی فضا ہے جس میں ایام ظہور اسلام سے قبل کا تصور بھی ذہن میں نہیں آتا۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہم الفاظ 'قدیم'۔ 'قدما' قدیم الایام، زمانۂ مابعد اسلام کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ ان الفاظ سے میرا مقصد وہی ہے جو دُنیا لیتی ہے۔ قدیم جدید کے مقابلے میں۔ قدما متاخرین کے مقابلے میں اور قدیم الایام زمانۂ حال کے مقابلے میں آتا ہے۔

اب مجھے دو باتیں ثابت کرنی ہیں: ایک تو یہ کہ عہد قدیم میں ایران میں چار بیتی کا رواج تھا۔ دوسرے یہ کہ چہار بیتی کے اوزان عربی سے مستخرج نہیں بلکہ ایران زاد اور مقامی ہیں۔

پہلی شق کے لیے محقق طوسی کا بیان جو میں مع ترجمہ اپنی تنقید میں نقل کر آیا ہوں دھیان میں رکھنا نہایت ضروری ہے لیکن معیار الاشعار پر سید صاحب کا اضطراری اعتماد محقق طوسی کے بیانات کی اصل وقعت و اہمیت کے احساس سے انھیں باز رکھتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ رباعی کسی شخصی ایجاد کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ ارتقا یافتہ شکل ہے قدیم چہار بیتی کی جو ہزج مربع اخرم و اخرب میں لکھی جاتی تھی۔ ان ایام میں صدر و ابتدا میں اخرب و مکفوف۔ اخرب و موفور کا اختلاف جائز سمجھا جاتا تھا جو چار بیتی کے ہر مصرع میں کار فرما ہے۔ جس کی بنا پر پہلے مصرع کے شروع میں مفعول کے مقابلے میں دوسرے مصرع کے شروع میں مفاعیل یا مفاعیلن آ جاتا ہے۔ بحر ہزج عربی میں مربع الارکان مستعمل ہے جب عربی عروض فارسی میں اختیار کی گئی تو ضروری ہے کہ ابتدا میں اشعار ہزج کے مربع میں لکھے جاتے ہوں۔ چنانچہ رباعی بھی مربع میں لکھی گئی۔ چونکہ اس میں چار شعر ہوا کرتے

تھے اس بنا پر اس کا نام چہار بیتی رکھا گیا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد جب اصول مثمنات کی دریافت نے اہل ایران کو زیادہ خوش آیند اور شگفتہ اوزان سے آشنا کر دیا۔ مربعات ترک کر دیے گئے اور مثمنات کو اختیار کر لیا گیا۔ اور ترانہ جو چار بیت مربع پر شامل تھا دو بیت مثمن کے قالب میں ڈھل گیا اور دو بیتی کہلایا۔ یہی اصول یعنی مربع کا مثمن کر دینا نہ صرف رباعی میں بلکہ دیگر اوزان میں بھی کام کر رہا ہے۔ مثال میں ہزج مربع کا یہ شعر عرض ہے:۔

من بے تو چنیں زار   تو از دور ہمی خند

اس کا وزن ہے مفعول مفاعیل مصرع اول، مفاعیل مفاعیل مصرع دوم۔ یہ رباعی کا وزن نہیں ہے۔ یہاں ابتدا میں صدر کے مقابلے میں مفاعیلُ بجائے مفعولُ لایا گیا ہے۔ ایران کی بعد کی خوش مذاقی کے دیکھتے ہوئے ایسا اختلاف ناقابلِ معافی ہے۔ مگر جب اسی وزن مربع کو مثمن بنا لیا یعنے پورے شعر کا مصرع کر لیا بر وزن مفعول مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیل۔ تو ایک نہایت خوش آیند وزن حاصل ہو گیا۔ چنانچہ

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور   تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

ایک اور مثال دی جاتی ہے:۔

ای یار دل ربائے   یکے بار ہی بساز

جو بحر مضارع مربع اخرب موفور مقصور ہے۔ یعنی مفعول فاعلات مصرع اوّل اور مفاعیل فاعلات مصرع دوم۔ یہاں صدر و ابتدا میں اخرب و موفور کا اجتماع ہے لیکن ان دونوں مصرعوں کو ایک مثمن مصرع مان لینے سے ایک نیا شگفتہ وزن ہاتھ آ گیا۔ مثال:۔

گر مرد ہمتی زمروت نشاں مخواہ   صد جا نہید شو دیت از دشمناں مخواہ

تعجب ہی کہ ہمارے سلیمان اعظم نے جہاں رباعی کے مختلف ناموں کی فہرست دی۔ مثلاً ترانہ۔ دوبیتی۔ قول۔ غزل۔ بیت وغیرہ۔ اس میں انھوں نے اس کے سب سے قدیم نام چہاربیتی کو شامل نہیں کیا اور محقق طوسی کا بیان بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ حالانکہ عروضی چہاربیتی کا برابر ذکر کرتے ہیں۔

مقیاس الاشعار میں مرزا آوج کہتے ہیں: "ترانے کو قدما نے چاربیت قیاس کیا ہی اور اس کو 'چہاربیتی' کہا ہی۔ یعنی اس میں ہر مصرع ایک بیت ہی اور تازی میں اس کو رباعی کہتے ہیں اور چاروں مصرعوں میں قافیہ لانا واجب جانتے ہیں لیکن نزدیک متاخرین جو مربعات اس وزن اخرب کے مستعمل نہیں یہ وزن بھی متروک ہی۔" (ص ۲۱۷ مقیاس الاشعار)

غلام حسین قدر بلگرامی کا قول ہی: اور اس کو اسی وجہ سے چہاربیتی اور رباعی کہنے لگے۔ لیکن متاخرین نے چار مصرعوں کو دو شعر فرض کیا اور اس کا نام دوبیتی رکھا۔"

"قدمائے فارس ترانہ را کہ از ہزج مربع اختراع کردہ اند چہاربیتی و رباعی می گفتند و ہر دو ر چہار رکنی را قافیہ لازم می شمردند۔ اما متاخرین شاں چوں ابیات مربع ہزج نزد ایشان متروک است ترانہ از مثمن قرار می دہند و ہر دو ر چہار رکنی را مصراعی می شمرند و مجموع را دوبیتی۔" (ص ۶ رسالہ کیفیت ایجاد رباعی از مفتی سعد اللہ)

شق دوم۔ یہ کہ چہاربیتی یا رباعی کے اوزان عربی سے مستخرج نہیں ہیں بلکہ ایران زا اور مقامی ہیں: میں حیران ہوں کہ سید صاحب کو ایسے بدیہی واقعے کا ثبوت مانگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ہم عروض کی جس قدیم و جدید کتاب کو اٹھا کر دیکھتے ہیں ہر مصنف یہی راگ الاپ رہا ہی کہ رباعی فارسی الاصل ہی۔ میں بعض عروضیوں کے بیان یہاں نقل کرتا ہوں:۔

(۱) بدانکہ وزن رباعی کہ آں را دوبیتی و ترانہ نیز گویند از بحر ہزج بیروں می آید و آں را عجم پیدا کردہ اند و بر بیست و چہار نوع آوردہ۔

(عروض سیفی تالیف ۸۹۶ھ ص ۱۱۹ طبع ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۷۲ء)

(۲) باید دانست کہ وزن دوبیتی را کہ رباعی و ترانہ نیز می گویند آں را شعراے عجم از وزن اخرم و اخرب ہزج مثمن برآوردہ اند۔"

(ص ۵۳ تنقید الدر را از قضائی تالیف ۹۹۹ھ)

(۳) باید دانست کہ رباعی را شعراے عجم اختراع نمودہ اند و آں را ترانہ و دوبیتی نیز نامند۔" (ص ۱۱۶ حدائق البلاغت۔ مطبع کریمی۔ لاہور ۱۹۲۰ء)

(۴) کرامت علی ابن رحمت علی حسینی جونپوری۔ مسٹر شلز فرانسیسی کے لیے اپنے قیام تبریز کے زمانے میں ایک رسالہ قواعد عروض و قوافی پارسی لکھتا ہی جس میں مرزا ابوالقاسم قائم مقام کی طرف بھی خطاب ہی۔ اس کا ایک نسخہ ٹائپ میں طبع شدہ میرے پاس ہی۔ جس پر تاریخ طباعت درج نہیں۔ اس رسالے کے صفحہ ۸۲ پر عبارت ذیل ملتی ہی:۔

"فصل شانزدہم در بحر رباعی و آنرا دوبیتی و ترانہ نیز گویند و آں پیدا کردۂ عجم است۔"

(۵) "و اوزان رباعی کہ آنرا دوبیتی و ترانہ گویند اہل عجم از بحر ہزج برآوردہ اند۔" (مخزن الفوائد ص ۱۶۲ ۱۸۸۴ء مطبع انجمن پنجاب)

(۵ ب) "وزن ترانہ کے مخترع شعراے عجم ہیں" (قواعد العروض از قدر بلگرامی)

(۶) "اور یہ رجحان کہ اس وزن میں مستعمل شعراے عجم ہیں اشعار عرب میں نہیں اور یہ وزن رباعی اشعار عرب میں نہ تھا۔"

(ص ۲۱۷ مقیاس الاشعار ۱۲۹۳ھ)

(۷) "اور جان تو کہ رباعی نکالی ہوئی فصحاے عجم کی ہی اور بحر ہزج سے خصوصیت رکھتی ہی۔" (تقویت الشعرا از امام الدین طالب۔ سلطان المطابع لکھنؤ)

(۸) "و رباعی از مخترعات اہل عجم است و بہ بحر ہزج اختصاص دارد۔"
(صفحہ ۵۶ شجرۃ العروض از منشی مظفر علی اسیر۔ نول کشور ۱۸۷۳ء)

یہاں ایک سوال کیا جا سکتا ہی کہ اگر رباعی ایرانی الاصل نہیں ہی تو پھر اس کی ایجاد کی توضیح کرنے والے قصے جن میں صرف ایرانی حصہ لیتے نظر آتے ہیں اور جنھیں سید صاحب نے اپنی معزز تالیف میں نقل بھی کیا ہی کیوں شہرت پاتے مثلاً رودکی کا ایک طفل جوز باز کو غزنین کے مرغزار میں جوشِ مسرت میں مصرع آیندہ پڑھتے سننا یا بقول دولت شاہ یعقوب بن لیث کے فرزند کا جوز کھیلتے ہوئے ایک نشاط آمیز لہجے میں کہنا کہ

غلطاں غلطاں ہمی رود تا بن گو

خیام کے صفحہ ۲۲۳ پر سید صاحب نے گزشتہ اعتراض سے ملتا جلتا یہ اعتراض کیا ہی:-

"ناقد شعر العجم نے اپنے اسی پہلے سلسلے میں یہ بے سند دعویٰ کیا ہی جس کا مدار ساتویں صدی کی معیار الاشعار پر ہی کہ قدما (کس عہد تک کے قدما؟) تمام تر چہار بیتی کہتے تھے، جس کے چاروں مصرع ہم قافیہ ہوتے تھے" اور اس سے نادر تر دعویٰ یہ ہی کہ چہار بیتی کی اب کوئی مثال نہیں پائی جاتی، حالانکہ ایسی رباعیاں جن کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں، عوفی کی لباب الالباب کے قدما کے حالات میں دس بارہ سے زیادہ ہیں اور بعد کے شعرا کے یہاں ایسی رباعیاں ملتی ہیں۔"

میں سید صاحب کی خدمت میں بصد ادب عرض کرتا ہوں کہ جب ان کو

یہ تسلیم ہی کہ میرے دعوے کا مدار ساتویں صدی کی معیار الاشعار پر ہی تو پھر میرا دعویٰ بے سند کیوں گردانا گیا۔ سید صاحب مجھ پر سخت ظلم کر رہے ہیں کہ معیار الاشعار جیسی کتاب کی سند کے باوجود میرے دعوے کو بے سند کہتے ہیں۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ عروضی لٹریچر میں یہ تالیف آج بھی زبردست اہمیت کی مالک ہی۔ گزشتہ سات صدیوں میں جس قدر کتابیں اس فن پر لکھی گئی ہیں ان سب پر اس کتاب کی افادی وقعت و افضلیت مسلّم ہی۔ ہر عہد میں اہل عروض اس کو مستند سمجھتے رہے ہیں اور اس کے حوالے دیتے آئے ہیں اس کی شرح تیار ہوئی ہی، ترجمہ کیا گیا ہی۔ مختصر یہ کہ عروضی مسائل پر قولِ فیصل مانی جاتی ہی اور یہ فن سے ہماری بیگانگی کا ثبوت ہوگا اگر ہم اس تصنیف کو قرار واقعی عزّت نہ دیں۔

اس کے بعد سوال کیا ہی (کس عہد تک کے قدما) تمام تر چہار بیتی کہتے تھے جس کے چاروں مصرع ہم قافیہ ہوتے تھے، یہاں بیت کی جگہ مصرع لکھنا سید صاحب کا سہو قلم ہی۔ عہد کا تعین کرنا ذرا دشوار ہی۔ اتنا کہا جا سکتا ہی کہ بسبب اصول مثمنات کا عام رواج ہوگیا اور مربعات متروک ہو گئے۔ چہار بیتی کو خیر باد کہہ دیا گیا اور دو بیتی نے اس کی جگہ لے لی۔ میں قدما کے متعلق اس سے قبل کچھ اشارہ کر آیا ہوں۔ یہاں اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ ان قدما کا زمانہ بھی وہی ہی جو اُن قدما کا ہی جن کا ذکر خود سیّد صاحب نے اپنی تالیف میں کیا ہی۔ جب فرمایا ہی :-

(۱) "عوفی کی لباب الالباب کے قدما کے حالات میں" وغیرہ (خیام صفحہ ۲۲۳ حاشیہ)

(۲) "یہ رباعی (چہار بیتی) کہنے والے قدماء عرب کے شاعر تھے" الخ (خیام صفحہ ۲۲۲)

(۳) قدما کے کلام میں غزل و ترانہ کا لفظ ساتھ ساتھ آتا ہی" (خیام صفحہ ۲۲۷)

آگے بڑھ کر سید صاحب ارشاد کرتے ہیں: "اور اس سے نادر تر دعوے یہ ہے کہ چہار بیتی کی اب کوئی مثال نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ ایسی رباعیاں جن کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں عوفی کی لباب الالباب کے قدما کے حالات میں دس بارہ سے زیادہ ہیں۔"

مجھے افسوس ہے کہ سید صاحب میرا مطلب بالکل نہیں سمجھے اور نہ انھوں نے محقق طوسی کے بیان پر جو میرے دعوے کی سند ہے کافی غور کیا۔ جن چار مصرعوں والی رباعیوں کو سید صاحب چار بیتیاں کہتے ہیں وہ تو دو بیتیاں ہیں۔ کیونکہ دو مثمن شعروں کی شکل میں لکھی جاتی ہیں۔ بحالیکہ چار بیتی چار مربع شعروں کی صورت میں لکھی جاتی تھی جس طرح کہ میں نے تنقید شعر العجم میں سمجھانے کے واسطے ابوشکور کی رباعی کو لکھا ہے۔ یا جس طرح خود سید صاحب نے میری تقلید میں ص۲۲۲ پر رودکی کی مفروضہ رباعی کو اور صفحہ ۲۲۳ تا ۲۲۵ عربی رباعیوں کو نقل کیا ہے۔ یہ ہے صحیح شکل چہار بیتی کی۔ اور جب چار بیتیاں اس طرح لکھی ہوئی نہیں ملتیں تو میں نے کیا غلط کہا جب یہ کہا کہ قدیم چہار بیتی کے اصلی نمونے ہم تک نہیں پہنچے۔ چار قافیوں والی رباعیاں مصرّع[۵۱] دو بیتیاں ہیں جس طرح تین قافیوں والی خصی رباعیاں ہیں۔

سید صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ چاروں مصرعوں میں قافیوں والی رباعیاں لباب الالباب میں قدما کے حالات میں دس بارہ سے زیادہ ہیں۔ میں نے بھی قدما کے ذکر ہی میں کہا تھا کہ سب سے قدیم رباعی مجھ کو ابوشکور بلخی کی

---

۵۱ مصرّع بیتی را گویند کہ ہر دو مصراع قافیت نگاہ داشتہ آید چنانکہ ابیات سرہای قصیدہ بود خصی دو بیتی را گویند کہ مصراع سوم او را قافیت نباشد۔" (ص۸۵، حدائق السحر رشید الدین وطواط۔ مرتبۂ عباس اقبال)

ملی ہی۔ لباب الالباب موجود ہی اور میں سید صاحب کو دعوت دیتا ہوں اگر وہ اس میں سے دس بارہ درکنار ایک رباعی بھی ابوشکور کے عہد سے قبل کی نکال کر بتا دیں گے۔ مگر دشواری یہ ہی کہ ہمارے محترم ہر چار مصرعوں کو عام اس سے کہ وہ رباعی کے وزن میں ہوں یا نہ ہوں رباعی کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ ایسی رباعیاں بے شک دس بارہ کیا درجنوں نکل آئیں گی، لیکن ادبی وعروضی نقطۂ نظر سے بلکہ رواجاً بھی رباعی وہی ہی جو بحر ہزج کے اخرب واخرم شجروں کے چوبیس اوزانِ مقررہ میں سے ہو۔ مگر سید صاحب جو خیام کی رباعیوں پر مقدمہ لکھ رہے ہیں اپنی اس فروگزاشت کا مطلق احساس نہیں کرتے ایک موقعے پر رقم پرداز ہیں:۔

"لباب الالباب عوفی میں حنظلہ بادغیسی کی حسب ذیل دوبیتیں ملتی ہیں جو رباعی کے وزن پر ہیں:۔

یارم سپند اگرچہ بر آتش ہمی فگند | از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
او را سپند و آتش ناید ہمی بکار | با روی ہمچو آتش و با خال چو(ن)[۱] سپند"

(خیام ص ۲۳۰)

ان دو شعروں کو خود عوفی دوبیتی نہیں مانتا۔ چنانچہ اس نے "این دوبیت" (ص ۲/۲ لباب الالباب) لکھا تھا۔ سید صاحب نے دوبیتیں تو عوفی کی تقلید میں لکھ دیا۔ لیکن الفاظ "جو رباعی کے وزن پر ہیں" اپنی طرف سے اضافہ کر دیے۔ حالانکہ یہ شعر رباعی کے وزن پر ہرگز ہرگز نہیں۔ رباعی کے اوزان بحرِ ہزج سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ابیات بحرِ مضارع میں واقع ہوتے ہیں۔ ان کا وزن ہی:۔

---

[۱] قلابوں میں 'نون' میرا اضافہ ہی۔ اس کے بغیر وزن غلط ہو جاتا ہی۔

مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات۔ یعنے مضارع اخرب مکفوف مقصور جو رباعی کے وزن سے کوسوں دور ہی۔

سید صاحب کی جلد بازی ملاحظہ ہو کہ حنظلہ کی اس مفروضہ رباعی کو دیکھ کر فوراً یہ نظریہ پیش کر دیا:۔ "اس سے معلوم ہوتا ہی کہ رباعی کی تاریخ رودکی بلکہ ابودُلف اور ابن الکعب سے بھی پہلے شروع ہوتی ہی اور سامانی بلکہ صفاری کے بجائے طاہری دربار کو اس کی اولیت کا فخر پہنچتا ہی" (ص۲۲۳ خیام)

اب جب یہ ثابت ہو گیا کہ حنظلہ کی رباعی سچی رباعی نہیں، تو یہ اولیت کا فخر کس دربار کی طرف منتقل کیا جائے گا؟ سلیمانِ اعظم ارشاد فرمائیں۔

تنقید شعر العجم (ص۲۹ اُردو) میں ایک موقعے پر میں نے فرخی کا ایک شعر بوطلب شاعر کی شہرت بحیثیت رباعی گو دکھانے کے لیے نقل کر دیا تھا۔ جو حسب ذیل تھا:۔

از دلآرامی و نغزی چوں غزلہائے شہید وز دلآویزی و خوبی چوں ترانہ بوطلب

اس کے تعلق میں سید صاحب ارشاد کرتے ہیں:۔

"پروفیسر شیرانی نے تنقید شعر العجم کے پہلے نمبر میں اس شعر کو کہیں سے نقل کیا ہی۔ مگر اپنے متن کا ماخذ نہیں بتایا ہی جو اسدی کے متن سے بہت کچھ مختلف ہی۔ شیرانی صاحب لکھتے ہیں:۔

از دلآویزی و نغزی چوں غزلہائے شہید وز دلآویزی و خوبی چوں ترانہ بوطلب

بظاہر معلوم ہوتا ہی کہ پروفیسر صاحب نے کسی متاخر ماخذ کو سامنے رکھا ہی جس نے فرخی کے قدیم الفاظ میں متاخرین کے محاوروں کے مطابق تصرف کر دیا ہی" (خیام ص۲۲۹)

کسی شاعر کا شعر نقل کرتے وقت ہمارے ہاں یہی دستور رہا ہی کہ شعر

نقل کرنے سے قبل اس شاعر کا نام دے دیا جائے۔ چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا اور شاعر کا نام فرخی دے دیا۔ سید صاحب کو اعتراض ہے کہ اس شعر کو کہیں سے نقل کر دیا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ کہیں سے تو کیا نقل کیا ہوگا، شاعر کے دیوان ہی سے نقل کیا ہوگا اور دیوان سے بہتر ماخذ ہوگا بھی کیا۔ متاخرین کے محاوروں کے مطابق اگر کوئی تصرف ہوا تو خود سید اس کے ذمہ دار ہیں میرے ہاں جہاں پہلے مصرع میں 'دلآرامی' تھا۔ سید صاحب نے اس کی جگہ 'دلآویزی' بنا دیا۔ یہ تصرف کیوں کیا گیا۔ مجھے معلوم نہیں۔ مگر یہ تصرف ہر حال میں صحیح نہیں۔ کیونکہ دونوں مصرعوں میں 'دلآویزی' مکرر ہو جاتا ہے۔

سید صاحب نے حسب روایت لغت فرس اس شعر کو یوں لکھا ہے:۔

زدلآویزی و تری چو غزلہائے شہید   وز غم انجامی و خوشی چو ترانہ بوطلب

میرا نقل کردہ شعر اگر اسدی کے متن سے نہیں ملتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے میرے لیے ضروری نہیں کہ فرخی کے شعر کے لیے اسدی کے لغت کی ورق گردانی کروں جس حال میں کہ دیوان موجود ہے اور چھپ چکا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جس شعر کو سید صاحب صحیح اور مستند سمجھ رہے ہیں۔ وہ یقیناً غلط ہے۔ اس غلطی کے ذمے دار خواہ ہمارے سید ہوں یا پال ہورن لغت فرس کا مرتب یا خود اسدی لغت فرس کا مصنف۔ شعر ہذا کوئی تنہا شعر نہیں ہے بلکہ فرخی[۵۸] کے قصیدے میں آتا ہے۔ یہ قصیدہ بحر رمل مثمن محذوف میں ہے، جس کا وزن ہے۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن، اور مطلع ہے:۔

دوست دارم کودکی سیمیں بر بیجادہ لب   ہر کجا زیشاں یکی بینی مرا آنجا طلب

---

[۵۸] دیوان فرخی مرتبۂ عبدالرسولی، ۱۳۱۱ھ۔ مطبوعہ مجلس (ایران) ص۶۔ و دیوان حکیم فرخی ص۶۔ طبع بمبئی۔

فرخی کا منقولۂ بالا شعر بھی ضرور ہی کہ اسی وزن میں ہو۔ چنانچہ تقطیع :-
از دلارا فاعلاتن، می ئی نغزی فاعلاتن، چون غزلہا فاعلاتن، ای شہید فاعلات
وز دلآوے فاعلاتن، زی ئی خوبی فاعلاتن، چہ ترانا فاعلاتن، بوطلب فاعلن،
یعنی وہی رمل مثمن مقصور یا محذوف۔ اب سید صاحب کے روایت کردہ شعر کی تقطیع ملاحظہ ہو :-
ز دلاوے فعلاتن، زئی تری فعلاتن، چ غزلہا فعلاتن، ءِ شہید فعلات،
وز غمنجا فاعلاتن، م ئی خوشی فعلاتن، چ ترانا فعلاتن، بوطلب فعلات،
اور وزن ہو بحر رمل مثمن مخبون مقصور۔ بالفاظ دیگر وزن ہی بدل گیا ہو یعنی سالم سے مخبون ہو گیا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ حشویات تمام قصیدے میں جس کے پچاس سے زیادہ شعر ہیں سالم آئیں اور ایک شعر میں مخبون ہو جائیں۔ لہذا میں تو سید صاحب کے روایت کردہ شعر کو غلط اور بے سند کہوں گا۔

قولہ :- "عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہو کہ چوں کہ یہ چار مصرعوں سے مرکب ہوتی ہو اس لیے اس کو رباعی کہتے ہیں ...... لیکن محمد بن قیس رازی نے .... رباعی کی ایجاد و پیدائش کے سلسلے میں لکھا ہو کہ اہل عرب اس کو رباعی اس لیے کہتے ہیں کہ بحر ہزج جس میں رباعی کہی جاتی ہو چار اجزا سے مرکب ہوتی ہو اور اس لیے اس وزن کا ایک مصرع عربی میں دو جز کا ایک شعر ہو جاتا ہو اور اس طرح چار مصرعوں میں چار شعر ہو جاتے ہیں۔ رازی کے اس بیان کی تائید معیار الاشعار فارسی عروض کی ایک قدیم کتاب ۶۴۹ھ سے ہوتی ہو۔" ص ۲۲۳

اس موقعے پر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ محمد بن قیس کا کیا بیان ہو۔ وہ کہتا ہو :-
"و مستعر بہ آن را رباعی خوانند از بہر آنکہ بحر ہزج در اشعار عرب مربع الاجزا

آمدہ است۔ پس ہر بیت ازیں وزن دو بیت عربی باشد"۔ (ص ۹۰ المعجم)

اس کا ترجمہ :- اور عربی خواں اسے رباعی کہتے ہیں کیونکہ بحر ہزج عربی اشعار میں مربع الاجزا (مربع الارکان) آتی ہی۔ پس ہر بیت اس وزن (رباعی فارسی) کا عربی کے دو بیت کے برابر ہوگا۔

رازی کا یہ بیان سید صاحب کے بیان سے بالکل مختلف ہی۔ اس کا مدعا تو یہ ہی کہ چونکہ بحر ہزج عربی میں مربع الارکان آتی ہی اس لیے اس کا نام رباعی رکھ دیا۔

لیکن میں یہ توجیہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ چوں کہ ہزج عربی میں مربع الارکان آتی ہی۔ اس بنا پر اس کو رباعی کہنے لگے۔ ہزج دائرے میں مسدس ہی۔ اگرچہ بنا میں مجزو ہی۔ دوسرے عربی میں ایک یہی بحر تو ہی نہیں جو مربع آتی ہی۔ اس میں تو اکثر بحریں مربع استعمال ہوتی ہیں پھر ہزج کی کیا خصوصیت رہی۔ اس کے علاوہ رباعی کی ابتدا فارسی سے ہوتی ہی نہ عربی سے۔ اس لیے اس کا نام رباعی رکھنے میں عربی خوانوں نے چاربیتی کی تقلید کی ہی۔

محقق طوسی کی تالیف معیار الاشعار سید صاحب کے خیال کی تائید نہیں کرتی۔ اس میں مذکور ہی :-

"ترانہ را قدما چہار بیت می گرفتہ اند و آنرا چہار بیتی خواندہ وبتازی رباعی"۔

یعنی قدما کے نزدیک رباعی چار بیتوں پر شامل تھی۔ اس لیے اس کا نام چہاربیتی رکھ دیا اور عربی میں رباعی۔ لہذا سید صاحب کا یہ بیان کہ رباعی کا نام رباعی چار مصرعوں کی وجہ سے نہیں ہی بلکہ چار مصرعوں کے چار شعر ہو جانے کی وجہ سے بالکل بے بنیاد ہی۔ صحیح وہی ہی جو محقق طوسی کے بیان سے مستنبط ہوتا ہی یعنی ایرانیوں نے اس کا نام چہاربیتی رکھا اور عربی والوں نے تقلیداً رباعی کہا۔

قولہ:۔ سوال یہ ہے کہ دو دو جزو کا اس طرح ایک ایک شعر ہو جانا آیا فارسی میں تھا اور اس لیے اس کو کبھی چہار بیتی کہتے تھے۔ یا عربی میں اور اس لیے اس کو رباعی کہتے تھے۔ مؤلف معیار الاشعار نے صرف قدما یعنی پہلے لوگ لکھا ہے جس سے فارسی و عربی کی تخصیص نہیں نکلتی۔"

(خیام ص۲۲۲)

مؤلف معیار الاشعار کے بیانات تو ہمیشہ ٹھیک ٹھیک راست بلاکم و کاست مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں۔ لیکن سید صاحب کی اس کتاب کے ساتھ عدم واقفیت نے بے شک انھیں غیر حقیقی الجھنوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ محقق طوسی کی یہ تالیف فارسی کے ساتھ ساتھ عربی عروض کی بھی جداگانہ توضیح کر رہی ہے چنانچہ دیباچے کی عبارت ہے:۔

"ایں مختصریست در علم عروض شعر تازی و فارسی کہ بالتماس بعضی دوستاں مرتب کردہ شدہ"۔

مصنف کا قاعدہ ہے کہ پہلے ہر بحر کے عربی ضوابط و اوزان و امثال بیان کرتا ہے اس کے بعد فارسی اوزان اور امثال دیتا ہے۔ سید صاحب اس کو محض فارسی عروض کی کتاب (ص۲۲ خیام) بیان کرتے ہیں۔ اسی لیے سید الاثبات کا یہ قول کہ "مولف معیار الاشعار نے صرف قدما یعنی پہلے لوگ لکھا ہے جس سے فارسی و عربی کی تخصیص نہیں نکلتی"۔ فاضل موصوف اس سے زیادہ اور کیا تخصیص کرتے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ دکھا دیا ہے۔ ہزج کے عربی اوزان میں انھوں نے رباعی کا مطلق ذکر نہیں کیا اور فارسی کے ذکر میں لکھا جس سے پڑھنے والے پر صاف روشن ہے کہ رباعی فارسی الاصل ہے اور عربی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ سید صاحب اس سے زیادہ اور کیا تخصیص چاہتے ہیں۔

قولہ :- مگر محمدؐ ابن قیس رازی نے تصریح کی ہے کہ یہ رباعی (چہار بیتی) کہنے والے قدمائے عربی کے شاعر تھے - کیونکہ اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ عربی کی طرح فارسی اہلِ عروض بھی ایک لفظ کے حرفوں کو توڑ کر کبھی دو مصرعوں میں بانٹتے تھے۔" (ص۲۲۲ خیام)

عروض کے میدان میں یوں تو کئی چیزیں عجمیوں کی دماغی پیداوار اور ذہنی یادگار کی حیثیت سے شمار کی جاسکتی ہیں - مثلاً بحور قریب و جدید و مشاکل نیز ان کی نو ایجاد اکیس بحریں جو دوائر منعکسہ و منغلقہ و منغلطہ سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان کی افادی وقعت قابلِ ذکر نہیں - لے دے کر کوئی کام کی چیز جو ایرانی اضافے کے طور سے تسلیم کی جاسکتی ہے مثنوی اور رباعی ہے مگر دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے سید والاشان نے بیک جنبش قلم رباعی کی ایجاد کی عزت سے انھیں محروم کر دیا۔ اور یہ ارشاد کر دیا کہ رباعی کہنے والے قدمائے عربی کے شاعر تھے - خوش قسمتی سے سید صاحب اس عقیدے میں بالکل تنہا ہیں حتیٰ کہ محمد ابن قیس بھی جس کی مبینہ تصریح پر سید صاحب یہ رائے قائم کرتے ہیں ان کے بالکل برخلاف ہے۔ ذیل میں مصنّف موصوف کے تین مختلف بیان جن میں سے ہر ایک سید صاحب کے مزعومہ دعوے کے مخالف ہے - نقل کیے جاتے ہیں :-

"لیکن بحکم آنکہ زحافی کہ دریں وزن مستعمل است در اشعار عرب نبودہ است درقدیم بریں وزن شعر تازی نگفتہ اند واکنون مُحدِثان ارباب طبع بر ان اقبالی تمام کردہ اند و رباعیات تازی درہمہ بلاد عرب شائع و متداول گشتہ است۔"

(صف۹۰ المعجم فی معاییر اشعار العجم)

اس کا ترجمہ :- لیکن چونکہ ایسے زحاف جو اس وزن (رباعی) میں استعمال ہوتے ہیں - اشعار عرب میں نہیں آتے - عہد قدیم میں تازی گویوں سے اس

وزن میں اشعار نہیں لکھے۔ البتہ عہدِ حاضر کے ارباب ذوق نے اس کی طرف اقدام کیا ہی۔ چنانچہ عربی رباعیاں تمام ممالک عرب میں رائج اور مشتہر ہوگئیں۔ ایسے صاف اور صریح بیان کے باوجود سید صاحب کس طرح یہ دعوٰے کرسکتے ہیں کہ یہ رباعی گو قدمار عربی کے شاعر تھے۔

شمس قیس کا دوسرا بیان یہ ہی:-

"وبحقیقت ہیچ وزن از اوزان مبتدع واشعار مخترع کہ بعد از خلیل احداث کردہ اند بدل نزدیک تر ودر طبع آویزندہ تر ازیں نیست۔ (صنو المعجم)

یہ بیان بھی سید صاحب کے دعوے کے خلاف ہی۔

شمس قیس کا تیسرا بیان رباعی کی ایجاد شاعر مشہور رودکی کی طرف منسوب کرتا ہی۔ جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہی:-

"ویکی از متقدمان شعرائے عجم وپندارم رودکی واللہ اعلم از نوع اخرم واخرب ایں بحر وزنی تخریج کردہ است کہ آں را وزن رباعی خوانند" (صـ۱۸۸ـ المعجم)

جب رباعی کی ایجاد بروایت شمس قیس رودکی کی طرف منسوب ہی تو پھر ہمارے سید محترم کس طرح قدمار عربی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور لطف یہ ہی کہ خود محمدؐ ابن قیس کو اپنے بے سند دعوے کا مدار علیہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمدؐ ابن قیس رازی نے تصریح کی ہی کہ یہ رباعی (چہار بیتی) کہنے والے قدمار عربی کے شاعر تھے۔ اگر رازی نے کوئی ایسی تصریح کی تھی تو سیّد صاحب کو چاہیے تھا کہ اس کی اصل عبارت نقل کر دیتے۔

عربی کی طرح فارسی اہل عروض بھی ایک لفظ کے ٹکڑوں کو توڑ کر کبھی دو مصرعوں میں بانٹتے تھے۔ اس سے میں سمجھتا ہوں سید صاحب کا مطلب اشعار معقّد سے ہی۔ ایسے اشعار عربی کی تقلید میں قدمار فارسی میں رائج تھے۔ زیادہ تر

انہی ایام میں جب شعر گوئی کا مدار اکثر و بیشتر مربعات پر تھا۔ اشعار معقّد میں مصرع اول مصرع دوم سے لفظاً و معناً وابستہ ہوتا ہی۔ ہر مصرع مرکب غیر مفید کا حکم رکھتا ہی جب تک دوسرا مصرع ساتھ نہ پڑھا جائے بات ناتمام رہتی ہی۔ اس لیے کئی موقعوں پر ضروری ہی کہ دونوں مصرعوں کو ساتھ ملا کر مثل ایک مصرع مثمن کے پڑھیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہی کہ یہ اشعار معقّد ہیں جو فارسی میں اصول مثمنات کی دریافت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ جب مثمنات کی دریافت نے فارسی عروض میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اوزان مربع کا رواج متروک ہو گیا ان کے ساتھ ہی اشعار معقّد بھی جو مثنیٰ و مربع و مثلث ہوتے تھے غائب ہو گئے محقق طوسی نے ان کی بعض مثالیں اپنی تالیف میں محفوظ رکھی ہیں۔ جن میں سے کچھ اس سے بیشتر اسی مضمون میں نقل ہو چکی ہیں۔ بعض یہاں درج کی جاتی ہیں:۔

مثال ہزج مربع سالم:۔

بیار آن مے کہ پنداری　　　روان یاقوت نابستے

ویا چون برکشیدہ تیغ　　　پیش آفتابستے

آخری شعر میں تیغ کا 'غین' وزن کی رو سے دوسرے مصرع میں شامل ہی۔ رودکی کا یہ قطعہ بالعموم مثمن شکل میں لکھا جاتا ہی جس سے تمام قطعہ مصرّع ہو گیا ہی حتیٰ کہ حدائق السحر میں بھی اس کو مثمن ہی درج کیا ہی۔ لیکن محقق طوسی نے مذکورۂ بالا شعر مربع کی مثال میں نقل کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ قطعہ اصل میں مربع تھا۔ اور مثمنات کے رواج کے بعد اس کو بھی مثمن بنا لیا گیا۔

مثال دیگر:۔ رہ شادیم　　بہ بستی

یہ دو رکنی شعر ہی۔ جس کی تقطیع ہی: رہ شادی فعلاتن، م ب بستی فعلاتن،

یعنے میم ضمیر متکلم شامل مصرع دوم ہے۔

مثال دیگر:- ہر کہ بد خواند ترا   از مردمی ہست او بری

اس شعر میں "از" بغرض تقطیع شامل مصرع اوّل ہے۔

مثال شعر مثلث:- نو شد جہان زین نو بہار و سال تو

یہ تین رکن کا پورا شعر ہے جس کا نصف معین نہیں۔ عربی تقلید میں بدیع بلخی نے یہ قصیدہ لکھا تھا۔

قولہ:- "چوتھی پانچویں صدی کے شعرار فارسی پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں کے ساتھ تیسرے کو بھی اکثر ہم قافیہ لایا کرتے تھے مگر اس کا قطعی لزوم ان کے ہاں بھی نہ تھا۔ چنانچہ رودکی، فردوسی، عنصری وغیرہ کی رباعیوں میں کبھی تیسرے مصرع میں قافیہ ہے اور کبھی نہیں ہے۔"

اس بارے میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال فارسی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کی رائے میرے خیال میں زیادہ وزنی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک رباعی جتنی زیادہ قدیم ہوگی گمان غالب ہے کہ وہ مصرّع ہوگی۔ جتنی متاخر ہوگی اتنی ہی خصی ہوگی۔ میں غیر خصی کو مصرّع اور خصی کو غیر مصرّع کہوں گا۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں بالعموم مصرّع رباعیاں رائج تھیں۔ مثلاً شعرائے عہد غزنہ کے دواوین میں سے عنصری کی ۳۶ رباعیوں میں سے ۳۴۔ فرخی کی ۳۷ میں سے ۳۶۔ ناصر خسرو کے ہاں ایک میں سے ایک۔ ابوالفرج رونی کے ہاں ۵۷ میں سے ۵۱۔ قطران تبریزی کے ہاں ۱۵ میں سے گیارہ۔ اور مسعود سعد سلمان کے ہاں ۲۲۷ میں سے ۲۱۹ رباعیاں مصرّع ہیں۔ اس سے ہم یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ چوتھی اور پانچویں صدی میں مصرّع رباعیاں کہنے کا دستور لزوم کی حد تک عام تھا۔ ان میں غیر مصرّع رباعیوں کا شمول خالی از اشتباہ نہیں۔ جلد دوم لباب الالباب میں شعرائے

آل سامان و شعرائے آل ناصر کی رباعیاں جو بتفصیل ذیل ہیں سب کی سب بلا استثنا مصرّع ہیں۔ چنانچہ :۔

ابوشکور بلخی، یک۔ ص۲۱۔ عنصری، یک ص۳۲۔ ابوعبداللہ محمد المعروف بروردہ البلخی کے ہاں پانچ مختلف مصرّع شعر بروزن رباعی ص۴۷۔ فرخی، ۲ ص۵۔ ابوعبداللہ عبدالرحمٰن بن محمد العطاردی، ۲ ص۵۷، ابوالحرث حرب بن محمد الحقوری الہروی، یک ص۶۱۔ ابوالمنصور عبدالرشید بن احمد بن ابی یوسف الہروی، یک، ص۶۱۔ مسعود الرازی، یک ص۶۳۔ ناصر لغوی، یک، ص۶۶ یہ رباعی ۴۲۱ھ میں امیر محمد بن محمود کے قید کیے جانے کے موقعے پر لکھی گئی ہے۔ محسن قزوینی، یک، ص۶۷۔ ...... بن احمد البدری الغزنوی، یک ص۶۷۔

لغت فرس میں تین رباعیاں میری نظر سے گزریں اور تینوں مصرّع ہیں پہلی لست کی شرح میں ص۱۶ پر لبیبی کی۔ دوسری 'زوشیدن' کی تشریح میں ص۵۳ پر عسجدی کی۔ اور تیسری ابوالموید کی، 'ملک' کی تشریح میں جو حسب ذیل ہے :۔

صفرای مرا سود ندارد ننکا   در دسر من کجا شناسد علکا
سوگند خورم بہر چہ ہستم ملکا   کز عشق تو بگداختہ ام چوں کلکا (ص۶۸)

لغت فرس میں تو یہ رباعی سب سے قدیم مانی جاسکتی ہے۔

رباعی کے وزن پر بعض شعر بھی اسی فرہنگ میں ملتے ہیں۔ مثلاً 'شبغازہ' کے ذکر میں ص۳۷ پر عمارہ کا شعر مصرّع اور ص۳۸ پر 'چغز' کے بیان میں ابوالفتح بستی کا مصرّع بیت :۔

ہر چند کہ درویش پسر فغ زاید   در چشم توانگراں ہمہ چغز آید

اور ص۸۵ پر 'مالہ' کے ذکر میں عمارہ کا شعر۔ لیکن دقیقی کا ایک شعر جو اگرچہ

وزن رباعی میں ہی غیر مصرّع ہی جو صفحہ ۱۰۸ پر "سخنوں" کی تشریح میں دیا گیا ہی۔ چنانچہ :-

ترسم کان وہم تیز خیزت لرزی   وہم ہمہ ہندواں بسوز و بسخون

یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ شعر کسی رباعی سے لیا گیا ہی بلکہ فردیات سے تعلق رکھتا ہی اوزان رباعی میں منفرد اشعار بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ میں ایک مثال رودکی کے ہاں سے دیتا ہوں :-

اندر عجبم زجاں ستاں کز چو توے   جان بستد و از جمال تو شرم نداشت[1]

گلستان سعدی میں ایسے فردیات کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

علیٰ ہذا دمیۃ القصر میں باخرزی نے جو عربی اور فارسی رباعیاں درج کی ہیں۔ تمام و کمال مصرّع ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحات صفحہ ۱۷۴۔ صفحہ ۱۷۵، صفحہ ۲۰۲، صفحہ ۲۶۱، صفحہ ۲۶۹۔ اس لیے کہا جاسکتا ہی کہ رودکی و فردوسی و عنصری وغیرہم کے ہاں غیر مصرّع رباعیوں کا موجود ہونا اس امر کی دلالت کرتا ہی کہ وہ ان شعرا کی اصلی رباعیاں نہیں بلکہ متاخرین نے سہواً ان کی طرف منسوب کردی ہیں۔ رودکی کی جس قدر رباعیاں سید صاحب نے نقل کی ہیں یقیناً مشتبہ ہیں اور یہ انھیں خود بھی تسلیم ہی۔ اسی قسم کی ایک رباعی شمس قیس نے المعجم میں حسب ذیل دی ہی :-

واجب نبود بکس بر افضال و کرم   واجب باشد ہر آئینہ شکر نعم
تقصیر نہ کرد خواجہ در نا واجب   من در واجب چگونہ تقصیر کنم

(المعجم صفحہ ۲۰۳)

---

[1] احوال و اشعار ابو عبد اللہ جعفر بن محمد رودکی جلد دوم صفحہ ۶۰۳ از سعید نفیسی۔ طہران ۱۳۱۰ھ۔

فرخی نے ایک قصیدہ وزن رباعی میں لکھا ہی۔ اس کا پہلا مصرع ہی۔ "ای سرّی گر برد ماہ دار د بسر

مگر یہ رباعی غیر مصرّع ہونے کے علاوہ پچاس فیصدی عربی الفاظ پر شامل ہی جو یقیناً رودکی کے عہد کی زبان نہیں۔ جلد دوم احوال و اشعار رودکی میں سعید نفیسی نے رودکی کی ہجویات کی مثال میں یہ رباعی نقل کی ہی۔ جو شبہ سے خالی نہیں:۔

آن خر پدرت بدشت خاشاک زدی — مامات دف و دو رویہ چالاک زدی
آں بر سر گورہا تبارک خواندی — ویں بر در خانہا بتوراک زدی

۳۵۲ھ میں امیر ابوجعفر والی سیستان کی وفات پر صانع بلخی یہ رباعی لکھتا ہی:۔

خان غم تو پست شدہ ویراں باد — خان طربت ہمیشہ آباداں باد
ہموارہ سر کار تو بانیکاں باد — تو میر شہید و دشمنت ماکاں باد[1]

قولہ:۔ "عربی کی رباعیوں میں چاروں مصرعوں کا ہم قافیہ لانا اس لیے ضروری تھا کہ اس کا ہر مصرع شعر ہوتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ بعض جدت پسندوں نے قافیہ کے ساتھ ردیف کی بھی شرط کر لی تھی" (ص ۲۲۳ خیام)

رباعی کے معاملے میں عربی والے ہمیشہ فارسی کے مقلد رہے اس لیے جب رباعی چار شعروں کی صورت میں لکھی جاتی تھی۔ یا جب دو شعروں کی صورت میں مرقوم ہوتی تھی، عربی خواں ہر حال میں تقلید شعرائے فارسی کرتے رہے ہیں۔ یہی کیفیت ردیف کی ہی جو فارسی الاصل ہی اور عربی والوں نے تقلیداً اختیار کر لی ہی۔ محقق طوسی کتاب معیار الاشعار میں رقمطراز ہیں:۔

"ردیف در اصل خاص بود بزبان پارسی و متاخران شعرائے عرب از پارسی گویان فرا گرفتہ اند و بکار می دارند" (معیار الاشعار و میزان الافکار ۱۲۶۴ھ مطبع علوی)

قولہ:۔ ابو الحسن باخرزی المتوفی ۴۶۷ھ نے اپنی کتاب دمیۃ القصر میں

---

[1] ص ۳۲۳ تاریخ سیستان تالیف در حدود ۴۴۵-۷۲۵، بتصحیح ملک الشعراء بہار۔ طہران ۱۳۱۴ شمسی۔

ذکر کیا ہی کہ میں نے اِس سے پہلے اِس طریقے پر رُباعی
نہیں سُنی تھی"۔ "لم اکن سمعت ھذہ الطریقۃ" یہاں تک کہ
میرے والد نے ابو العباس باخرزی کی چند رباعیاں اسی طرز کی سُنائیں"۔

(ص ۲۲۴ خیام)

"لم اکن سمعت ھذہ الطریقۃ" کا ترجمہ سید محترم نے ان الفاظ میں کیا ہی کہ:۔ "میں نے اس سے پہلے اس طریقے پر رباعی نہیں سُنی تھی"۔ لیکن یہ ترجمہ دُرست نہیں معلوم ہوتا۔ عربی عبارت میں رباعی کا لفظ مذکور نہیں۔ میرے نزدیک اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ "میں نے اب تک اس قسم کی نظم نہیں سُنی تھی"۔ اور مصنف کا مقصد ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس کے لیے عربی میں رباعی سُننے کا عمر میں یہ پہلا موقع تھا جب اس کے والد نے ابو العباس باخرزی کی اس طرح کی رباعیاں سنائیں۔ باخرزی کی عبارت ہی:۔

"ولم اکن سمعت ھذہ الطریقۃ حتیٰ انشدنی والدی لابی العباس الباخرزی رباعیات علیٰ ھذا النمط"۔ (ص ۱۲۴)

اگر میرا یہ اختلافی ترجمہ قابل قبول ہو تو ظاہر ہی کہ رباعی کا تعارف اگرچہ عربی میں ہو چکا تھا مگر اس کا علم خواص تک محدود تھا اور عام رواج میں نہیں آئی تھی کیونکہ باخرزی جیسا فاضل شخص اس کے وجود سے بے خبر تھا۔ باخرزی کا یہ بیان بجائے سید صاحب کی تائید کے ان کے اس قول کی کہ "رُباعی کہنے والے قدماء عرب کے شاعر تھے" واضح تردید کرتا ہی۔ بلکہ دمیۃ القصر میں اور موقعوں پر بھی فارسی کے ساتھ رباعی کے مربوط ہونے کی نسبت اشارے موجود ہیں۔ چنانچہ ابو نصر تمیم بن احمد الغزنوی کے حالات میں مذکور ہی:۔ "والغالب علیہ لسان العجم و رباعیۃ" ص ۱۷۱

محمد بن ابی نصر کے ذکر میں مرقوم ہے:-" ولہ رباعیات فی الفارسیة رقیقة واختراعات فیہا دقیقة " ص۲۶۵ اسی طرح صفحات ۲۰۲، ۲۶۱ و ۲۶۲، ۲۶۵ و ۲۹۶ پر فارسی کی متعدد رباعیاں اور ان کے عربی ترجمے منقول ہیں۔

اس کے بعد فاضل سید دمیة القصر سے عربی کی پانچ مصرّع رباعیاں نقل کر کے فرماتے ہیں:-

"آپ دیکھیں کہ ان سب رباعیات کے چاروں مصرعوں میں قافیے ہیں، حالانکہ اسی عہد کی بلکہ اس سے پیشتر کی فارسی رباعیوں میں اس کی پابندی مطلق نہیں ہے۔ عمّارہ مروزی جو چوتھی صدی کے اواسط میں تھا، کہ اس نے سامانی وغزنوی دونوں درباروں میں رسوخ پایا تھا، کہتا ہے:-

آن می بدست آں بت سیمین تن نگر گوئی کہ آفتاب بپیوست با قمر

واں ساغری کہ سایہ بفگندمی برد برگ گل سپید است گوئی بلالہ بر

تیسرا مصرع قافیے سے خالی ہے۔" (ص۲۲۵ خیام)

چاروں مصرعوں میں قافیہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس عہد میں بتقلید چہاربیتی دوبیتی یا مصرّع رباعیاں کہنے کا دستور تھا۔ فارسی شعرا بھی اپنی دوبیتیوں میں چار قافیے ہی لاتے تھے جیسا کہ اس سے قبل گزارش ہو چکا ہے۔ سید صاحب کے ذہن میں جو تین قافیوں والی غیر مصرّع رباعیاں ہیں وہ درحقیقت زمانۂ مابعد کی پیداوار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اوزان غیر رباعی کو اوزان رباعی کے ساتھ خلط ملط کر رہے ہیں۔ چنانچہ عمّارہ مروزی کے تین قافیوں والے اشعار بالا کو رباعی تصور کر رہے ہیں۔ حالانکہ رباعی کو ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اصل میں بحر ہزج کے بارہ اخرب اور بارہ اخرم اوزان جن کی میزان چوبیس ہوتی ہے،

اوزان رباعی کہلاتے ہیں اور رباعی کا اطلاق انہی اوزان پہ محدود ہی۔ عمارہ مروزی کے اشعار بحر مضارع میں ہیں۔ ان کی تقطیع ہی :-

ا موبَ مفعولُ ، دستِ ااب فاعلاتُ ، ت سیمیں مفاعیلُ ، من نگر فاعلن ، گوئی ک مفعولُ ، افتاب فاعلاتُ ، ب پیوست مفاعیلُ ، باقمر فاعلن ، اور وزن مضارع مثمن مکفوف و محذوف ہی۔

رباعی کے مختلف ناموں کے ذکر میں ہمارے سید والا شان قابوس نامۂ عنصر المعالی امیر کیکاؤس سے مثالیں دے کر غزل و ترانہ کو ایک ہی اصطلاح منوانے کی کوشش میں مصروف ہیں چنانچہ :

قولہ :- "باب سی و پنجم اندر آئین و رسم شاعری" میں مختلف اصنافِ سخن کے سلسلے میں "غزل و ترانہ" کہا ہی۔ "اگر غزل و ترانہ گوئی سہل و لطیف تر گوئی و بقوافی معروف گوئی" ، پھر آگے چل کر ہی۔ "و غزل و ترانہ تر و آبدار گوئی"

(ص ۱۴۳ بمبئی)

ع یہ ایسی دھری ہی کہ اُٹھائی نہیں جاتی ۔ پس کسی حالت میں بھی سید صاحب کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتا کہ امیر کیکاؤس نے ان فقروں میں غزل کو ترانے کا مرادف سمجھا ہی۔ غزل و ترانہ میں خبط کر دینا اور یہ سمجھنا کہ چونکہ دونوں معطوف و معطوف علیہ ہیں۔ اس لیے معنوں میں مشترک ہیں۔ صریح مسلمات سے انکار کرنا ہی۔ غزل و ترانہ سے عنصر المعالی کی مُراد یہی مشہور دو اقسام نظم ہیں جو غزل اور رباعی کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ یہاں سیّد صاحب ایک شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اسی سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں :-

قولہ :- "محمّد بن قیس رازی نے معجم (سنہ ۶۱۴ھ سنہ ۶۳۰ھ) میں ذرا ذرا سے

فرق سے اس کے (یعنی رباعی کے) حسب ذیل نام بتائے ہیں :-

قول :- ہرچہ ازاں جنس برابیات تازی (عربی) سازند آنرا قول گویند

غزل :- و ہرچہ بر مقطعات پارسی باشد آنرا غزل خوانند۔

ترانہ :- اہل دانش ملحونات ایں وزن را ترانہ نام کردند۔

دوبیتی :- و شعر مجرد آنرا دوبیتی خوانند برائے آنکہ بنای آں بردو بیت بیش نیست۔

رباعی :- و مستعربہ آں را رباعی خوانند از بہر آنکہ بحر ہزج در اشعار عرب مربع الاجزا آمدہ است' پس ہر بیت ازیں وزن دو بیت عربی باشد۔ (صفحہ ۹)

قدما کے کلام میں غزل و ترانہ کا لفظ ساتھ ساتھ آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد تک غزل کی موجودہ اصطلاح پختہ نہیں ہوئی تھی" (طبع ۲۲ خیام)

سید صاحب قول و غزل و ترانہ کو مرادف شمار کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسی غلط فہمی نہ قدما میں تھی نہ متاخرین میں۔ یہ اصطلاحیں ہمیشہ جدا جدا مانی گئی ہیں، مانی جاتی ہیں اور مانی جاتی رہیں گی۔ ہمیں یقین ہے کہ سید والا مناقب کو ایک شخص بھی ان کی رائے کا موید نہیں ملے گا۔ اسی طرح میرے مخدوم شمس قیس کا اصل مطلب سمجھنے میں قاصر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان اصطلاحات میں شمس قیس نے ذرا ذرا سے فرق سے رباعی کے نام دیے ہیں۔ حالانکہ شمس قیس کی مراد بالکل مختلف ہے۔ مصنف موصوف رباعی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

درحقیقت ان تمام نو ایجاد اوزان میں سے جو خلیل کے بعد ایجاد ہوئے ہیں کوئی وزن وزنِ رباعی سے زیادہ دل آویز اور مرغوب طبع عوام نہیں۔ کیونکہ موسیقی کے فن کاروں نے اس وزن میں نفیس نفیس لحنیں اور لطیف لطیف

راہیں بٹھائی ہیں (اس کے بعد بطور جملۂ معترضہ کہتے ہیں) اور دستور یوں چلا آیا ہی کہ اس جنس (لحنوں) سے جو کچھ عربی اشعار میں بٹھایا جائے، اسے قول کہتے ہیں"۔ گویا مصنف کے نزدیک قول اس راگ یا سرود کا نام ہی جو عربی اشعار میں بٹھایا جاتا ہی۔ اس بارے میں اہل لغت بھی مصنف کے ساتھ متفق ہیں۔ ان کے نزدیک قول ایسا سرود ہی جس میں عربی عبارت شامل ہوتی ہی۔ "و در اصطلاح موسیقیاں نوعے از سرود کہ دراں عبارت عربی نیز داخل باشد"۔ اسی لیے قول گانے والا قوال کہلاتا ہی۔ اس سے ظاہر ہی کہ قول ہمارے مصنف کے نزدیک ترانہ یا رباعی سے بالکل مختلف چیز ہی۔

آگے شمس قیس کا بیان ہی کہ جو "لحنیں فارسی مقطعات یعنے اشعار میں بٹھائی جائیں انھیں غزل کہتے ہیں"۔ اس سے مطلب شعرا کی غزل نہیں بلکہ موسیقی کی۔ اس جملے میں مقطعات کی اصطلاح تشریح طلب ہی۔ فارسی لغات کا بیان ہی۔ "مقطعات شعرہاے سبک وزن و اشعار بحر رجز"۔ اس جاننے کے بعد مصنف کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہی کہ جو کچھ فارسی کے سبک اوزان اشعار میں لکھا جاتا ہی اُسے غزل کہتے ہیں۔ شیخ بہار الدین برناوی متوفی ۱۰۳۰ھ جو موسیقی میں امیر خسرو کے بعد امام فن کا رتبہ رکھتے ہیں۔ غزل کی تشریح یوں کرتے ہیں: غزل وہ قسم ہی جس میں ایک غزل یا اس کے انتخابی ابیات سادہ راگ اور تال میں بغیر تانا تلی کے باندھ دیں۔ اس قسم میں پردۂ ولایتی مغلوب کر دیتے ہیں بلکہ بعض اقسام میں نہیں لاتے۔ اس کو جکری اور بشنپد سے زیادہ مشابہت ہی"۔ (ص۸۰ اورینٹل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۲۷ء)۔

اس کے بعد مصنف ممدوح کہتے ہیں کہ "اہل دانش نے اس وزن یعنی وزن رباعی کی لحنوں کا نام ترانہ رکھا ہی۔ جسے بمناسبت شعر فارسی دو

بیتی کہتے ہیں اور عربی خواں رباعی"۔ بالفاظ دیگر رباعی بحیثیت اصطلاحِ موسیقی ترانہ کہلاتی ہی۔ باعتبار شعر دوبیتی اور عربی خوانوں میں رباعی کہلاتی ہی۔ اس سے بیشتر مصنف نے قول۔ غزل اور ترانے کا فرق موسیقی کے اعتبار سے دکھایا تھا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے مرادف ہیں۔ اس کا ثبوت ہمارے پاس یہ ہی کہ شمس قیس نے اپنی اسی تصنیف میں کسی دوسرے مقام پر غزل و رباعی کی جنھیں سید صاحب ایک سمجھ رہے ہیں جدا جدا صراحت کی ہی جس سے ثابت ہوتا ہی کہ مصنف مذکور کے نزدیک غزل و رباعی نظم کی دو مختلف اقسام ہیں۔ غزل کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"غزل در اصل لغت حدیث زنان وصفت عشقبازی با ایشان و تہالک در دوستی ایشان است و مغازلت عشقبازی و ملاعبت است با زنان...... و بیشتر شعرائے مُفلِق ذکر جمال معشوق و وصف احوال عشق و تصابی را غزل خوانند... و بحکم آنکہ مقصود از غزل ترویح خاطر و خوش آمد نفس است باید کہ بنا ر آں بر وزنے خوش مطبوع و الفاظی عذب سلس و معانی رائق مروّق نہند و در نظم آن از کلمات مستکرہ و سخنانِ خشن محترز باشند" (ص ۳۸۷ المعجم)

اور رباعی کے متعلق کہتے ہیں:۔

"ہمچنیں رباعی کہ بیش ازیں در قسم عروض شرح آن گفتہ آمدہ است بحکم آنکہ بنا ر آں بر دوبیت بیش نیست باید کہ ترکیب اجزا ر آں دُرست و قوافی متمکن و الفاظ عذب و معانی لطیف باشد و از کلمات حشو و تجنیسات متکرر و تقدیم و تاخیرات ناخوش خالی بود و اگر باآں چیزے از صناعات مستحسن و مستبدعات مطبوع چون مطابقۂ لطیف و تشبیہی دُرست و استعارتی لطیف و تقابلی موزوں و ایہامی شیریں یار بود نیکوتر آید" (ص ۳۸۸ المعجم)

ابوطلب رباعی گو کی نسبت جس کا ذکر فرخی کے مسبوق الذکر شعر میں آتا ہے۔
سید صاحب رقمطراز ہیں :-

قولہ "ابوطلب نام کسی شاعر کا پتا ہم کو نہیں چلتا۔ فرخی جس کا یہ شعر ہے اس نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی ہے۔ اس لیے ابوطلب ترانہ گو کا زمانہ اس سے تو بہر حال پہلے تھا۔ ایک خیال ہوتا ہے کہ ابوطلب ابودُلف تو نہیں مگر یہ امر سراپا تحقیق طلب ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو ترانہ گوئی کا زمانہ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں پہنچ جائے گا" (ص ۲۲۹۔ خیام)

سبحان اللہ ابھی تحقیقات شروع بھی نہیں ہوئی لیکن سید والا منزلت نے پہلے ہی یہ حکم لگا دیا کہ 'اگر یہ صحیح ہے تو ترانہ گوئی کا زمانہ تیسری صدی میں پہنچ جائے گا'۔ اچھا اگر یہ غلط ثابت ہوا تو پھر کون سی صدی میں پہنچ جائے گا؟ یہاں ہم سید صاحب کی تحقیقات سے اعراض کر کے اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ جیسا اس سے قبل بیان ہو چکا ہے شعر بالا جس میں ابوطلب کا نام مذکور ہے۔ فرخی کے بائیہ قصیدے سے تعلق رکھتا ہے جس میں 'بے' روی اور قافیہ غضب۔ رجب۔ عجب۔ ادب نسب وغیرہ ہے۔ ان مراتب کو جانتے ہوئے بوطلب کی جگہ بودُلف کو قبول کرنے میں جس کے سید صاحب محرک ہیں ہمیں بے شمار مشکلات سے سابقہ پڑے گا کیونکہ نہ صرف بوطلب کو بودلف میں تبدیل کرنا کفایت کرے گا بلکہ قصیدے کے تمام قافیوں کی 'بے'، کو جن کی تعداد پچاس ہے 'فے'، کے ساتھ تبدیل کرنا پڑے گا۔ جس سے نہایت مضحک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ اور وہی معاملہ پیش آئے گا جو سعدیؒ کے مصرع ع شاید کہ پلنگ خفتہ باشد' کو 'خفیہ' پڑھنے سے پیش آیا تھا۔ یعنی اس کے پہلے شعر ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

کے قافیوں گفتہ و نہفتہ کو نئی ترمیم کی خاطر گفیہ و نہفیہ پڑھنے پر مجبور ہونا پڑا
تھا۔ یہ ابوطلب کا بدل ابوُدلف جو بقول دولت شاہ یعقوب صفار متوفی ۲۶۵ھ
کے دربار میں ابن الکعب ایک اور شاعر کے ساتھ رباعی کا موجد مانا گیا ہی۔
اور موجودہ تحقیقات جس کا کوئی پتانشان نہیں دیتی ہیں تو صرف دولت شاہ
کے تخیل کی ایک مخلوق معلوم ہوتا ہی۔ مگر ہمارے محترم نے اس غیر حقیقی شخصیت
کو حقیقی شخصیت دینے کے لیے مامون و معتصم کے عہد کے ایک امیر ابودلف
عجلی متوفی ۲۲۶ھ کے ساتھ شناخت کرلیا ہی۔ چنانچہ کہتے ہیں :۔

قولہ:۔ دولت شاہ نے اپنی روایت میں یعقوب صفار کے دربار کے جن
دو شاعروں کے نام لیے ہیں۔ ان میں سے ابن الکعب سے ہم واقف
نہیں البتہ رابعہ بنت الکعب (دختر کعب) کا ذکر ملتا ہی۔ جو عہد سلاطین
غزنین (پانچویں صدی) میں تھی (عوفی ۲-۶۱) دوسرے شاعر
ابودلف عجلی کا تذکرہ سیاسی و ادبی کتابوں میں ملتا ہی۔ یہ شخص نسلاً
عرب اور مامون و معتصم کے عہد میں ایران کا سپہ سالار تھا قاسم
بن عیسیٰ نام تھا۔ ابن خلکان نے اسی نام کے تحت میں اس کا پورا
حال لکھا ہی۔ ۲۲۶ھ میں اس نے وفات پائی" وغیرہ وغیرہ۔
اور آخر میں اضافہ ہوا ہی :۔ "اس کا زمانہ امیر یعقوب صفار سے
پہلے تھا۔ یعقوب صفار کے عہد میں اس کے بیٹے عبدالعزیز بن ابی
دلف کا نام اصفہان کی سیاسیات کے سلسلے میں آتا ہی"

(صفحہ ۲۳۰-۲۳۱ خیام)

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ حضرت مولانا نے اِن دونوں اشخاص میں اسمی
اشتراک کے سوا کیا وجہ مماثلت دیکھی کہ دونوں کو ایک مان لیا۔ گویا امیر ابوُدلف

عجلی ۲۲۶ھ میں وفات پاکر بروے تناسخ دوبارہ جنم لے کر یعقوب بن لیث
کے دربار میں بحیثیت شاعر نمودار ہوتا ہی اگرچہ مولانا ابو دلف کو یعقوب صفار
سے اقدم بھی مان رہے ہیں۔ ایک لطف یہ ہی کہ جب جناب سیّد کو دولت شاہ
کا بیتنہ ابن الکعب نہ مل سکا تو بنت الکعب پر قناعت کرلی جس کا زمانہ عہد آل
غزنہ بیان کرتے ہیں۔

سید صاحب کا خیال ہی کہ رودکی کے زمانے میں غزنی کوئی آباد شہر نہ تھا
اسی بنا پر شمس قیس کا روایت کردہ قصہ جو رباعی کی ایجاد پر روشنی ڈالتا ہی اور
جس میں رودکی شاعر غزنین کے مرغزار میں عید کے روز سیر و گشت میں مصروف
دکھایا گیا ہی۔ ان کے نزدیک ناقابل قبول ہی۔ کیونکہ جب شہر ہی آباد نہ تھا تو
شاعر وہاں کیوں جاتا۔ (دیکھو صث۲۳ خیام)

لیکن معلوم ہوتا ہی کہ غزنین قدیم شہروں میں سے ہی۔ بروایت تاریخ کامل
عبدالرحمٰن بن سمرہ بخلافت حضرت عثمانؓ غزنین کو فتح کرتا ہی۔ (ج ۳ صث۵) تاریخ
سیستان میں مذکور ہی:۔ "وغزنین یعقوب بن اللیث ملک الدنیا کرد"[۱] (صث۲۴)
۲۸۶ھ کے قریب یعقوب کے بھائی عمرو لیث کے زمانے میں ناسد ہندی
و آلمان ہندی متحد ہو کر غزنین پر چڑھ آتے ہیں اور عمرو کے عامل بردعالی
کو شکست دیتے ہیں (صث۲۵۵ تاریخ سیستان)۔ اسی خاندان کے ایک اور فرد
لیث بن علی کے عہد میں اس کا سالار معدل سنہ ۲۹۷ھ میں غالب کو قید کرکے
لیث کے پاس سیستان بھیجتا ہی اور پھر غزنین پہنچ کر سنجک کو قتل کرتا ہی۔ سنجک
کی فوج معدل کی تلاش کرتی ہی لیکن معدل غزنین میں نہیں ملتا (صث۲۸۷ تاریخ
سیستان)۔ سنہ ۲۹۸ھ کی ذیل میں آتا ہی:۔ "وخطبہ بسیستان وبست وکابل وغزنین

---

[۱] یعنے آباد کرد۔

محمد بن علی اللیث راہی کردند (صفحہ ۲۹)۔

امیر نصر بن احمد سامانی ۳۰۱ھ کے سالِ جلوس کے ذکر میں یہ عبارت ملتی ہے:۔ "و عبید اللہ بن احمد بن جیہانی در بست و رخج بود و سعید طالقانی را بگرفت و بہ بغداد فرستاد و فضل و خالد بر غزنہ و بست دست یافتند"۔

(صفحہ ۴ احوال و اشعار رودکی جلد اوّل)

ان مثالوں سے تو غزنین رودکی کے زمانے میں ایک اہم اور آباد شہر معلوم ہوتا ہے۔ ایک امر دلچسپی کا موجب یہ ہے کہ بنت الکعب جسے ہمارے سیّد بروایت عوفی آلِ غزنہ کے زمانے میں جگہ دیتے ہیں شیخ فریدالدین عطار جو عوفی سے بھی اقدم ہیں۔ رودکی کی معاصر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُس نے رودکی کے ساتھ مشاعرے کیے ہیں۔ جن دنوں رودکی اس شاعرہ کے وطن میں آیا تھا۔ وہ اس کا نام زین العرب بتاتے ہیں[۱]۔

میں نے ابوشکور بلخی کی ایک رباعی کو جس کا آفرین نامہ ۳۳۳ھ میں ختم ہوتا ہے سب سے قدیم رباعی بتایا تھا۔ اس پر سید صاحب نے اعتراض کیا اور کہا کہ ایسی رباعیاں عوفی کے ہاں دس بارہ سے زیادہ ہیں۔ یہاں میں یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ سید صاحب کے نزدیک سب سے قدیم رباعی کون سی ہے۔ انھوں نے سرفہرست حنظلہ بادغیسی متوفی ۲۱۹ھ کی رباعی کو جگہ دی ہے مگر جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں وہ رباعی دوبیت ہیں اور دوبیتی نہیں ہے — آگے سیّد صاحب نے بایزید بسطامی متوفی ۲۳۴ھ کے نام پر تین غیر مصرع رباعیاں دی ہیں اور زبان کی صفائی اور والہ داغستانی کی تائید مزید کی بنا پر ان رباعیوں کو بایزیدی ٹکسال کا نہیں مانا۔ زاں بعد رودکی کا نمبر

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اورنٹیل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۲۵ء۔

آتا ہے جس کی سات رباعیاں درج کی ہیں۔ اور آخر میں اضافہ کیا ہے کہ "ان رباعیوں پر بھی یقین نہیں کہ وہ واقعی اسی کی ہیں"۔۔۔۔ فاضل سید نے فارابی کا تو اس انداز سے اعلان کیا ہے جس سے گمان گزرتا ہے کہ رباعی گوئی مدت العمر اس کا پیشہ رہا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔ "رباعی گو حکیموں میں پہلا نام اور مطلق رباعی گویوں میں تیسرا نام معلم ثانی ابو النصر فارابی المتوفی ۳۳۹ھ ہجری کا ملتا ہے۔" (صفحہ ۲۳۴ خیام) تین غیر مصرع رباعیاں اُس کے نام پر نقل کی ہیں جو اوروں کی طرف بھی منسوب ہیں۔ سید صاحب کے نزدیک فارابی کی رباعی گوئی کے یہ قرائن ہیں کہ گو نسلاً وہ ترک تھا مگر اس زمانے میں عجم و ترکستان کی عام زبان فارسی ہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ متعدد زبانوں سے واقف تھا اس لیے اس کی طرف فارسی رباعیات کا انتساب غیر متوقع نہیں ہے۔ شہرزوری کی تاریخ الحکما میں ہے۔ اصلہ فارسی"۔ میں کہتا ہوں ایسے غیر متعلق قرائن تین رباعی تو بہت ہوتی ہیں۔ فارابی کے حصے میں ایک رباعی دینے کو بھی ہم آمادہ نہیں کر سکتے۔ آگے جا کر خود ہمارے مخدوم یقین اور بے یقینی کے سیلاب میں بہ گئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں "مگر ان قرائن کے باوجود کوئی قدیم اور غیر مشکوک دلیل اس کے رباعی گو شاعر ہونے پر ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے بجز اس کے کہ شہرزوری نے تاریخ الحکما میں اس کے حال میں لکھا ہے "ولہ اشعار حسنۃ حِکمیّۃ" اور اس کے اچھے حکیمانہ اشعار ہیں اور اس کے عربی حکیمانہ اشعار دو صفحوں میں نقل کیے ہیں"۔

یہاں ایک سوال ہو سکتا ہے کہ ان دو صفحے عربی اشعار کی بنا پر ہم کیا فارابی کو فارسی کے میدان میں رباعی گو شاعر اور رباعی گو حکیم کہنے میں الفاظ کا بیجا اور بے معنی استعمال نہیں کر رہے ہیں؟۔

ایک موقعے پر ہمارے مکرم، شیخ احمدؒ بدیلی سبزواری جو ۵۸۲ھ میں موجود تھے اور شیخ فریدالدین عطّار المتوفی ۶۲۷ھ کے ذکر کے بعد رقمطراز ہیں :-

"اس وقت تک شاعری کے جو اصناف رواج پذیر تھے وہ قصیدہ مثنوی اور قطعہ تھے" (ص ۲۴۹)

پھر فرماتے ہیں :- "اور غزل بحیثیت ایک مستقل صنف سخن کے اب تک پیدا نہیں ہوئی تھی جس میں معنی کے لحاظ سے ہر شعر بجائے خود مستقل ہوتا ہے۔ کمال اسمٰعیل متوفی ۶۳۵ہ ہجری نے اس طرز کا آغاز کیا اور شیخ سعدی المتوفی ۶۹۱ سنہ ہجری نے اس کو کمال کو پہنچایا۔ اس لیے فلسفہ وحکمت کے مختصر متفرق خیالات کے لیے رباعی کے سوا کوئی چیز اس وقت موجود نہ تھی" (ص ۲۵۰ خیام)

اس عہد سے بیشتر قول وغزل وترانہ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں شعری تثلیث بنے ہوئے تھے۔ مگر کمال اسمٰعیل کے دور میں غزل قوام میں آکر پختہ ہوگئی، معلوم نہیں سیّد والا جاہ ان لوگوں کو کیا کہیں گے جو غزل کے علیحدہ وجود کے رودکی کے عہد سے قائل ہیں۔ مثلاً محمود کے دربار کا ملک الشعرا عنصری رودکی کی غزلیات پر رشک کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں رودکی کی طرح غزلیں نہیں لکھ سکتا۔ ؎

غزل رودکی وار نیکو بود　　غزلہاے من رودکی وار نیست

میں یہاں رودکی کی غزل کا ایک مطلع بھی درج کر دیتا ہوں ؎

کس فرستاد بسر آں بت عیار مرا

کہ مکن یاد بشعر اندر بسیار مرا

دقیقی کی دو غزلیں تو لباب الالباب عوفی میں موجود ہیں۔ میں صرف ان کے مطلعوں پر قناعت کرتا ہوں ؎

کاشکے اندر جہان شب نیستی — تا مرا ہجران آن لب نیستی

اور :۔ ؎

ای ابر بہمنی نہ بچشم من اندری — دم زن زمانکی و برآسای و کم گری

شمس قیس دقیقی کی ایک اور غزل نقل کرتے ہیں اور رائے دیتے ہیں :۔

"و دقیقی غزل مشکول[1] گفتہ است و بعلت بے انتظامی ارکان و اختلاف اجزا در قبول طبع بدین بیت نسبتی ندارد۔ و غزل اینست :۔

شب سیاه بدان زلفکان تو ماند — سپید روز بپاکی رخان تو ماند
عقیق را چو بسایند نیک سوده گران — کہ آبدار بود بالبان تو ماند
بوستان ملوکان ہزار گشتم بیش — گل شگفتہ برخسارگان تو ماند
دو چشم آہو و دو نرگس شگفتہ ببار — درست و راست بدان چشمکان تو ماند
کمان بابلیان دیدم و طرازی تیر — کہ برکشیدہ شود بابروان تو ماند
ترا بسرو بن بالا قیاس نتوان کرد — کی سرو را قد و بالا بدان تو ماند

(صفحہ ۱۳۰، المعجم)

رابعہ بنت کعب القزداری کی غزل کی نسبت عوفی رقم کرتا ہے :۔

"و این غزل از کعب الغزال در حلاوت زیادہ است" (صلا۲۶ لباب) میں صرف مطلع درج کرتا ہوں :۔

مرا بعشق ہمی محتمل کنی بحیل — چہ حجت آری پیش خدای عز و جل

---

[1] اس وزن کو مشکول کہنا سراسر تکلف ہے۔ اگر مجبوں مان لیا جائے تو بے انتظامی ارکان کی شکایت خود بخود رفع ہو جاتی ہے۔

شعرائے غزنہ میں سے عنصری اور فرخی کی غزلیات ان شاعروں کے دیوانوں میں موجود ہیں۔ عسجدی کی غزل کے نمونے عوفی نے لباب الالباب میں ص ۵۲ پر اور ابو اللیث طبری کے ص ۶۶ پر۔ امیر معزی کے ص ۷۰-۷۵ پر عبدالواسع جبلی کے ص ۸۰-۱۰۷ پر۔ خالد بن الربیع کے ص ۳۱-۱۴۲ پر اور سنائی مروزی کے ص ۵-۱۴۷ پر مرقوم کیے ہیں۔ انوری و خاقانی کے تو مستقل دیوان موجود ہیں جو ان کے کلیات میں شامل ہیں۔ بلکہ سنائی المتوفی ۵۴۵ھ کے ہاں غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ مقطع میں تخلص کا استعمال باقاعدہ شروع ہوجاتا ہے۔ واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا انہی سے شروع ہوتا ہے اور صومعہ کو خیرباد کہہ کر خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہے۔ عطّار اور مولانا رومؒ سنائی کی بنیادوں پر قصر و ایوان کھڑے کرتے ہیں۔

سامانیوں، غزنویوں اور سلجوقیوں کے عہد میں غزل کے وجود سے انکار کرنا تاریخ کے مسلمہ واقعات کو نظر انداز کر دینا ہے۔

یہاں میں اس بحث کو ختم کر کے عرض کرتا ہوں کہ سید صاحب ممدوح کی آرا رباعی کی قدامت اور دیگر امورِ متعلقہ کی بابت نہ صرف ہماری فنی روایات سے متبائن و متفاوت ہیں بلکہ اُن سے عام غلط فہمی پیدا ہونے کا بھی احتمال ہے۔ اسی لیے مجھے ان بیانات کی تردید کی جرأت ہوئی۔

مجھے شکایت ہے کہ سید صاحب نے باوجودیکہ کئی موقعوں پر مجھے اپنی قابلِ قدر تالیف خیام میں ملزم ٹھیرایا ہے۔ لیکن اس کا کوئی نسخہ میری اطلاع کے واسطے حسب رواجِ زمانہ مجھے نہیں بھیجا۔ اور مجھ کو بے خبر رکھ کر لائقِ تعزیر قرار دیا۔ میں اس یک طرفہ کارروائی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ یہ خفیہ تیر اندازی نامناسب ہے۔

لاف آں بہتر کہ در میدان سر بازان زنیم
شرطِ دعویٰ نیست تنہا گوی و چوگاں باختن

حال ہی میں جب میں نے رباعی کی تقطیع کے آسان طریقے پر قلم اٹھانا چاہا اس کی تاریخ کے سلسلے میں مخدومی پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال نے سید صاحب کی تالیف کا بھی ذکر کیا جس میں رباعی پر ایک طویل الذیل مضمون موجود ہے۔ اس طرح سید صاحب کے اعتراضات سے مجھے دیر میں اطلاع ملی۔ اور یہ میرا قصور نہیں اگر جواب دیر میں دیا گیا۔
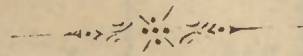
مفید عام پریس لاہور میں باہتمام لالہ موتی رام مینجر چھپی۔
اور سید صلاح الدین جمالی مینجر انجمن ترقی اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کی +

اشاریہ[1]

فہرست اوّل، اشخاص و مقامات

ا

---

[1] انجمنِ ترقیٔ اردو اس اشاریہ کی تیاری کے لیے شیخ محمد داؤد صاحب خلف الرشید پروفیسر محمد اقبال صاحب کی منت گزار ہے [illegible]

ب

ن